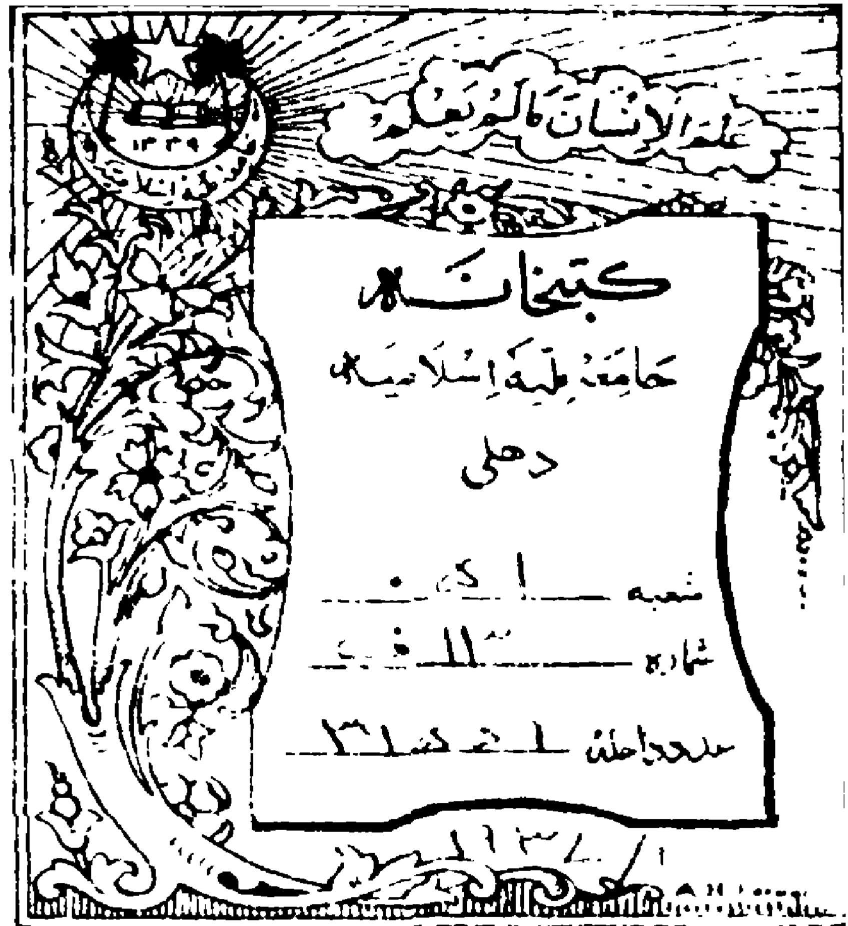
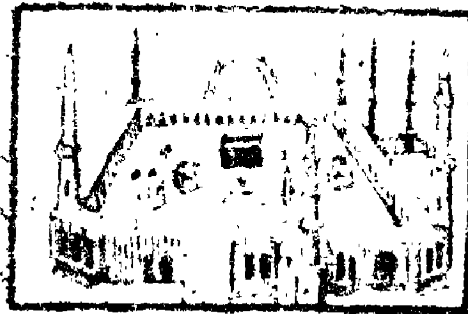


فاران



قیمت

تمام خطوط اور ترسیل زر کا پتہ

محمد مجید حسن مالک رسالہ فاران بجنور (یو۔پی)

قیمت

قواعد

۱۔ فاران کی تاریخ اشاعت ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ ہے۔
۲۔ مضامین جو معیار کے مطابق ہوں شائع ہوتے ہوں
۳۔ ذاتی حملوں والے دل آزار مضامین درج نہیں کئے جاتے
۴۔ ناپسندیدہ مضامین ار کا ٹکٹ آنے پر واپس ہو سکتے ہیں
۵۔ خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں ہوتے۔
۶۔ فاران کی ضخامت چوسٹھ صفحے ماہانہ ہے۔
۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں آخر ماہ کے اندر اندر آنی چاہئے۔ ممالک غیر کی اطلاع دوسرے مہینہ کی پند تاریخ کے اندر پہنچ جانی چاہئے ورنہ اس کے بعد رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔
۸۔ جواب طلب امور کے لئے ار کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔
۹۔ فاران کی سالانہ قیمت ﮩ ششماہی عہ، فی پرچہ ۲ر ممالک غیر سے ﮩ۲ مع محصولڈاک ہے۔
۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ صاف اور خوشخط تحریر فرمائیے۔
۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری کا نمبر ضرور درج کیجئے۔

نرخنامہ اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	للعہ،	ﮩللعہ،	ﮩعـہ	عہ،
آدھا صفحہ	ﮩللعہ،	ﮩعـہ	ﮩ،	ﮩر
چوتھائی صفحہ	ﮩعہ،	ﮩعہ،	ﮩ۲	ﮩ،

۱۔ اجرت پیشگی لی جائے گی، وہ چریا وی پی کے ذریعہ وصول نہیں کی جائے گی۔
۲۔ جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔
۳۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہے گا۔
۴۔ اشتہار فراہم کرنے والوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر
فاران بجنور یوپی

فاران

مالک — محمد مجید حسن

ہر ماہ انگریزی کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

مدیر — ابو اللیث ندوی اصلاحی

نمبر ۱ — بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۷ء مطابق ماہ شوال سنہ ۱۳۵۵ ہجری — جلد ۳

فہرست مضامین

بحث و نظر

جنوری کا وہ مبارک مہینہ آگیا جس کے لئے ہم زیادہ دنوں سے چشم براہ تھے۔ ناظرین اس ماہ مبارک کے آنے پر ہماری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

آپ کو یقیناً تعجب ہوگا کہ عید آئی اور گذر گئی لیکن اس کی آمد پر ہم نے مبارکباد پیش نہیں کی۔ یہ جنوری کی کیا خصوصیت ہے کہ اس کے آنے پر ناظرین کو مبارکباد پیش کی جا رہی ہے؟

آپ کا تعجب بیجا نہیں۔ بالکل برمحل ہے۔ یقیناً آپ کو اس پر تعجب ہونا چاہئے۔ ہمارے اخبارات و رسائل کا عام دستور یہی ہے کہ وہ عید کے موقع پر اپنے ناظرین کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہمارا بھی جی چاہتا تھا کہ اور رسائل کی عادت سے ناظرین کو عید کی مبارکباد پیش کریں لیکن پھر طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ خواہ مخواہ ہم ایک رسمی چیز کی بے وجہ اتباع کریں۔ جب عید کے آنے پر ہمیں کسی قسم کی مسرت لاحق نہیں ہوتی، جب عید پیام مسرت کے بجائے ہمارے لئے رنج و غم کا پیام لے کر آتی ہے تو اس کے آنے پر مبارکباد کیونکر پیش کی جا سکتی ہے۔ کیا رنج و غم کا پیام لانے والی عید کی آمد پر کسی کو مبارکباد پیش کرنا، اس کے ساتھ استہزا و تمسخر کے مرادف نہیں ہے؟ ہندوستان کا کون مسلمان ہے جسے عید کے دن واقعی مسرت لاحق ہوتی ہو اور وہ اس موقع پر اپنے دل میں خوشی کا کوئی اثر پاتا ہو! بلاشبہ کسی دینی خدمت اور عبادت کو انجام دے کر مسرور و شادمان ہونا ایک قدرتی امر ہے لیکن ہم میں کتنے ایسے [illegible] گے جن کا دل اپنی جگہ مطمئن ہو کہ انھوں نے فریضہ رمضان کو اس کے ضروری آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا ہے! اور [illegible] بھی ایسا نظر آسکتا ہے جس کے اس جذبۂ مسرت پر اس رنج و غم کا طوفان، غالب نہ آجاتا ہو جو خصوصیت کے [illegible] وہ حالت کے احساس سے طاری ہوتا ہے۔

[illegible] ستان میں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ہر طرف سے اعدائے اسلام کے نرغے میں ہیں۔ [illegible] لا رہے ہیں۔ [illegible] دیو ہلاکت منہ پھاڑے ان کی [illegible] رف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور بادی [illegible] [illegible] رہا لیجا [illegible] چاہتا ہے۔ کیا ایسی حالت میں کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی عید [illegible] کا جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا۔ تو پھر عید کے آنے

آپ خیال کریں گے شاید اس لئے کہ اس مہینے سے نیا سال شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے، ہمیں کسی سال کے آنے پر کوئی خاص خوشی نہیں ہوتی کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر نیا سال ہمارے لئے کسی نہ کسی مصیبت ہی کا پیام لے کر آتا ہے اور اگر سال نو کی آمد پر ہمیں خوشی ہوتی تو جنوری کے بجائے ہم اپنے مذہبی سال کے ابتدائی مہینہ کی آمد پر خوشی مناتے کہ ہمارا سال ہجری کم از کم ہمارے گذشتہ زمانہ کے ایک ایسے واقعہ کی یادگار ہے جس کے بعد مسلمانوں کو مکہ کے مشرکین کی ایذا رسانیوں سے نجات ملی اور ان کی ترقی اور عروج کا نیا دروازہ کھلا۔ جنوری کی آمد پر ہمیں کیونکر خوشی ہو سکتی ہے جبکہ اس سے ان [illegible] کے سال کی ابتدا ہوتی ہے جو سال کے ہر لمحہ میں ہم پر نئی نئی مصیبتیں ڈھاتے رہتے ہیں۔ بیشک اس سال جنوری کا آنا ہمارے لئے خوش کن ہے لیکن اس لئے نہیں کہ یہ سال کا نیا مہینہ ہے بلکہ اس لئے کہ اس ماہ سے چند ایسے کاموں کی ابتدا ہونے والی ہے جو مسلمانوں کے شاندار مستقبل کا پتہ دیتے ہیں اور جن سے ہم اپنی فلاح و بہبود کی بہترین توقعات وابستہ کرسکتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اسلامی حکومتوں کا وہ معاہدہ اتحاد ہے جو سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ افغانستان (جن کی کوششوں کو اس معاہدہ کے ظہور پذیر ہونے میں بہت زیادہ دخل ہے) کے اعلان اتحاد بیان کے مطابق اسی ماہ میں اپنے تمام اہم ترین مراحل سے گذر کر مکمل ہو جائے گا۔ ہمارے نزدیک اسلامی حکومتوں کا باہمی اتحاد تمام عالم کے مسلمانوں کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالنے والا ہے اور اس سے آئندہ نہایت خوشگوار نتائج کے ظہور پذیر ہونے کی توقع ہے اس لئے ہم نے خلاف معمول جنوری کی آمد پر مبارکباد پیش کی کہ اسی ماہ میں یہ مبارک معاہدہ مکمل ہونے والا ہے۔

ہر وہ شخص جسے مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہے جانتا ہے کہ

ہمیں جس چیز نے کھویا وہ تفریق و تجزی تھی،

مسلمانوں نے اپنے زمانہ عروج میں جن جن ملکوں کو فتح کیا اور جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں، ان کی مفصل تاریخ پڑھ جائیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ مسلمانوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی حکومت کے تختے الٹے اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی اپنی عظمت و سلطنت کو پارہ پارہ کیا۔

اندلس میں عربوں نے جو شاندار حکومت قائم کی تھی اور جس کا پرچم صدیوں یورپ میں لہراتا رہا، کیا اس کے زوال کا سبب بجز ان سلاطین و امراء کی باہمی عداوت و اختلاف کے سوا کسی اور چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اپنے ہی دینی بھائیوں کو مٹانے کے لئے اپنے کو مسلمان کہلانے والے امراء و سلاطین اپنے دشمنوں سے مدد لیتے تھے بلکہ اس کے لئے اپنے دشمن بادشاہوں کی ہر طرح کی امداد و اعانت میں سرگرم رہتے تھے۔ اندلس کو ہم نے یہاں مثالاً پیش کر دیا ہے ورنہ ہر ملک میں، اسلامی سلطنت کے زوال و انحطاط کے باعث خود مسلمان ہوئے ہیں، یہ ایک دلدوز لیکن حقیقی داستان ہے جس کو بیان کرنے کے لئے [illegible] کامل دفتر درکار ہے۔

مسلمان بد قسمتی سے تفرقہ و انتشار کے قعر مذلت میں پہلے ہی سے پہونچے ہوئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ہر ملک کے مسلمان باہم برسرپیکار تھے بلکہ مذہبی اثر و اقتدار کے کم ہونے کی وجہ سے ہر ملک اپنے دینی رشتۂ اتحاد کو توڑ کر دوسرے اسلامی ممالک سے منقطع علیحدہ سا ہو گیا تھا۔ لیکن ان میں جو تھوڑا سا رشتۂ اتحاد باقی بھی تھا، اسے اس قومیت پرستی نے منقطع کر دیا جو یورپ کی نقالی کے سبب سے حاصل کی تھی۔ حالانکہ اسلام دنیا میں آیا ہی اس لئے تھا کہ وطنیت و جنسیت وغیرہ کی جاہلانہ عصبیتوں کو مٹا کر تمام دنیا کو ایک عالمگیر برادری میں داخل ہونے کی دعوت دے۔ چنانچہ قومیت پرستی کی لعنت میں مبتلا ہونے سے پہلے تمام عالم کے مسلمانوں میں صرف ایک اسلام کی قومیت تھی اور ان سے باہمی اختلاف و شقاق کے باوجود اس کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ ایک مسلمان ایک مسلمان کو اپنا بھائی سمجھتا تھا اور اس کے رنج و مصیبت سے متاثر ہوتا تھا، خواہ وہ کسی خطۂ ارض کا رہنے والا ہو اور کسی نسب و خاندان سے تعلق رکھتا ہو کیونکہ اسلام نے بتایا تھا کہ ذات پات اور رنگ و نسل کی تفریق بے معنی ہے۔ اور شعوب و قبائل کی تقسیم محض تعارف کے لئے ہے

یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلے اور قبیلے ذاتیں، اور قبیلے اس لئے بنائے کہ آپس کی پہچان ہو سکے۔ زیادہ عزت اللہ کے یہاں اس کی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اور انسان ہونے کی حیثیت سے سب لوگ برابر ہیں۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی کلھم ابناء آدم — کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت۔ تم سب آدم کی اولاد ہو۔

لیکن قومیت پرستی نے فروغ پا کر مسلمانوں کے عالمگیر رشتۂ اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہر ملک کے مسلمان اپنے دوسرے ملک کے دینی بھائیوں سے الگ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر اسلامی نظام کے دانے بکھر گئے۔ مصری اپنے اہرام اور اپنے فراعنہ پر، ایرانی اپنے زردشت اور دارا پر، ترک ہلاکو اور چنگیز کی اولاد ہونے پر فخر و ناز کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بالکل منقطع اور منافرت کی

آپ سمجھتے ہیں کہ اس قومیت پرستی نے ان ملکوں کو کوئی فائدہ پہونچایا؟ ممکن ہے ہر ملک نے اپنے اندر اس جذبہ کو پیدا کر کے وقتی طور پر تھوڑا بہت فائدہ حاصل کر لیا ہو لیکن جب ہم اسلام کے وسیع نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں اور مسلمانوں کے مجموعی مصالح و مفاد کے پیش نظر، قومیت پرستی کے حال و مستقبل کے فوائد و مضار پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز نے گو وقتی اور ظاہری طور پر ہر ملک کو تھوڑا بہت فائدہ پہونچایا لیکن بحیثیت مجموعی ان کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا اور ان کے مستقبل کو نہایت تاریک اور خطرات و مشکلات سے معمور کر دیا۔ یہی قومیت پرستی کا جذبہ تھا جس نے جنگ عظیم میں عربوں کو ترکوں سے بغاوت پر آمادہ کیا۔ عربوں نے اپنی عربی قومیت باقی رکھنے کے لئے ترکوں سے کنارہ کشی اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت عثمانیہ بھی تباہ ہوئی اور ان کا عربی حکومت کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا کیونکہ جسم اسلام سے علیحدہ ہو کر انھوں نے اپنی وہ طاقت کھو دی جو . . . اتحادیوں کو اپنے وعدوں کے ایفا پر آمادہ کر سکتی

[illegible] اسباب پر [illegible]

ہوا یہ تھا کہ اس وقت عالم عیسائیت میں مذہبی منازعات چھڑے ہوئے تھے اور عیسائیوں کا ہر فرقہ دوسرے فرقہ کا دشمن تھا برخلاف اس کے ترک، عرب، اور کرد وغیرہ تمام مسلمان قومیں متحد تھیں لیکن زمانے نے جب پلٹا کھایا تو ایک طرف کیتھولک، [illegible] آپس میں مل کر ایک ہو گئے دوسری طرف ترکیت اور عربیت کے نفاق نے جڑ پکڑ لیا۔ عربوں نے سمجھا کہ اگر ہم دولت عثمانیہ کا ساتھ دیں گے تو ایک دن ہماری عربی قومیت فنا ہو جائے گی۔ اس لئے انہوں نے ترکوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور یہ دولت عثمانیہ کے زوال کا راز ہے۔

اس قومیت پرستی نے یہی نہیں کہ دولت عثمانیہ کو پارہ پارہ کر دیا بلکہ تمام اسلامی حکومتوں کو سخت خطرات سے دوچار کر دیا ان کے ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کی وجہ سے ان میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو گیا۔ اور یورپین حکومتوں کو موقع ملا کہ انہیں کمزور پا کر اپنی استعمار پرستی کا شکار بنا لیں اور لقمہ تر کی طرح آسانی سے نگل جائیں، چنانچہ اس کے لئے مختلف قسم کے منصوبے باندھے گئیں اور بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔

انسان بہت کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔ شروع شروع میں جب یورپ نے نہایت مکاری کے ساتھ قومیت پرستی کا صور پھونکا تو تمام اسلامی ممالک اس سے اس حد تک مسحور ہو گئے کہ انہوں نے دوسرے اسلامی ممالک سے اپنا ہر قسم کا رشتہ منقطع کر لینا چاہا اور ہر ملک صرف اپنے ملک کا راگ الاپنے لگا لیکن جب ان کی قومیت پرستی کے نتائج سامنے آنے لگے تو انہیں ہوش آیا۔ اسی کا نتیجہ ہے جو تم دیکھ رہے ہو کہ ہر اسلامی ملک اب دوسرے اسلامی ملک کی طرف اتحاد و مودت کا ہاتھ بڑھا رہا ہے اور باہم بغل گیر ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ اسی انقلاب حال کا نتیجہ وہ معاہدہ اتحاد بھی ہے جو اس ماہ میں چار بڑی اسلامی حکومتوں کے درمیان تکمیل پذیر ہونے والا ہے۔

اسلامی ممالک میں حال و مستقبل کی ضروریات اور یورپ کے جدید حالات کے پیش نظر اس وقت نہایت ضروری سمجھا جانے لگا ہے کہ ایشیا کی اسلامی سلطنتوں میں اتحاد و یگانگت کا جذبہ پیدا کیا جائے اور اپنے تمام اختلافات کو باہمی مفاہمت اور اتحاد و محبت کے ساتھ ختم کر دیا جائے۔ چار بڑی اسلامی حکومتیں ترکی۔ عراق۔ ایران اور افغانستان ایک معاہدہ اتحاد پر دستخط ہونے والی ہیں اور توقع کی جا رہی ہے کہ دیگر اسلامی ممالک بھی جلد ان کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ سلطان ابن سعود اور شاہ یمن کو اس معاہدہ میں شرکت کی دعوت دی جا چکی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ یہ دونوں اسلامی سلطنتیں بھی بہت جلد شرکت پر آمادہ ہو جائیں گی۔

اس معاہدہ اتحاد کے ساتھ بہت زیادہ خوش آیند اور آیندہ کے تعلقات پر بہتر اثر ڈالنے والی [illegible] جو اسلامی ممالک کے باہمی منازعات کو دور کرنے کے لئے بروئے کار لائی جا رہی ہیں۔ حکومت مصر اور حکومت [illegible]

اختلافات ہو مسئلہ موصل کی بنا پر ایک مدت سے چلے آرہے تھے ۔ اب قضیۂ نامرضیہ اس طرح حل ہو گیا ہے کہ دونوں حکومتیں راضی ہو گئیں۔
ایران اور عراق کی سرحدات کے متعلق جو اختلاف ایک مدت سے چلا آرہا تھا اس کے فیصلے کے لئے مصطفےٰ کمال پاشا کو حکم
مقرر کیا گیا ہے امید ہے وہ جلد کوئی ایسا فیصلہ کر دیں گے جسے دونوں حکومتیں بخوشی منظور کر لیں ۔

اسلامی ممالک اپنے تعلقات کو مستحکم اور پائدار بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے دوسرے وسائل بھی اختیار کر رہے ہیں
ان کے درمیان مختلف قسم کے تجارتی اور غیر تجارتی معاہدے ہو رہے ہیں آمد و رفت کے وسائل زیادہ کئے جا رہے ہیں اور وہ تمام
صورتیں اختیار کی جا رہی ہیں جن سے ملکی تعلقات پر خوشگوار اثر پڑے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر اسلامی ملک دوسرے اسلامی
ملک سے اپنے بہتر تعلقات قائم کرنے کے لئے بے چین ہے ۔ بعض ممالک میں اس کے لئے مستقل انجمنیں قائم ہو گئی ہیں ۔ جو
شب و روز ان وسائل پر غور کر رہی ہیں جن سے اتحاد و [illegible] کو تقویت ہو ۔ اس سلسلہ میں مصر کے اس وفد کا تذکرہ کر دینا
بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اس وقت ہندوستان کا دورہ کر رہا ہے اور جس کا مقصد عظیم یہاں کے مسلمانوں سے اپنے تعلقات
کو مستحکم اور مضبوط بنانا ہے ۔

مسلمانوں نے اپنے اختلاف و شقاق کی بنا پر اپنا بہت کچھ کھویا ہے لیکن اگر وہ سب کچھ کھو کر اتفاق و اتحاد کی ضرورت
محسوس کرنے لگے ہیں تو اسے اپنے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ سمجھنا چاہئے ۔ خدا ہمارے اس اتحاد کو نظر بد سے بچائے ۔

اسلامی حکمرانوں کے اتحاد سے زیادہ اہم اہمیں اتحاد کا وہ جذبہ نظر آ رہا ہے جو اسلامی ممالک میں افراد کے درمیان پایا جاتا ہے
ہر اسلامی ملک کے باشندے اتحاد و اتفاق کے نشہ میں سرشار نظر آ رہے ہیں اور اپنے جملہ قسم کے مذہبی و غیر مذہبی اختلافات و مناقشات
کو مٹا کر باہم بغل گیر ہو رہے ہیں ۔ مسلمانوں کے اختلاف و انشقاق کا سب سے بڑا سبب ان کی مذہبی فرقہ بندی تھی شیعہ سنی
کے دشمن تھے ، سنی شیعوں کے خون کے پیاسے تھے حنفی شافعی کو گالیاں دیتے تھے ، شافعی حنفی کو برا بھلا کہتے تھے ۔ غرض ایک
خدا ایک رسول اور ایک کتاب کو ماننے والے ، اپنی جہالت اور تنگ نظری کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے
لیکن اب وہ اس فرقہ بندی کے خطرناک نتائج سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے تمام مذہبی مناقشات کو ختم کر کے ترقی قوم
کے کاموں میں مل جل کر حصہ لینے لگے ہیں ۔ مصر کا جامعہ ازہر شیخ مصطفےٰ مراغی کی رہنمائی میں ایک جدید دور سے گذر رہا ہے
اور وہاں ایسے علماء تیار کئے جا رہے ہیں جو مذہبی مناقشات اور اختلافات سے بلند ہو کر اسلام کی خدمت کر سکیں ۔ ایران
میں شیعہ و سنی کا تفرقہ نہایت شدید تھا لیکن رضا شاہ پہلوی کے حسن تدبر نے ان تمام چیزوں کی جڑ کاٹ دی جو ان دونوں
فرقوں کے درمیان ہمیشہ اختلاف کی آگ مشتعل رکھتی تھیں ۔ یہی حال دوسرے اسلامی ممالک کا بھی ہے کہ اب فرقہ بندی
وہاں سے رخصت ہو رہی ہے مذہبی اختلافات مٹ رہے ہیں اور ملک کے باشندے بے سود جزئی مسائل پر ایک دوسرے
کا سر پھوڑنے کے بجائے کامل اتحاد اور یک جہتی کے ساتھ اپنی ترقی و تعمیر میں مشغول ہیں ۔

... کو ایسے اختلافات کو مٹانے اور آپس میں مگر [illegible] اتحاد و اتفاق [illegible]

[illegible] ایک اندازہ ان تقریروں اور تحریروں سے بھی ہو سکتا ہے جو رہنمایان قوم اور ہر فرقہ کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ان ممالک کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں شیعان عراق کے مذہبی پیشوا شیخ [illegible] نے [illegible] میں ایک تاریخی تقریر کی ہے جس کے دوران میں آپ نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"ہم نے اصول کو چھوڑ کر فروع کو اختیار کیا اور اس پاک مذہب سے دور ہو گئے جس کی تلقین خیر البشر نے فرمائی تھی۔ جس طرح دھوبی کپڑے کو مار مار کر میل سے پاک کرتا ہے اس طرح زمانہ نے مار مار کر ہم کو میل کچیل سے پاک کیا اور اتحاد اسلامی کا سبق یاد دلایا جو اسلام کا بنیادی اصول ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں تفرق، نفس پرست علماء کی کوتاہ اندیشی اور خود غرضی سے پڑا ورنہ تمام کلمہ گو مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک خدا اور ایک رسول اور ایک مذہب کے پیرو ہیں''

شیعہ سنی کا اختلاف فی الحقیقت ایک فروعی اختلاف ہے جس طرح کہ سنیوں میں حنفی اور شافعی کا اختلاف ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ اختلاف شیعہ سنیوں کے درمیان ایک حد فاصل بن گیا ہے۔

آخر میں آپ نے اپنی ان مساعی جمیلہ کا تذکرہ فرمایا جو اتحاد اسلام کو ترقی دینے اور شیعہ سنی اختلاف مٹانے کے لئے فرمائی ہیں اور اس فقرہ پر اپنی تقریر ختم کی۔

خدا کا شکر لازم ہے کہ ہم کو تنگ خیالی اور جہالت کے دلدل سے نکالا اور آج سنی، شیعہ سب فرقے مساوی ہیں

مشہور شیعی فاضل مرزا عبدالکریم زنجانی کے ایک مقالہ کا اقتباس درج ذیل ہے۔

''شیعہ اور سنیوں کے مابین جہاں حقیقی اختلاف کی شاید ہی کوئی بات پائی جاتی ہو وہاں بہت سے اہم بنیادی اصول ہیں جن میں تمام اسلامی فرقے متحد ہیں۔

اگر ہم شیعہ اور سنی دونوں کے خیالات کے ضروری اور بنیادی اصولوں کو علمی طور پر بخلوص دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہونچ جائیں کہ صرف ایک اہم سیاسی اختلاف رائے ہے جو دونوں گروہوں میں پایا جاتا ہے اور وہ امامت یا خلافت کے نظریہ سے تعلق رکھتا ہے۔ زیادہ [illegible] مسیحی عیسائیوں کو حضرت علی کے

ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ سنی ایک سیاسی نظریہ کو مانتے ہیں اور شیعہ د[illegible]

لیکن جہاں اتحاد کا پہلو آتا ہے وہاں مذہب اور شریعت کے تمام

[illegible] اظہار کا وقت نہ تھا بلکہ اس میں بڑے بڑے ادبا، مورخین

کے تمام اصولوں میں دونوں متحد ہیں''

[illegible] کے بعد مضمون نگار نے دونوں فرقوں کے وجوہ اتحاد [illegible] ان جملوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی شدید فرقہ بندی کا حال

ان منافات ایمان کے مقابلہ [illegible] بریلوی و دیوبندی وغیرہ کے ان جھگڑوں کا ایک لمحہ کے لئے

چاہتے ہیں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

مضمون کے آخر میں آپ نے ہر دو فرقوں کو الگ الگ مخاطب کر کے اتحاد و اتفاق کی تلقین فرمائی ہے مضمون کا اختتام دونوں سے یہ اپیل کی ہے۔

"میں اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے شیعہ دوستوں سے وحدت اسلامی کے لئے مخلصانہ اپیل کرتا ہوں۔ میں سب سے درخواست کرتا ہوں کہ بھول جانے اور معاف کر دینے کی اسپرٹ اپنے اندر پیدا کریں۔ آپ کو چاہئے کہ عالمگیر ہمدردی اندر پیدا کریں اپنے نقطہ نظر کو دیکھا کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے رواداری اور اعتدال کا طریق اختیار کریں، مہربانی فرما کر سب قسم کے بحث و مباحث، رنج و عناد کو عزت و وقار کے ساتھ ختم کر دیں۔ آپ امت کو سوال پر تیرہ صدیوں تک جھگڑتے رہے ہیں لیکن اس جھگڑے سے کچھ بھی آپ نے حاصل نہ کیا بلکہ اس میں مذہب، آزادی، ملک طاقت، حکومت غرض دین اور دنیا سب چیزوں کو ہم نے کھو دیا ہے میں کبھی نہ کہوں گا کہ شیعہ سنی ہو جائیں یا سنی شیعہ بن جائیں میں مانتا ہوں کہ اختلاف رائے کی کچھ نہ کچھ گنجائش ہونی چاہئے۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے ماتحت چھوٹے چھوٹے اختلافات بے شک رکھیں لیکن ایسے معاملات میں جو اسلامی اصولوں اور آپ کے ملک و مذہب کی حفاظت اور بہبودی سے تعلق رکھتے ہیں آپ سب کو ایک جسم و جان ہو جانا چاہئے۔"

ابھی حال ہی میں امیر شکیب ارسلان کا مقالات شام و فلسطین کے متعلق ایک بیان آفرین مضمون شائع ہوا ہے جس میں آپ نے تمام ملت اسلامیہ سے اتحاد و اتفاق کی اپیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ شائع کی جو کمٹ بریناک رگڑ ھنے وطن کے نام سے فرقے بنانے کے بجائے اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں اور اس ضابطۂ حیات پر عمل کریں جو خداوند عالم نے تمہاری ہدایت و اصلاح کے لئے نازل فرمایا ہے، اگر اتحاد کے ذریعہ تم نے اپنی قوت استوار کر لی تو دنیا تمہارے آگے سرنگوں ہوگی اور تم یقیناً قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح دنیا پر بھاری ہوگے۔"

ان اقتباسات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام کے رجحانات کیا ہیں اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ کس تیزی کے ساتھ فروغ پا رہا ہے اس سلسلہ میں اس تحریک کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اس وقت اسلامی ممالک میں کئی کاموں میں ہے [illegible] کہ مختلف اسلامی فرقوں کی ایک کانفرنس کیجائے جو تمام مذہبی اختلافات و تعصبات کو دور [illegible] تیار کئے جا رہے ہیں۔

شیعہ وسنی کا تفرقہ نہایت شدید تھا لیکن رضا [illegible] نے ہمیں بہت زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ ہماری یہی فرقہ بندی ہمارے [illegible] فرقوں کے درمیان ہمیشہ اختلاف کی آگ مشتعل رکھتی ہے۔ شکر ہے کہ اب یہ زنجیر بھی کٹتی نظر آرہی ہے۔

[illegible] رخصت ہو رہی ہے مذہبی اختلافات مٹ رہے ہیں۔

[illegible] بجائے کہ الٰہی اتحاد و یک جہتی کے ساتھ اپنی ترقی ڈال دی جائے کہ انھیں زمانہ نے کیا سبق دیا ہے [illegible]

اتحاد و اتفاق کی کس منزل میں ہیں۔

خدا کا شکر ہے ہندوستانی مسلمان اب تک قومیت پرستی کی نجاست سے محفوظ ہے اور اپنے بیرونی بھائیوں کے ساتھ ہمیشہ اتحاد و یگانگت کا ثبوت دیا اور جب کبھی ضرورت پیش آئی ان کی ہر قسم کی امداد و اعانت پر آمادہ ہو گئے۔ غیر ملکی مسلمانوں کے ساتھ ان کا جذبہ اتحاد اس حد تک قوی ہے کہ اکثر ہمارے برادران وطن، اس پر "انگشت نمائی" کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ان کا تمدنی اختلاف اور مذہبی فرقہ بندی اس قدر شدید ہے کہ اس کی مثال ہمیں کسی دوسرے اسلامی ملک میں کم نظر آتی ہے زمانہ نے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے اور وہ اب اپنے جملہ قسم کے اختلافات مٹا کر ایک جسم و یک جان ہو رہے ہیں لیکن ہندوستانی مسلمان ہیں کہ اب تک انھیں ہوش نہیں آیا ہے اور وہ بدستور باہمی جنگ و جدال میں مصروف ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ مذہبی فرقہ بندی نے انھیں مختلف ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہے بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی وہ مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر جماعت خواہ مذہب کے نام پر قائم کی گئی ہو یا سیاست کے دوسری جماعت سے اس طرح الگ ہے کہ ان کا کسی طرح متحد ہونا ناممکن ہے۔ ان کی مذہبی فرقہ بندی کی کیفیت معلوم کرنی ہو تو حال کے ان تازہ واقعات کو پیش نظر رکھیے جو مدح صحابہ کے سلسلہ میں پیش آتے ہیں۔ آزاد ممالک کے شیعی پیشواؤں نے شیعہ و سنی اختلافات کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آپ پڑھ چکے ہو اب ذرا اپنے دل کو قابو میں رکھ کر اس مسئلہ کے متعلق ہندوستانی شیعہ مجتہدین کے خیالات بھی سن لیجئے۔

مدح صحابہ کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں اور ہر دو فرقہ نے اپنے ایک نجی معاملہ کو حسن تفاہم سے طے کر لینے کے بجائے حکومت کے سامنے پیش کر کے اسلامی شرف و وقار کو جو صدمہ پہونچایا ہے ہم اس وقت اس پر بحث کرنا اپنے دائرہ سے خارج سمجھتے ہیں۔ البتہ ۹ ار دسمبر کو شیعوں کے وفد نے گورنر یوپی کی بارگاہ میں جو میموریل پیش کیا ہے اس کے چند فقرے یہاں درج کرتے ہیں جن سے یہ واضح ہو گا کہ ہندوستان میں شیعہ اور سنیوں کے درمیان اختلاف کا جذبہ کس قدر شدید ہے۔

"جن لوگوں کی تعریف مدح صحابہ میں کی جاتی ہے ان سے اختلاف مذہبی کے علاوہ شیعوں کو خاص رنج ہے۔ ان کے کاموں سے شیعوں کے دلوں میں گہرے زخم ہیں جو تیرہ سو برس کے بعد بھی مندمل نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے مذہب پر باقی ہیں"

شیعوں کو مدح صحابہ سننے کے لئے آمادہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہندوؤں کو راون کی مدح یا مسیحی عیسائیوں کو حضرت علی کے ظاہری قاتلوں کی تعریف"

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ وفد عوام و جہلا کا وفد نہ تھا بلکہ اس میں بڑے بڑے ادبا، مورخین، علما، اور وکلا کے علاوہ دو تین بڑے مجتہدین بھی شریک تھے۔ ان جلوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی شدید فرقہ بندی کا حال واضح ہو جاتا ہے اگر اور ثبوت درکار ہو تو حنفی و شافعی، وہابی و بدعتی بریلوی و دیوبندی وغیرہ کے ان جھگڑوں کا ایک لمحہ کے لئے

تصور کر بیٹھے جو ملک کے طول و عرض میں ہر وقت برپا رہتے ہیں۔

یہ حال تو مذہبی فرقہ بندی کا ہے۔ سیاسی فرقہ بندی دیکھنی ہو تو ان انجمنوں کی فہرست پر نظر ڈال لیجئے جو ہندوستان میں اسلام کے نام پر قائم کی گئی ہیں۔ جتنے ہمارے لیڈر ہیں ان سے زیادہ ہماری سیاسی انجمنیں ہیں اور لطف یہ ہے کہ مقاصد سب کے تقریباً یکساں ہیں۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی جس قدر سیاسی انجمنیں قائم ہیں، ان سب کو شمار کرنا تو شاید آپ کے امکان سے باہر ہو۔ صرف صوبہ پنجاب میں مسلمانوں کی اتنی سیاسی انجمنیں قائم ہیں کہ ان کی تعداد سُن کر آپ حیران ہو کر رہ جائیں گے۔ انجمنوں کی یہ کثرت ممکن ہے کسی کے لئے کسی نقطۂ نظر سے خوش آئند ہو۔ مگر ہمارے نزدیک تو ہندوستان میں ہمارے سیاسی تنزل و انحطاط کا باعث انجمنوں کی یہی کثرت ہے۔

---

۶ اوپر کی تمام تفصیلات پڑھ کر یقیناً آپ کو حیرت ہوگی کہ ایک طرف مسلمانوں میں دینی اخوت و ہمدردی کا جذبہ اس قوت و شدت کے ساتھ موجود ہے کہ اپنے غیر ملکی بھائیوں کی معمولی سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتے ہیں اور جب کبھی ضرورت پیش آتی ہے ان کی امداد و اعانت کے لئے سب کے سب متحد ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف ان میں باہم اس درجہ منافرت اور عداوت ہے کہ مشترکہ اغراض ہی انہیں یکجا نہیں کر سکتے اور ایک خدا ایک رسول اور ایک کتاب کے ماننے والے سیاسی اور مذہبی حیثیت سے سینکڑوں فرقوں اور جماعتوں میں اس طرح تقسیم ہو گئے ہیں کہ ہر جماعت دوسری جماعت کی جانی دشمن ہے۔ بظاہر ہندوستانی مسلمانوں کا یہ متضاد رویہ سخت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس کے اسباب و علل کی جستجو کی جائے تو پھر ہمارے لئے جائے حیرت باقی نہیں رہتی۔ غیر ملکی بھائیوں کے ساتھ ہم جس ہمدردی اور اخوت مذہبی کا ثبوت دیتے ہیں اور جس اتحاد و یکدلی کے ساتھ ان کی اعانت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مذہبی و سیاسی ہر دو قسم کے رہنما اپنے صحیح اسلامی جذبہ کے ماتحت یا محض اپنی محبت اسلام ثابت کرنے کے لئے عالمگیر اتحاد اسلامی کی دعوت نہایت زور و شور کے ساتھ دیتے رہتے ہیں اس لئے عوام اس کی ضرورت و اہمیت سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں اور جب کبھی عالمگیر اخوت مذہبی کا جذبہ کسی عملی کارروائی کا موجب ہوتا ہے تو یہ رہنما حقیقی جذبہ اخوت سے مجبور ہو کر یا کم از کم اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے میدان عمل میں کود پڑتے ہیں اس لئے عوام بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ . . . . ان کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر چونکہ ہمارا اندرونی اتحاد ان کے اغراض کے منافی ہوتا ہے اس لئے وہ یا تو تنظیم و اتحاد، و اخوت وغیرہ کی تعلیم و تلقین سے غفلت اختیار کر لیتے ہیں یا ان میں پھوٹ ڈالنے اور انہیں باہم لڑانے کے لئے پوری جد و جہد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جملہ قسم کے اختلافات و مناقشات، ہمارے رہنماؤں اور پیشواؤں کی تنگ نظری، خود غرضی اور غفلت کا نتیجہ ہیں، شیخ زنجباری نے اپنی تقریر میں مذہبی اختلافات کا باعث، علماء کی کوتاہ بینی اور خود غرضی کو قرار دیا ہے لیکن ہمارے سیاسی اختلافات کی بنا بھی سیاسی رہنماؤں کی خود غرضی اور کوتاہ اندیشی کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ ہمارے بہت سے مذہبی و سیاسی رہنما ہمارے اتحاد و اتفاق کو دل سے ناپسند

کہتے ہیں کیونکہ جس طرح حکومت کی بنیاد ہمارے اختلافات پر قائم ہے اسی طرح ان کی لیڈری و پیشوائی بھی اسی پر مبنی ہے۔ ہمارے مذہبی و سیاسی اختلافات کے بعض اور بھی اسباب ہیں لیکن آج کی صحبت میں ان پر بحث نہیں کی جا سکتی۔

غرض یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر نہ مذہبی اتحاد ہے اور نہ سیاسی تنظیم۔ جس طرح افراد ایک دوسرے کے ساتھ معمولی معمولی مسائل پر ہر وقت دست و گریباں رہتے ہیں اسی طرح ہماری جماعتیں اور انجمنیں بھی متحد ہو کر کام کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی شکست و ریخت میں مصروف رہتی ہیں۔ دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمان تو دنیا کے جدید حالات و واقعات سے متاثر ہو کر اپنے ہر قسم کے اختلافات مٹا رہے ہیں اور اپنی تنظیم و اتحاد میں سرگرم ہیں لیکن ہمیں جنگ و جدال سے ابھی اتنی فرصت نہیں ملی کہ کبھی اپنے موجودہ حالت پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور ہم کیا کر رہے ہیں

مسلمانوں کی مشہور و قابل فخر مذہبی درسگاہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء اس وقت جن مالی دشواریوں میں مبتلا ہے اس کا تذکرہ پچھلے پرچہ کے شذرات میں کیا جا چکا ہے۔ دارالعلوم کی مالی امداد کے لئے حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی نے قوم کے نام اخبارات میں ایک اپیل شائع کی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ مولانا کی یہ اپیل صدا بصحرا نہیں ثابت ہوئی اور مسلمانوں نے اپنی اس بہترین مذہبی درسگاہ کی طرف جس سے ان کی بہترین امیدیں وابستہ ہیں، امداد کا ہاتھ بڑھانا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ سب سے پہلے خود ندوہ کے چند ارکان نے اپنی حیثیت کے مطابق اس کی اعانت کے لئے عملی قدم اٹھایا اور تیرہ سو سے کچھ زائد رقم جمع کر دی۔ ضرورت ہے کہ جن لوگوں نے اب تک اس سعادت میں حصہ نہیں لیا ہے وہ بھی جلد اس طرف توجہ کریں۔

ندوۃ نے اپنی مختصر سی زندگی میں جو شاندار خدمتیں ملک و مذہب کی انجام دی ہیں، ان کی طرف گذشتہ نمبر میں سرسری طور پر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں اتحاد و اتفاق کی بحث کی مناسبت سے یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ندوہ کی بنا رکھتے وقت جن بلند اغراض و مقاصد کا تحت عمل میں آئی تھی، ان میں ایک نہایت اہم مقصد علماء کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرنا اور ملک کو بے سود مذہبی جھگڑوں سے آزاد کرنا تھا۔ چنانچہ ندوہ کے فارغ التحصیل علماء کی اکثریت کے شمائل، ندوہ کے اس اہم اور بنیادی مقصد کے مظہر ہیں۔ اسی لئے ندوہ کی امداد کرنا اسکو اپنی توجہ و عنایت کا مرکز قرار دیکر اس کے مقاصد کی تکمیل کا سامان کرنا ایک گونہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش میں حصہ لینے کے مرادف ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔

فاران اپنی عمر کی دو منزلیں طے کر چکا، اس ماہ سے وہ تیسری منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ آئندہ پرچہ کو زیادہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کی جو تجاویز ہمارے پیش نظر ہیں، ان کے متعلق ہم ابھی کچھ کہنا قبل از وقت خیال کرتے ہیں۔ معنوی خوبیوں میں اضافہ کے ساتھ ہم چند ظاہری تبدیلیاں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ارادہ ہے کہ رسالہ کا ٹائٹل بالکل بدل دیا جائے اور رنگین کے بجائے سادہ رکھا جائے۔ ابھی یہ بات طے نہیں ہوئی ہے کہ ٹائٹل کیسا ہو۔ ناظرین میں سے اگر کوئی صاحب اسکے متعلق کوئی بہتر مشورہ پیش کرینگے تو شکریہ کیساتھ قبول کیا جائیگا

گذشتہ نمبر میں "بلاد مشرق و عالم اسلام" کا ایک جدید مستقل باب مشرقی اور اسلامی سیاست پر مضامین شائع کرنے کیلئے قائم کیا گیا ہے اس عنوان پر آئندہ نمبر میں انشاء اللہ مولانا حامد الانصاری صاحب مدیر مدینہ کا ایک قابل قدر مضمون شائع ہوگا اس نمبر میں گنجائش نہ نکل سکی۔

توحید اور اس کے اثرات

(۴)

اس مضمون کے تین نمبر اب تک شائع ہو چکے ہیں لیکن ان سب کی حیثیت محض ایک تمہید کی تھی۔ اصل بحث اب شروع ہونے والی ہے ہمارا ارادہ تھا کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ دکھائیں گے کہ ایمان کے حقیقی خصائص و لوازم کیا ہیں اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اس کے کیا اثرات طاری ہوتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اگر بہت زیادہ اختصار و اجمال سے کام نہ لیا گیا تو اس کا سلسلہ اس قدر دراز ہو جائیگا کہ شاید اکثر ناظرین فاران گھبرا جائیں۔ اس لئے اب ہم چاہتے ہیں کہ فی الحال اصل موضوع کے متعلق اپنے خیالات نہایت سرسری طور پر عرض کر دیں اور تفصیلات کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھیں۔

اس زمانہ میں بدقسمتی سے اپنے کو مسلمان کہلانے والے اسلام سے اس قدر دور جا پڑے ہیں کہ ان کی زندگی اس کے فہم کے اثر سے محروم ہو چکی ہے۔ اس لئے ہمیں اسلام کے آثار و نتائج معلوم کرنے کے لئے قرآن و احادیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ مسلمانوں کی زندگی، اسلام کے اثرات و نتائج کی مظہر تھی۔ ان کا ہر ہر فرد اس کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ ان کے افراد کو دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اسلام کا انفرادی حیثیت سے زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور ان کے اجتماعی حالات پر نظر ڈال کر مشاہدہ کیا جا سکتا تھا کہ اسلام کے اجتماعی اثرات کیا ہیں لیکن اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا۔ انقلابات زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی حالت میں بھی زبردست انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ اب ہمیں ایسے لوگ شاذ و نادر نظر آتے ہیں جنہیں اسلام کا مظہر قرار دیا جا سکے اور ہماری اجتماعی زندگی تو یکسر اس کی روح سے خالی ہو چکی ہے! اب اسلام کے خصائص و لوازم معلوم کرنے کے لئے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مطالعہ بےسود ہے کہ ان کے اوراق زندگی، ایمان کے نقوش سے معریٰ ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اسلام اور اس کے اثرات و خصائص کو مسلمانوں کی کتاب زندگی میں تلاش کرنے کے بجائے ان کتابوں میں تلاش کریں جن میں ان کا مذہب محفوظ ہو

علم و عمل کا لزوم

ایمان کے اثرات و نتائج بیان کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایمان موثر اور منتج کیونکر ہوتا ہے؟ یعنی اس پر اثرات و نتائج کا کیونکر ظہور ہوتا ہے۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لو۔ کہ علم و عمل میں لزوم کا تعلق ہے۔ جب ہمیں کسی چیز کا علم حاصل ہوتا ہے تو لامحالہ اس کا ظہور عمل کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ علم کی کئی قسمیں ہیں اور ہر علم، عمل کا موجب نہیں ہوتا

بلکہ وہی ہوتا ہے جو اذعان و یقین کے درجہ تک پہنچ جائے اور اس کا کوئی معارض علم اس سے زیادہ قوی نہ ہو۔ ایک مسافر جو اپنی راہ قطع کرتا ہوا جا رہا ہے۔ اگر اسے قابل یقین ذریعہ سے معلوم ہو جائے کہ اس کی راہ ہلاکت کی راہ ہے تو وہ ہرگز آگے قدم نہیں بڑھائے گا۔ پر اگر اس علم کے بعد بھی وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے تو سمجھو کہ یا تو اسے راستے کے پرخطر ہونے کا یقین نہیں ہے یا اسے جنون ہوگیا ہے۔ امام غزالی ابن تیمیہ اور دوسرے محققین نے اپنی کتابوں میں ثابت کیا ہے کہ علم صحیح، عمل کا موجب ہے اور حقیقی جاننا وہی ہے جسے ہونا کہتے ہیں۔ حکماء کا بھی یہی خیال تھا چنانچہ سقراط گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا تھا۔

غرض یہ ہے کہ علم و عمل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، جب علم پایا جائیگا تو اس کے ساتھ عمل بھی پایا جائے گا۔ اگر تم اس کے خلاف دیکھو کہ علم پایا جاتے لیکن اس کے ساتھ عمل نہ ہو تو سمجھو کہ وہ علم علم نہیں عقیدہ توحید بھی خدا کی ذات و صفات کے متعلق ایک خاص قسم کے علم کا نام ہے اس لئے لامحالہ اس علم کا اثر بھی عمل پر پڑے گا۔ اور ہر علم کی طرح اس کے بھی کچھ اثرات و خصوصیات ہونگے

ہمارے تمام اعمال، علم کے نتیجہ ہیں

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسکا ماحصل یہ ہے کہ علم، عمل کا موجب ہے جب علم ہوگا تو اس کے ساتھ عمل بھی ہوگا۔ مگر اس سے بڑھ کر یہ بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے تمام افعال و حرکات ہمارے علم ہی کے نتیجہ ہیں اور یہی ان سب کے وجود میں آنے کا باعث ہے کیونکہ ہمارے ہر فعل کا باعث ہمارا ارادہ ہے اور ارادہ کا محرک ہمارے خیالات و جذبات ہیں جو تمامتر ہمارے ان چند یقینی اور اساسی علم کے تابع ہوتے ہیں جنہیں عقائد کہا جاتا ہے اور جو ہمارے جذبات و خیالات پر حکومت کرتے ہیں۔

موجودہ علم نفسیات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا ہر عمل، ہمارے علم و عقیدہ کے تابع ہوتا ہے اور ہمارے دل اور ارادہ پر ہمارے عقائد حکومت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عملی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک قلبی اور دماغی اصلاح نہ ہو کیونکہ ہمارے اعضاء و جوارح قلب و دماغ ہی کے اشارہ پر حرکت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں عام طور پر عقلاء و مفکرین اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مجرمین کو جرم سے باز رکھنے کے لئے قید و بند یا جسمانی تکلیفوں کی سزائیں دینا بیکار ہے اسکے بجائے انہیں تعلیم و تربیت کے ذریعہ جرائم سے متنفر بنانا چاہیئے کہ عموماً ناقص علم اور ناقص تربیت ارتکاب جرائم کا باعث ہوتی ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارے اعمال ہمارے عقائد کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اس سے یہ بات بداہۃً ثابت ہو گئی کہ علم، موجب عمل ہے۔

ہر علم کا خاصہ الگ ہے

اوپر کی تفصیلات سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ ہر علم کے کچھ اثرات ہوتے ہیں جو ان سے کسی حال میں جدا نہیں ہوتے اس کے بعد یہ ثابت ہے کہ مختلف علم، مختلف اثرات کے موجب ہونگے۔ دو سپاہی ایک ساتھ میدان جنگ میں لڑ رہے ہیں ایک سمجھتا ہے کہ موقع پر ملک و وطن کے لئے جان لڑا دینا فرض ہے لیکن دوسرا اسے ضروری نہیں سمجھتا۔ ظاہر ہے کہ دونوں کی کوشش یکساں نہیں ہو سکتیں۔ ایک پوری جانبازی سے لڑے گا۔ اور دوسرا جی چرائے گا۔ یہ فرق محض اس لئے ہوگا کہ دونوں کے خیالات میں

تفاوت ہے۔ یہی تفاوت علم ہے جس کی بنا پر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ

وَاِذَا جَاءَهُمُ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (سورہ احزاب)	پھر جب آئے ڈر کا وقت تو تو دیکھے ان کو کہ دیکھتے ہیں تیری طرف پھرتی ہیں آنکھیں ان کی جیسے کسی پر آئے بیہوشی موت کی۔

اور بعض لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا	اور جب دیکھی مسلمانوں نے فوجیں بولے یہ وہی ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور ان کو اور بڑھ گیا یقین اور اطاعت کرنا

خلاصہ یہ ہے کہ ہر علم و عقیدہ کے کچھ خواص و لوازم ہوتے ہیں جو کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہو سکتے اور جو لازماً و بداہتہً دوسرے علم و عقیدہ کے خواص و لوازم سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس اصل کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ عقیدہ توحید کے بھی جو خدا کی ذات و صفات کے متعلق ایک خاص قسم کا علم ہے کچھ خواص و لوازم ہوں۔

توحید کے خواص و لوازم

جب غور و فکر اور زمین و آسمان کی آیات کو دیکھ کر انسان کو خدا کی وحدانیت اور اس کی صفات کا اذعان تام حاصل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کا اثر اس کے قلب و ذہن پر نمودار ہوتا ہے اس کے ذہن میں پہلے سے جو باطل معتقدات گھر کئے ہوئے تھے وہ اس عقیدہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں اور اوہام و خرافات کے وہ تمام بادل جو صحیح علم کے نہ ہونے کی وجہ سے اس پر چھائے ہوئے تھے خود بخود چھٹ جاتے ہیں اس سے اس کے ذہن میں ایک خاص روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا قلب زندہ ہوتا ہے اس کا طائر فکر ہر قسم کی غلط بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کی روح کو طمانیت و سکون نصیب ہوتا ہے۔ اس کا دل نئے ساز و سامان سے آراستہ ہوتا ہے۔ غرض اس کے قلب و ذہن کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے اور از سر نو اس کی تعمیر ہوتی ہے پہلے اس کی عقل اندھی تھی اب اس میں بصیرت آگئی۔ اس کا دل مردہ تھا زندہ ہو گیا۔ روح پژمردہ تھی اس میں بالیدگی پیدا ہو گئی۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ	اور برابر نہیں اندھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا اور نہ سایہ اور نہ لو اور برابر نہیں جیتے اور مرے

جب قلب و دماغ کا ہر گوشہ معرفت الٰہی کی روشنی سے معمور اور نئے ساز و سامان زندگی سے آراستہ ہو گیا تو لامحالہ اس کا اثر اعمال پر پڑے گا اور وہ اس شکل میں ڈھلنے لگیں گے جو اس نئی زندگی اور انقلاب کے حسب حال ہوں۔ تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ علم کا اثر عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ پس جب خالق کائنات کی وحدانیت اور اس کے جمالی و کمالی صفات کا علم حاصل ہو گیا تو ضروری ہے کہ اس کا اثر اعمال پر پڑے اور اس سے ایسے افعال کا ظہور ہونے لگے جو اس علم کے اقتضا ہوں۔ اس علم کے مقتضیات کیا ہیں ہم آگے بتاتے ہیں

ایمان کے اثرات و مقتضیات قرآن میں

قرآن میں ایمان کے ساتھ ساتھ ہمیشہ عمل صالح کا ذکر ہوتا ہے اس کی وجہ محض یہی ہے کہ ایمان و عمل صالح لازم ملزوم ہیں

اصل و فرع ہیں، ایمان ملزوم و اصل ہے اور عمل صالح لازم اور اس کی فرع۔ اسی لئے عمل ہمیشہ ذکر میں ایمان سے موخر ہوتا ہے

یوں تو قرآن مجید ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے لیکن اگر اس کے لوازم و خصوصیات بتفصیل معلوم کرنا چاہو تو قرآن کا بالاستیعاب مطالعہ کرو۔ اس کے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے ان پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً

(۱) بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں صراحۃً مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جیسے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ .... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ

کامیاب ہوگئے ایمان والے جو اپنی نمازیں جھکنے والے ہیں اور جو لغو بات پر دھیان نہیں کرتے۔ اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں...... اور جو اپنی امانتوں سے اور اپنے قرار سے خبردار رہیں اور جو اپنی نمازوں کی خبر رکھتے ہیں۔

یا

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لئے اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور ان ہی لوگوں کا بھلا ہے

(۲) بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں امر یا نہی کے بعد اِن کُنتم مومنین (اگر تم ایمان والے ہو) یا اِن کُنتم تومنون (اگر تم ایمان رکھتے ہو) کہا گیا ہے مثلاً

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور)

بدکاری کرنے والی عورت اور مرد ہر ایک کو دونوں میں سے سو سو درّے مارو اور ان پر تم کو ترس نہ آئے اگر تم یقین رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن پر

اسی سورۃ میں یہ تنبیہ فرماتے ہوئے کہ مومنوں کو پوری طرح چوکس اور ہشیار رہنا چاہئے اور بغیر ثبوت کے کسی بہتان پر کان دھرنا نہیں چاہئے۔ فرمایا۔

يعظكم الله ان تعودوا لمثله ابدا ان كنتم مومنين

اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ پھر کبھی ایسا کام نہ کرنا اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

ان الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان سے پہلے جو اوامر و نواہی ہیں، ان کی پابندی ایمان کا خاصہ ہے۔ اسی لئے جن احکام کی پابندی پر زیادہ زور دینا مقصود ہے ان کے بیان میں خطاب بھی یا ایہا الذین امنوا کے صیغہ سے کیا گیا ہے اور خاتمہ پر بھی اِن کُنتم مومنین کہہ کر گویا ان کی پابندی کو ایمان کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً سود کہ اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اس کے بیان میں کہا گیا :-

يايها الذين امنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربوا

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے

ان کنتم مومنین	چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو۔

(۳) کبھی کبھی یا ایہا الذین امنو کے ساتھ خطاب کرنے یا بصراحت مومنوں کے اوصاف بیان کرنے کے بجائے ایمان کے کسی ایک جزو کو ذکر کر کے ایمان کا کوئی خاصہ بیان کیا جاتا ہے مثلاً

قال الذین یظنون انہم ملقوا اللہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ	کہا ان لوگوں نے جو خیال کرتے ہیں کہ انھیں خدا سے ملنا ہے بہت سی تھوڑی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں

یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ قیامت پر ایمان لاتے ہیں وہ اپنی قلت کی کثرت کے مقابلہ میں کوئی پروا نہیں کرتے لیکن حقیقت میں یہ ایمان کا خاصہ بیان کیا گیا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم پچھلے نمبروں میں کہیں بیان کر آئے ہیں "ایمان بالآخرت بھی عقیدۂ توحید کا ایک جزو ہے اس لئے کہ روز جزا کا آنا، خدا کے ان اوصاف ہی کا اقتضا ہے جن پر ایمان لانا ہر مومن کے لئے ضروری ہے۔ سورۂ ہود میں ہے۔

ولئن اذقنا الانسان منا رحمۃ ثم نزعنہا منہ انہ لیئوس کفور ولئن اذقنہ نعماء بعد ضراء مستہ لیقولن ذھب السیات عنی انہ لفرح فخور الا الذین صبروا وعملوا الصلحت	اور اگر ہم آدمی کو اپنی طرف سے رحمت چکھا دیں پھر وہ چھین لیں اس کو تو وہ ناامید ناشکرا ہوتا ہے اور اگر ہم چکھا دیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچی تھی تو بول اٹھے دور ہوئیں برائیاں مجھ سے۔ وہ اترانے والا شیخی خورا ہے مگر جو لوگ صابر ہیں اور نیکیاں کرتے ہیں۔

مصیبتوں میں مایوس نہ ہونا اور دولت و ثروت کے بعد فخر و غرور میں مبتلا نہ ہونا مومنین کا وصف ہے جیسا کہ دوسرے مقامات سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے لیکن یہاں موقع کی مناسبت سے اسے ایمان کے بجائے اس کے لوازم کا خاصہ بتایا گیا اور یہ لوازم وہ ہیں جو مذکورہ بالا وصف کے براہ راست محرک و باعث ہوتے ہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں۔

سورہ معارج میں قریب قریب یہی وصف "مصلین" کے لئے بیان فرمایا گیا ہے۔

ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسہ الشر جزوعا واذا مسہ الخیر منوعا الا المصلین الذین ھم علی صلاتھم دائمون	آدمی بنا ہے جی کا کچا جب پہنچے اس کو برائی تو بے صبرا اور جب پہنچے اسکو بھلائی تو بے توفیقا مگر وہ نمازی جو اپنی نماز پر قائم ہیں

یہاں بھی اگرچہ مومنین کے بجائے "مصلین" کا لفظ مذکور ہے جس سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا خاصہ، ایمان کا نہیں صلوٰۃ کا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایمان ہی کا خاصہ ہے جو نماز کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کو "جزع" "ومنع" سے روکنے والی چیز فی نفسہ نماز نہیں بلکہ خدا کی وہ چند صفات ہیں جو آیات قرآن کی بار بار تلاوت اور خدا کے ساتھ بالمواجہ گفتگو کی وجہ سے نمازیوں کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ اسکی تفصیل آگے آئے گی۔

(۴) بعض آیتیں ایسی ہیں جن میں اگرچہ نہ خطاب یا ایہا الذین امنوا کے ساتھ کیا گیا ہے اور نہ آخر میں ان کنتم مومنین کہا گیا ہے

لیکن ان میں بعض ایسے فقرے لگے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایمان کا خاصہ ہے مثلاً طلاق وغیرہ کے متعلق چند احکام نازل فرمانے کے بعد کہا گیا

ذالك يوعظ به من كان منكم يومن بالله واليوم الآخر	یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا

گویا ایمان باللہ وایمان بالآخرۃ کا اقتضا یہ ہے کہ احکام مذکورہ پر عمل کیا جائے۔

(۵) ایمان کے خصائص ولوازم معلوم کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ قرآن میں مشرکین ومنافقین یا شرک ونفاق کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ایمان کی خصوصیات کو ان کے برعکس سمجھ لیا جائے مثلاً کافروں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

انما يفترى الكذب الذين لا يومنون بآيات الله واولئك هم الكاذبون۔	جھوٹ کا افترا وہ لوگ کرتے ہیں جو اللہ کی نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے ہیں اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

ایک آیت میں ہے:۔

سنلقى فى قلوب الذين كفروا الرعب بما اشركوا بالله ما لم ينزل به سلطانا	ہم کافروں کے دلوں میں ہیبت ڈالینگے اس واسطے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کا جس کی اس نے کوئی سند نہیں اُتاری۔

گویا شرک کا خاصہ خوف ودہشت ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ایمان کا خاصہ دلیری اور بے خوفی ہے اسکی توجیہ آگے آئے گی۔

غرض یہ ہے کہ ایمان کے اثرات وخصوصیات بے شمار ہیں جن پر قرآن میں مختلف طریقوں سے روشنی پڑتی ہے۔ آیندہ نمبر میں انشاء اللہ ہم اس کے چند اہم خصائص کا تذکرہ کرینگے۔ (باقی)

افکار وجدی

(از جناب اکرام الدین صاحب وجدی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

روداد حسن وعشق سناؤں کہاں کہاں
اب داغہائے دل کو دکھاؤں کہاں کہاں

جس سمت دیکھتا ہوں چلا آرہا ہے تو
حیران ہوں کہ آنکھیں بچھاؤں کہاں کہاں

رگ رگ میں آگ سی ہے لگی سوز عشق سے
اے چارہ ساز درد بتاؤں کہاں کہاں

ہر ہر قدم پہ نقش کف پائے یار ہیں
ذوق سجود سر کو جھکاؤں کہاں کہاں

پائے جنوں نے دیکھ لیا راہِ بے خودی
دامِ فریب ہوش بچھاؤں کہاں کہاں

وجدی تلاش جس کی تھی اسکو تو پا لیا
اب کہئے خود کو ڈھونڈھنے جاؤں کہاں کہاں

تفسیر سورہ بقرہ

بسلسلہ سابق

(از امام جلیل سید رشید رضا مرحوم)

سورۃ بقرہ کے شرعی اصول و قواعد

(۱۷) قصداً اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ　(۱۹۵)　اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

پس مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ ان کی جماعت کے لئے یہ کسی طرح روا نہیں کہ قصداً اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں۔ ماقبل کی آیت میں مسلمانوں کو مدافعت کے مصارف کے لئے "انفاق" کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم کے بعد اس نہی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اپنے ہلاکت کر۔۔۔ ی اور ایجابی اسباب سے احتراز واجب ہے ہلاکت سے بچنے کیلئے جنگی تیاریاں مسلمانوں کیلئے ضروری ہیں خصوصاً ان ایام میں جبکہ جنگ کے نئے نئے آلات ایجاد ہو چکے ہیں اور بڑی بڑی سلطنتیں اپنی بحری بری اور فضائی طاقت بڑھانے کے لئے لاکھوں روپیہ صرف کر رہی ہیں۔

(۱۸) گھروں میں دروازہ کی راہ سے داخل ہونے کا حکم ہے نہ کہ پشت کی جانب سے مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کو حاصل کرنے کے لئے ان کے حقیقی اسباب اختیار کرنے چاہئیں۔ عادت کو عبادت[1] قرار دے لینا اور عبادت کو عادت بنا لینا غلط ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی امور کے حصول میں ہمیں ان کے اسباب و علل کا پابند ہونا چاہئے۔ ان کے لئے دینی نصوص کی تلاش بیکار ہے۔ آنحضورؐ کا قول ہے انتم اعلم باموردنیاکم (تم اپنے دنیاوی معاملات سے زیادہ واقف ہو)

زراعت، صنعت حرفت اور تجارت وغیرہ میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب ان میں ان کے اصل دروازوں سے ہو کر قدم رکھا جائے۔ . . . . ادھر چند آخری صدیوں سے مسلمانوں میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے مساجد میں صحیح بخاری کی تلاوت ہوتی ہے۔ یہ رواج اس قاعدہ کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔ البتہ اگر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنی ہر ممکن تیاری کے بعد خدا سے اپنی فتح و نصرت کی دعا کی جائے تو یہ خلاف نہ ہوگا۔ کیونکہ دعا قوت کے معنوی اسباب میں داخل ہے۔

---

[1] زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ حج کا احرام باندھنے کے بعد اگر گھر میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آتی تو دروازہ کے بجائے چھت پر چڑھ کر اندر اترتے یا پشت کی جانب نقب دے کر گھستے اور اسی کو نیکی خیال کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رواج کو نیکی سے معری قرار دیا اور اصل نیکی کی طرف ہدایت فرمائی۔

(۱۹) (۱) دین اور اعتقاد کی آزادی حاصل ہونی چاہئے اور مذہب کی بنا پر اگر سختی ہو رہی ہو تو اسے روکنا چاہئے خواہ اس کے لئے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے (۲) اور کوئی مذہب قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین۔

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فساد نہ باقی رہے اور حکم خدا تعالیٰ کا رہے۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔

"فتنہ" کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس کے دین کی وجہ سے ستایا جائے یا قتل کیا جائے یا جلاوطن کیا جائے جیسا کہ صدر اسلام میں مشرکین عرب مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے اس آیت سے پہلے سورۂ حج میں قتال کے متعلق جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ مشرکین کے اس سلوک کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ (۲۲ : ۳۹)

حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ الخ (۴۰)

وہ لوگ جن کو نکالا ان کے گھروں سے ناحق محض اس لئے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔

اور اس سورۃ میں بھی حکم قتال کی تمہید کے طور پر ان کے فتنوں کا تذکرہ کیا ہے۔

واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل۔

اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔

یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ، قل قتال فیہ کبیر وصد عن سبیل اللہ وکفر بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ والفتنۃ اکبر من القتل ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔ الآیۃ

تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو کہ اس میں لڑنا کیسا ہے۔ کہدے لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے۔ اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک اور لوگوں کو دین سے بچلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے الخ

(۲) دین یہاں تک کہ اسلام قبول کرنے کے لئے بھی سختی کرنے کی نفی اللہ تعالیٰ کے قول لا اکراہ فی الدین (دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں) سے سمجھی جاتی ہے۔ محدثین اور آثار سے بحث کرنے والے مفسرین نے اس آیت کی شان نزول میں جو کچھ بیان کیا ہے، اسے ہم نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبیلہ بنو نضیر کے یہودیوں کے یہاں صحابہ کرام کے کچھ لڑکے رہا کرتے تھے جن کی انھوں نے پرورش کی تھی اور انھیں یہودی بنا لیا تھا۔ جب آنحضور صلعم نے ان کی مسلسل شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے تنگ آکر انھیں جلاوطن کر دینے کا حکم دیا تو مسلمانوں نے چاہا کہ ان سے اپنی اولاد لے کر انھیں زبردستی مسلمان بنا لیں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس کے بعد آنحضور صلعم نے فرمایا۔

"کہ تمہارے" لوگوں" کو اللہ نے اختیار دے دیا ہے اگر وہ یہودیوں کو اختیار کرلیں تو وہ ان کے ساتھ ہوگئے اور اگر تمہیں اختیار کرلیں تو وہ تم میں سے ہیں۔"

لیکن ان نصوص صریحہ کے باوجود اب تک ایسے لوگ یہاں تک کہ خود مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں جو دشمنان اسلام کی اس افتراء پردازی کو صحیح سمجھتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا اور آنحضور صلعم نے خود مشرکین سے جنگ کرنے میں پیشقدمی فرمائی؟

(۳۰) اسلام میں دو باتوں کے لئے جہاد شروع قرار دیا گیا ہے۔

(۱) نفس اور وطن کی مدافعت کے لئے۔ مشرکین عرب نے آنحضور صلعم اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کو مکہ سے نکالدیا اور اس کے بعد مدینہ میں بھی انہیں چین نہیں لینے دیا۔ خود ان سے جنگ کی ابتداء کی اور اہل کتاب نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ یہ دونوں ملکر بار بار مسلمانوں کو چھیڑتے اور انہیں دعوت مقابلہ دیتے رہے یہاں تک کہ بے بس ہوگئے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے قتال کا حکم اس طرح دیا:-

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔	اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی نہ کرو. بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

(۲) دینی آزادی برقرار رکھنے کے لئے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین للہ فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین۔	اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ کا۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔

(۳) اسلامی سطوت و سیادت کی محافظت اور دشمنوں کی طاقت توڑنے کے لئے تاکہ وہ اسلام کی راہ میں حائل نہ ہوسکیں جیسا کہ سورۃ توبہ میں اہل کتاب کو جزیہ ادا کرنے پر مجبور کرنے کے لئے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔

(۳۱) مسلمانوں کو چاہئے کہ اسلام کی ان دینی اور دنیاوی سعادتوں کو جن کا تذکرہ قاعدہ اولیٰ میں کیا گیا ہے۔ حاصل کرنے کی کوشش کریں کیونکہ کوشش اور طلب ہی سے ہر چیز کے لوازم و غایات کا حصول ہوتا ہے۔

پس مسلمانوں کے لئے یہ زیبا نہیں کہ دنیاوی معاملات اور سیاسیات سے الگ ہو کر بیٹھ جائیں اور اپنے دشمنوں کے تابع ہو کر فقر و ذلت کی زندگی بسر کریں، یا چوپایوں اور درندوں کی طرح ہوجائیں کہ سوا بدنی خواہشات اور بہائم چیر پھاڑ کے کوئی ان کا مقصد باقی نہ رہے۔ دین و دنیا کو جمع کرنا مقتضائے فطرت ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ اسی لئے اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہم دین و دنیا دونوں کو پیش نظر رکھیں۔

ومن الناس من یقول ربنا آتنا فی الدنیا وما لہ فی الاخرۃ من خلاق۔ (۲۰۰)	اور کوئی کہتا ہے اے رب ہم کو دنیا میں دے اور اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔
ومنھم من یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ	اور کوئی ان میں کہتا ہے اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں خوبی دے اور آخرت میں

حسنۃ وقنا عذاب النار ۔ اولٰئک لھم نصیب مما کسبوا واللہ سریع الحساب ۔ (۲۰۱)

بھی اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا ۔ انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے اپنی کمائی کا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ۔

(۲۲) وہ احکام جو اجتہادی ہوں اور کسی صریح اور قطعی نص سے روایتاً یا دلالۃً ثابت نہ ہوں ، انھیں کسی پر لازم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اگر وہ عبادات وغیرہ سے متعلق ہوں تو انھیں افراد امت کے اجتہاد پر اور اگر سیاسی اور انتظامی معاملات سے متعلق ہوں تو حکام اور ارباب نظم ونسق کے اجتہاد پر چھوڑ دیا جائیگا ۔

اس قاعدہ کی اصل آیت ۲۱۹ ہے یعنی

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما ۔

تم سے لوگ شراب اور جوے کا حکم پوچھتے ہیں کہدو ان دونوں میں بڑا گناہ اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں ۔ اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے

کیونکہ اس آیت میں شراب اور جوے کی حرمت پر یہ ایک اجتہادی استدلال قائم کیا گیا ہے کہ جس چیز کا اثم اور ضرر نفع سے بڑھا ہوا ہو وہ حرام ہے اور اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے ۔ اسی لیئے بعض صحابہ نے اس استدلال کی بنا پر اس آیت کے نزول کے بعد ہی سے ان دونوں چیزوں سے احتراز کرنا شروع کر دیا تھا لیکن آنحضور صلعم نے کسی پر ان سے اجتناب لازم نہیں کیا اور ترک کرنے والوں اور نہ ترک کرنے والوں دونوں کو ان کے اجتہاد پر چھوڑ دیا مگر جب سورۃ مائدہ کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں ان دونوں کو قطعاً حرام قرار دیا گیا تو اس وقت اجتہاد کی گنجائش باقی نہیں رہی اور شراب نوشی اور قمار بازی بالکلیہ ممنوع قرار دیگئی ۔ اور شراب نوشی پر آنحضور صلعم حد جاری فرمانے لگے ۔ اسی اصل کی بنا پر سلف صالحین ان لوگوں کو معذور خیال کرتے تھے جو کسی غیر قطعی اخبار یا اجتہادی آثار میں ۔ ان کی مخالفت کرتے تھے اور بعد کے مقلدین کی طرح اپنے اجتہاد کی اتباع ہر شخص کے لئے ضروری نہیں خیال کرتے تھے اور اسی بنا پر جب پہلے خلیفہ منصور اور بعد کو ہارون الرشید نے حضرت امام مالک سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ازروئے قانون تمام ملک میں ان کی کتابوں پر عمل کرنا ضروری قرار دیدیا جائے تو باوجودیکہ انکی کتاب موطا کی صحت پر . . . . اس زمانہ کے تمام علماء نے اتفاق کر لیا تھا لیکن انھوں نے اسکی سخت مخالفت کی ۔

(۲۳ - ۲۶) اسلام میں گھریلو زندگی اور اولاد کی تربیت وغیرہ کا نظام چار بنیادوں پر قائم ہے ۔

(۱) عورتوں کو وہ امور انجام دینے چاہئیں جو ان کی خدمت اور فطرت کا اقتضا ہیں مثلاً رضاعت اور تربیت اولاد وغیرہ اور مردوں کو تمام نفقات کا کفیل ہونا چاہیئے ۔

(۲) مرد اور عورت ہر ایک اپنی خدمت اور واجبات کو اسی حد تک ادا کرے گا جو آسانی ممکن ہو ۔ وسعت سے زیادہ کی ان کو تکلیف نہیں دی جائے گی ۔

(۳) بچہ کے ماں باپ ، بچہ یا کسی اور وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف نہ دیں (مثلاً ماں بلاوجہ دودھ پلانے سے انکار کردے یا باپ بلا سبب ماں سے بچہ جدا کر کے کسی اور سے دودھ پلوائے یا کھانے کپڑے میں تنگی کرے)

(۴) غیر قطعی امور کا فیصلہ باہمی مشورہ اور رضامندی سے ہونا چاہئے۔

ان قواعد کا ماخذ آیت ۲۳۳ ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف لا تکلف نفس الا وسعھا لا تضار والدۃ بولدھا ولا مولود لہ بولدہ وعلی الوارث مثل ذالک فان ارادا فصالا عن تراض منھما وتشاور فلا جناح علیھما۔

اور بچے والی عورتیں دودھ پلادیں اپنے بچوں کو پورے دو برس جو کوئی چاہے کہ پوری کرے دودھ کی مدت۔ اور لڑکے والے یعنی باپ پر کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا موافق دستور کے۔ نہیں تکلیف دیجاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق۔ نقصان دیا جاوے ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ اسکو کہ جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اسکے بچے کی وجہ سے اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ چھڑالیں یعنی دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورہ سے تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔

اگر مسلمان خانگی معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کریں تو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ راحت و اطمینان کی زندگی بسر کریں، اور پھر کسی دشمن یا زندیق کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ اسلام نے عورتوں پر ظلم کیا ہے یا مسلمان اپنی گھریلو زندگی کی اصلاح کے لئے دوسری قوموں کی تقلید کے محتاج ہیں۔

(۲۷) شر و فساد کے ذرائع کو روکنے، عدل و انصاف کو قائم رکھنے اور لوگوں کے مصالح کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے احکام و شرائع کی علت قرار دیا ہے۔ چنانچہ قتال کے حکم میں انہیں باتوں کو بطور علت بیان کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی مدد و نصرت سے سرفراز کرنے اور زبردست قوت و سلطنت عطا کرنے کی وجہ بھی انہیں چیزوں کو قرار دیا۔

فھزموھم باذن اللہ وقتل داؤد جالوت واتہ اللہ الملک والحکمۃ وعلمہ مما یشاء ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العلمین۔

پھر شکست دی مومنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور اللہ نے داؤد کو سلطنت اور حکمت دی اور جو چاہا ان کو سکھایا اور اگر نہ ہوتا اللہ کا ایک کا دوسرے سے دفع کرنا تو ملک خراب ہو جاتا لیکن اللہ جہان کے لوگوں پر بہت مہربان ہے۔

اسی طرح پہلے پہل مسلمانوں کو جہاد کا حکم دینے کے بعد فرمایا۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا۔ (سورۃ حج)

اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھا جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت۔

(۲۸) یوم آخرت پر ایمان لانا اور صبر (جو ایمان ہی کا ثمرہ ہے) چھوٹی جماعتوں کے بڑی جماعتوں پر غالب آجانے کے دو بڑے سبب ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قال الذین یظنون انھم ملٰقوا اللہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصّابرین ۔	کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ انہیں اللہ سے ملنا ہے بار ہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔

(۲۹) لوگوں کا ناحق مال کھانا حرام ہے اور یہی تمام محرمات کی اصل ہے۔ اسی بنا پر حرمت سود کے بعد اس کا بقیہ حصہ چھوڑ دینے کا حکم دیتے ہوئے تعلیلاً فرمایا۔

فان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون ۔	اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے لئے تمہارا اصل مال ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ۔

قرض دینے والا مقروض سے اصل سے زیادہ جو کچھ لیتا ہے وہ باطل ہے اور اس کے عوض میں مقروض کو کچھ نہیں ملتا اس لئے یہ ظلم ہے۔ لیکن جن معاملات میں فریقین میں سے کسی پر ظلم نہ ہو رہا ہو، ان میں کوئی ہرج نہیں اور نہ وہ سود یا ربا کی حد میں آتے ہیں۔

(۳۰) ہر انسان اپنے عمل کے نفع و نقصان کا خود ذمہ دار ہے۔ دوسروں کے اعمال اس کے لئے نہ مفید ہو سکتے ہیں۔ اور نہ مضر۔ اسی لئے اس سورۃ کے خاتمہ پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت ۔	اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔

اس اصل کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے اور جو اسی سورۃ میں آنحضور صلعم کے ارشاد کے مطابق آیات ربا کے بعد درج کی گئی ہے یعنی

واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون ۔	اور ڈرتے رہو اس دن سے جس دن کو لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائیگا ہر شخص کو جو کچھ کہ اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

گویہاں یہ قاعدہ بصیغۂ حصر نہیں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات قرآن کی اور بھی بہت سی آیتوں میں بیان کی گئی ہے اس آیت سے پہلے بعض کی سورتوں میں عقائد کے ضمن میں متعدد بار اس کا اعادہ کیا گیا ہے ۔ مثلاً سورۃ نجم میں ہے ۔

الا تزر وازرۃ وزر اخریٰ (۵۳ : ۳۸)	کہ اٹھاتا نہیں کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ ۔
وان لیس للانسان الا ما سعیٰ (۳۹)	اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا ۔

سورۃ انعام میں ہے ۔

ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ (۶ : ۱۶۵)	اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اس کے ذمہ ہے اور بوجھ نہ اٹھائے گا۔ ایک شخص دوسرے کا ۔

آٹھویں جلد میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس قاعدہ کے اور شواہد بھی ملینگے ۔

قرآن کی چند آیتیں بظاہر اس قاعدہ کے خلاف ہیں جن کی بنا پر بعض لوگوں نے اس قاعدہ کی تخصیص کی ہے اور بعض ایسی صورتیں بیان کی ہیں جن میں مردوں یا زندوں کو دوسروں کے اعمال سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہم اس آیت کی تفسیر کرتے وقت بیان کریں گے کہ دوسروں کے اعمال سے مستفید ہونے کی صحیح صورت کیا ہے اور وہ کسی طرح اس قاعدہ کی عمومیت کے مخالف نہیں۔

(۱۳) شفاعت کے اس مشرکانہ عقیدہ کا بطلان جو عربوں اور پہلی قوموں کی گمراہی اور بت پرستی کی بنا تھا۔ یعنی غیر اللہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگر عبادت وغیرہ کے ذریعہ ان کو خوشنودی حاصل کرلیجائے تو وہ ہمارے متعلق خدا سے سفارش کردیں گے اور ہماری تکلیفیں دور اور مرادیں پوری ہو جائیں گی۔

مشرکین عرب شفاعت کے اس عقیدہ کے قائل تھے اور اہل کتاب اور روز قیامت پر ایمان لانے والے یہ خیال کرتے تھے کہ یہ شفعاء قیامت کے دن بھی انکے کام آئینگے اور آخرت کے عذاب سے انہیں بچالینگے انہیں کے متعلق خدا نے فرمایا ہے۔

ویعبدون من دون اللہ مالا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ	وہ اللہ کے علاوہ انکی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے اور نہ نفع اور کہتے ہیں یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفعاء ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے شفاعت کے اس عقیدہ کو غلط قرار دیا ہے چنانچہ اسی سورۃ میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

یاایھا الذین اٰمنوا انفقوا مما رزقناکم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ (۲۵۳)	اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں کہ نہ خرید و فروخت ہو اور نہ آشنائی اور نہ سفارش۔

اور بنی اسرائیل کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منھا شفاعۃ ولا یؤخذ منھا عدل ولا ھم ینصرون (۴۷)	اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور نہ قبول ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلا اور نہ ان کو مدد پہنچے۔

اس آیت کی ہم معنی آیت ۱۲۲ بھی ہے۔

لیکن ایک اور شفاعت ہے جس کا تذکرہ حدیثوں میں آتا ہے اور وہ اس شفاعت کے علاوہ ہے اور وہ کسی طرح توحید کے منافی نہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

یہ چند اصول سرسری طور پر سورۃ بقرۃ کے مطالعہ سے ذہن میں آگئے ہیں جنہیں ہم نے اختصار کے ساتھ یہاں بیان کردیا ہے اگر غور و تدبر سے کام لیا جائے تو اور اصول بھی مستنبط ہوسکتے ہیں۔

(باقی)

یادِ اندلس

(۲)

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گذشتہ نمبر میں یہ معلوم کر چکے ہو کہ اندلس کب اور کس طرح فتح ہوا! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فتح اندلس کے بعد مسلمانوں نے مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کیا! ایک مدت سے ہمارے دشمنوں کی طرف سے اسلامی دورِ حکومت کو بدنام کرنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں اور شاہانِ اسلام کے ظلم و ستم اور تعصب و تشدد کی جو فرضی داستانیں ملک میں پھیلائی جارہی ہیں، ان کی بنا پر بہت ممکن ہے بعض وہ لوگ جو تاریخ سے ناآشنا ہیں اور اعدائے اسلام کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنے کے لئے تیار رہتے ہیں، اس سوال کے جواب میں دشمنوں کی کہی ہوئی باتوں پر اپنے قیاس کی بنیاد قائم کرتے ہوئے بے تکلف یہ کہہ اٹھیں کہ مفتوحین کو بے بس دیکھ کر ان کی آتشِ انتقام بھڑک اٹھی ہوگی، اس لئے انھیں بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا ہوگا اور اپنی تلواریں اس وقت نیام میں کی ہوں گی، جب اندلس کا ہر متنفس حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا ہوگا۔ لیکن جو لوگ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے مقصدِ جہاد سے واقف ہیں وہ تاریخ کے مطالعہ کے بغیر بھی ایک لمحہ کے لئے یہ تصور نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں نے اہلِ اندلس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا ہوگا۔ اندلس پر فوج کشی سے پہلے بہت سے ممالک مسلمانوں کے زیرِ نگیں آچکے تھے۔ مگر یہ معلوم ہے کہ انھوں نے کہیں بھی مفتوحین کے ساتھ کوئی برا برتاؤ نہیں کیا۔ مفتوحین کے ساتھ ان کا بے نظیر حسنِ سلوک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان اپنی مذہبی تعلیمات کی بنا پر دشمن کو اسی وقت تک دشمن سمجھتے ہیں جب تک وہ نبرد آزما ہیں۔ مگر جب انھوں نے ہتھیار رکھ دیئے تو پھر وہ ان کے بھائی ہیں اور اب ان کی جان و مال محفوظ اور وہ اپنے دین و مذہب میں آزاد ہیں۔ یہی چیز ہے جو مسلمان فاتحین کو چنگیز اور سکندر جیسے سفاکوں کی صف سے الگ کر دیتی ہے۔ چنگیز و سکندر نے اپنی فتوحات کے سلسلہ میں جو سفاکیاں کیں، خلقِ خدا کا جس بے دردی کے ساتھ خون بہایا، وہ کسی پر مخفی نہیں۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ سکندر نے جب شہر صور کو فتح کیا تو وہاں کے لوگوں کو محض اس جرم میں قتلِ عام کا حکم دیدیا کہ وہ دیر تک جم کر لڑے تھے۔ اسے ان کا جم کر لڑنا اس حد تک ناگوار گذرا کہ اس نے ایک ہزار شہریوں کے سر شہر پناہ کی دیوار پر لٹکا دیئے [illegible] ہزار باشندوں کو لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ اسی طرح جب اس نے فارس میں اصطخر کو فتح کیا تو نہایت بے دردی کے ساتھ تمام مردوں کو قتل کرا دیا۔ برخلاف اس کے ہمارے حق پسند دشمنوں کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ اسلام کی تاریخ سفاکی و بہیمیت کے ان واقعات سے یکسر پاک ہے۔ اسلام کو اپنے ابتدائی دور ہی سے جنگ و جدال سے [illegible] واسطہ پڑا اور اسکا سلسلہ

برابر قایم رہا لیکن ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے فتح کے بعد جوش انتقام میں کسی پر ناروا سختی کی ہو یا کسی کو زبردستی مسلمان بنانا چاہا ہو۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ چنگیز و سکندر کی جنگ آزمائیاں محض ملک گیری کے لئے تھیں اور وہ حصول ملک کیلئے قتل و خونریزی ظلم و ستم ہر قسم کی معاشی دہشت کو جائز سمجھتے تھے مگر اسلام ملک گیری کے لئے تلوار اٹھانے کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور بے وجہ خون بہانے اور محض مخالف مذہب کی بنا پر کسی پر جبر کرنے کا کسی حال میں روادار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جن ملکوں کو فتح کرتے تھے ان کے باشندوں کو مذہب کی پوری آزادی دیدیتے تھے اور ان کے ساتھ اس طرح عدل و انصاف سے پیش آتے تھے کہ تمام رعایا ان کی گرویدہ ہو جاتی اور ان کی حکومت کو رحمت الہٰی تصور کرنے لگتی یہی نہیں بلکہ بسا اوقات جوش امتنان میں اپنے ہم مذہبوں کے مقابلہ میں ان کی اعانت و مساعدت سے بھی دریغ نہ کرتی۔ اگر مسلمانوں نے اشاعت اسلام کے لئے تلوار سے کام لیا ہوتا اور محض اختلاف مذہب کی بنا پر خونریزی روا رکھا ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ آج دنیا میں ان کی تعداد اس قدر تھوڑی ہوتی!

غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کا برتاؤ

اسلامی تاریخ کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے ہر موقع پر اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ نہایت شفقت و محبت کا برتاؤ کیا۔ خود آنحضور صلعم کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے موجود ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا اور آپ کے سامنے تمام جباران قریش حاضر کئے گئے تو گو ان میں وہ بھی تھے جو اسلام کی جڑ اکھاڑ دینے کے دن رات ساعی رہتے تھے۔ وہ بھی تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں وہ بھی تھے جنھوں نے آپ کے قتل کی سازشیں کی تھیں اور قلب اطہر میں تمسخر و استہزاء کے نشتر چبھوئے تھے اور سب کے سب اپنے متعلق اپنی کردار کے مطابق کسی سخت حکم کے متوقع تھے لیکن اس موقع پر بھی رحمت دو عالم کی زبان مبارک سے یہ مژدہ سن کر سب کے سب محو حیرت ہو کر رہ گئے کہ

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء	تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

فتح مکہ ہی کے سلسلہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت سعد بن عبادہ جب اپنے لشکر کو ساتھ لئے ہوئے ابو سفیان کے سامنے سے گذرے تو اسے دیکھ کر اس کی اسلام دشمنی اور اس کی ایذا رسانیوں کے تمام واقعات دفعتہً ان کے سامنے آگئے۔ اس لئے آپ جوش میں آکر پکار اٹھے :۔

الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبہ	آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

لیکن آنحضور صلعم کو جب حضرت سعد کے اس جملہ کی خبر ہوئی تو آپ نے اپنی سخت ناگواری کا اظہار فرمایا اور ارشاد ہوا کہ انھوں نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے اور اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ فوج کا علم ان سے لیکر ان کے بیٹے کو دیدیا جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اسلام کی تعلیمات اپنی روشن شکل میں موجود تھیں۔ قرآن نے انہیں صراحۃً بتا دیا تھا کہ

لا اکراہ فی الدین۔ وہ اپنے مذہب کی اس تلقین سے واقف تھے کہ دشمنوں کو اسی وقت قتل کی اجازت ہے جب وہ معرکۂ قتال میں ہوں اور ہر حال میں ان کے ساتھ حسن سلوک اور عدل واجب ہے۔

یا ایھا الذین کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ الخ (الاہ) ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔	اے ایمان والو قایم رہو انصاف پر۔ گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا۔ کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو کیونکہ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

پھر وہ جانتے تھے کہ جہاد کی بنیاد ہی دنیا اور اہل دنیا کی خیر خواہی پر قایم ہے اور اسی کے ساتھ ان کے سامنے آنحضور صلعم کا اسوۂ حسنہ موجود تھا کہ آپ دشمنوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔ اسی لئے وہ کبھی کسی موقع پر اپنی فتوحات کے سلسلہ میں قانون انصاف سے سر مو تجاوز نہیں کرتے تھے اور بجز عین معرکۂ قتال کے کسی کو وہ قتل کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ انکی رواداری مسالمت اور حسن سلوک کا تو یہ حال تھا کہ جو لوگ مطیع ہونے کے بعد بھی باغی ہو جایا کرتے تھے انہیں بھی قتل نہیں کرتے تھے بلکہ دوبارہ ان سے اقرار لیکر ان سے درگذر کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں عربسوس والے تین تین دفعہ متواتر اقرار کرکے پھر گئے لیکن اس کے باوجود ان کے ساتھ صرف یہ کیا گیا کہ انہیں وہاں سے جلا وطن کر دیا گیا۔ لیکن اس طرح کہ انکی کل جائداد کی قیمت ادا کر دی گئی۔ اور جب خیبر کے یہودیوں کو ان کی مسلسل شرارتوں اور ایذا رسانیوں کے جرم میں نکالا گیا تو ان کی مقبوضہ اراضیات کا پورا پورا معاوضہ دیدیا گیا اور ہر طرف حکام کے نام یہ احکام جاری کردیئے گئے کہ جدھر ان کا گذر ہو ان کی ہر طرح اعانت کی جائے اور جب یہ کسی شہر میں قیام کریں تو ایک سال تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔ مسلمانوں کی درگذر، رواداری، بے تعصبی اور حسن سلوک کے واقعات سے تاریخ کی کتابیں بھری ہیں، انھیں پڑھ کر یقیناً حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس قدر فراخ دل، وسیع القلب اور رحمدل تھے۔

انسانی فطرت کا کچھ خاصہ سا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فتح و غلبہ کے وقت اپنے جوش انتقام کو روک نہیں سکتا اور اس وقت ایسی حرکتیں کرجاتا ہے جنھیں، عدل و انصاف کا قانون جائز نہیں رکھتا مگر جب ہم عرب فاتحین کی تاریخ پڑھتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ سخت سے سخت اشتعال انگیز مواقع پر بھی انتہائی ضبط و استقلال کا ثبوت دیتے ہیں اور اپنی قوت و سلطنت کے شباب کے عالم میں بھی دشمنوں کے ساتھ رحم و کرم کے مجسمہ نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام نے ان کے دلوں کو بیجا خواہشات سے پاک کرکے تمام بنی نوع انسان کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ سے معمور کر دیا تھا! ایسے مافوق العادت خصائل رکھنے والوں کے متعلق یہ گمان رکھنا کہ انھوں نے فتح اندلس کے بعد وہاں کے باشندوں کے ساتھ کوئی سختی کا برتاؤ کیا ہوگا ان پر بہت بڑا ظلم ہے۔

اہل اندلس کے ساتھ عربوں کا سلوک

یوں تو تاریخ میں مسلمانوں کی یہ بات ہمیشہ یاد رکھی جائیگی کہ انھوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ صد درجہ رواداری اور تسامح کا

برتاؤ کیا لیکن اندلس کے دور حکومت میں ہمیں ان کا یہ خاصہ بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر یہ عجیب خاصیت تھی کہ فتوحات کے سلسلہ میں جہاں جہاں ان کا گذر ہوا اور جس ملک کو انھوں نے فتح کیا، اسے اپنا وطن سمجھ لیا۔ دنیا کی بعض قدیم فاتح قوموں کی طرح انھوں نے کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد، باشندوں کو لوٹ مار کر اور ان کا سب کچھ لے دے کر اپنے دیس کو واپس چلے گئے ہوں اور نہ کبھی اس زمانہ کی بعض قوموں کی طرح انھوں نے تجارت کی بنیادوں پر سلطنت قائم کی، بلکہ اس کے بجائے ہمیشہ انھوں نے اپنے زیر نگیں ممالک کو اپنے خاص وطن کا درجہ دیا۔ اور اکثر وہاں انھوں نے اس طرح مستقل بود و باش اختیار کر لی کہ اپنا آبائی وطن کو بھول گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی دولت ہمیشہ ملک ہی کی ترقی و تعمیر میں صرف ہوتی تھی اور ان کی حکومت اہل ملک کے مفاد کے لحاظ سے گویا ان کی قومی حکومت بن جاتی تھی۔ اسپین میں بھی یہی ہوا مسلمانوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا۔ وہاں مستقل بود و باش اختیار کر لی اور اہل وطن کے ساتھ اپنے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں کا سا سلوک کرنے لگے۔ ان کو مذہبی آزادی بخشدی۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر انہیں سرفراز کیا۔ مسلمانوں کی طرح بیت المال سے ان کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ قانوناً ان کو تمام جائز حقوق تفویض کر دیئے۔ غرض ان کے ساتھ ان کا اس قدر بہتر سلوک ہوا اور وہ ان سے اس طرح گھل مل گئے کہ اہل ملک کو سوا ان حالات کے جبکہ ان کے مذہبی پیشوا انھیں ورغلایا کرتے، محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان پر کوئی اجنبی قوم مسلط ہے یا وہ محکوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شادی بیاہ کے رشتے

عربوں اور اہل اندلس کا میل جول اور باہمی اختلاط اس طرح بڑھا کہ ان کے درمیان، معاشرتی رشتے بھی قایم ہونے لگے چنانچہ بڑے بڑے مسلمان امراء و سلاطین اسپینی عورتوں کیساتھ شادیاں کرنے میں کسی قسم کا ننگ نہ محسوس کرتے یہ رشتہ حقیقت میں داعی اور رعایا کے درمیان، بہترین تعلقات قائم ہونے میں بہت زیادہ معین ثابت ہوا اور اس کی بناء پر دونوں جماعتوں میں اور زیادہ وابستگی بڑھ گئی۔ یہی نہیں کہ عرب امراء و سلاطین ان کی بیٹیوں اور بہنوں کو بے تکلف اپنے حرم میں داخل کر لیا کرتے تھے۔ بلکہ ہمیں اندلس کی طوائف الملوکی کے زمانہ میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ عیسائی بادشاہوں نے مسلمان امراء کی لڑکیوں سے شادیاں کر لی تھیں۔ چنانچہ الفانسو سادس کی شادی امیر اشبیلیہ کی لڑکی زایدہ سے ہوئی تھی۔ اسپینی اور پرتگالی عورتوں کی شادیاں مسلمانوں کے ساتھ اور اندلس کے آخری اسلامی دور میں مسلمان عورتوں کی شادیاں اسپینیوں اور پرتگالیوں کے ساتھ اس کثرت کے ساتھ ہوئی تھیں کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جب معاہدہ ہوا تو اس میں ان کے متعلق بعض شرائط بھی طے ہوئے

حکومت میں اہل اسپین کا حصہ

مسلمانوں نے اپنی مشہور رواداری اور تسامح کی بناء پر اسپینیوں کو مذہب کی جس طرح آزادی دیدی تھی اس کا بیان آگے آئیگا۔ یہاں یہ بیان کر دینا مناسب ہے کہ جس طرح مذہب کے بارے میں انھوں نے بہت زیادہ رواداری برتی، اسی طرح انھیں مناصب حکومت پر سرفراز کرنے میں بھی کسی تعصب کا اظہار نہیں کیا بلکہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ حکومت کے بڑے

بہت سے ان کے لئے کھلے رہے۔ اموی خلفاء کے دور حکومت میں سسلی کے بیشمار باشندے فوج میں داخل تھے۔ حکومت کے تمام اہم عہدوں میں آئینی بشرط اہلیت بغیر کسی تفریق کے حصہ لے سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مرتبہ وزارت تک بھی وہ پہنچ سکتے تھے چنانچہ مسلمان سلاطین نے بہت سے عیسائیوں اور یہودیوں کو اپنا وزیر بنایا۔ اس زمانہ میں عیسائی عام طور سے طبابت میں مہارت رکھتے تھے۔ مسلمان بے تکلف اپنے کو ان کے ہاتھوں میں دیدیا کرتے تھے اور ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔

اختلاط و رواداری کا نتیجہ

یہ بات ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے کہ جب دو قوموں کا باہم میل جول ہوتا ہے تو ہر دو قومیں ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے اور ہر ایک کی زبان دوسرے کی زبان سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہیں لیکن عموماً مغلوب قومیں بوجوہ معلوم غالب قوموں کا اثر زیادہ قبول کرتی ہیں۔ جب مسلمان اپنی رواداری اور مسالمت کی بنا پر اہل اندلس سے زیادہ گھل مل گئے تو اس اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور پر انھوں نے ان کی معاشرت، ان کی تہذیب اور ان کی زبان اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ نصف ہی صدی کے اندر اندر سارے جزیرہ میں اس طرح عربی زبان کا رواج ہو گیا کہ خود عیسائیوں کے لئے کنیسہ کو اپنی خاص دعاؤں وغیرہ کا عربی زبان میں ترجمہ کرنا پڑا اہل اندلس نے اپنی اصل زبان فراموش کردی اور عام طور پر تحریر و بول چال میں عربی زبان استعمال کرنے لگے یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر عربی زبان اندلس کی اصل زبان ہوگئی وہاں کے باشندوں میں بہت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو اہل زبان کی طرح عربی پر قدرت رکھتے تھے۔ عربی میں شعر و شاعری کرتے تھے۔ ان کی عربی میں اس زمانہ کی لکھی ہوئی تحریریں اب تک سینکڑوں کی تعداد میں محفوظ ہیں۔ عربوں کے اس اختلاط سے اہل اندلس اور ان کے واسطے سے یورپ کو جو فائدہ پہنچا، اس کا کچھ تذکرہ اس مضمون میں آچکا ہے جو ابھی حال ہی "مغربی تہذیب و تمدن پر مشرق کا اثر" کے عنوان سے قاران کے کئی نمبروں میں شائع ہوا ہے اور کچھ بیان انشاء اللہ آگے آئے گا۔

اہل اسپین کا اثر مسلمانوں پر

اگرچہ عام قاعدہ یہی ہے کہ مغلوب اور فروتر قومیں اپنے سے برتر اور غالب قوموں کی معاشرت، تہذیب، لباس اور زبان وغیرہ میں اتباع کرتی ہیں۔ لیکن ہمیں اندلس کے فاتحین میں بہت سے ایسے افراد ملتے ہیں جنھوں نے غالباً اپنی رواداری میں اہل اندلس کا لباس، طرز معاشرت اور ان کی زبان وغیرہ کو اختیار کرلیا تھا۔ مثلاً مشرقی اندلس کے بادشاہ محمد بن سعد کو اسپین کا خاص لباس بہت پسند تھا۔ کچھ مسلمان وزراء ایسے بھی گذرے ہیں جو عام طور پر اندلس کی زبان سے واقف تھے اور گفتگو اور طرز معاشرت وغیرہ میں اندلسیوں کی اتباع کرتے تھے۔

مسلمانوں کی مذہبی رواداری

مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے سلسلہ میں کبھی کسی قوم کے مذہب سے تعرض نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ہر شخص کو آزادی دیدی کہ جو مذہب چاہے اختیار کرلے۔ مذہب سے عدم تعرض، تو یوں بھی ان کا خاصہ ہے لیکن وہ خصوصیت کے ساتھ آسمانی مذاہب کے

پرستاروں کے ساتھ اس بارے میں بہت زیادہ مراعات برتتے تھے اور کسی حال میں ان سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ اندلس میں بھی ان کی یہی رواداری جو حقیقت میں ان کی مذہبی تعلیمات کا نتیجہ تھی، باقی رہی بلکہ بعض بعض خلفاء کے زمانہ میں یہ اس حد تک بڑھ گئی کہ اس کی بنا پر عیسائی مراعات بیجا کرنے لگے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات عیسائی مسجدوں کے دروازوں پر کھڑے ہو کر خود مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے اور ان پر حکومت کی طرف سے کچھ روک ٹوک نہ ہوتی۔ مسلمان سلاطین کے اس روادارانہ سلوک سے انکی دلیری اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ علانیہ اسلام کو برا بھلا کہتے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت قانونی تشدد نہیں اختیار کرتی۔

چنانچہ عیسائیوں کو اس بیجا حرکت سے روکنے کے لئے قانون نافذ کرنے کے بجائے، عبدالرحمٰن ثانی نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اشبیلیہ کے سب سے بڑے پادری کی صدارت میں عیسائیوں کی ایک کانفرنس کی جائے جو انھیں، اس قسم کی حرکتوں سے باز رکھنے کی تدبیریں سوچے۔ لیکن اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی عبدالرحمٰن کا انتقال ہوگیا۔ حقیقت میں زور و طاقت کے ہوتے ہوئے بھی اندلس میں مسلمانوں نے جس مذہبی رواداری کا ثبوت دیا اس کی نظیر تاریخ میں نہیں پیش کی جاسکتی۔ خصوصاً اس زمانہ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، جبکہ محض اختلاف مذہب کی بنا پر ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے تھے اور بڑی بڑی بستیاں ویران کر دی جاتی تھیں۔

مسلمان سلاطین کی رواداری اور مصالحت کے چند واقعات

اوپر تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ عیسائی نہ صرف اپنے مذہب میں آزاد تھے بلکہ وہ اپنے مذہب کی خود مسلمانوں میں تبلیغ کرتے اور بسا اوقات گستاخانہ رویہ اختیار کر لیتے تھے، حقیقت میں یہ مسلمان سلاطین کی حد سے بڑھی ہوئی رواداری اور مسالمت کا نتیجہ تھا عموماً خلفاء اندلس نے بلاتفریق مذہب ہر ایک کے لئے زبان و قلم کی آزادی بخش دی تھی اس لئے لوگ عام طور سے تقریر و تحریر میں جو چاہتے کہتے اور لکھتے، یہاں تک کہ وہ خود خلفاء پر نکتہ چینیاں کرتے اور ظلم و قہر کے بجائے، ان پر لطف و محبت کی بارش ہوتی یہاں میں دو ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جن سے آپ کو اندازہ ہوسکے گا کہ اس زمانہ میں زبان و قلم کی کس طرح آزادی حاصل تھی۔

خلیفہ ناصر و قاضی منذر ابن سعید

اندلس کے خلفاء میں خلیفہ ناصر کو تعمیرات سے بہت زیادہ دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے اپنے زمانہ خلافت میں متعدد شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اس کے دور میں قصر زہراء کی بھی تعمیر ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں اس کی تعمیر ہو رہی تھی بادشاہ کو اس میں اس درجہ انہماک تھا کہ اس نے جمعہ کے روز جامع مسجد میں جانا چھوڑ دیا۔ اس زمانہ میں قرطبہ کے جامع مسجد کے امام قاضی منذر ابن سعید تھے انہیں بادشاہ کا یہ فعل اس درجہ ناگوار گذرا کہ انھوں نے خطبہ جمعہ کے اندر ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں اس کے خلاف ایک نہایت سخت تقریر کی جس کی ابتداء قرآن کی اس آیت سے کی۔

اتبنون بکل ریع آیة تعبثون وتتخذون مصانع لعلکم | کیا بناتے ہو ہر اونچی زمین پر ایک نشان کھیلنے کو اور بناتے ہو کاریگریاں شاید

تخلدون واذا بطشتم بطشتم جبارین فاتقوا اللہ واطیعون واتقوا الذی امدکم بما تعلمون امدکم بانعام وبنین وجنت وعیون انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم۔ (سورۃ الشعراء)

تم ہمیشہ رہوگے اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظلم سے۔ سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے اور باغ اور چشمے۔ میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے۔

اور اس کے بعد تعمیر اور اس کے اخراجات وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی:۔

افمن اسس بنیانہ علی تقویٰ من اللہ ورضوان خیر ام من اسس بنیانہ علی شفا جرف ھار فانھار بہ فی نار جہنم واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ لا یزال بنیانھم الذی بنوا ریبۃ فی قلوبھم الا ان تقطع قلوبھم واللہ علیم حکیم۔ (سورۃ توبہ)

کیا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے ڈرنے پر اور اس کی رضامندی پر وہ بہتر ہے یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی کنارہ پر ایک کھائی کے جو گرنے کو ہے پھر اس کو لے کر ڈھے پڑا دوزخ کی آگ میں اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دیتا ہمیشہ رہیگا اس عمارت سے جو انھوں نے بنائی تھی شبہ ان کے دلوں میں مگر جب ٹکڑے ہو جائیں انکے دل اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

غرض انھوں نے بادشاہ کے اس انہماک پر سخت نکتہ چینی کی اور مصلحت کو نظر انداز کرتے ہوئے جو کچھ ان سے بن پڑا خلیفہ کے خلاف کہہ ڈالا۔ بادشاہ کو قاضی منذر کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ آئندہ ان کے پیچھے کبھی جمعہ کی نماز نہ پڑھے گا۔ اس پر اس کے بیٹے نے کہا جب ایسا ہے تو پھر انھیں معزول کر کے کسی اور کو کیوں نہیں امام مقرر کر دیا جاتا خلیفہ نے یہ سنکر بیٹے پر اپنی سخت خفگی کا اظہار کیا اور کہا کیا اپنی شریر اور گم گشتہ راہ نفس کو خوش کرنے کے لئے منذر بن سعید جیسے پرہیزگار اور عالم فاضل امام کو الگ کیا جاسکتا ہے؟

ایک دوسرا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مشہور مورخ نے شاہ وقت پر کوئی سخت نکتہ چینی کی جس پر شاہ کو تو نہیں لیکن شاہزادہ کو بہت غصہ آیا چنانچہ اس نے اسے قتل کرنیکا ارادہ کرلیا جب بادشاہ کو شاہزادہ کے اس ارادہ کی خبر ہوئی تو اسے اپنے پاس بلایا اور کہا اگر تم اپنے ارادہ سے باز نہ آؤگے تو یاد رکھو میں خود مقتول کے خون کا مطالبہ کرونگا۔ کیا تم اسے قتل کر کے چاہتے ہو کہ لوگ مجھے یہ طعنہ دیں کہ میں اپنے مورخین کو قتل کرایا کرتا ہوں؟ اسکے چند دن بعد جب وہ شخص حمام سے نکلکر اپنے کپڑے پہننے لگا تو کپڑوں کے اندر ہزار دینار کی ایک تھیلی اور ایک رقعہ ملا جس میں تحریر تھا کہ جس نامعلوم شخص نے یہ دینار تمہیں بھیجے ہیں وہ تمہیں اپنے آدمیوں کو بھیجکر قتل بھی کرا سکتا ہے۔ اس لئے تم اپنی قلم کو روکو اور اگر تمہیں لکھنا ہی ہے تو بیجا نکتہ چینی سے باز آجاؤ۔

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کے متعدد ادوار قائم ہوئے لیکن رواداری اور تسامح کی یہ روح ہر دور میں موجود رہی البتہ مرابطین اور موحدین کے دور حکومت میں کسی حد تک اس میں ضعف آگیا تھا کیونکہ ان کے اندر عربی خون کے بجائے افریقی خون موجزن تھا لیکن جب بنو نصر کے خاندان میں حکومت آئی تو پھر پہلی سی رواداری عود کر آئی۔

(باقی)

حسن سلوک اور احسان فراموشی

ایک عبرت آموز تاریخی داستان

(از جناب مولانا ماہر القادری صاحب)

اسلام کی تاریخ کا ہر ورق شاہد ہے کہ عیسائیت نے ہر محاذ پر اسلام سے نبرد آزمائی کی ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عیسائیت کسی عنوان بھی اسلام کی ترقی دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ ابتدائے اسلام سے لیکر آج تک "اسلام دشمنی" کا ڈرامہ عیسائیت کے اسٹیج پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اسلام نے عیسائیت کے دامن کو مسالمت و رواداری کے پھولوں سے بھرا، لیکن اس کے جواب میں بھی عیسائیت نے اسلام کے پھلنے پھولنے کو گوارا نہیں کیا۔ عین اس وقت جبکہ اسلام، عیسائیت کے ہونٹوں سے آبحیات کا پیالہ لگا رہا تھا، عیسائیت نے اسلام کے کلیجہ میں معاندانہ نکتہ چینی اور غیر صحیح تنقید کے نشتر چبھو دیئے۔ یہ صرف قیاس آرائی، بیان کی رنگینی اور شاعرانہ تخیل نہیں ہے، حقایق ہیں، ایسے حقائق جو کبھی جھٹلائے نہیں جاسکتے۔ دور کیوں جایئے، ہندوستان ہی کو لیجئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں مسلمان مصائب کے جس طوفان سے گذرے، اس کا اقرار خود ان ہی لوگوں نے کیا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے خون کی قدر و قیمت کو ضائع کرنے میں گرمجوشی سے حصہ لیا تھا۔ بزم مغلیہ کے آخری چراغ، سراج الدین شاہ ظفر نے بھی اپنے اشعار میں "کلمہ گویوں" کی تباہ حالی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شاید دور حاضر کی تاریخ ان اشعار کو زیادہ اہمیت نہ دیگی، جو واقعی خون جگر سے لکھے گئے تھے، اور جن کو پڑھ کر مسلمانوں کے خون کے سرخ ذرات چمکنے لگتے ہیں۔ خیر جانے دیجئے، ہم ایک معتبر شخص کی شہادت پیش کرتے ہیں، جو اس معرکہ میں خود موجود تھا،

۱۸۵۷ء کے غدر میں مسٹر رابرٹ جو بعد میں لارڈ ہوگئے، لفٹنٹ کے عہدے پر تھے، انھوں نے اپنی والدہ کو ایک خط میں لکھا تھا۔

> "ہم جہلم سے پشاور تک پاپیادہ آئے، راہ میں باغیوں کو قتل کرتے رہے اور فوجوں سے ہتھیار لیتے رہے، لوگوں پر سزائے موت کا جو توپ سے واقع ہوئی، بڑا اثر پڑتا ہے، یہ بڑا ہی خوفناک منظر ہے، مگر اس کے بغیر چارہ نہیں، ان مظالم کے ذریعہ ہم ان بدمعاش مسلمانوں کو بتادینا چاہتے ہیں، کہ ہم خدا کی مدد سے ہندوستان پر قابض رہیں گے۔"
>
> (الہلال ۲ر ستمبر ۱۹۲۷ء)

یہ بیکس و مظلوم شاہ ظفر کے اشعار نہیں ہیں، کسی مسلمان کے دہرائے ہوئے فقرے نہیں ہیں، ایک ذمہ دار انگریز افسر کا خط ہے، جو اس نے اپنی ماں کو لکھا ہے، یہ الفاظ ایک قلم کے نکلے ہوئے ہیں۔ مگر تمام انگریزی سپاہیوں اور افسروں کے

جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں، انگریزوں کو نہ سکھوں سے بحث ہے اور نہ ہندوؤں سے، صرف مسلمانوں سے سروکار ہے، پرستاران حق پر اقتدار لینے کے لئے اژدردم توپوں کا بے تحاشا استعمال کیا جا رہا ہے، یہ منظر اتنا بھیانک اور دردناک ہے کہ لفٹننٹ رابرٹ بھی اس کو "خوفناک" بتاتے ہیں۔ نصرانی لفٹننٹ کا جوش دیکھئے کہ مسلمانوں کو "بدمعاش" کہتا ہے، اور اس کے بعد خدا کی مدد سے ہندوستان پر قابض رہنا چاہتا ہے۔ ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ لیکن یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا خون اتنا ارزاں نہیں ہے، جتنا سمجھا گیا ہے، جب وقت آتا ہے تو اس خون کی ایک بوند کی قیمت، تخت و تاج بھی ادا نہیں کر سکتے۔

تمہید سے یہ دکھانا مقصود تھا، کہ عیسائیت کو اسلام اور مسلمانوں سے تاریخ کے قدیم زمانہ سے عداوت رہی ہے، اور مسلمانوں کو ہر جگہ کچلا گیا ہے، حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے ہی عیسائیوں کو داخل ہونے کی اجازت دی، اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ اس وقت جبکہ بھارت ورش کے ویر اور سورما راجپوت مسلمانوں کے سامنے جھک کر تلواریں پیش کر رہے تھے، کسی عیسائی کے جان و مال کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا اور مسلمانوں نے کمزور نہتے اور پردیسی عیسائیوں پر اپنی طاقت کا استعمال کیا؟ تاریخ کوئی ایسی نظیر پیش نہیں کر سکتی، لیکن وہی جس نے عیسائیوں کو پناہ دی تھی، اس کی اولاد کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، اس کی تفصیل اگر بیان کی جائے گی تو قلعہ معلیٰ کی بیجان دیواروں سے لہو ٹپکنے لگیگا، اس ہی چیز کو میں ایک دوسرے تاریخی واقعہ کی روشنی میں پیش کر رہا ہوں۔

حسن سلوک

عبدالرحمٰن ثالث جب اندلس کے تخت پر بیٹھا، تو اس کی مسیں بھی پورے طور پر بھیگنے نہ پائی تھیں، مگر اس کمسنی کے باوجود وہ دلیر، صاحب عزم، قوی الارادہ اور اقبالمند تھا۔ امرائے عرب سے بحث کر، جب عبدالرحمٰن نے ملک پر نظر ڈالی، تو عیسائیوں کو ریشہ دوانی کرتا ہوا پایا، مسلمان بادشاہوں کی کمزوری اور طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر عیسائیوں نے قوت حاصل کر لی تھی۔ اور وہ روز ایک نہ ایک شاخسانہ کھڑا کر دیا کرتے تھے۔ ابن حفصون باغی عیسائیوں کا سردار تھا، اس نے کھلے خزانے بغاوت کی، اسلامی لشکر کو پریشان کیا، قافلوں کو لوٹا، شبخون مارا، اور رعایا کے امن و امان کو غارت کیا، ابن حفصون بہت بوڑھا تھا قبل اس کے کسی مسلمان کی تلوار، اسے جہنم کا راستہ دکھاتی، وہ اپنی موت مر گیا، ابن حفصون کے مرتے ہی عیسائیوں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اور انھوں نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے، عیسائیوں نے جس قلعہ کو اپنا مرکز بنایا تھا، اس کے دروازے کھول دیئے گئے اور سلطان فتح و نصرت کے پھریرے کی چھاؤں میں قلعہ میں داخل ہو گیا۔ سلطان نے قلعہ میں داخل ہو کر پہلا کام یہ کیا، کہ خدا کی بارگاہ میں دو رکعت نماز شکرانہ ...... ادا کی، یعنی وہ سر جس کے سامنے سرکش عیسائی جھک گئے تھے، خدا کے آگے عاجزی کے ساتھ جھک گیا، سلطان کو ان سرکش عیسائیوں پر پورا قابو حاصل تھا، جو ایک عرصہ تک حکومت کو پریشان کرتے رہے تھے، اور جنھوں نے علی الاعلان بغاوت کی تھی، اگر سلطان چاہتا تو قلعہ کے ہر برج کو دہلی کا "خونیں دروازہ" بنا دیتا، مگر اس نے بغیر کسی باز پرس کے سب کو معاف کر دیا اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں جن عیسائیوں کی جائداد کا نقصان ہوا تھا ان کی بیت المال سے

امداد کی گئی۔

کیا عیسائیوں نے مسلمانوں کے ہر احسان کو بھلا دیا؟

احسان فراموش عیسائی

عبدالرحمٰن جوش کے ساتھ ساتھ صاحب تدبیر بھی تھا، اس نے بحری فوج کو بہت کچھ ترقی دی، جنگی بیڑہ تیار کرایا اور چند دن میں مسلمانوں کے جہاز آبنائے طارق، بحر متوسط کی موجوں پر آزادی کے ساتھ حکمرانی کرنے لگے۔ آج بہت سی بحری اصطلاحیں جو افرنجی اور فرانسوی زبانوں میں رائج ہیں وہ دور اسلامی دور کی پیداوار ہیں، اور بحری بیڑے کے بہت سے نقشے ان ہی خاکوں کی مدد سے تیار کیے گئے ہیں۔ سلطان بحری استحکامات میں مصروف تھا، اور عیسائی یلغار کرتے ہوئے اندلس کی سرحد میں داخل ہو گئے مسلمان اب تک عیسائیوں کو حقیر سمجھتے تھے، اس لئے ان کو عیسائیوں کی فتنہ پردازیوں اور شورشوں کی کچھ پروا نہ تھی عیسائی مسلمانوں کی اس بے پروائی سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت میں اضافہ کرتے گئے۔ اور جب سازوسامان درست ہو گیا، تو اچانک طور پر غافل عربوں پر یورش کر کے ملک کے بڑے حصہ کو قبضہ میں کر لیا۔ عرب بالکل غافل تھے، عیسائیوں کے پاس کافی فوج تھی۔ ہر محاذ پر مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا، یہاں تک جلیقیہ اور قسطلہ کا تمام خطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جب عیسائیوں نے مسلم علاقہ پر قابو پا لیا، تو ان کے آبائی تعصب کا آتشکدہ بھڑکا، اور انھوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا شروع کئے۔ ایسے ہولناک مظالم، غریب مسلمانوں پر کئے جن کے تصور سے کلیجہ دہل جاتا ہے۔

بوڑھے اور اپاہج مسلمانوں کو تہ تیغ کیا، مسلم عورتوں کے سینوں کو سنگینوں کی نوکوں پر اٹھا لیا اور دودھ پیتے بچوں کو عیسائی درندوں نے پھاڑ کھایا۔ جو مسلمان تہ تیغ ہونے سے بچ گئے ان سے بالجبر عیسائی مذہب قبول کرایا گیا، اور بعض کی گردنوں میں غلامی کا طوق ڈالا گیا۔

مسلمانوں نے بھی عیسائیوں پر قابو پایا تھا، مگر ایک عیسائی کو بھی ان کے ہاتھوں نقصان نہ پہنچا، کسی گرجا کا پتھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹایا گیا، لیکن عیسائیوں نے پھول کا جواب پتھر سے اور آب حیات کا جواب آب شمشیر سے دیا۔

ایسے احسان فراموش دنیا میں شاید ہی کبھی پیدا ہوئے ہوں؟

اسلام کی فتح!

لیون کا حکمراں اردونی ثانی نہایت ہی کینہ پرور اور متعصب شخص تھا، اس نے مسلمانوں کی سرحد پر بڑے سازوسامان کے ساتھ چڑھائی کی، عبدالرحمٰن نے عیسائیوں کے روکنے کے لئے ایک دستہ بھیجدیا، اس مختصر سی فوج نے عیسائیوں کے چھکے چھڑا دیئے، اور نصرانی فوج بالکل تتر بتر ہو گئی، لیکن اردونی اس قدر چالاک اور مضبوط دل کا انسان تھا کہ اس شکست نے اُسکے ہوش و حواس کو قایم رکھا، اور اس نے منتشر فوج کو سمیٹ کر، عربوں پر پھر ہلہ بول دیا۔ مسلمان بالکل غافل تھے، اس اچانک حملہ نے ان کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ عربوں کا سپہ سالار، فوج کی یہ حالت دیکھ کر، میدان جنگ میں تلوار لیکر کود اور اللہ اکبر کا

نعرہ لگاتا ہوا، دشمن کی صفوں میں گھس گیا، عیسائیوں نے یکہ وتنہا بہادر کے کلیجہ میں سنگینیں بھونک دیں، اور فاتح بدروحنین کا شیدائی مسکراتا ہوا شہید ہوگیا۔ اردونی کا کمینہ پن دیکھئے کہ شہید سپہ سالار کے سر کو خنزیر کے ساتھ قلعہ کے دروازے پر لٹکایا۔ عبدالرحمٰن نے دیکھا کہ عیسائی مفسدہ پردازی سے کسی طرح باز ہی نہیں آتے، تو وہ خود ۳۲۶ھ میں اپنے بہادر امرا کو لیکر عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ شاہ اردونی ثانی کی مدد کے لئے بھی کئی عیسائی بادشاہ اپنی جرار فوج کے ساتھ رزمگاہ میں موجود تھے بڑے زور کی لڑائی ہوئی، دونوں طرف سے طوفانی جوش دکھایا گیا۔ اس وقت جبکہ تلواروں سے خون ٹپک رہا تھا اور ہر طرف موت کے ڈراونے بادل چھائے ہوئے تھے، عبدالرحمٰن آزمودہ کار فوج کو لیکر دشمن کی صفوں میں گھس گیا، عبدالرحمٰن کی جرات نے سپاہیوں کے بدن میں بجلی دوڑادی، عیسائیوں نے بہت کچھ سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن عربوں کے جوش اسلامی نے پرستاران تثلیث کی جمعیت کو اس طرح پریشان کیا کہ عیسائی بدحواس ہوکر بھاگے، ہزاروں میدان جنگ میں ڈھیر ہوکر رہ گئے مسلمانوں کو کامل فتح نصیب ہوئی۔

اس جنگ کے بعد اگرچہ عیسائیوں کا بہت کچھ زور ٹوٹ گیا، مگر وہ پھر بھی مفسدہ پردازی سے باز نہ آئے، عبدالرحمٰن نے مجبور ہوکر پھر توجہ کی اور عیسائی قوت کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ خدائی شان کہ اسے ہر محاذ پر فتح حاصل ہوئی، ان فتوحات کی یادگار میں عبدالرحمٰن نے "الناصر لدین اللہ" کا خطاب اپنی رعایا کی دلی خواہش کی بنا پر اپنے لئے تجویز کیا۔

مسلمانو! تاریخ کو عبرت کی نگاہ سے پڑھو، اور پڑھنے کے بعد اپنے جوش اسلامی کا جائزہ لو! ربانی قوت اب بھی تمہاری امداد کے لئے موجود ہے۔ بشرطیکہ تم جنبش کرو۔

افریقہ کے صحراؤں میں ایک نئی دنیا کی تعمیر

سائنس کی ہمت تسخیر ابھی صحراؤں کی طرف نہیں متوجہ ہوئی تھی لیکن اب جرمنی نے قدم آگے بڑھایا ہے کہ ان غیر مفتوح علاقوں کو بھی سائنس کے تصرف میں دیدے۔ اسوقت جرمنی کے سامنے دو اسکیمیں ہیں ایک طرف تو وہ اپنی سابق نوآبادیات واپس لینا چاہتا ہے دوسری طرف افریقہ کے صحرائے اعظم کے اندر مصنوعی ندیاں جاری کرکے اس کو زرخیز وشاداب بنادینا چاہتا ہے۔

اس اسکیم کا خلاصہ یہ ہے کہ نہر کانگو پر ایک بند جو ڈھائی میل لمبا ہوگا، باندھ کر اس کثیر بارش کا تمام پانی روک دیا جائیگا جو اس علاقہ میں ہوتی ہے، اور اس کا رخ نہر کانگو کے ہاڈ کی طرف پھیر دیا جائیگا۔ یہ نہر ایک زمانہ میں ایک وسیع اور گہرے بحیرہ کی شکل میں تھی اب پھر کوشش کی جائیگی کہ اپنی قدیم حیثیت دوبارہ حاصل کرلے اور ۳۵۰۰۰۰ میل مربع تک پھیل جائے۔ لیکن بایں ہمہ اس علاقہ کی غیر منقطع بارش کے تمام پانی کے جمع کرنے کے لئے یہ وسعت بھی کافی نہ ہوگی، اس لئے باقی پانی بحیرہ شاد کی طرف پھیر دیا جائیگا اور اس کو وسیع کرکے اول الذکر کے برابر کردیا جائیگا۔ پھر بحیرہ شاد کو نیل ثانی کے ذریعہ بحر ابیض متوسط سے ملادیا جائے گا۔

عہد حاضر کی ایک مشہور شخصیت

مصطفیٰ کمال پاشا

(۵)

(از جناب عبد الحکیم صاحب بی اے)

سبے چند کی غداری کا واقعہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ صفحہ ہے سابق وزیر اعظم داماد فرید پاشاہ نے بھی ٹھیک یہی غدارانہ رویہ اختیار کیا گذشتہ جاہ وحشم کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے اس نے چاہا کہ اتحادیوں کی مدد سے نیشنل پارٹی کا وجود مٹا دیا جائے۔ چنانچہ برطانوی کمانڈر جنرل ملنے اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوگیا اور مارشل لا جاری کردیا یہی نہیں بلکہ جتنے قومی رہنما مل سکے گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ فرید پاشا کی آرزو پوری ہوئی وہ قسطنطنیہ کی نئی حکومت میں وزیر اعظم کے منصب جلیل پر فائز ہوگیا۔ لیکن

ع دشمن اگر قوی است مہرباں قوی ترست

بہت سے قومی رہنما جن میں کمال بھی تھا عین وقت پر فرید پاشا کی حرکتوں سے مطلع ہو کر قسطنطنیہ سے بھاگ کر انگورہ پہنچ گئے اور ایک خاص اجتماع میں انھوں نے طے کیا کہ ہم لوگ اپنی ایک الگ حکومت قایم کریں گے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی اہم کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا یہ کہ حکومت قسطنطنیہ کی غداری کی وضاحت کرکے عام لوگوں کی نظروں سے اسے گرادیا۔ اور اس طرح قومی حکومت کے قیام کے لئے خوشگوار فضا تیار کی دوسرا کام اخبار "حاکمیت ملی" کا اجرا تھا اس کی ایڈیٹری محترمہ خالدہ ادیب خانم اور یونس نادی بے کے سپرد ہوئی۔ اس کے بعد حکومت کی نوعیت اور شکل کے متعلق سب نے باہم تبادلہ خیالات کیا اس موضوع پر مختلف لیڈروں کے درمیان سخت اختلاف رہا۔ لیکن بالآخر ایک کثیر تعداد نے جس تجویز کی تائید کی وہ یہ تھی کہ ایک ایسی دستوری شاہنشاہیت کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بادشاہ کوئی نہو۔ ایک مجلس قانون ساز، کیبنٹ مجلس منتظمہ اور ایک صدر اس حکومت کے عناصر ترکیبی ہوں۔ کمال نے اپنی رائے پیش کی اور کہا کہ یہ حکومت تقریباً ایک قسم کی ریپبلک حکومت ہوگی لوگ اس کا نام سنکر تعجب کریں گے اس لئے کہ یورپ میں تجربات ومشاہدات نے تبلا دیا ہے کہ یہ چیز اب قطعاً نامقبول اور غیر مفید ہے اس نے خود نظام حکومت کا ایک خاکہ بنایا جس میں مغربی جمہوریت کے عناصر بھی تھے اور مشرقیت کا رنگ بھی اس کے مطابق نیشنل اسمبلی کو قانونی اور انتظامی دونوں امور پر اختیار کلی حاصل ہوگا کیبنٹ کے ممبروں کا انتخاب بھی اسمبلی ہی کرے گی ان ممبروں کا انتخاب ذاتی امتیازات وخصائص کی بنا پر عمل میں آئیگا اور ہر ایک فرداً فرداً صرف اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوگا کیبنٹ کے

مختار مجموعی حیثیت سے کیبنٹ کے سامنے ذمہ دار قرار پائیں گے۔ درحقیقت یہ افسروں کی ایک جماعت ہوگی جو نیشنل اسمبلی کی صوابدید کے مطابق عملدرآمد کرے گی۔ اسمبلی کا صدر اس کا بھی صدر ہوگا وہ ذاتی طور پر کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہوگا۔ ممبروں کو وزیر کے نام سے نہیں بلکہ "گماشتۂ قوم" کے نام سے پکارا جائے گا۔ یہ دستور بالشوزم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے، چنانچہ ہر طرف سے اعتراض کئے گئے لیکن اس خیال سے کہ ملک نہایت نازک دور سے گذر رہا ہے۔ نا اتفاقی حد درجہ مضر ہوگی سارے اعتراضات از خود اُٹھ گئے۔ خالدہ خانم لکھتی ہیں "میرے نزدیک کسی نظام کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں۔ البتہ میں مصطفٰے کمال کے فطری استحکام و صلابت کو دیکھ رہی تھی جس نے اُسے ایک مافوق العادت انسان بنا دیا ہے۔ جدید ترکی اس کے نظریوں اور معقولوں سے وجود پذیر نہیں ہوئی بلکہ اس کے ارادہ و عمل کی قوتوں نے ترکی کو ترکی بنا دیا ہے کوئی متوسط درجے کا انسان اس کی جد و جہد کا حریف نہیں بن سکتا۔" بالآخر منتخب لیڈروں کی ایک جماعت نے اس دستور کی حمایت کی لیکن اسمبلی میں اسے پاس کرانا باقی تھا۔ اجلاس ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو ہونے والا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں ایک واقعہ پیش آگیا جس سے کمال کے کردار پر تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے۔ ایک شخص جس کا نام شجاعت بے تھا انگورہ میں آیا اور کہا کہ وزیر اعظم فرید پاشا نے ایک خاص عدالت باغیوں کے مقدموں کی خاطر قائم کی ہے اس کا صدر ایک کردی مصطفٰے کمال نامی ہے۔ اس عدالت نے سات لیڈروں کو پھانسی کا حکم دیا ہے مصطفٰے کمال خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر عدنان بھی ان میں شامل ہیں اور شیخ الاسلام کے فتوے نے اس حکمنامے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ کمال یہ خبر سن کر بہت گھبرا گیا چنانچہ فوراً یہ تحریک شروع ہوگئی کہ انگورہ کی جدید حکومت کا سب سے پہلا ایکٹ یہ ہونا چاہئے کہ ان تمام لوگوں کو پھانسی دی جائے جنھوں نے قومی رہنماؤں کی پھانسی کے لئے احکام جاری کئے ہیں اور مقامی مفتیوں سے فتوے حاصل کر کے اس کی تصدیق بھی کر لی جائے۔

۲۲ر اپریل کی شام کو نئے دستور کی نوعیت پر تکمیلی گفتگو ہوئی۔ اسمبلی کے لئے بہت سے نام تجویز کئے گئے لیکن آخر میں "یوق ملت مجلسی" کو سب نے پسند کیا۔ یہ طے پایا کہ کیبنٹ کے ۱۱ ممبر ہوا کریں گے ہر ایک کے تحت ایک خاص محکمہ ہوگا اور صدر خود مصطفٰے کمال ہوگا۔ ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو اسمبلی کا اجلاس ہوا کمال نے مسلسل چار گھنٹے تک تقریر کی اس کے جوش خطابت اور طرز تقریر نے بتلا دیا کہ وہ ایک بلند پایہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آتش بیان خطیب بھی ہے۔ اس نے اینگلو سیکسن اور امریکن طرز حکومت پر سخت اعتراضات کئے اور بتلایا کہ ان کی مثال بے جان مشینوں کی سی ہے۔ غور و خوض اور رائے و مشورہ کے بعد ہر کام صرف ایک شخص کے عقل و فہم کے سپرد کر دینا بہتر ہے۔ ہماری حکومت نہ جمہوری ہے اور نہ اشتراکی دنیا کی کوئی گورنمنٹ ہماری گورنمنٹ کے مشابہ نہیں ہے تاہم یہ ہر حال میں قوم کی آواز اور قوم کی سلطنت ہے۔

اسمبلی نے اعلان کر دیا کہ میثاق قومی کی پابندی اور اتحادیوں کی تجویزوں اور ارادوں کو شکست دینا قوم کا فرض ہے چنانچہ اسمبلی میں سب سے پہلے جو تجویز پاس ہوئی وہ یہ تھی چونکہ سلطان اور حکومت قسطنطنیہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں کہ اتحادیوں کے ہاتھ کی گڑیا ہیں جن سے قومی مفاد کو زبردست نقصان کا اندیشہ ہے لہذا ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء سے قوم سارے حقوق و اختیارات ان سے لے کر

ان

تام حکومت مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں میں دے رہی ہے۔ کمال نے ۲۹ اپریل کو مسٹر لنڈسینڈ کو یوں اطلاع دی۔ میں یورایکسیلنسی کو قوم
کے ان فیصلوں سے مطلع کر دینا چاہتا ہوں جو ۲۹ اپریل ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں متفقہ طور پر قرار پائے۔
اول یہ کہ عثمانی ترک مرکز خلافت قسطنطنیہ اور حکومت قسطنطنیہ دونوں کو اتحادیوں کا قیدی سمجھتے ہیں لہذا تمام احکام اور سارے
نادے جن کا نفاذ حکومت قسطنطنیہ کی جانب سے ہوگا قانونی اور مذہبی حیثیت سے قطعاً بے وقعت خیال کئے جائیں گے مزید براں
حکومت قسطنطنیہ کے سارے معاہدے جو بیرونی قوتوں سے ہو رہے ہیں باطل سمجھے جائیں گے۔
دوم یہ کہ ترکان احرار امن و امان کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ترکی کی قدیم آزادی اور متبرک روایات کے حفاظت کی
خاطر ہر امکانی جدو جہد سے کام لیں گے۔ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ اپنی آزادی اور وقار کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اتحادیوں سے صلح
کر لیں لیکن یہ بھی بتلا دینا چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر سوائے سچے قومی نمایندوں کے دوسرا کوئی بحث و گفتگو کرنے کا مجاز نہیں
ہے۔
سوم یہ کہ عیسائی باشندوں اور ان تمام غیر اقوام کو ترکی حکومت کی حمایت و حفاظت حاصل ہوگی جنھوں نے ترکی کو اپنا
مسکن بنا لیا ہے لیکن انھیں مطلع کیا جاتا ہے کہ قومی حکومت کے خلاف ہر فعل سے پرہیز کریں۔
حکومت قسطنطنیہ نے ان تجاویز کی طرف کوئی توجہ نہ کی برخلاف اس کے مصطفیٰ کمال کے قتل کرنے کے لئے متعدد سازشیں
کی گئیں۔ ایک ایسی ہی سازش کا حال اسوقت کھلا جب مشہور انگریزی جاسوس مصطفیٰ صغیر گرفتار کیا گیا۔ اس شخص نے ترکی میں خود کو ہندوستان
کی خلافت کانفرنس کا نمایندہ مشہور کر رکھا تھا اور اپنی شرمناک خدمات انجام دینے کے لئے حکومت انگورہ سے اس نے درخواست
کی تھی کہ مجھے انگورہ سے قسطنطنیہ کے قومی محکمہ جاسوسی تک خبریں پہنچانے کے لئے مامور کیا جائے لیکن انگورہ کی حکومت اس کی
درخواست پر چونک پڑی۔ اس کی حرکات و سکنات کا بغور معائنہ ہوتا رہا یہاں تک کہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا اور پھانسی
دیدی گئی۔ دوران مقدمہ میں اس نے بیان کیا کہ میں بنارس کے ایک معزز مسلمان خاندان کا ایک فرد ہوں بچپن ہی میں انگلینڈ
چلا گیا تھا وہیں میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میرے ہاتھ پر قرآن رکھ کر مجھ سے قسم لی گئی تھی کہ میں برطانیہ اور
ہندوستان کے وائسرائے کا وفادار رہوں گا۔ میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوں ابتدا میں مصر کی تحریک قومی کی جاسوسی
کے لئے میں مامور ہوا تھا لیکن میری قابلیت اور میرے کارناموں کو دیکھ کر مجھے فارس افغانستان ہندوستان اور ترکی میں عظیم الشان
خدمات کی انجام دہی کے لئے بھیجا گیا۔ مصطفیٰ صغیر نے اس رقم کی مقدار بھی بتلائی جو ہر مہینے سلطان کو برطانوی خزانے سے ملتی تھی اس نے
یہ بھی کہا کہ مصطفیٰ کمال اگر برطانیہ کی ہدایات پر عمل کرتے تو انھیں بھی ستر لاکھ ڈالر (تقریباً ۱۵۰۰۰۰۰۰ روپے) ملتے۔
غازی یہ سنکر مسکرا دیا اور کہا کہ میں نے آج تک تجارتی نقطہ نظر سے اپنی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ مصطفیٰ صغیر نے اس کے
بعد ان تمام سازشوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا جو داماد فرید پاشا اور اسکے مویدین، سلطان اور برطانوی حکام کمال کے خلاف کر رہے
تھے اس نے یہ بھی بتلایا کہ اناطولیہ میں میرے آنے کی غرض صرف مصطفیٰ کمال کو قتل کرنا تھا۔

"اس فرض کو انجام دینے کے لئے کیوں تمہارا ہی انتخاب عمل میں آیا؟" لوگوں نے اس سے پوچھا۔
اس نے کہا اس لئے کہ میں افغانستان میں ایک اس سے زیادہ عظیم الشان مہم سرانجام کرچکا تھا، امیر میرے ہی ہاتھوں سے قتل ہوا۔ یہ داستان ختم کرنے کے بعد اس نے صرف ایک التجا کی وہ یہ کہ میرا نام دنیا پر ظاہر نہ کیا جائے ورنہ ایک معزز اور قدیم اسلامی خاندان کے اعزاز و وقار کو زبردست صدمہ پہنچیگا۔ اس کا حقیقی نام کچھ اور ہوگا مصطفےٰ صغیر اس کا ایک فرضی نام ہے۔
ان حیرت انگیز انکشافات کے بعد مصطفےٰ کمال کو دلیں نام نہاد مغربی تہذیب و تمدن سے اور مشرقی ممالک میں انکی سیہ کاریوں سے ایک قسم کا غصہ اور تنفر پیدا ہوگیا اور آخر مئی ۱۹۳۵ء میں جب خالدہ ادیب خانم نے کمال کے سامنے برطانوی مدبر کی اس تقریر کا ترجمہ پیش کیا جس میں مشرقی ممالک میں برطانیہ کی جابرانہ پالیسی کا ذکر تھا تو وہ حد سے زیادہ غضبناک ہوگیا اور نہایت غصّہ میں الفاظ میں کہنے لگا کہ ان کو بہت جلد معلوم ہوجائے گا کہ ہم کسی حال میں بھی ان سے کم نہیں ہیں انہیں ہمارے ساتھ برابری کا سلوک کرنا پڑے گا ہم کبھی اپنا سر ان کے سامنے نہیں جھکا سکتے ہم میں کا ہر فرد آزادی کی خاطر ان سے برسر پیکار رہے گا۔ یہانتک کہ ہم ان کی تہذیب کا بھانڈا ان کے سر پر پھوڑ دیں۔" ہر مشرقی انسان کے دل میں غازی مصطفےٰ کمال کے ان الفاظ کی وقعت ہے۔

(باقی)

محسوسات ماہر

(از جناب ماہر القادری صاحب)

وہ کیوں نہ ہر ادا میں ہو نایاب نظر فروش
ذرّے ہیں جس کی راہ کے شمس و قمر فروش

بڑھ جائیں گی کچھ اور بیاباں کی وسعتیں
جوشِ جنوں رہا جو یوں ہی بام و در فروش

"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"
تو دشنہ در نگاہ، میں تاش جگر فروش

کانٹے نگاہ گیر ہیں، کلیاں نظر نواز
جلوے ہیں ہر لباس میں ذوقِ نظر فروش

گیسو ہیں اور عارضِ رنگیں کی تابشیں
وہ ایک ہی ادا میں ہیں شام و سحر فروش

ناکامیوں نے حوصلے دل کے بڑھا دیئے
یعنی شکستِ عشق ہے فتح و ظفر فروش

تم سامنے ہو، پھر مجھے کیا اور چاہیئے؟
عکسِ نظر ملیح، تبسم شکر فروش

غم کیا دیا کہ تو نے خزانے لٹا دیئے
ہر چشم اشکبار ہے لعل و گہر فروش

خودداریٔ کمال کی رسوائیاں نہ پوچھ
بازار زندگی میں ہے ماہر ہنر فروش

ادب اور زندگی

(از جناب عبد الحکیم صاحب بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ادب آئینۂ زندگی ہے نہیں بلکہ رموز و معارف زندگی کا بہترین ترجمان و مفسر ہے۔ آئینہ صرف چہروں کے خد و خال، چتونوں کے جمال، رخساروں کی رنگینی اور آنکھوں کے سحر کو پیش نظر کر دیتا ہے جو جسم انسانی کے خارجی حسن و جمال ہیں۔ داخلی خوبی و کمال کی حد جہاں سے شروع ہوتی ہے آئینہ وہاں کچھ کام نہیں دے سکتا۔ یہ وصف ادب اور تنہا ادب کے حصہ میں آیا ہے کہ خارجی محاسن و معائب کے ساتھ روحوں کی نقاب کشائی، دنیائے دل کے حسن و قبح کی وضاحت، پوشیدہ فطری میلانات، سربستہ رموز و اسرار، ذہنی نقوش و تصورات اور قلبی واردات و کیفیات کی بھی تفسیر کرتا ہے، غرض لٹریچر وہ چیز ہے کہ زندگی کے تمام پر پیچ زاویے اور تاریک گوشے اس کی روشنی میں روشن اور اجاگر ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم دنیا کے ہر بڑے ادیب کی زندگی کا عکس اس کی ادبی تحریروں میں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

ادب اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے اس درجہ وسیع ہے کہ دنیا کے سارے علوم و فنون فلسفہ۔ تاریخ۔ سائنس۔ مذہب۔ اخلاق۔ سیاست غرض وہ سب کچھ جسے انسانی سمجھ بوجھ آج تک تحریر یا تقریر کے دائرے میں لا سکی ہے، ادب کے دائرے میں آ جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت ادب کا اطلاق صرف ان مضامین پر ہوتا ہے جن کا مقصود لطافت زبان حسن بیان۔ آرٹ اور حسن ہو۔ ایک مورخ اپنے مضامین میں قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ ان کی عام تمدنی معاشرتی شیرازہ بندی اور سیاسی استحکام تفصیل سے بیان کرتا ہے بلا شبہ اس کے بیان میں ادب کی چاشنی پائی جاتی ہے اس کے مقالات میں جا بجا لطافت زبان کے بھی نمونے ملتے ہیں لیکن تاہم اس کی تحریر کو ہم ادبی تحریر نہیں سمجھتے اور نہ اس کے مقالات و مضامین کے دفتر کو ادبی یا لٹریری مقالے کا شرف بخشا جاتا ہے یہ اس لئے کہ مورخ کا مقصود حسن بیان یا لطافت زبان نہیں تھا اس کی تاریخ میں ہر جگہ اولیت اور مرکزیت تاریخی واقعات و حقائق کو حاصل ہے اور ادب محض ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اصل مقصود تھی اور ادب صرف ایک ذریعے کی حیثیت رکھتا تھا پس ہر وہ تحریر جس میں ادب کی پوزیشن ثانوی ہے ادب کے دائرہ سے باہر ہے یہاں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کے سارے علوم و فنون کا تعلق ادب سے براہ راست نہیں تو بالواسطہ ضرور ہے اور کہیں کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ ادبی شان اور فنی حیثیت اس طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی ہیں کہ ایک ہی مقالے میں دونوں اپنی اپنی مستقل ہستی رکھتی ہیں اور بیک وقت ہم دونوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اس قسم کی مثالیں صرف چوٹی کے ادبا اور شعراء کے کلام میں مل سکتی ہیں۔ جن لوگوں نے شکسپیر کے مشہور المیہ ڈراما Macbeth کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس ڈرامے کی ادبی رفعت و شان سے قطع نظر ایک مستقل تاریخی حیثیت بھی ہے جو سولھویں صدی

عیسوی کے مذہبی عقائد، توہمات، رسم و رواج پر روشنی ڈالتی ہے شکسپیر نے چڑیلوں اور ان کے مکروہ اور شیطانی کارناموں کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ سب کچھ اس کے دماغ کی اختراع اور ذہن کی ایجاد ہے جس میں اس نے انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہوئے طلسماتی منظر پیش کیا ہے اور جس کی داد صرف یہ ہے کہ حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جائے یا صرف ہنس دیا جائے یہ واقعہ ہے کہ سولھویں صدی میں اہل برطانیہ چڑیلوں اور بھوتوں اور ان کے حیرت انگیز کارناموں پر کامل اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ جو دنیا میں طوفان۔ قحط۔ طاعون۔ سیلاب اور دوسری بلائیں نازل ہوتی رہتی ہیں یہ سب انہی چڑیلوں کی کارستانیوں کے نتائج ہیں اور یہ کہ ہر انسان جو اپنی روح شیطان کے اختیار میں دیدے قدرت کے نظام میں بڑی حد تک دخیل ہو سکتا ہے اور شیطانی قوتوں کی مدد سے جس کسی کو چاہے رنج و محن میں مبتلا کر سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۵۸۸ء میں ایک خاتون مسز ڈائر کو صرف اس لئے سزا دی گئی تھی کہ آنتوں کے درد کی تکلیف سے ملکہ الزبتھ کئی رات سو نہ سکی اور خیال یہ تھا کہ مسز ڈائر ہی کی شیطنت سے ایسا ہوا ہے یہی نہیں بلکہ ۱۵۹۰ء میں تقریباً چھ سو عورتیں اسی شبہے کی بنا پر آگ میں جلا ڈالی گئیں۔ شکسپیر کا کمال کہنا چاہئے کہ وہ ان عام ذہنی و مذہبی اعتقادات کا اس خوبی سے ذکر کرتا ہے کہ ایک طرف ڈرامے کی ادبی فضا میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور دوسری طرف الزبتھ کے زمانے کے اعتقادات و توہمات کی روشن تصویر سامنے آجاتی ہے شکسپیر کے قریب قریب ہر ڈرامے کا یہی حال ہے کہ اس زمانے کے کسی نہ کسی سچے اور واقعی حالات کی طرف رہبری کرتے ہیں۔ مرچنٹ آف وینس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا طبقہ لوگوں میں کتنا ذلیل اور افتادہ سمجھا جاتا تھا یہ ضرور ہے کہ یہودی اہل دولت اور فارغ البال ہوتے تھے لیکن ان کے سودی کاروبار کو ہر شخص نہایت نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور ان کے ساتھ نہایت اہانت آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔ تاریخ اور شکسپیر کے ڈراموں کا فرق اس طرح بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نیسری کی بیان کرنے میں چاہے اپنا سارا زور بیان ختم کر دے لیکن وہ اس حقیقی تصور کے پیدا کرنے میں سراسر ناکام رہے گا جو نیسری کے برای العین مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے ٹھیک یہی حال تاریخ اور شکسپیر کا ہے تاریخ بیان واقعہ ہے اور شکسپیر کے کلام میں اصل واقعہ کا لطف آتا ہے

اردو کا شباب اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب اسلامی حکومتوں کا زمانہ زوال اور پیری کا زمانہ تھا اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بہت پہلے سے اسلامی تمدن و معاشرت۔ اخلاق۔ مذہب تعلیم اور اسلامی روایات سب تیزی کے ساتھ زوال و پستی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اور بصیرت کی نگاہوں نے اسلامی اخلاق و تمدن سیاست و معاشرت کے اس انجام کو سمجھ لیا تھا جو ہنگامۂ غدر کے بعد ظاہر ہوا۔ اسی دور میں اردو اس قابل ہوئی کہ اس کا شمار بھی دنیا کی علمی زبانوں میں ہونے لگا۔ ناگزیر تھا کہ ہنگامۂ غدر کے بعد کی زبوں حالی۔ افلاس اور بیکسی کے تاثرات سے ادب اردو کا دامن خالی نہ رہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ناخدائے سخن میر تقی میر کے کلام میں جو حزن و یاس۔ حسرت و حرمان۔ بیدلی اور افسردگی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلامی تمدن کی بربادی اور اخلاقی و معاشرتی بدحالیوں کے تاثرات ہیں۔ ممکن ہے یہ خیال صحیح ہو لیکن میرے نزدیک اگر میر اس زمانے میں بھی ہوتے تو یقیناً ان کا کلام مایوسی اور قنوطیت کے عناصر سے خالی نہ ہوتا۔ اس زمانے کے حالات تفصیل کے

ساتھ [illegible] نواب [illegible] الملک کی ادبی اور اصلاحی تحریروں میں ملتے ہیں اور حالی کی مسدس تو خاص اسی غرض کے تحت لکھی ہی گئی تھی۔ مسلمانوں کے [illegible] گزشتہ [illegible] اور موجودہ پستی و جہت مفلسی و بیچارگی کا تقابل پیش کرکے انہیں بیدار کیا جائے۔ [illegible] ترقی کی راہ پر [illegible] کا [illegible] مسدس کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کی سچی محاکات ہے [illegible] انسان کی فطرت ہے کہ چیزوں کی ہو بہو تصویر اسے بہت پسند ہوتی ہے چاہے وہ چیز [illegible] مسدس کی تصویر پسند ہے اگرچہ اس میں مسرت و شادمانی کی باتیں بہت ہی کم ہیں [illegible] سے مسلمانوں کی زندگی کے [illegible] پہلو پر تیز روشنی پڑتی ہے۔

اکبر الہ آبادی [illegible] انھوں نے اسلامی معاشرت اور طرز زندگی کے تاریک گوشوں اور تقلید مغرب کے ناخوشگوار [illegible] شاعری کا موضوع قرار دیا ہے۔ لیکن اس لحاظ سے ان کا کلام بہت بلند اور وقیع ہو جاتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے [illegible] معاشرتی اور اخلاقی رجحانات کی ایک اچھی خاصی تاریخ ترتیب دی جا سکتی ہے۔ مغربی تعلیم اور مغربی [illegible] دل و دماغ پر پوری حکومت ہو گئی تھی جس کا صحیح نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال دماغی اور ذوق سلیم تقاضائے مغرب ہو گئے۔ مغربی خیالات مغربی تمدن غرض کہ مغرب کی ہر چیز نے آنکھوں کو خیرہ اور دلوں کو تیرہ کر دیا تھا۔ اس مغربی طوفان کی عالمگیری کو اکبر نے بخوبی [illegible] سے متاثر ہو کر اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ۔ ؎

اذانوں سے سوا ہے اب کن انجن کی سیٹی ہے　　　اس پرستش بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

کہاں باقی رہے ہم ہیں وہ وردِ سحرگاہی　　　وظیفہ کی جگہ یا پائنیر ہے یا آئی۔ ڈی۔ پی۔ ہے

اکبر مغربی تعلیم کے فوائد کو محض وقتی اور [illegible] ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کا یقین تھا کہ یہ مخرب اخلاق بھی ہیں۔ فرماتے ہیں ۔ ؎

سوا اس کے یورپ [illegible] پاپ کو　　　بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

اکبر کے بعد علامہ شبلی کی نظموں میں بھی سیاست اور معاشرت کی تنقید [illegible] علامہ شبلی ان ادیبوں میں سے ہیں جن کے کلام میں ادب اور فن دونوں عروج کمال کے آخری نقطے پر نظر آتے ہیں ان کی مشہور نظم

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک　　　چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

ہنگامہ بلقان کے موقع پر لکھی گئی اور ادبی خلوص، معرفت کے ماورا اسلامی سیاست کی بیکسی اور زبوں حالی کا خاکہ پیش کرتی ہے انھوں نے ایک نظم ہنگامہ کانپور کے موقع پر بھی لکھی اور اس انداز میں لکھی ہے کہ واقعے کی اصل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ان کی اکثر نظمیں واقعات اور حقائق پر مبنی ہیں۔

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ادب اور اجتماعی یا قومی زندگی کا تعلق نہایت اہم ہے۔ ادب بڑی حد تک تمدن معاشرت مذہب، حکومت، سیاست اور دوسرے قومی اداروں سے جن سے قوم و ملت کی تشکیل ہوتی ہے متاثر ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے

ادیب کے کلام میں قومی سربلندی، سیاسی قوت و اقتدار یا اس کے برخلاف وقت کی تنگ نظری، مالی اور معاشرتی پریشانیوں کا حال ملتا ہے "جبریل مشرق" یعنی مشہور قومی شاعر اقبال کا کلام قومی بدحالیوں، ملی پستیوں اور پریشانیوں نیز موجودہ اسلامی اور غیر اسلامی تحریکات کی داستان ہے۔ لیکن یہ داستان بے جان تاریخی داستان نہیں ہے بلکہ زندگی، جوش، حرارت اور تڑپ سے معمور ہے۔ اقبال کی شاعری گذشتہ اسلامی تہذیب و تمدن قومی عزت و وقار اور مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کے خاکوں سے پر ہے۔ آج تقریباً دنیا کے ہر ملک میں سرمایہ داری اور مزدوری کے درمیان جنگ ہو رہی ہے اس جنگ کا فیصلہ اقبال کی زبان سے سنئے یہ اسلوب بیان صرف الہام اقبال سے ممکن ہے۔

خدا اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو	کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے	کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی	اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے	میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

علامہ اقبال نوجوانان اسلام کی رگوں کو یوں گرماتے ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے	وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تمدن آفریں خلاق آئین جہانداری	وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں	کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سر دارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی	کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی	نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی	کہ دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن	کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

"کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سر دارا" میں اسلامی اولوالعزمی شجاعت و بسالت کی جو شان پائی جاتی ہے وہ درحقیقت دفتروں میں بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ موجودہ بے حسی اور زبوں حالی کی تصویر کھینچتے ہوئے گذشتہ عظمت و وقار کی یہ جھلک اقبال کے بیان کو کس درجہ موثر جاندار اور پرجوش بنا دیتی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ گو شاعر اور اسکی جماعت پستی اور زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان کا قدیم اعزاز و وقار چھین چکا ہے لیکن قوم میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جن کے پیش نظر اسلام کی عظمت و شان اب بھی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ قوم کی نئی پودیں پھر وہی زندگی، جوش، حرارت پیدا کر دیں جو کبھی مسلمانوں کی خصوصیات تھیں۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری میں قومی زندگی اور افراد قوم کے ذہنی و دماغی تصورات کا اچھا خاصا ذخیرہ

ماتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ دنیائے ادب اس دنیا کے ماورا اور کوئی شے نہیں ہے جس طرح دنیا کے تمام علوم و فنون کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں گہرے مطالعہ اور دقیق نظریۂ اسباب و واقعات کی چھان بین اور فکر و نظر کی ساری کاوشیں کام میں لائی گئی ہیں ٹھیک اسی طرح ادب بھی دنیا اور زندگی، زمانے کے انقلابات آسمان کے حوادث۔ کائنات کی نیرنگی۔ نباتات کی بوقلمونی جمادات کی بے حسی حیوانات کے جذبات و احساسات ہر چیز کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے اور پھر اپنے تاثرات کو ایک خاص نقطۂ نظر کے ماتحت پیش کرتا ہے بس یہی وجہ ہے کہ ادیب و شاعر کے کلام کا معتدبہ حصہ زندگی اور زندگی ہی کی بوقلمونیوں کی داستان ہوتا ہے

جس طرح ادب کی بنیاد زندگی ہے اور اس کا مواد تمام تر زندگی ہی سے ماخوذ ہے یوں ہی ادب بھی انسانی زندگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے اس کی مثال ان فرانسیسی ادبا کے کلام میں ملسکتی ہے جن کی تحریروں نے فرانس میں آگ لگادی اور جن کے انقلابی تصورات و تحریکات ہی کی بنا پر فرانس میں انقلاب ہوگیا۔ روسو کا نظریہ Doctrine of the General will بڑی حد تک انقلاب فرانس کا ذمہ دار ہے۔ روسو نے اس نظریہ میں انسانی قدر و قیمت کو پیش کیا ہے اور بتلایا ہے کہ سلطنت و حکومت جمہور کی ملکیت ہے اور یہ کہ کسی ایک فرد کو حکومت کے اختیار دیئے ہی نہیں جا سکتے۔ روسو سے پہلے جمہور فرانس کی ذہنیت غلامانہ تھی وہ اس پر قانع تھے کہ ہم غلامی ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں سلطنت و حکومت میں ہمارا کوئی حصہ ہو نہیں سکتا لیکن والٹیئر اور روسو کے ولولہ انگیز خیالات نے ان کے دلوں کو گرما دیا ان میں شجاعت و بسالت ہمت و جوانمردی کے جذبات پیدا کر دیئے چنانچہ وہی لوگ جو خود کو غلام سمجھتے تھے اٹھے اور بادشاہ اور ملکہ کو قتل کر دیا اور قدیم رسم و رواج کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا ہر قدیم چیز کو مٹا دیا اور سلطنت و قوت کے مالک بن گئے۔

روس کی تاریخ بھی ادب اور ادب کی قوتوں کی شہادت دیتی ہے ۱۹۱[illegible]ء سے قبل روس کا بھی تقریباً وہی حال تھا جو انقلاب سے پہلے فرانس کا تھا لیکن کارل مارکس۔ لینن۔ ٹالسٹائی کی آتش خیز تقریروں اور تحریروں نے ملک میں کایا پلٹ کر دی کارل مارکس اخوت و مساوات کا حامی تھا اس نے امرا و روسا کی عیش پرستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی تصنیفات اور اخباروں کے ذریعہ اشتمالیت Communism کا زبردست پروپیگنڈا کیا اگرچہ وہ اپنی تحریک کی اس عظیم الشان کامیابی کو نہ دیکھ سکا جو ۱۹۱[illegible]ء کے بعد اسے حاصل ہوئی لیکن وہ بتلا تا گیا کہ دنیا میں انسان ادب و زبان کی مدد سے کیا کچھ کر سکتا ہے۔

شعرائے عرب زبان و ادب سے تیغ و تبر کا کام لیا کرتے تھے عرب کا قدیم لٹریچر ہی عربوں میں شجاعت۔ خودداری۔ علو ہمتی سخاوت و مہمان نوازی کے شریف جذبات کو زندہ رکھتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ شعرائے عرب کے پرجوش اور شعلہ خیز قصیدوں اور نظموں کی بنا پر دو قبیلوں میں جنگ کی نوبت آگئی ہے اور رجز تو عربوں کی زندگی کا خاص جز تھا۔ رجز میں عموماً ایسی زبان اور واقعات سے کام لیا جاتا تھا کہ لڑنے والا پوری بے جگری اور بہادری سے لڑے اور جان کی قطعاً پروانہ کرے۔ ادب کی تاثیر

اور انسان کی زندگی پر اس کی حکومت کا ایک مختصر واقعہ بیان کر کے اس مضمون کو ختم کر دیا جائے گا۔

محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ تھا دربار ہر وقت سرخوش و سرمست۔ امراء و رؤسا سے پُر رہتا تھا اور ارباب نشاط کے متعدد طائفے بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے لیکن دربار میں ایک کنچنی تھی نور بائی جس پر بادشاہ سب سے زیادہ مہربان تھے۔ ایک روز نور بائی حاضر تھی مجرا ہو رہا تھا کہ خبر لگی۔ جناب سید میراں شاہ قبلہ کی سواری آ رہی ہے۔ بادشاہ سید صاحب قبلہ کے بڑے معتقد تھے اور ان کا بہت ادب کرتے تھے چنانچہ اشارہ کیا اور نور بائی پردے کی اوٹ میں چلی گئی۔ میر صاحب تشریف لائے بادشاہ نے نیازمندانہ پذیرائی کی اور شہ نشین میں انہیں بٹھلایا۔ خلاف معمول میراں صاحب دیر تک بیٹھے۔ ادھر نور بائی گھبرا رہی تھی طبیعت نہایت بے چین پائی تھی بیٹھے نہ رہا گیا سروقد اٹھی اور اوٹ سے نکل کر میراں صاحب قبلہ کی خدمت میں دست بستہ آداب بجا لائی اور بڑی خوشی کے انداز میں عرض کیا کہ حکم ہو تو کچھ گاؤں میر صاحب از بسکہ موسیقی کے دلدادہ تھے خاموش رہے نور بائی نے اجازت سمجھ کر خیام کی یہ رباعی پڑھنی شروع کی۔

شخصے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی　　　　ہر لحظہ بہ دام دگرے پابستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم　　　　تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

یہ رباعی سننا تھا کہ میراں صاحب کا برا حال ہو گیا۔ زمین پر لوٹتے تھے اور سر مارے دے پٹکتے تھے۔ لیکن دل کی شورش کم نہ ہوتی تھی محمد شاہ نے فوراً نور بائی کو ہٹا دیا۔ لیکن سید صاحب کی خلش کم نہ ہوتی تھی۔ بارے تھوڑی دیر کے بعد کچھ سکون ہوا تو گھر تشریف لے گئے۔

ادب کا مواد کہاں تک انسانی زندگی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ انسان کے تصورات و خیالات پر ادب کہاں تک کارفرما ہے۔ گذشتہ واقعات و امثال سے واضح ہو گیا ہو گا لیکن ادب اور زندگی کا تعلق یہیں ختم نہیں ہوتا۔ ادب ایک اور حیثیت سے بھی زندگی پر اثر ڈالتا رہتا ہے وہ زندگی کو خوشگوار، دلآویز اور لطیف بناتا رہتا ہے اور در اصل ادب کی سچی عظمت و جلالت اور تمام دوسرے علوم و فنون پر اس کے شرف و تفوق کا یہی راز ہے کہ وہ انسان کو اس دنیائے آب و گل اور کشمکش حیات کے پرشور ہنگاموں سے نکال کر ایک ایسے عالم میں لیجاتا ہے جہاں آسمان سے زمزموں کی بارش ہوتی ہے جہاں حوریں کیف و محبت کے نغمے گاتی ہیں۔ ستارے ناچتے ہیں ماہتاب اپنا ساز بجاتا ہے۔ آفتاب ساغر بکف ہوتا ہے، فضا میں چاندی سونے کے ذرات رقصاں رہتے ہیں، فرش پر ہند و جواہر کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ گلاب اور یاسمن انسانوں سے ہمکلام ہوتے ہیں اور ان رموز و اسرار کو کھولدیتے ہیں جنہیں فلاسفہ و مورخین۔ سائنسداں اپنی تمام کاوشوں اور دماغ سوزیوں کے بعد بھی نہ معلوم کر سکے تھے۔ یہ ایک نور کی دنیا ہوتی ہے۔ جہاں ظلمت کا گذر نہیں ہوتا۔ جہاں کا ضابطہ الفت و محبت، خلوص و ہمدردی۔ ایثار اور دلسوزی کا ضابطہ ہوتا ہے نفرت و عداوت۔ افلاس و غلامی۔ ظلم و فریب کے الفاظ سے لوگوں کے کان ناآشنا ہوتے ہیں اس دنیا میں انسان ایک سرمد جاوداں ایک لذت پیم ایک کیف مسلسل سے ہم آغوش رہتا ہے اس کی روح ہر آن و ہر لمحے ان تجلیات سے معمور

رہتی ہے جس کی تلاش میں درویشوں اور جوگیوں نے دنیا تج دی۔ صوفیوں نے مراقبے اور چلہ کشی کی اور شیوخ وزہاد ایڑیاں رگڑتے رہ گئے۔

دنیا تنازع للبقا اور جدوجہد حیات کا معرکہ کارزار ہے یہاں ہر شخص اپنے مطلب کی چال چلتا ہے۔ سرمایہ دار مزدوروں کو ہڑپ کرجانا چاہتا ہے مہاجن زمینداروں کو ہضم کرجاتا ہے۔ آقا چاہتا ہے کہ غلام تا زندگی غلامی کی لعنت میں گرفتار رہے۔ امراء اور رؤسا عیش ونشاط کے مالک عیش ونشاط کے بندے۔ نادار کاشتکاروں کے قطرات خون سے اپنی بزم نشاط کی رنگینی وشوخی بڑھاتے ہیں۔

ایک حساس دل ان دلدوز مناظر کی تاب نہیں لا سکتا۔ زندگی کی تلخ کامیوں اور حیات کی الم ناکیوں سے وہ ایک دم کو نجات چاہتا ہے۔ شعر وادب ایسی حالت میں اپنی دنیا سے رنگین پیش کر دیتا ہے اور تھوڑے عرصے کے لئے انسان زندگی کی الجھنوں کو بھول جاتا ہے۔ کوئی کیسا ہی غمزدہ اور مصیبت کا مارا کیوں نہ ہو لیکن جب ان اشعار کو پڑھتا ہے تو ایک عرصہ کے لئے ضرور اپنا غم بھول جاتا ہے۔

خبر اس کی نہیں ان خامکاران محبت کو — اسی کو دکھ بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں
یہ کیا طاقت کہ ہم پر ڈالدے بیشرمی نظارگی — مگر اس جان محبوبی کو مستغنی سمجھتے ہیں

الٰہی ترک محبت بھی کیا محبت ہے — بھلاتے ہیں انہیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا
جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ رے معراج شوق — دیکھتا کیا ہوں کہ وہ جان بہار آ ہی گیا
ہاں سزا دے اے خدائے عشق اے توفیق غم — پھر زبان بے ادب پر ذکر یار آ ہی گیا
ہائے کافر دل کی یہ کافر جنوں انگیزیاں — تم کو پیار آئے نہ آئے مجھکو پیار آ ہی گیا
درد نے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے — دفعتہً پردہ اٹھا اور پردہ دار آ ہی گیا

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

دنیا کا عجیب ترین شہر

نیویارک کے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات

فاران کے دلچسپ معلومات کے سلسلہ میں امریکہ کی "عجوبات" کا کبھی کبھی تذکرہ ہوتا رہا ہے جس سے ناظرین اس ملک کی عجائب نوازی سے ایک حد تک واقف ہو گئے۔ امریکہ کا ایک دوسرا شہر نیویارک ہے جو اپنی عجیب و غریب خصوصیات کے اعتبار سے زمانۂ قدیم کے شہر بابل کی طرح، عہد جدید کا ایک عجوبۂ روزگار ہے۔ ابھی حال ہی میں فرانس کے ایک سیاح نے اپنی سیاحت کے بعد وہاں کے عجیب و غریب حالات اخبارات میں شائع کئے ہیں جس کا خلاصہ [illegible] ناظرین فاران کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بیان مذکور لکھتا ہے:

کسی زمانہ میں مارکو پولو نے چین کی سیاحت کی تھی مشہور ہے کہ جب وہ اپنے ملک کو واپس آیا اور چین کے مشاہدات لوگوں کے سامنے بیان کئے تو ہر طرف سے انکار کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی طرح باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ دنیا میں کوئی ایسا پتھر بھی پایا جاتا ہے جس سے آگ روشن کی جاتی ہے اور کوئی ایسا ملک بھی ہو سکتا ہے جہاں [illegible] کاغذ کا رواج ہو۔ اس زمانہ میں بھی اگر کوئی سیاح نیویارک کے سفر سے واپس آکر لوگوں کے سامنے اپنے مشاہدات بیان کرے تو غالباً یہی ہے کہ مارکو پولو کی طرح وہ بھی ان کے تمسخر کا نشانہ بنے گا اور اگر خود مارکو پولو زندہ ہو جاتے اور امریکہ کی سیاحت کرتے تو یقیناً دنیا کے اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز شہر نیویارک کے مشاہدات بیان کرنے کے لئے اس کے الفاظ کا خزانہ اس کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ نیویارک میں نو ایجاد مشینیں جن حیرت انگیز طریقوں سے انسانی کام انجام دے رہی ہیں انہیں دیکھ کر انسان حیران اور ششدر ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض آلات ایسے ایجاد ہو چکے ہیں جو [illegible] کی طرح ہر چیز کو سنتے اور نوٹ کر لیتے ہیں بعض آلے اس قسم کے ہیں جو زندہ انسانوں کی طرح خبروں کو [illegible] کے مطابق حروف کی کمپوزنگ کرتے اور انہیں مشینوں کے حوالہ کرتے ہیں۔ بعض مشینیں ایسی پائی جاتی ہیں جو نہایت صحت کے ساتھ حساب اور جمع و تفریق کرتی ہیں اور بجلی کے ذریعہ گھر کے تمام کاروبار نہایت سرعت کے ساتھ انجام دیتی ہیں اور اس قسم کے بے شمار حیرت انگیز آلات اور مشینیں وہاں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ بیچارہ مارکو پولو کن ناموں سے انہیں یاد کر سکے گا؟ ہمیں ان چیزوں کو سن کر زیادہ تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ہم بار بار سن چکے ہیں کہ دنیا میں اس قسم کی چیزیں موجود ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اب تک جدید اختراعات کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔

نیو یارک حقیقت میں انسانی قدرت و استعداد اور عصر جدید کی ترقیوں کا ایک کامل نمونہ ہے۔

نیو یارک کی سر بفلک عمارتیں

اس کی وہ سر بفلک عمارتیں جو رات کی تاریکیوں میں فضا کی وسیع دامن کا ایک وسیع نورانی کُرہ بن کر چمکتی اور ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں، اگرچہ ان کی حیثیت عصر قدیم کے خیالی افسانوں کی سی نظر آتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور ہم بچشم خود ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

نیو یارک اب بلند ترین عمارتوں کے ذریعہ ہمارے سامنے مختلف مناظر پیش کرتا ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ہر منظر نہایت جاذب نظر اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔ رات کے کسی حصہ میں کسی بلند جگہ پر چڑھ کر اس شہر کا معائنہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ اس کی عمارتیں کس طرح حسن و جمال اور بلندی میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود نیو یارک عمارتوں کی موجودہ بلندی اور حسن و جمال پر قانع نہیں ہے بلکہ روز بروز ان میں اضافہ کا کوشاں ہے چنانچہ وہاں کے انجینئر آسمان سے بھی زیادہ اونچی عمارتوں کا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں، ممکن ہے ان کی یہ کوشش جنون سے تعبیر کی جائیں، ہاں بیشک یہ ایک قسم کا جنون ہی ہے لیکن حقیقت میں اس کے چند در چند اسباب بھی موجود ہیں۔ زمین کی گرانی، کرایہ کی زیادتی اور امریکہ کی مخصوص ذہنیت کو عمارتوں کی اس بلندی کا اہم سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آج سے ابھی پچاس سال پہلے جب نیو یارک میں پہلے پہل ایک پیارہ منزلہ عمارت بنائی گئی تو آس پاس کے مکانات کے رہنے والے ہر وقت خوفزدہ رہا کرتے تھے کہ کہیں یہ عمارت منہدم ہو کر ان کے اوپر نہ آ جائے۔ بہتوں نے اسی خوف سے اپنے مکانات میں سکونت ترک کر دی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب یہ عمارت متعدد طوفانی ہواؤں وغیرہ کے مقابلہ میں کامیاب ثابت ہوئی تو ان کا خوف زائل ہوا۔ اب پچاس ہی سال کے اندر وہاں اتنا زبردست انقلاب پیدا ہو گیا ہے کہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ منزلوں کی عمارتیں ہر طرف کھڑی ہوئی ہیں اور ۸۰ منزلہ عمارتیں بنانے کے نقشے بنائے جا رہے ہیں۔

آلہ جر ثقیل

ان عمارتوں کے سلسلہ میں بہت زیادہ جاذب نظر چیز جر ثقیل کے وہ آلے ہیں جو انسان کو سطح زمین سے نہایت سرعت کے ساتھ مکان کی انتہائی بلندی تک پہنچا دیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ آلے ہر روز اتنی مسافت طے کرتے ہیں کہ اگر زمین کی مسافت طے کی جاتی تو نیو یارک سے شکاگو تک کی مسافت طے ہو جاتی۔

رہنے والوں کی تعداد

ان اونچی اونچی عمارتوں میں جس قدر لوگ رہتے ہیں ان کی تعداد سن کر انسان متحیر ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں ۱۵ ہزار سے ۲۰ ہزار تک آدمی بیک وقت سکونت کرتے ہیں، گویا ہر عمارت ایک مستقل شہر ہے۔ ان عمارتوں کے اندر ہی ضروریات زندگی کی تمام چیزیں ہر وقت آسانی مل سکتی ہیں۔ اور ہر شخص کی ہر احتیاج کم از کم مدت میں رفع کر دینے کے وسائل بھی ہمہ وقت مہیا

رہتے ہیں۔

اہالیان شہر کی مصروفیت

نیویارک کی عظمت صرف ان سر بفلک اور آسمان خراش عمارتوں ہی کی وجہ سے نہیں ہے سب سے زیادہ جو چیز اس کی عظمت و اہمیت کو نمایاں کرتی ہے وہ لوگوں کی دوڑ دھوپ، جد و جہد اور مصروفیت ہے جو شہر کے ہر حصہ میں نظر آتی ہے۔ اس کی کسی چیز کو ایک حالت میں قرار نہیں۔ وہاں ہر شے میں ہمیشہ رد و بدل اور انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہاں کی کوئی چیز دو دن ایک حالت میں نہیں دیکھی جا سکتی۔ آج تم ایک راستہ سے گذر رہے ہو، سامنے ایک لق و دق اور خوشنما عمارت نظر آرہی ہے۔ لیکن کل جب تمہارا گذر ہوگا تو دیکھو گے کہ وہ عمارت ویران پڑی ہے اور پھر جب ایک ہفتہ کے بعد وہاں سے گذرو گے تو اس کی جگہ کئی منزلہ آہنی اور فولادی عمارت کھڑی نظر آئیگی۔

شہر کی آبادی

یہ حرکت و سرعت اور عمارتوں کی یہ بلندی، حقیقت میں کثرت آبادی کا نتیجہ ہے۔ نیویارک کے صرف ایک محلہ میں پورے شہر پیرس کی آبادی کے برابر انسان رہتے ہیں۔ نیویارک اور اس کے اطراف میں تقریباً ۹ لاکھ آدمی آباد ہیں۔ یہ آبادی امریکہ کی آبادی کا بارھواں، فرانس کی آبادی کا پانچواں۔ انگلستان کی آبادی کا چوتھا۔ اور جرمنی کی آبادی کا چھٹا حصہ ہے۔ اسی کثرت آبادی کی بنا پر ہر وقت وہاں حرکت جاری رہتی ہے۔ ہر طرف چہل پہل رہتی ہے اور شب و روز کے کسی حصہ میں آمد و رفت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔

کاروبار کی وسعت

امریکہ کے ہر گوشہ سے بیکاروں کی جماعت نیویارک کا قصد کرتی ہے اور وہاں پہنچکر اپنی معاش کا کچھ نہ کچھ وسیلہ مزدوری پیدا کر لیتی ہے۔ یہ شہر کیا ہے گویا ایک بہت بڑا عمیق غار ہے جو لوگوں کو اپنے اندر ہضم کر لیتا ہے۔ نیویارک کے رہنے والوں کی بیشتر تعداد دوسرے شہروں کے باشندوں کی ہے جو معاش وغیرہ کے سلسلہ میں وہاں آگئے ہیں جن کے باہم اختلاط سے وہاں انسانوں کے نئے نئے طبقے پیدا ہو گئے ہیں جن کی نظیر کسی دوسرے شہر میں نہیں ملتی۔ تمام ولایات متحدہ امریکہ میں جو کپڑا استعمال ہوتا ہے اس کا پانچواں حصہ، اسی شہر میں بنا جاتا ہے۔ درزیوں کا بھی گویا ایک مستقل شہر آباد ہے۔

مطبوعات

مطبوعات کا کام حد بیان سے باہر ہے۔ طباعت کے سلسلہ میں ہر کام بجلی کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ مشینیں، اخبارات کو چھاپ کر، تراش کر، اور ملفوف کر کرا کر باہر گرا دیتی ہیں۔ اگرچہ مطابع عموماً شہر سے باہر ہیں لیکن اس کے باوجود شہر میں مطبعوں کی تعداد دو ہزار سے زائد ہی ہے جن میں ۷۵ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ امریکہ سے ہر سال تقریباً ۱۱ کروڑ کتابیں شائع ہوتی ہیں جن میں ۷۰ فیصدی نیویارک کا حصہ ہے۔ ان کتابوں کی طبع و نشر کے کاموں میں صرف تین فیصدی انسان کی قوت کو دخل ہے بقیہ

م مشینوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

ٹیلیفون و ٹیلیگراف اور سڑکیں

نیویارک میں بڑی اور مشہور سڑکیں ۱۲۶ ہیں جن کے مختلف حصوں میں ۲۷ ڈاکخانے قایم ہیں۔ شہر کی اندرونی ڈاک زمین دوز
ہوں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچائی جاتی ہے۔

ٹیلیفون کا مرکزی دفتر بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ہر سکنڈ کے اندر نمبروں کے ملانے کی تقریباً سو فرمائشیں ہوتی ہیں۔ ڈاکخانہ
ٹیلیگراف کے دفتروں کو چاہے ایک الگ شہر سمجھ لو۔

نیویارک کی بڑی بڑی دوکانیں بھی قابل دید ہیں۔ ایک بڑی دوکان ڈیپارٹمنٹ اسٹورس کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں ہر روز
۰ ہزار خریدار جاتے ہیں۔ جو چیزیں ان دوکانوں سے خریدی جاتی ہیں، وہ دوکان کے مالکوں کی طرف سے ان کے خاص وسائل
و نقل کے ذریعہ خریداروں کے گھروں تک پہنچادی جاتی ہیں۔

وال اسٹریٹ

اگر کوئی نیویارک جائے اور وہاں کی وال اسٹریٹ نہ دیکھے تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ وال اسٹریٹ نیویارک
مالی بازار ہے جہاں صرافوں کی دوکانیں اور بڑے بڑے بنک ہیں۔ جنگ کے بعد مدت تک وال اسٹریٹ کا تمام دنیا پر مالی اقتدار
مایا ہوا تھا۔ اور اب بھی دنیا کے بڑے بڑے قرضوں کے معاملات یہیں طے پاتے ہیں۔ دنیا کے مالی اتار چڑھاؤ میں اس محلہ کو
بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ امریکہ کا مشہور "فیڈرل ریزرو بنک" اسی محلہ میں ہے جس میں دنیا کے مجموعی سونے کا بارھواں
سہ محفوظ ہے۔ یہ خزانہ زمین کی تہ میں نہایت نیچے رکھا گیا ہے اور ہر طرف سے فولاد کی موٹی دیواریں کھڑی کردی گئی ہیں۔
سے کھولنے اور بند کرنے کا راز صرف چند آدمیوں کو معلوم ہے۔ اس خزانہ میں سونے چاندی کی جو تعداد محفوظ ہے شاید کسی ایک
لک میں اس قدر سونا چاندی موجود نہ ہو۔

تعمیرات کے مصارف

آخر میں نیویارک کی بلند عمارتوں کی تعمیر اور اسکے مصارف کی بابت بھی چند فقرے لکھنے ضروری ہیں۔ کریسلر جو وہاں کی بلند ترین
مارتوں میں ہے اسکی تعمیر پر ۵ ملیون ڈالر سے زیادہ خرچ ہوا ہے۔ اس عمارت میں ۱۱ ہزار آدمی رہتے ہیں۔ لیکن اسکے ملازمین کی کل تعداد
صرف ۱۵۰ ہے کیونکہ ان کے اکثر کام مشینوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

منہاٹن بنک کے لئے ایک ۶۵ منزلہ عمارت بنوائی جارہی ہے جس کے اخراجات کا تخمینہ ۲۰ ملیون ڈالر کیا گیا ہے۔ ان بڑی بڑی
عمارتوں کی تعمیر بڑی بڑی کمپنیوں کی شرکت و اعانت سے وجود میں آتی ہے۔ اہالی شہر بھی ان میں حصے لے سکتے ہیں۔ باہمی شرکت
و اعانت کو وہاں عموماً بڑے بڑے کام کئے جاتے ہیں۔ امریکہ کی فولاد کمپنی میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد حصہ دار شریک ہیں۔
نیویارک کے عجائب کا یہ ایک نہایت سرسری خاکہ ہے۔ اگر ہر چیز کی تفصیل بیان کیجائے تو اس کے لئے کئی مقالات لکھنے ہونگے۔

نقد و تبصرہ

"معیار العلماء"

مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی ملک میں زیادہ تر ایک مورخ کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن جن لوگوں کو ان کی تصنیفات کے مطالعہ کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ مورخ سے زیادہ مبلغ اسلام ہیں، چنانچہ ان کی یہ حیثیت انکی ان تصنیفات میں بھی قدم قدم پر نمایاں ہے جو خالص تاریخی مباحث پر لکھی گئی ہیں۔ مولانا موصوف اپنے اندر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا سچا جذبہ رکھتے ہیں اس لئے جہاں تک ان سے ہوسکتا ہے۔ اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنی پوری کوشش صرف فرماتے رہتے ہیں۔ وہ اسلام کے ان خادموں میں ہیں جو صرف اپنے قلم سے مسلمانوں کی خدمت اور اصلاح کرنی چاہتے ہیں بلکہ وہ اپنے قلمی جد و جہد کے ساتھ ساتھ اس کام میں عملی حصہ بھی لیتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے علمی تجربہ کی بنا پر جانتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں کیا چیزیں حائل ہیں، اور ان کی اصلاح کے حقیقی ذرائع کیا ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے جو کتابیں نکلتی ہیں وہ عموماً وقت کی اہم ضروریات کے عین مطابق ہوتی ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ کتابیں لکھتے ہی اس وقت ہیں جب ضروریات ان کی داعی ہوں۔

آج سے ابھی چند ماہ پیشتر جب ڈاکٹر امبیدکار کے تبدیل مذہب کے اعلان سے تمام مذاہب کے پیروں میں تبلیغ کی ایک عام لہر پیدا ہوگئی۔ اور ہر دین و مذہب کے مبلغین، اچھوتوں کو اپنے دام فریب میں مبتلا کرنے کے لئے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تو اس موقع پر یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ان کے سامنے اسلامی تعلیمات بھی پیش کی جائیں اور ان کا دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے مقابلہ کرکے ثابت کردیا جائے کہ صرف مذہب اسلام اچھوتوں کا حقیقی غمخوار ہے اور یہی انکے درد کا درماں ہوسکتا ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ملک کے بعض دوسرے علماء کی طرح مولانا نے بھی بر وقت ایک مختصر رسالہ "اچھوت اقوام اور اسلام" کے عنوان سے لکھا جو پیش نظر مقصد کے لئے بعض اعتبار سے اپنی نوع کی بہت سی ضخیم کتابوں سے زیادہ مفید تھا آج ہم ناظرین سے مولانا نجیب آبادی کی جس تازہ تصنیف کا تعارف کرانا چاہتے ہیں وہ بھی ان کی سابق تصنیف کی طرح وقت کی ایک اہم ضرورت کے لئے لکھی گئی ہے اور اسے بطریق احسن پورا کررہی ہے۔

ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس وقت اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی ترقی و عروج میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہے وہ

علماء سوء کا وجود ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جو دین و مذہب کے نام پر مسلمانوں میں بدعات و خرافات کو رواج دیتی ہے۔ انھیں اسلام سے برگشتہ کر کے غلط راستوں پر ڈالتی ہے۔ اپنے نفسانی اغراض و اہواء کے لئے قرآن و احادیث کی غلط تاویلیں کرتی ہے عوام و جہلاء کو خوش کرنے کے لئے ضعیف و موضوع روایات کو فروغ دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کر کے اسلامی شیرازہ بندی کو پارہ پارہ کرتی ہے۔ ملک میں فتنہ و فساد کی آگ ہر وقت مشتعل رکھتی ہے۔ اپنی بداعمالیوں سے لوگوں کو اسلام اور علماء حقانیین سے برگشتہ کرتی ہے۔ ہر مفید کام کی مخالفت کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتی ہے۔ حقیقت میں یہ جماعت قوم و مذہب کے لئے ایک مستقل فتنہ ہے۔ جب تک اس کا وجود قایم ہے ہماری کوئی اصلاحی تحریک برگ و بار پیدا نہیں کر سکتی۔ اس جماعت کے ہوتے ہوئے نہ ہماری زندگی مذہب سے آشنا ہو سکتی ہے اور نہ ہماری اعتقادی گمراہی اور معاشرتی فساد کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے مصلحین کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم فریضہ یہ ہے کہ کم از کم لوگوں کو اس خطرناک اور مفسد گروہ کی حقیقت سے آگاہ کریں اور ان کے تباہ کن جراثیم سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔

علماء سوء کے وجود کو ہم نہایت دیانتداری کے ساتھ مذہب و قوم کے لئے ایک زبردست فتنہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں مسلمان اس وقت جس بدبختی اور انحطاط و زوال کا شکار ہو رہے ہیں اس کا باعث زیادہ تر ہمارے یہی جہلاء اور بدنیت اشخاص ہیں۔ جنھوں نے دنیا کو فریب میں ڈالنے کے لئے علم و مذہب کا ظاہری لبادہ اپنے اوپر ڈال لیا ہے۔ لیکن ہم ان لوگوں کی چلبلتی کو بھی نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو صرف اپنے نفس امارہ کو خوش کرنے کے لئے علماء پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اپنی ذلیل خواہشات کے لئے انھیں بدنام کرتے ہیں۔ ان کے پردے میں مذہب کو مٹا دینے کی دل میں تمنا رکھتے ہیں۔ ان کی گرفت کو ڈھیل کر کے مذہبی قید و بند سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں اور انھیں مٹا کر الحاد و دہریت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر علماء سوء کا وجود خطرناک ہے تو ان لوگوں کا وجود کچھ کم خطرناک نہیں جو ان پر اس لئے لعن طعن کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ساتھ حقیقی علماء کا وقار اور مذہب کی عظمت و وقعت بھی لوگوں کے دلوں سے رخصت ہو جائے۔ اس وقت ہر طرف سے "مولویوں" پر یورش ہے انھیں گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے انھیں خطرناک گروہ ثابت کیا جا رہا ہے، ہمیں یہ سب تسلیم ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ گروہ خطرناک ہے اور اس سزا سے زیادہ کا مستحق ہے جو ان کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ لیکن اس تحریک میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے والوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی نظر آ رہی ہے جو اپنے سامنے نہایت ذلیل اغراض رکھتے ہیں بہت سے لوگ علماء کی مخالفت محض اس لئے کر رہے ہیں کہ یہ "روشن خیالی" کی ایک علامت ہے، بہت سے ان پر زبان طعن اس لئے دراز کر رہے ہیں کہ ان کی وجہ سے انھیں بدکاریوں کی آزادی حاصل نہیں اور بہتیرے انھیں اس لئے برا بھلا کہہ رہے ہیں کہ وہ ان کے خود ساختہ مذہب اور احمقانہ اجتہادات کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ علماء سوء کا گروہ بلاشبہ خطرناک ہے، لیکن ان کو مٹانے کے لئے جو جماعت آگے بڑھ رہی ہے ان میں بہت سے ایسے لوگ شریک ہیں جو بجائے خود ایک فتنہ عظیم ہیں اور وہ اپنے نہایت مذموم اغراض کے

فن طیران کا مستقبل

(از جناب ناصر الدین صاحب اعظمی)

جس دن پہلا ہوائی جہاز سطح زمین سے فضا میں بلند ہوا اسی دن سے لوگوں کی توجہ، فضا پر حکمرانی کی طرف مائل ہو گئی اور عقل بشری ایسے ہوائی جہاز بنانے کے منصوبے باندھنے لگی جو سمندروں کے بڑے بڑے جہازوں کی طرح ہزاروں آدمی اور ہزاروں ٹن سامان کو اٹھا سکیں۔ شروع شروع میں یہ منصوبے، حکایات وقصص کے ذریعہ منظر عام پر آئے لیکن اس وقت کوئی نہیں کر سکتا تھا کہ انسان کی یہ ذہنی اپج کبھی حقیقت بن کر سامنے آئے گی۔ بہت زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ فن طیران نے نہایت تیزی کے ساتھ اس طرح ترقی کی کہ انسان کا وہ پرانا خواب، پورا ہوتا نظر آنے لگا۔ اس سلسلہ میں انسان کو بہت زیادہ کوششیں کرنی پڑیں جن کا بہترین ثمرہ جرمنی کے مشہور بڑے جہاز "ڈو۔۔۔۱۰" کو قرار دیا جا سکتا ہے اس جہاز کے ایجاد کے بعد بھی مختلف خصوصیات واوصاف کے ہوائی جہاز آج تک ایجاد ہوتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جرمنی میں ماہرین جس عظیم الشان ہوائی جہاز کا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں اس کے سامنے وہ تمام ہوائی جہاز جو اب تک ظہور میں آئے ہیں ہیچ ہو جائینگے۔

فضائی کشتی

جرمنی میں اس وقت جو جہاز بنایا جا رہا ہے وہ اپنی عظمت وشان کے اعتبار سے بے مثل ہو گا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۵۰۰ آدمی بیک وقت اس میں سوار ہو سکیں گے۔ ونیز سواریوں کی اس کثیر تعداد کے ساتھ اس پر کافی مقدار میں سامان وغیرہ بھی رکھا جا سکیگا۔

جہاز کی وسعت

اس جہاز میں، سیر وتفریح کے لئے میدان ہونگے۔ رقص وسرود کے ہال ہونگے، مسافروں کے رہنے کے لئے متعدد کمرے ہونگے۔ سگریٹ نوشی وغیرہ کے لئے الگ الگ حجرے ہونگے، معمولی طرح کے کافی تعداد میں ہوائی جہاز ہونگے تاکہ خطرہ کے وقت مسافر انہیں استعمال کر سکیں۔ اس میں کچھ جگہ ان موٹروں کو رکھنے کے لئے بھی مخصوص ہوگی جنہیں مسافر اپنے ساتھ لیجانا چاہینگے۔

جہاز کی شکل وہئیت

اس عظیم الشان ہوائی جہاز کی شکل بالکل انہی معمولی ہوائی جہازوں کی طرح ہوگی۔ البتہ اس کے زیریں حصہ میں کشتیاں لگی ہوئی ہونگی جو کہ شکل وہئیت میں ان ڈونگیوں کی طرح ہونگی جو بڑے بڑے بحری جہازوں میں پہیہ کے طور پر لگائی جاتی ہیں لیکن یہ اتنی بڑی ہونگی کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک چھوٹا سا جہاز معلوم ہوگا انھیں ڈونگیوں پر جہاز کا سلسلہ موٹے مجوف ستونوں کے ذریعہ قائم ہوگا۔

جہاز کے طبقے

ڈونگیوں کے دو حصے ہونگے نیچے کے حصہ میں موٹروں کے رکھنے کے لئے جگہ ہوگی اور اسی حصہ میں پانی اور تیل وغیرہ کا خزانہ ہوگا۔ بالائی حصہ میں لکڑی وغیرہ کا سامان اور چھوٹے ہوائی جہاز وغیرہ رکھے جائینگے اور اسی حصہ میں سکرٹریوں وغیرہ کے دفتر ہونگے۔۔ ۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن مجوف ستونوں کے ذریعہ جہاز کا ان ڈونگیوں سے اتصال ہوگا وہ تقریباً سات سات میٹر اونچے ہونگے جن کے اندر ڈاک وغیرہ کے خزانے ہونگے اور انہیں کے اندر جہاز کے افسروں اور جہاز چلانے والوں کے رہنے کے لئے کمرے ہونگے۔ انہیں سے ہوکر جہاز کے بالائی حصہ تک سیڑھیاں جائینگی۔

غرض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس جہاز کے طول وعرض کا تصور کرے تو وہ حیران ہوکر رہ جائیگا کیونکہ اس کا طول کئی سو میٹر سے زیادہ ہے۔ جہاز کے بالائی حصہ میں ۱۲ پنکھے لگے ہوئے ہیں جن کا طول اس وقت کے معمولی جہازوں کے برابر ہے۔ جہاز کے اندر بھی دو طبقے ہیں۔ کناروں پر کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن سے جھانک کر مسافر فضا کی ساری چیزیں دیکھ سکتے ہیں اوپر کے طبقے میں کھانے پینے، رقص وسرود وغیرہ کے بڑے بڑے کمرے ہیں۔

یہ ہوائی جہاز بھی بندرگاہ پر بحری جہازوں کی طرح لنگر انداز ہوا کرے گا۔ اور مسافر نیچے کی کشتی پر چڑھ کر سکرٹری کے دفتر سے ہوکر بالائی منزل پر پہونچ جایا کرینگے۔ وہاں ان کو وہ تمام چیزیں ملیں گی جو بڑے بڑے بحری جہازوں میں ہوتی ہیں۔ مختلف اغراض کے لئے بڑے بڑے کمرے ہوں گے چلنے پھرنے اور ٹہلنے کے لئے میدان ہونگے اور وہ سب چیزیں ہوں گی جن کا انسان اس وقت ایک بڑے بحری جہاز میں تصور کر سکتا ہے۔ یہانتک کہ وہ ان چیزوں کو دیکھ کر یہ خیال نہیں کرسکتا کہ وہ کسی ہوائی جہاز پر سوار ہے اس جہاز کا جو معمولی نقشہ یہاں پیش کیا گیا ہے اسے سن کر بہت سے لوگ ممکن ہے اسے خواب و خیال یا شیخ چلی کے منصوبوں سے زیادہ وقعت نہ دیں۔ لیکن زمانہ جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرتا جاتا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس قسم کے جہاز کا ایجاد ہونا مستبعد نہیں خیال کیا جاسکتا۔ آج سے پچاس سال پہلے کیا کوئی شخص یہ تصور کرسکتا تھا کہ جرمنی کے عظیم الشان طیارہ د، د — ۱۰، کی قسم کا کوئی طیارہ ایجاد ہو سکتا ہے۔ یہ زمانہ ترقی کا زمانہ ہے۔ بہت سی وہ چیزیں جو ہمیں محال نظر آتی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہو جاتی ہیں۔ اگر انسانی ترقی کا یہی عالم رہا تو آیندہ کچھ دنوں میں ایسے ایسے عجائب و مدہشات کا انکشاف وظہور ہوگا کہ ان کے سامنے الف لیلہ کے خیالی قصے بھی ہیچ نظر آئیں گے۔

دلچسپ معلومات

(از جناب مولوی قمرالزماں صاحب صلاحی)

شہنشاہ برطانیہ کا تاج . . . . . اپنی صنعت و نزاکت اور اپنی قیمت کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر سمجھا جاتا ہے - وہ تین ہزار سے زیادہ ایسے جواہرات سے مرصع ہے کہ کسی ایک فرد کا ان کی قیمت ادا کرنا دشوار ہے ان جواہرات کی تفصیل یہ ہے

بڑے بڑے یاقوت / قاچوردی یاقوت	سولہ عدد (۴ عدد)	نیلگوں یاقوت	ایک عدد
بڑے زمرد	گیارہ عدد	الماس برلن	تیرہ سو تریسٹھ عدد
گلابی الماس	بارہ سو تہتر عدد	بڑے الماس	ایک سو پینتالیس عدد
لقطہ کی شکل کے بڑے موتی	چار عدد	نادرالمثال موتی	دو سو تہتر

ان تمام جواہرات میں سب سے زیادہ روشن اور قیمتی یاقوت ہے جو وسط تاج میں لٹکا ہوا ہے۔

سورج کی گرمی سے بچے نکل آتے ہیں

اب تک مرغیوں اور دوسری چڑیوں کے بچے پیدا ہونے کے متعلق صرف دو طریقے معلوم تھے، ایک طبعی طریقہ یعنی یہ کہ مادہ انڈوں کو سیتی ہے اور ایک متعین مدت کے بعد بچے نکل آتے ہیں، دوسرا مصنوعی طریقہ اور وہ یہ کہ خاص ترکیبوں سے مشینوں کے ذریعہ خاص درجہ کی حرارت ایک متعین مدت تک پہنچائی جاتی ہے اور بچے نکل آتے ہیں۔ لیکن حال میں انڈے سے بچہ پیدا ہونے کے متعلق ایک نئی اور انوکھی اطلاع موصول ہوئی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض وقتوں میں سورج کی حرارت بھی مرغیوں اور مشینوں کی قائم مقامی کرتی ہے۔

امریکہ کے ایک کھیت میں ایک بٹیر نے سات انڈے دئے اور ان سے بے پروا ہو کر کہیں چلی گئی۔ انڈے چند روز دھوپ میں پڑے رہے بالآخر ایک دن بچے نکل آئے اور اپنا چارہ تلاش کرنے لگے۔

منجمین جھوٹے ہیں

یورپ میں زمانہ قدیم میں اکثر و بیشتر نظریات کی بنا ظن و قیاس پر ہوتی تھی۔ علم و یقین کو ان سے قطعاً واسطہ نہ تھا، اس وجہ سے اکثر دھوکہ ہو جاتا تھا اور لوگ مالی و جسمانی نقصانات میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ اسی قسم کا ایک تاریخی واقعہ یہ ہے ۱۵۲۳ء میں یورپ کے منجموں اور ماہرین فلکیات نے اعلان کیا کہ یکم فروری ۱۵۲۴ء میں دریائے ٹمس سے طوفان اٹھے گا۔ اور لندن غرق ہو جائے گا۔ اس خبر سے لندن اور اسکے اطراف میں ایک سخت اضطراب پیدا ہو گیا اور اس ہلاکت آفریں طوفان سے

بچنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں، لاکھوں آدمی اہل و عیال کے ساتھ ہجرت کر گئے۔ اور لندن سے دور خیموں اور جھونپڑوں میں زندگی بسر کرنے لگے۔ بالآخر یوم موعود آیا بہت سے لوگ دریا کے کنارے جمع ہوئے اور خوف و دہشت کے ساتھ شام تک طوفان کا انتظار کرتے رہے لیکن دریا میں کوئی غیر معمولی حرکت پیدا نہیں ہوئی، لوگوں کو سخت حیرت ہوئی جس کو نجومیوں نے اس اعلان سے دور کیا کہ "ایک حسابی غلطی ہو گئی۔ طوفان اس تاریخ سے ٹھیک ایک صدی بعد آئیگا۔"

دلچسپ تماشہ

ایک مرتبہ بمبئی کی کسی سینما کمپنی کے منیجر کو روپیہ کمانے کی سوجھی، اس نے اشتہار شائع کیا کہ فلاں روز ایک نہایت دلچسپ حیرت انگیز تماشا ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جسے دیکھ کر امید ہے سب لوگ خوش ہوں گے اور اگر بالفرض کوئی شخص خوش نہ ہوا تو اس کے ٹکٹ کی قیمت واپس کر دی جائے گی، اس اعلان کے بعد لوگ پروانہ وار ٹوٹ پڑے۔ تھوڑی دیر تک کوئی کھیل دکھایا گیا اور پہلا سین ختم ہو گیا، ناظرین کو سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن اس حیرت انگیز تماشہ کا خوش کن انتظار باقی تھا۔ تھوڑی دیر بعد پردہ اٹھا اور ایک بہت بڑی تصویر پھولوں اور کلیوں سے مرصع سامنے آئی۔ یہ ہر ہٹلر کا شبیہ تھا، اس کے بعد قومی باجے اور گانے ہوئے اور کھیل ختم ہو گیا۔

کمپنی کا منیجر مسکراتا ہوا آیا، اور مجمع سے خطاب کر کے بولا "اگر آپ میں سے کسی کو یہ کھیل اور تصویریں پسند نہ آئی ہوں تو فرمائیں ان کے ٹکٹ کا دام واپس کر دیا جائے"۔ مجمع خاموش رہا کسی ایک کو بھی جرأت نہیں ہوئی کہ اپنی ناپسندیدگی و نفرت کا اظہار کرے۔

مچھلی کے پیٹ میں زندہ انسان

کتب مقدسہ میں مذکور ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام چند روز مچھلی کے پیٹ میں رہے، یہ ان کا معجزہ خیال کیا گیا، اس کے بعد کسی شخص کے متعلق یہ نہیں سنا گیا کہ اس کو مچھلی نے نگل لیا ہو، اور وہ چند منٹ بھی زندہ رہا ہو۔

لیکن امریکہ کی وزارت بحریہ کی اطلاع ہے کہ فروری [illegible] میں چند صیاد کشتی اور نیزوں کے ساتھ سمندر میں شکار کو گئے، ایک مچھلی نظر آئی، شکاری شکار کی گھات میں تھے کہ مچھلی نے اپنی دم سے کشتی الٹ دی، اور ان میں سے ایک کو نگل گئی، اور دو نے بمشکل جان بچائی اور کسی طرح کشتی پر قابو حاصل کر کے پھر شکار کا ارادہ کیا اتفاق سے اسی بڑی مچھلی کے شکار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو ان کے ایک ساتھی کی متحرک قبر تھی، انھوں نے اس کا پیٹ چاک کر کے اپنے ساتھی کو نکالا، وہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا۔ البتہ اس پر غشی کی کیفیت طاری تھی، لوگوں کو اس کی زندگی پر حیرت ہوئی۔ اس کا علاج ہوا۔ اور اچھا ہو گیا۔

کوائف عالم اسلامی

شام

شام میں فرانس کے خلاف ایک نئی تحریک کا آغاز

حکومت فرانس نے شام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ لبنان میں علیحدہ جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے اور شام میں علیحدہ جس سے عرب شام میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ دمشق میں تحریک وحدت عرب شروع ہو گئی ہے۔ بیروت میں موتمر اسلامی کا انعقاد عمل میں آیا جس میں حکومت فرانس کے اس فیصلہ کی تنسیخ کے لئے تحریک جاری کرنے کے لئے مجلس عمل بنائی گئی جو ۱۰ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ مجلس جلد تحریک جاری کر دے گی۔ موتمر میں سید سلیم علی سلام نے ایک زبردست تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہم اور آپ سب بھائی وحدت شام اور آزادی وطن کے حامی ہیں۔ ہم اپنی اجتماعی بلندی سے کسی طرح نیچے اترنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس راہ میں اگر طاقت و قوت کا استعمال کیا گیا تو ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے لیکن مقصد کے اصل خط سے ایک انچ نہیں ہٹیں گے۔

شام کا معاہدۂ آزادی

شام کے مشہور قائد آزادی ڈاکٹر شہبندر نے جلاوطنی کی حالت میں مصر سے یہ اعلان شائع کیا ہے کہ شام کا نام نہاد معاہدہ آزادی ہمارے مطمح نظر سے گرا ہوا ہے اور وہ ہماری قومی امیدوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

مصر

ملک کے تحفظ کیلئے تیاریاں

ایک مشہور مصری اخبار کہتا ہے کہ مستقبل کی جنگ میں مصر کا نصب العین دفاع اور تحفظ ملک ہوگا۔ اس مقصد کے لئے حکومت مصر نے فیصلہ کیا ہے کہ بہت جلد ایک جنگی بیڑہ تیار کیا جائے جس میں اچھی قسم کے جہاز ہوں گے اور حکومت ہر سال اس کی ترقی کے لئے بیڑا نیہ میں خاص خیال رکھے گی۔ دوسرا جنگی [illegible] ہوائی جہازوں پر مشتمل ہوگا۔ حکومت ان دو بیڑوں کی تشکیل اور خریداری کے لئے زبردست رقمیں منظور کرنے والی ہے۔

مصری محمل کا قضیہ حل ہو گیا

محمل مصری کا مسئلہ جس کی بنا پر حکومت مصر اور حکومت [illegible] کے تعلقات زیادہ دنوں سے کشیدہ تھے۔ دیگر مسائل

کی طرح طے ہوگیا۔ عمل کے فیصلہ میں نہ تو مصر کو محمل کی حمایت کے حق سے محروم ہونا پڑا اور نہ حکومت سعودیہ اپنے استقلال وسیادت کے معیار سے نیچے اتری بلکہ دونظریوں کے درمیان وسط کی راہ اختیار کرلی گئی۔ مصر نے تو اس۔ ۔ ۔ پر اکتفا کیا کہ محمل حجاز جائے مگر جدہ تک اور حکومت سعودیہ نے اس کو مناسب سمجھا کہ محمل جدہ تک رہے اور وہاں سے غلاف کعبہ حرم شریف کو روانہ کیا جائے اس طرح مصر اور حجاز نے وسط کی راہ اختیار کرکے تمام اختلافات کا خاتمہ کردیا۔

مصری معاہدہ کا اثر مشرقی ممالک پر

مصری انگریزی معاہدہ نے ان ممالک کی ہمت افزائی کی ہے جو محدود آزادی یا آزادی کا کوئی حصہ حاصل کرچکے ہیں عراق کا آخری انقلاب اس حقیقت کا شاہد ہے کہ اس نے ۱۹۳۰ء کے معاہدہ میں برطانی انتداب کو ختم کردیا تھا مگر عراقیوں نے مصر کی ترقی کو نمونہ بناکر آگے بڑھنے کی کوشش کی اور انقلاب برپا کردیا۔ شام ولبنان نے مصری معاہدہ کو میزان قرار دے کر شامی اور لبنانی معاہدہ کو غیر تشفی قرار دیا۔ بیروت اور طرابلس کے آخری حوادث اسی شعور کا مظہر ہیں۔

ٹیونس میں وطنی حرکت تیز تر ہوگئی ہے اور الجزائر اپنی نیم آزادی کے باوجود فرانس کی سیادت کے جوئے کو اپنے کندھوں سے اتارنے کے لئے کھڑا ہوگیا ہے۔ مراکش میں حرکت استقلال زور پر ہے اور باشندے اپنی آزادی کو اسپین کی جنگ میں خون بہاکر خرید رہے ہیں۔ ماوراء النہر کی طرف فرانس کے خلاف فاس۔ رباط اور دارالبیضا میں مظاہرے کئے جارہے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم طرابلس الغرب سے صدائے آزادی جدید نغموں کے ساتھ سن رہے ہیں اور طرابلس عرب اٹلی سے مطالبہ کررہے ہیں کہ وہ بھی فرانس اور برطانیہ کی اقتدا کرے اور شام ولبنان اور عراق ومصر کی طرح ان کو بھی نعمت آزادی سے مالا مال کردے یہ ساری تحریکیں مبارک ہیں جو کسی نہ کسی وقت اپنے شیریں پھل سے کام ودہن کی تواضع کریں گی۔

ترکی

کاغذسازی کا عظیم الشان کارخانہ

ازمیت میں ترکوں نے جو کاغذسازی کا عظیم الشان کارخانہ قائم کیا تھا ترکی اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اس سے ترکوں کو زبردست فائدہ پہونچا ہے اور پہلے ہی مرحلے میں اتنا کاغذ تیار ہوگیا ہے کہ کارخانہ کے کل مصارف نکل آئے یعنی ۲۴۰۰۰۰۰ ترکی پونڈ کا کاغذ فروخت ہوچکا ہے اس کارخانہ میں مختلف انواع واقسام کے کاغذ تیار کئے جائینگے جو تمام ترکی قلمرو کی ضروریات کے لئے کافی ہوں گے اور غیر ممالک سے ایک پونڈ کاغذ خریدنے کی بھی ضرورت نہ پڑے گی اس کارخانہ سے ہرسال ۱۲ ہزار ٹن کاغذ تیار ہوگا جس کی قیمت کم ازکم ۲۸۰۰۰۰۰ ترکی پونڈ ہوگی۔

ادارۂ اقتصاد نے ایک کارخانہ کے ساتھ ایک دوسرے کارخانہ کی تعمیر کا بھی آغاز کردیا ہے۔ جس پر ۸۰۰۰۰۰ ترکی پونڈ کا صرفہ ہوگا اس طرح جب یہ کارخانہ بھی جاری ہوجائیگا تو تمام دنیا میں کوئی کارخانہ بھی ان کا مقابلہ نہ کرسکے گا اور ترکی غیر ممالک

ملک کا نقدوں سے بے نیاز ہو جائے گا۔

غیر ممالک سے ترکی کے تجارتی تعلقات

وزارت خارجہ ترکیہ دیگر ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کرنے میں زبردست کوشش کر رہی ہے تاکہ ترکی کی اقتصادی حالت مستحکم اور پائدار بنیادوں پر قائم ہو جائے اور ترکی پیداوار اور ترکی مصنوعات کے لئے دیگر ممالک کی منڈیاں حکومت کے قبضہ میں آجائیں۔ حال میں ترکی نے یوگوسلاویہ سے تجارتی معاہدہ کر کے اس کا نفاذ کر دیا ہے۔ آئرلینڈ کے تجارتی معاہدہ کی مدت ختم ہو چکی، اور جدید معاہدہ کی غرض سے گذشتہ معاہدہ کی میعاد میں توسیع کر دی گئی جو آخر جنوری ۱۹۳۶ء پر ختم ہو جائے گی۔

الغرض ترکی مصنوعات اور پیداوار کے لئے غیر ممالک کی منڈیوں کے دروازے کھل گئے ہیں اور تمام ترکی میں اقتصادی خوشحالی کا دور دورہ ہے۔

یمن

یمن کا صنعتی کالج

حکومت یمن تعلیم کے باب میں خاص مشرقی اور افادی نظریہ رکھتی ہے امام یمن کی خواہش یہ ہے کہ مغربی تعلیم جو بیکاروں کی جماعت پیدا کرتی ہے یمن سے دور رہے، چنانچہ انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی بلکہ سب سے پہلے یمن کے طلبہ کو عراق اور مصر بھیجا تاکہ وہ اسلامی ماحول میں مناسب وقت جدید علوم حاصل کریں اور اب دوسرا قدم یہ اٹھایا ہے کہ صنعا میں صنعتی کالج قائم کیا گیا ہے جس میں سب سے پہلے صابن سازی کی تعلیم کا افتتاح کیا گیا ہے اس شعبہ نے اپنے آغاز میں کافی تعداد میں بہترین صابن تیار کیا ہے۔ امید ہے یمن کا تعلیم یافتہ طبقہ اس طرز عمل سے ایک طرف تو تباہ کن مغربی فیشن سے محفوظ ہو جائے گا اور دوسری طرف بیکاری سے محفوظ رہے گا۔

فلسطین

اخبار اللواء نے جو عرب ہائی کمیٹی کا ترجمان ہے اس بے بنیاد افواہ کی تردید کی ہے جو مختلف ایجنسیاں دنیا میں پھیلا رہی ہیں اور جس کا مفاد یہ ہے کہ عرب ہائی کمیٹی اپنے بعض ارکان کو شاہی کمیشن کے سامنے شہادت دینے کی غرض سے پیش کرے گی۔ اللواء لکھتا ہے کہ عرب ہائی کمیٹی کا کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے اور اس کی طرف اس خبر کا انتساب سرتاپا غلط ہے۔

افغانستان کی جدید فضائی قوت

ایک خبر ہے کہ حکومت افغانستان بہت جلد اپنی فضائی قوت کی تجدید کے لئے جدید قدم اٹھائے گی اب سے قبل افغانستان کے پاس متعدد اچھے طیارے تھے مگر ان میں سے اکثر انقلاب میں برباد ہو گئے جو باقی بچے تھے وہ بھی کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ چنانچہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ابھی ساخت کے نئے ہوائی جہاز خریدے جائیں۔ ایک جہاز خاص طور پر شاہ افغانستان اور وزراء حکومت کے لئے ہوگا۔ افغانستان میں ہوابازی کی تعلیم کے لئے سٹر ہمبل جرمن ہواباز کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔

فاران کے لئے مضامین

۱۔ مذہبی مضامین جو فاران کے معیار کے مطابق ہوں۔

۲۔ تاریخی مضامین جو عام فہم مستند اور نتیجہ خیز ہوں

۳۔ خواتین کے متعلق اصلاحی مضامین

۴۔ الحاد و دہریت اور زنگی خیالات پر سنجیدہ مقالات

۵۔ علوم جدیدہ اور انکشافات حاضرہ پر تبصرہ

۶۔ مذاہب عالم پر تحقیقی اور تنقیدی نظر

۷۔ مفاد عامہ کے پیش نظر صحت عامہ اور طریقہائے علاج

۸۔ ادب و اخلاق اور ذہنی تربیت کے متعلق مفید تجاویز

۹۔ اسلامی اور غیر اسلامی سیاسیات کا تقابل

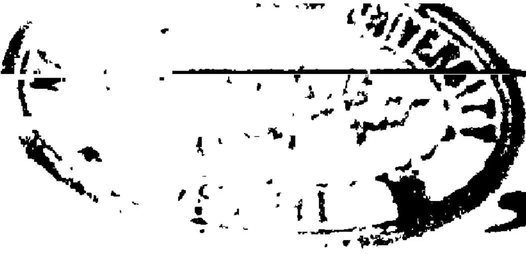
۱۰۔ معاشیات اور اقتصادیات

۱۱۔ بلند معیار کی نظمیں اور غزلیں

ہر مضمون ٹھوس اور سنجیدہ ہونا چاہئے اور شخصی مباحث سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ورنہ اس قسم کے مضمون فاران میں شائع نہ ہو سکیں گے۔

مضامین میں اختصار اور جامعیت کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایڈیٹر کو حذف و ترمیم اور اضافہ کا اختیار رہو گا۔

مدیر "فاران"



فاران

مالک: محمد مجید حسن

ہر ماہ انگریزی کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

مدیر: ابواللیث ندوی اصلاحی

نمبر ۲ | بجنور ماہ فروری سنہ ۱۹۳۷ء مطابق ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۵ ہجری | جلد ۳

فہرست مضامین

بحث و نظر

فلسطین کے ہنگاموں کی تحقیقات کے لئے جو شاہی کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس نے ۲۰ر جنوری کو اپنا کام ختم کر دیا اور اس کے اراکین فلسطین سے روانہ ہو گئے۔ عربوں نے اگرچہ ابتدا میں شاہی کمیشن کا مقاطعہ کر دیا تھا لیکن پھر شاہان عرب کے مشورہ سے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اپنی شکایتیں اور مطالبات پوری وضاحت اور دلیری کے ساتھ اس کے سامنے پیش کئے اب کمیشن کے سامنے عربوں اور یہودیوں دونوں کے نقطہ ہائے نظر واضح ہو چکے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد غالباً عنقریب ہی کمیشن اپنی رپورٹ مرتب کر کے برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرے گا۔

اس رپورٹ میں کیا ہوگا اور کمیشن کی پیش کردہ تجاویز پر حکومت کہاں تک عامل ہوگی؟ اس کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن جہاں تک ہمارے گذشتہ تجربات کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ تو کمیشن کے متعلق یہ حسن ظن رکھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص قومی رجحانات اور مفاد کے خیال کو بالکل پس پشت ڈالتے ہوئے، اپنی رپورٹ ٹھیک ان حالات و کیفیات کے مطابق مرتب کرے گا، جو انھوں نے فلسطین میں دیکھے اور سنے ہیں اور نہ حکومت سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ آسانی سے عربوں کے ساتھ انصاف کرنے پر آمادہ ہو جائے گی اور اپنی خود غرضانہ پالیسی چھوڑ کر ان چند بظاہر خوش آئند تجاویز پر بھی عمل کرے گی جو غالباً کمیشن اپنے اخلاص و دیانت کو ثابت کرنے اور اہل ملک کو فریب میں مبتلا کرنے کیلئے پیش کریگا

گذشتہ واقعات شاہد ہیں کہ کمیشنوں کا تقرر بالعموم حکومت کی ایک سیاسی چال ہوتی ہے جس کا مقصود کسی غیر معمولی جوش و خروش کو فوری طور پر دبا دینا اور اہل ملک کی توجہ کا رخ کسی اور طرف پھیر دینا ہوتا ہے۔ حکومت جب کسی معاملہ کو کھٹائی میں ڈالنا چاہتی ہے تو جھٹ اس کے لئے کوئی تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیتی ہے اور جب تک کمیشن تحقیقات کرتا ہے اور رپورٹ مرتب کرتا ہے اور اس پر بحث مباحثہ ہوتا ہے، حکومت دوسری تدبیروں سے صورت حال پر قابو پا لینے کی کوشش کرتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ وہ بالعموم اپنی اس حکمت عملی میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

یہی صورت حال بظاہر فلسطین کے کمیشن کی بھی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اگر حکومت کا مقصود نیک نیتی کے ساتھ فلسطین کو فتنہ و فساد سے پاک کرنا ہوتا تو اس کے لئے خواہ مخواہ کمیشن مقرر کرنے اور اسکی آمد و رفت اور دوروں پر گراں قدر رقم خرچ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ برطانیہ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ عربوں اور یہودیوں کے تصادم کے اسباب کیا ہیں اور کیوں

اس وقت سرزمین فلسطین فتنہ و فساد کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ آج سے چند سال پہلے ایک شاہی کمیشن عربوں اور یہودیوں کی شورش کے اسباب کی تحقیقات کرچکا ہے۔ اور مختلف اوقات میں متعدد سرکاری اور ذمہ دار حضرات۔ ان پر اس طرح روشنی ڈال چکے ہیں کہ اب انھیں معلوم و متعین کرنے کے لئے کسی مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت باقی نہیں رہی، ایسی صورت میں فلسطین کے اندر امن و امان قائم کرنے کی سیدھی اور صاف راہ چھوڑ کر، کمیشن کے تقرر کا پُرپیچ اور طول و طویل راستہ اختیار کرنے سے کیا حکومت کے متعلق یہ بدگمانی قائم نہیں کی جا سکتی کہ کمیشن کے تقرر سے اس کا مقصود فتنہ و فساد کے اسباب معلوم کرنے کے بجائے کچھ اور ہے اور کیا ایسی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کمیشن کے مقاطعہ میں حق بجانب نہ تھے؟

ہم نے اوپر حکومت اور شاہی کمیشن کے متعلق جس بدگمانی کا اظہار کیا ہے، وہ کسی تعصب یا عناد پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد کمیشنوں کے متعلق ہمارے گذشتہ تجربات پر قائم ہے۔ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ شاہی کمیشنوں کی تحقیقات اور رپورٹیں، کبھی حکومت کے منشا و مفاد کے خلاف نہیں ہوتیں اور ایسا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ عموماً حکومت کی طرف سے اس قسم کے کمیشنوں کے اراکین وہ لوگ منتخب کئے جاتے ہیں جن کے متعلق مشکل سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے قومی مفاد پر حق و دیانت کو ترجیح دیں گے۔ اور اگر بالفرض وہ حق و دیانت کے ساتھ تحقیقات کرنا بھی چاہتے ہیں تب بھی وہ صحیح نتیجہ تک پہونچنے سے قاصر رہتے ہیں کیونکہ ان کے گرد و پیش ایسی صورتیں جمع ہو جاتی ہیں یا جمع کر دی جاتی ہیں کہ ان سے ان کا متاثر نہ ہونا ناممکن ہے۔ جس وقت شاہی کمیشن فلسطین میں شہادتیں لے رہا تھا چونکہ وہاں کے اعلیٰ سرکاری حکام عموماً یورپین ہیں اس لئے ان کی طرف سے جتنی شہادتیں گذریں ان سب میں اصلی حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی اور واقعات کو بالکل غلط رنگ میں پیش کیا گیا۔ مثلاً مسٹر بومن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان منافرت کی بڑی وجہ یہ بیان کی کہ "دونوں اپنے اپنے مدارس میں اپنی اپنی زبان میں تعلیم دینے پر مصر ہیں اور کوئی مدرسہ ایسا قائم نہیں کیا جا سکتا جس میں عرب اور یہودی لڑکے یکجا پڑھ سکیں" اس لئے مسٹر بومن نے یہ رائے دی ہے کہ "فلسطین کے مدارس میں انگریزی تعلیم دی جائے اور اس طرح فرقہ وارانہ میل جول کا وسیلہ پیدا کیا جائے۔"

کیا عجب ہے کہ کمیشن اپنی جماعت کے ایک افسر اعلیٰ کے بیان کو "نامی" "متعصب" اور "سرکش" عربوں کی شہادتوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ اور مبنی برحق قرار دے اور مسٹر بومن کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے عربوں اور یہودیوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے بہانہ سے ہندوستان کی طرح فلسطین کے مدارس میں بھی انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کرے اور اس طرح اہل فلسطین کی ذہنی آزادی کو بھی ختم کر دینے کا سامان کر دے۔

مسٹر بومن عربوں اور یہودیوں کی منافرت کا جو سبب چاہیں بیان کریں، ان کی زبان کون پکڑ سکتا ہے لیکن

یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس بیان میں حق بات کا اظہار نہیں کیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے بھی فلسطین میں یہودیوں کی آبادیاں تھیں اور اس وقت بھی مدارس میں ذریعۂ تعلیم، انگریزی زبان نہ تھی لیکن ان میں کسی قسم کی کشیدگی نہیں پائی جاتی تھی اور دونوں پنی اپنی جگہ خوش و خرم تھے۔ ان کے درمیان فتنہ و فساد کی ابتدا تو اس وقت ہوئی جب انگریزوں کا بہ قدم وہاں پہونچا اور لارڈ بالفور نے اپنی حکومت کے مصالح کے لئے اس ناقابل تطبیق دو عملی پالیسی کا اعلان کیا

"حکومت برطانیہ فلسطین میں وطن یہود قائم کرنے کے خیال کو پسند کرتی ہے اور اس مقصد کے حصول میں وہ یہودیوں کی مدد کرنے اور اس سلسلہ میں انھیں آسانیاں بہم پہونچانے کے لئے تیار ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی بات ایسی روا نہ رکھی جائے گی جو فلسطین کے غیر یہود باشندوں کے خلاف ہو یا ان یہودیوں کے سیاسی مرتبہ اور شہری حقوق کے خلاف پڑے جو غیر ممالک میں آباد ہیں"۔

یہی اعلان حقیقت میں ان تمام فتنہ و فساد کی بنیاد ہے جو اس وقت فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان رونما ہے۔

یہود دنیا کی سب سے زیادہ بدبخت قوم ہے خدا کی وسیع سرزمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہے، کوئی ملک ایسا نہیں جو انھیں اپنے یہاں قدم رکھنے کی اجازت دیدے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قوم جس ملک میں پہونچتی ہے، اس ملک کی خوش حالی اور فارغ البالی ان کی سرمایہ داری کی نذر ہو جاتی ہے۔ ہٹلر نے اسی بنا پر ان کا جرمنی سے بالکل خاتمہ کردیا۔ وہ اسے اپنا اتنا بڑا کارنامہ خیال کرتا ہے کہ اس کا تذکرہ "ریشتاغ" میں نہایت فخر کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسرے ممالک بھی انھیں دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ بظاہر حکومت برطانیہ ان کی ہمدرد نظر آرہی تھی لیکن ابھی حال ہی میں جنوبی افریقہ کی یونین اسمبلی نے قانوناً وہاں یہودیوں کے توطن کو ملک کر یہ ثابت کردیا ہے کہ انھیں یہودیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے البتہ اس کے کچھ سیاسی مصالح ہیں جن کی بنا پر وہ اسے فلسطین میں آباد کرکے عربوں پر عافیت تنگ کرنا چاہتی ہے۔ یہی مصالح تھے جن کی بنا پر لارڈ بالفور نے اپنا مذکورہ بالا اعلان کیا اور یہی مصالح ہیں جو اب تک حکومت برطانیہ کو جہانتک فلسطین کا تعلق ہے انکی پشت پناہی پر آمادہ کررہی ہیں۔

یہودیوں نے دنیا کے ہر ہر حصہ میں پھر پھرا کر دیکھ لیا کہ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو انھیں بخوشی اپنی آغوش میں لینے کیلئے تیار ہو اور جہاں وہ مضبوطی کیساتھ اپنے قدم جماسکیں۔ اسلئے انھوں نے کسی خاص ملک کو اپنا قومی وطن بنانا چاہا اور مختلف مصالح کی بنا پر فلسطین کو اسکے لئے منتخب کیا۔ یہود جیسے کچھ بھی ہوں لیکن سرمایہ داری میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ انھوں نے اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر اپنے اس منصوبہ کو پورا کرنا چاہا۔ اگرچہ اس وقت دنیا بظاہر سرمایہ داری کی مخالف اور سرمایہ داروں کی دشمن نظر آرہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی قوم بھی سرمایہ پرستی کے عیب سے پاک نہیں ہے چنانچہ یہودیوں نے اپنے اسی سرمایہ کی بدولت، فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانے کی اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی بڑی طاقتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اتفاق

ست حکومت برطانیہ کے سیاسی مصالح بھی فلسطین میں ایک سرمایہ دار لیکن بے غیرت اور فرنبردار قوم کے آباد کرنے کے مقتضی ہوئے۔ اس لئے یہودیوں کی علی الاعلان بہت افزائی شروع کردی گئی اور فلسطین کو وطن یہود بنانے کیلئے ہر قسم کی آسانیاں بہم پہونچائی جانے لگیں۔

یہود ہر ملک میں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہی تھے اور کسی ملک کے باشندے بھی انکے ساتھ کوئی بہتر سلوک کرنے پر آمادہ نہ تھے اسلئے اب یہود ہر طرف سے سمٹ کر فلسطین پہونچنے لگے یہاں تک کہ چند ہی سال کے اندر وہاں یہودیوں کی آبادی کئی لاکھ زیادہ ہوگئی اور غریب عربوں کی جائداد اور زمینیں ان کے قبضہ و تصرف میں جانے لگیں۔

جنگ عظیم کے دوران میں حکومت نے عربوں سے عربی حکومت قائم کرنیکا جو وعدہ کیا تھا اسی پورا نہ کرکے انکے دلوں کو پہلے ہی سے مجروح کرچکا تھا اسکے بعد جب حکومت کی تائید اور ہمت افزائی سے یہودی بلائے بے درماں بنکر ان پر ٹوٹ پڑے اور انھیں بے دخل کرکے انکی جائداد اور زمینوں پر قبضہ کرنے لگے تو قدرتی طور پر ایک طرف تو حکومت برطانیہ کے خلاف انکے غم و غصہ کی آگ مشتعل ہوگئی جس نے یہ بلاان کے سر مسلط کی تھی اور دوسری طرف یہودیوں کے ساتھ ان کی عداوت و نفرت کا جذبہ بڑھتا رہا۔ یہانتک کہ ۱۹۲۹ء میں ان کے درمیان نہایت سخت معرکہ آرائیاں ہوئیں جس کا سبب حکومت ہی کے تحقیقاتی کمیشن کی تحقیقات کے مطابق صرف یہ تھا کہ "عربوں کو یہ اندیشہ ہوگیا ہے کہ یہودی فلسطین کو اپنا قومی وطن بنا رہے ہیں اور عربوں کو زندگی کی ہر راہ میں بے دخل کرنا چاہتے ہیں"

حکومت نے کمیشن کی اس رپورٹ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ عربوں کے اس اندیشہ کو دور کرنے کے بجائے انکے زخم پر ایک اعلان کے ذریعہ اور زیادہ نمک چھڑک دیا۔ ۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو وزیر اعظم نے دارالعوام میں یہ بیان دیا۔ "دوہری ذمہ داریاں اس سلسلہ میں ہم پر عائد ہوتی ہیں ایک یہودیوں کے متعلق دوسری فلسطین کی غیر یہودی آبادی کے سلسلہ میں حکومت برطانیہ کا یہ غیر متزلزل ارادہ ہے کہ وہ اپنی پوری قوت کیساتھ ان دونوں ذمہ داریوں کو پورا کرے اور دونوں جماعتوں کیساتھ پورا پورا انصاف کرے۔" اس اعلان کے بعد عربوں کی بے چینی اور زیادہ بڑھ گئی اسلئے حکومت نے پھر تحقیقات کے لئے نئے سرے سے ان کے غم و غصہ کا علاج کرنا چاہا اور سر جان ہوپ سمپسن کو اس کام کیلئے مقرر کیا

اگرچہ حسب توقع سر جان ہوپ نے عربوں کی بے چینیوں کو رفع کرنے کے لئے زیادہ تر کاشت وغیرہ کی اصلاح پر زور دیا تھا لیکن انصاف سے کام لیتے ہوئے انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ:- "اب مزید مہاجر یہودیوں کیلئے زمینیں نہیں نکالی جاسکتیں یہ قرین انصاف نہیں ہے کہ بیکار عرب مزدوروں کی موجودگی میں جب کام نکلے تو غیر ممالک سے یہودیوں کو فلسطین میں لا کر انسے کام لیا جائے"

لیکن حکومت نے پہلے کی طرح اب بھی اس مشورہ پر عمل کرکے یہودیوں کو ناخوش کرنا نہیں چاہا جسکا نتیجہ گذشتہ سال کے فسادات کی شکل میں ظاہر ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ جبتک حکومت اپنی "دوہری ذمہ داریوں" کو پورا کرنے کی کوشش ترک نہ کرے گی فلسطین کے فتنہ و فساد کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

کمیشنوں کی رپورٹوں کیساتھ حکومت کی اس بے اعتنائی کی بنا پر نہیں کہا جاسکتا کہ حال کے کمیشن کی رپورٹ کا کیا حشر ہوگا لیکن حکومت اور ارکان کمیشن دونوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ اب حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ عرب آزادی کی فضا میں سانس لینے پر تل گئے ہیں۔ وہ اپنے سابق تجربات کی بنا پر حکومت کی چالوں کو بھی بخوبی سمجھ گئے ہیں اسلئے اب انھیں زیادہ دنوں تک غلام نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ مفتی اعظم کے وہ جائز مطالبات جو انھوں نے کمیشن کے سامنے پیش کئے ہیں جب تک منظور نہیں کئے جائینگے فلسطین میں امن و امان کا قائم ہونا محال ہے۔

بلادِ مشرق اور عالمِ اسلام

اسلامی دنیا کا ماضی۔ حال اور مستقبل

(از جناب مولانا حامد الانصاری صاحب غازی مدینہ)

دنیا اس وقت ایک نئے دور۔ نئی سیاست اور نئے سیاسی محرکات کے ساتھ ایک جدید شاہراہ سے گذر رہی ہے۔ انقلاب کے آثار ہر طرف ظہور پذیر ہیں اور حال کے تغیرات ماضی کے سادہ نقشوں میں تازہ رنگ بھر رہے ہیں۔

ہم ماضی بعید سے آگے بڑھ کر ایک ایسے نشان منزل تک پہونچ چکے ہیں جہاں سے انسانی نوع کا ہر گروہ اپنے مستقبل کی تقدیر کا ایک بدلا ہوا نقش دیکھ سکتا ہے جو بات ہم مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے اور جو آج کے حالات میں ہمیں غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے وہ یہ ہے کہ سیاست و دستور کے مرکز اتصال پر ہمارا مقام کہاں ہے، ہم اسلامی دنیا کے دوسرے اہم اور مستحکم مرکزوں سے کتنی دور ہیں۔ خود اسلامی دنیا کے آزاد عناصر قوت و طاقت کے کس مرکز پر ہیں اور ان کی انفرادی اور اجتماعی اہمیت ایشیا اور یوروپ کی آزاد اور منظم و منظم حکومتوں کے مقابلہ میں کتنی ہے۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ آزاد عناصر ان تمام دوسرے اسلامی ممالک سے جو آج تک کمزور اور اقوام غالب کے زیردست ہیں کس قسم کا ربط و ضبط رکھتے ہیں اور یہ مجبور و مظلوم ممالک بجائے خود آزاد اسلامی ممالک سے کس قسم کے تعلقات کو ضروری سمجھتے ہیں اور کیا توقعات رکھتے ہیں۔

معلوم ہے کہ ہندوستان کے مسلمان نصف صدی سے اپنی سیاسی اہمیت کو ختم کر چکے ہیں۔ ہم اپنے عہد حکومت میں ہندوستان کے سینے میں دل کی طرح تھے لیکن برطانوی نظام حکومت کے ظہور کے بعد سب سے پہلے ہماری سیاسی اہمیت کا خاتمہ ہوا۔ اسکے بعد ہماری تعلیمی اقتدار کا ضیاع رونما ہوا اور اسکے بعد ہماری انحطاط پذیر اقتصادی حالت نے ہمارے اخلاق پر اثر ڈالا اور ہمیں ایک ایسی جگہ پر پہونچا دیا جس کا حال ہم میں سے ہر شخص کو معلوم ہے۔

تاہم ہمیں صبر و شکیب کے مجبور کن مطمح نظر کے ماتحت اپنی سیاست کو اسلامی دنیا کی سیاست کے روشن آئینہ میں دیکھنا ہے۔ اور یہ غور کرنا ہے کہ اسلامی دنیا بجائے خود اثر و اقتدار کے کس مرکز پر ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سوال جس قدر ہمہ گیر نوعیت رکھتا ہے اسی قدر ہمہ گیر بحث و نظر کا محتاج ہے نہ کسی ایک فرصت میں اس مسئلہ پر گفتگو ہو سکتی ہے اور نہ اس گفتگو کے مباحث نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں۔ آغاز کار کے طور پر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہند اور اسلامی دنیا کی سیاست پر ایک جامع نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور اس محدود ضرورت کی تکمیل بہت

ہو سکتی ہے۔

اگر پورے پچاس سال کی تاریخ اور سیاسی سرگذشت کو نظر انداز کر دیں اور صرف گذشتہ ۵۰ سال کی کوائف کو پیش نظر رکھیں تو آپکو یہ معلوم ہوگا کہ اس عرصہ میں اسلامی دنیا کے مختلف عناصر کی حالت تغیر و تبدیلی کے ایک ایسے گہوارے میں متحرک رہی ہے جو حوادث کے ہولناک زلزلوں کی وجہ سے حرکت کا عادی رہا ہے۔

۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ اسلامی ہند کا سیاسی تصور پیدا ہوا۔ اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۲ء تک اپنے شباب پر پہونچکر رک گیا۔ ترکوں نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں حصہ لیا اور اپنی زندگی کی سند دنیا کی جنگی طاقتوں سے حاصل کی طرابلس۔ مصر، شام، فلسطین، عرب عراق اور یمن۔ یہ حضرت شیخ احمد سنوسی۔ علامہ جمال الدین افغانی۔ علامہ عبد العزیز جاویش علامہ مفتی عبدہ اور آل سعود کے بزرگ۔ دوربین اور با اصول اور پختہ کاران مذہب و اخلاق کے اثر سے بیدار ہو کر آنکھیں ملتے ہوئے غفلت کے بستروں سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ان میں سے طرابلس آخر وقت تک اپنی جگہ قائم رہا ہے اس نے آزادی کے لئے اٹلی سے اتنی طویل جنگ کی کہ ۶ لاکھ طرابلسی نوجوانوں کا خون زمین پر بہتا ہوا نظر آنے لگا۔ ۱۹۳۰ء میں ایک دن وہ آیا کہ طرابلس کا آخری مجاہد سید عمر مختار کا دل زخمی ہو گیا اس مجاہد نے گولی کھائی اور دنیا کے خوبصورت سورج کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اس نے کہا میں نے ۲۰ سال تک تلوار چلائی مگر ایک ایسے فرض کے لئے جس سے بڑا فرض کوئی نہیں،، مجاہد کے دل پر اطالوی گولی پڑی مگر اسی دن طرابلس کی نبضیں ساقط ہو گئیں

۱۹۱۴ء کی جنگ نے ترکوں کی فوجی قوت کو ہر طرف سے مجبور کر کے دردانیال پر لا کر کھڑا کر دیا عرب لوگ جو ترکوں کے شاکی تھے اور جن کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ترکوں نے انکے ملک کو تنظیم تعلیم۔ اخلاق اور تمدن سے کچھ حصہ نہیں دیا کرنل لارنس کی سازشوں کے ماتحت شریف مکہ حسین کے اقتدار سے مسحور ہو گئے شریف کی آنکھوں میں وحدت عرب کا خواب جھلک رہا ہے۔ عربوں نے اسکی تعبیر برطانیہ سے دریافت کی اور اس دریافت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحدت اور آزادی کے نام پر ان کے لئے غلامی اور تفریق کو تجویز کیا گیا۔ شریف حسین کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا۔ مگر عراق۔ شام۔ لبنان شرق اردن اور حجاز کے علاقے تقسیم ہو چکے تھے یہ تقسیم چالاک اتحادیوں کی طے شدہ اسکیم کے ماتحت عمل میں آئی تھی اس لئے شریف حسین کا پہلا احتجاج بیکار گیا اور وہ اپنی مسند شرافت سے علیحدہ کر کے قبرص کے جزیرہ میں موت کی آخری ساعتوں کا انتظار کرنے کے لئے بھیجدیا گیا۔

شریف حسین کی موت کے بعد بھی برطانوی سیاست زندہ رہی۔ مگر ایک طرف تو امام یمن کا زبردست جذبہ برروئے کار رہا اور دوسری طرف سلطان عبد العزیز ابن سعود کے پرجوش اخوان نے علی کے تخت کی جگہ اپنے سلطان کا تخت بچھا دیا۔

چونکہ ایران میں برطانیہ کے سیاسی اثر و اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اشتراکی انقلاب نے روسی برطانوی اتحاد کا خاتمہ کر کر ایران کی آزادی تام کے امکان کو حقیقت کی صورت میں پیش کر دیا تھا اسلئے برطانیہ کی تمام مصلحتیں ایران کی سرزمین سے خلیج فارس کی طرف منتقل ہو گئیں اور عرب شیوخ کی سیادت حاصل کرنے کے بعد برطانیہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ایران کے قریب ایک نئی اسلامی حکومت قائم کیجائے جو خلیج فارس میں برطانوی اسکیموں کے لئے مفید ثابت ہو۔ برطانوی مدبرین انہی سے زیادہ ان سیاسی مصلحتوں سے باخبر تھے جن کے ماتحت عراق کو آزادی دیگئی لیکن عراق آزاد بھی ہو گیا اور جمعیۃ اقوام کا رکن بھی۔ یہ آزادی اتنی تیزی سے ملی کہ اس سے قبل کا عراقی و برطانوی معاہدہ جس کی دفعات ۲۰ سال کے لئے نافذ ہوئی تھیں دو سال کے اندر بصرہ کے قریب دریا میں غرق ہو گئیں۔

عراق کی آزادی کے پانچ سال بعد فرانس کو بھی ۱۹۳۶ء میں شام کو نام نہاد آزادی دینی پڑی لیکن اس نے اس مختصر ملک کو تین ایسے مختصر اجزا میں تقسیم کر دیا جنکے لئے مزید تقسیم کا امکان نہ رہا۔

(۱) شام جس کا دارالسلطنت دمشق ہے اور جہاں سنی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

(۲) بلاد علویہ جہاں علوی شیعہ زیادہ آباد ہیں۔

(۳) لبنان جس کا مرکز سلطنت بیروت ہے۔ اور جہاں عیسائیوں کی زیادہ آبادی ہے شام یقیناً اس آزادی سے استحکام حاصل کرے گا۔ اور چند سال کے استحکام سے آزادی کامل کی آخری منزل تک پہونچے گا لیکن فلسطین اور شرق اردن اب تک اس گناہ اور بغاوت کا کفارہ ادا نہیں کر سکے جو انھوں نے ترکوں کے خلاف ۱۶ سال قبل کی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ برطانیہ حیفا (فلسطین) سے عقبہ (حجاز) تک ایک ایسی بری راہ تیار کرنا چاہتا ہے جو نہر سویز کے بند ہونے کی صورت میں کام آسکے اور نہ صرف یہ کہ اسکے سامان جنگ۔ افواج اور رسد کو بحر روم سے بحر قلزم کی طرف منتقل کر سکے بلکہ ایک طرف عراق و ایران اور ترکی پر اثر ڈالے دوسری طرف حجاز و یمن کی ترقی پذیر قوموں کو دبائے رکھے اور تیسری طرف خلیج فارس کی راہ سے ہندوستان کی سرحدات کو بھی متاثر کر سکے۔ برطانیہ کی خواہش ہے کہ سنگا پور کے بحری مستقر کی تکمیل کے بعد حیفا اور عقبہ کے بحری مرکزوں کو جدید استحکام عطا کرے اس استحکام پر لازماً کروڑوں روپیہ خرچ کیا جائیگا مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ آزادی کی نگاہ فلسطین کو قریب سے اور شرق اردن کو کسی قدر دور سے دیکھ رہی ہے۔

اسلامی دنیا کے آزاد ممالک میں سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر جو نئی تحریک اتحاد پیدا ہو رہی ہے اس کو برطانیہ اور اٹلی کی مخالفت کی وجہ سے لازماً ایک جدید اساس ترقی حاصل ہو سکے گی۔ برطانیہ اپنے مفاد کے لحاظ سے متعدد مقامات پر اسلامی سیاست سے اختلاف کرے گا لیکن حالات نے اس کو اس درجہ مجبور کر دیا ہے کہ وہ مشرق قریب اور وسط ایشیا کی

اسلامی طاقتوں کا تعاون حاصل کرے۔

اگرچہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۴ء میں یہ اعلان کیا کہ اتحاد اسلامی کا تصور مذہبی ایک ناقابل فہم تصور ہے، لیکن یہ تصور ایک جدید صورت میں قابل فہم ہی نہیں لائق عمل معلوم ہو رہا ہے ترکی کمال۔ ایرانی رضا۔ افغانی فیض محمد اور عراقی غازی کی کوشش سے مجلس اقوام کے اصول پر ایک ایسی ایشیائی مجلس کی تشکیل کا سلسلہ جاری ہے جو ترکی۔ ایران۔ افغانستان اور عراق کو متحد کر دیگی یہ اتحاد۔ اتحاد اولیٰ قرار دیا جائیگا اور اسکے ماتحت عراق حجاز اور یمن متحد ہو کر اتحاد ثانی کا نمونہ پیش کرینگے مصر، فلسطین شام اور شرق اردن کیلئے شرکت کا دروازہ کھلا رہیگا۔ ہم یقین کی آنکھ سے جو کچھ دیکھ رہے ہیں اسکا اندازہ کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزاد ممالک کی یہ جدوجہد اور سیاسی تنظیم اسلامی دنیا کے غلام ممالک اسلامی ہند طرابلس۔ شرق اردن۔ ریاستہائے عدن۔۔۔۔ بحرین الجیریا اور مراکش پر بھی زبردست اثر ڈالے گی۔ گر یہ اثر سیاسی ذرائع کے مقابلہ میں اخلاقی اور تمدنی ذرائع سے وسیع ہوگا۔

ترکی میں جمہوریت کے قیام اور الغائے خلافت کے وقت ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو عثمانی سلطنت کا حامی تھا۔ اس طبقہ کے دل کی زندہ خواہش یہ تھی کہ منصب خلافت کی وجہ سے ترکی کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کو باقی رکھا جائے لیکن کمالی ترکوں نے اس آرزو کو ایک گہری قبر میں دفن کر دیا تھا۔ اسلامی دنیا کے وہ پختہ کار مذہبی رہنما جنھوں نے ترک اعظم مصطفےٰ کمال کو مجدد خلافت کا خطاب دیا تھا نوجوان ترکوں کے رجحانات پر بہت برہم ہوئے۔ انھوں نے آخری تجویز کی حیثیت سے غازی پاشا سے درخواست کی کہ اگر عثمانی سلطنت کا قیام ترکی کے داخلی مصالح کے خلاف ہے تو خود ان کو صدر جمہوریہ کی حیثیت سے منصب خلافت کو قبول کر لینا چاہئے ترک اعظم نے اس مطالبہ کی قوت کو محسوس کیا لیکن انھوں نے اغلباً ۱۹۲۲ء میں اسکے متعلق اپنی رائے کو واضح الفاظ میں پیش کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ خلافت کا تصور ناقابل عمل ہے۔ جنگ عظیم کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیائے اسلام نے خلافت کے منصب عظمیٰ کا احترام نہیں کیا ہندوستان کے مسلمان۔ صلیب کا علم لیکر باب خلافت تک پہونچے۔ عربوں نے قبائے خلافت کو پارہ پارہ کر دیا۔

افغانستان مناسب امداد دینے سے قاصر رہا۔ اور آزاد قبائل میں خلیفۃ المسلمین کے فرامین کی کوئی قیمت محسوس نہیں کی گئی اسکے برعکس محض منصب خلافت کی وجہ سے ترکی کو تمام یوروپ کی مخالفت برداشت کرنی پڑی۔ اسلئے ترکی عملی حیثیت سے کبھی قیام خلافت کا موید نہیں ہوسکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بین الاقوامی صورت حال کے معتدل ہونے اور آزاد اسلامی ممالک کے طاقت حاصل کرنے پر باضابطہ معاہدوں کی روشنی میں ایک ایسی متحدہ اسلامی فیڈریشن قائم کی جائے۔ جس کے صدر کا اثر واقتدار زمانہ ماضی کے خلیفہ کے اثر واقتدار کے مماثل ہوگا

آج ہم دیکھتے ہیں کہ چند ماہ بعد اس قسم کی اسلامی مجلس اقوام کا تصور عملی صورت اختیار کر رہا ہے ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ اگر ترکی۔ ایران۔ افغانستان۔ عراق۔ حجاز اور یمن کا یہ اتحاد جامع تفصیلات کے ساتھ استحکام پذیر ہوگیا تو اسکے اثرات کا حلقہ تمام اسلامی دنیا کو اپنی آغوش میں لے سکیگا۔

توحید اور اس کے اثرات

(۵)

گذشتہ نمبر میں تم پڑھ آئے ہو کہ جب خدا کی ذات و صفات کے متعلق وہ خاص علم حاصل ہوتا ہے جسے ہم عقیدۂ توحید کہتے ہیں تو اس کا اثر سب سے پہلے قلب و ذہن پر پڑتا ہے۔ وہ تمام غلط و فاسد خیالات جو صحیح علم کے نہ ہونے کی وجہ سے دل و دماغ میں گھس جاتے ہیں اس عقیدہ کے رسوخ کے بعد خود بخود کافور ہو جاتے ہیں اور ان کے بجائے، صحیح، روح پرور اور سکون آفریں خیالات و جذبات، دل و دماغ کو اپنا نشیمن بنا لیتے ہیں۔ اور چونکہ ہمارے خیالات ہی ہمارے اعمال و حرکات کی اساس ہیں جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے اس لئے خیالات کا یہ انقلاب، عملی انقلاب کا موجب ہوتا ہے اور ہم سے ایسے افعال صادر ہونے لگتے ہیں جو اس انقلاب سے پہلے صادر نہیں ہوتے تھے

توحید کا انقلاب انگیز اثر اور ہمارا قصور ادراک

عقیدۂ توحید کا ہمارے ذہن و دماغ اور اعضاء و جوارح پر جو انقلاب انگیز اثر طاری ہوتا ہے، حقیقت میں ہم لوگ اس کی حقیقی اہمیت و عظمت کے ادراک سے قاصر ہیں، کیونکہ اس کا کوئی اثر خود ہم پر کبھی طاری نہیں ہوتا۔ مسلمان تو ہم بھی ہیں اس لئے ایمان کا یہ انقلابی اثر ہم پر طاری ضرور ہونا چاہئے مگر چونکہ ایمان کسب کی بجائے ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ بچپن میں کچھ باتیں سرسری طور پر خدا کی ذات و صفات کے متعلق بتا دی گئی ہیں، جنہیں بے سوچے سمجھے اور بغیر دلیل و برہان کے نظری طور پر ہم نے صحیح تسلیم کر لیا ہے نہ تو ہمیں خدا کی ذات و صفات کے متعلق وہ سب کچھ معلوم ہے، جو معلوم ہونا چاہئے۔ اور نہ جو کچھ معلوم ہے اس کا اس طرح اذعان و یقین ہے کہ وہ کسی نتیجہ یا اثر کا موجب ہو سکے، اس لئے مسلمان ہونے کے باوجود ہماری زندگی میں ہم پر اس عقیدہ کا وہ ذہنی اور عملی اثر کبھی طاری ہی نہیں ہوتا جو اس عقیدہ کا اقتضاء ہے۔ اسی لئے ہم اس کی عظمت کے احساس سے بھی قاصر ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو ایک مدت تک کفر و شرک میں مبتلا رہتے ہیں اور اس کے بعد دلائل و براہین کی روشنی میں خدا کی وحدانیت اور اس کے اوصاف حسنہ کا علم حاصل کرتے ہیں، یا وہ لوگ جو ہوتے تو وراثتی مسلمان ہیں، لیکن رشد و تمیز کی عمر میں پہونچکر اپنی عقل و فہم اور طلب و جستجو سے خدا کی حقیقی معرفت حاصل کر لیتے ہیں یہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں کہ اس عقیدہ کا انسان کے ظاہر و باطن پر کتنا زبردست اثر پڑتا ہے۔

عقیدۂ توحید کا اولین، سکون بخش اثر

خدا کی صحیح معرفت سے پہلے کائنات، خالق کائنات، نظام کائنات کے متعلق جو کچھ انسان تصور قائم کرتا ہے چونکہ وہ غلط اور اس کے ضمیر و فطرت کے خلاف ہوتا ہے اس لئے اگر روح مردہ نہ ہو جائے تو وہ ہمیشہ روحانی اضطراب و بے چینی میں مبتلا رہتا ہے۔ انسان کے اردگرد بیشمار ایسے حوادث و واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جو اس کے ذہن و دماغ کو اپنی

طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن خدا کے صحیح تصور کے بغیر، انسان اپنی تمام ذہنی کدوکاوش کے باوجود ان کی کوئی تسلی بخش تاویل و توجیہ نہیں کرسکتا اس لئے اس کی زندگی، دائمی اضطراب و پریشانی کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔[1]

دنیا کا جملہ کاروبار ایک خاص نظام کے ماتحت جاری ہے۔ انسانی ترقی و عروج، انحطاط و زوال، عزت و ذلت، فتح و شکست ہر ایک چیز خدا کے ٹھہرائے ہوئے اصول و قوانین کے ماتحت رونما ہوتی ہے۔ انہیں کو فطرت اللہ یا سنت الٰہی کی تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کو کامیاب و بامراد بنانے کے لئے جب تک سنت اللہ کی متابعت نہیں کرے گا۔ دنیا میں ہمیشہ ناکامی و نامرادی اور بدبختی و ذلت کا شکار رہے گا اور اس کی زندگی اس کے لئے عذاب بن جائے گی۔ خدا کی صحیح معرفت کے بغیر نہ تو ان سنن الٰہیہ کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو سکتا ہے جو اس کی بنائی ہوئی کائنات میں جاری و ساری ہیں اور نہ انسان کے اندر وہ اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں جو اس کی زندگی کے نظام کو ان کے مطابق کردیں اس لئے اس کا خدا کی معرفت کے بغیر کامیاب، بامراد اور پرمسرت زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ قرآن میں بیشمار مقامات میں فوز و فلاح کو مومنین کیلئے اور خسران و بدنصیبی کو کافرین و منکرین کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ مومن ان اصول و قوانین کی اتباع کرتا ہے جو فوز و فلاح کے ضامن ہیں اور منکر اپنی جہالت و انکار کی وجہ سے ان راستوں پر پڑ جاتا ہے جو ناکامی و خسران کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص، ظاہری کامیابی کے اصول و قوانین کا پابند ہو کر کچھ کامیابی حاصل بھی کرلے، جب بھی دوسرے سنن الٰہیہ سے ناواقف ہونے اور ان کے خلاف زندگی بسر کرنے کی وجہ سے پرمسرت زندگی سے وہ محروم رہتا ہے۔ نظام کائنات اور انسان کے نظام زندگی میں جب تک توافق و ہم آہنگی نہ ہو اسے سکون و اطمینان میسر نہیں آسکتا اور اسے پورا ماحول اپنا مخالف نظر آتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کے بغیر وجوہ مذکورہ اور ان کے علاوہ دوسرے غیر مذکور اسباب و وجوہ کی بنا پر ہمہ وقت انسان کا قلب مضطرب، دل پریشان اور روح بے چین رہتی ہے۔ جب خدا کی صحیح معرفت حاصل

[1] گزشتہ صدی کے نصف آخر میں جبکہ یورپ میں مسئلہ ارتقا کی اشاعت نے بڑا دہریت کے اثرات بہت بڑھے ہوئے تھے انگلستان کے دو مشہور ترین سائنسدان پروفیسر جارج رومانیز اور پروفیسر کنگ ڈن کلیفورڈ خدا کے منکر ہو گئے لیکن دونوں کی تحریروں کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کفر و الحاد کی تکلیف بری طرح محسوس کرتے تھے۔ ایک مغربی فاضل ڈاکٹر سنڈرلینڈ نے اپنے ایک مقالہ میں جسکا ترجمہ معارف، دسمبر میں شائع ہوا ہے ان دونوں کے چند جملے نقل کئے ہیں جن سے اس پر روشنی پڑتی ہے پروفیسر کلیفورڈ اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں "اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ وجود باریتعالیٰ کے قائل ہیں، ان کے لئے یہ عقیدہ تسکین و تسلی کا باعث ہے اور اس سے محروم ہو جانا نہایت ہی تکلیف دہ ہے۔ اس میں کم از کم ہمارے زمانہ کے ان بہت سے آدمیوں کو شبہ نہیں ہو سکتا جو یا تو اس وقت بھی اس عقیدہ کے قائل ہیں یا بچپن میں اسے حاصل کرنے کے بعد ایسے رنج و تکلیف کیساتھ جس کو چھوڑ چکے ہیں جو صرف پیدائشی مذہب کے ترک کرنے سے محسوس ہو سکتی ہے"۔ پروفیسر رومانیز نے اپنی روحانی بےچینی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔ "مجھے اس امر کا اقرار کرلینے میں شرم نہیں کہ عملی طور پر یوں خدا کا انکار کر دینے سے کائنات کے حسن و خوبی کی روح جاتی رہی ...... تاہم جب بعض اوقات میں بالکل لابدی طور پر غور کرتا ہوں کہ اس مذہب اور عقیدۂ خداوندی کی مقدس عظمت جو کبھی میرا تھا اور وجود کے وحشت انگیز راز کے درمیان جیسے میں اب دیکھ رہا ہوں کس قدر مہیب فرق ہے تو میرے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ شدید ترین تکلیف جس کی میری فطرت اہل ہے محسوس نہ کروں۔"

ہو جاتی ہے تو دل کی مرجھائی ہوئی کلی شاداب و شگفتہ ہو جاتی ہے، روح گراں بار اور پریشان کن بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ دماغ کا ہر ہر گوشہ بے چین و مضطرب کرنے والے خرافات و اباطیل سے پاک ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور کائنات کے تمام سربستہ اسرار قابل فہم اور جملہ واقعات و حوادث ایک سمجھ میں آنے والے رشتہ و نظام سے وابستہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کی زندگی نظام کائنات کے مطابق اور اس کی ہم آہنگ ہو جاتی ہے اس لئے دنیا کا ہر ذرہ ذرہ اس کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی روح کی بے چینی دور ہو جاتی ہے۔ اس کا قلبی اضطراب کافور ہو جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ سخت تاریکی سے دفعۃً روشنی میں آگیا یا کسی نہایت گندی جگہ سے نکل کر کسی خوشنما گلزار میں پہونچ گیا۔

روحانی اطمینان اور اس کی قدر و قیمت

روحانی اطمینان اور قلبی سکون کی یہ دولت پا کر انسان کو جو مسرت لاحق ہوتی ہے وہ اسے اس قدر عزیز ہوتی ہے کہ وہ اس کے لئے دنیا کی تمام مسرتوں کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ تخت و تاج پر لات مار دیتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے اعزاز کو ٹھکرا دیتا ہے اس کے لئے ناقابل برداشت مصیبتیں خوشی خوشی برداشت کرتا ہے، لوگوں کا طعن و تشنیع انگیز کرتا ہے، خویش و اقارب کا قطع تعلق گوارا کرتا ہے، گھربار مال و دولت چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ غرض جسقدر مصائب پیش آتے ہیں، وہ سب کا خندہ پیشانی کیساتھ استقبال کرتا ہے پر اس دولت سے محروم ہونا جو عرفت الٰہی کو حاصل ہوئی ہے کسی حال میں گوارا نہیں کرتا۔

ایمان کا روحانی سکون حاصل کرنے کیلئے جسمانی تکلیفیں برداشت کرنا

حضرت بلالؓ کو کفار نے لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیا کہ وہ جسمانی تکلیفوں سے گھبرا کر اس روحانی دولت سے دستکش ہو جائیں مگر جان پر کھیل کر انہوں نے اس کی حفاظت کی۔ حضرت خبابؓ کے سر پر گرم لوہا رکھا گیا اور انھیں انگاروں پر لٹا کر گھسیٹا گیا لیکن وہ اس بیش بہا سرمایہ کو ہاتھ سے دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حضرت صہیب، حضرت عمار ابو فکیہ حضرت سمیہ کو ہر قسم کا جسمانی آزار پہونچایا گیا، لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں لٹایا گیا، پاؤں میں رسیاں باندھ کر مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا گیا لیکن ان سب تکلیفوں کے باوجود بھی وہ اپنی اس متاع عزیز کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے جس زمانہ میں انھیں یہ تکلیفیں پہونچائی جا رہی تھیں ظاہر ہے کہ اس وقت ان میں سے کوئی بھی ایک لمحہ کے لئے یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ مصائب آئندہ کی خوش گوار زندگی کا پیش خیمہ ہیں یا ان مصائب و محن کے بعد کوئی شاندار دور آنے والا ہے اس لئے ان کے اس تجلد و تحمل اور صبر و جفاکشی کے متعلق سوا اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف اس لئے تھا کہ انھیں دولت ایمان عزیز تھی۔

متمولانہ زندگی سے دستکش ہونا

اوپر جن بزرگان کرام کا نام لیا گیا ہے یہ وہ لوگ تھے جو لونڈی، غلام یا غریب الوطن تھے اس لئے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ

ان کا دین کی حفاظت کے لئے ان شدائد کا برداشت کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ وہ اس قسم کے شدائد برداشت کرنے کے عادی تھے لیکن کیا حضرت عثمانؓ حضرت زبیر بن عوام اور حضرت ابوبکر وغیرہم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے متعلق بھی یہ گمان کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ لوگ قریش کے نہایت دولتمند اور معزز شخص نہیں تھے؟ لیکن اس کے باوجود کیا ان لوگوں نے اپنی اس روحانی دولت کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیفیں برداشت نہیں کیں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضرت عثمان جب ایمان لائے تو خود ان کے چچا نے انھیں رسی میں باندھ دیا۔ حضرت ابوبکر نے جب ایک تقریر کے ذریعہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان عام کیا تو انھیں اس طرح مارا گیا کہ لوگوں کو ان کی موت کا یقین آگیا۔ حضرت زبیر بن عوام کے ایمان لانے کے بعد ان کا چچا انھیں چٹائی میں لپیٹ کر لٹکا دیتا اور پھر نیچے سے ان کی ناک میں دھواں دیتا۔ اگر معرفت الٰہی میں کوئی غیر معمولی لذت ومسرت نہ ہوتی تو اس کے لئے یہ لوگ اپنی دنیاوی راحت کی زندگی چھوڑ کر از خود یہ مصائب کیوں مول لیتے۔

گھر بار اور خویش واقارب کو چھوڑنا

انسان کے لئے ان مصائب وشدائد سے زیادہ صبر آزما خویش واقارب سے تعلقات کا منقطع کرنا اور انھیں اور اپنے آبائی دیار ووطن کو ترک کرکے پردیس کی راہ لینا ہے لیکن جب کوئی شخص، دولت ایمان سے بہرہ ور ہو جاتا ہے تو اس کی حفاظت کیلئے یہ تمام ناقابل برداشت چیزیں، خوشی خوشی برداشت کرلیتا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص جب اسلام لائے تو ان کی ماں نے قسم کھائی کہ جب تک وہ اسلام نہ چھوڑیں گے نہ وہ کھانا کھائیں گی نہ پانی پئینگی۔ وہ مسلسل کئی روز کے فاقہ سے بیہوش ہو جاتی ہیں لیکن حضرت سعد صاف صاف کہدیتے ہیں کہ اگر تمہارے قالب میں ہزار جانیں بھی ہوں اور ایک ایک کرکے ہر جان نکل جائے تب بھی میں اپنے دین کو نہ چھوڑوں گا۔

صحابہ کرام نے اپنا مال واسباب زمین وجائداد سب کچھ چھوڑ کر مکہ سے چلا جانا گوارا کرلیا لیکن ایمان کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی معرفت ایک عظیم الشان خزانہ ہے جس کو پانے کے بعد انسان وہ مسرت محسوس کرتا ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کرسکتی اسی لئے وہ اس لئے سب کچھ چھوڑنے اور ہر تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جب خدا پرستی کا نشہ کسی کو چڑھ جاتا ہے تو تکلیف وتہدید ترغیب وایذا رسانی کوئی چیز اسے اتار نہیں سکتی۔

ایمان وارتداد

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ایک مرتبہ اس کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں وہ مدت العمر اس سے دستکش ہونے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ شاذونادر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہوگیا ہو۔ کون ہے جو نور پر ظلمت کو اور گلزار پر آگ کے انگاروں کو ترجیح دے گا؟ ایمان سرچشمہ حیات ہے، سرمایہ سکون ہے، وجہ اطمینان ہے، باعث قرار ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ایسی دولت پاکر اسے چھوڑ دے اور اپنی اس زندگی کی طرف لوٹ جائے جس میں ذلت

نامرادی اضطراب و بے چینی اور غم و حزن کے سوا کچھ نہیں! یہی وجہ ہے کہ نہ ابتدائے اسلام کے صبر آزما شدائد و مشکلات مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر سکیں اور نہ اس زمانہ میں زمانہ حال کی تمام ترغیبات اور غیر مسلم اقوام کی مسلسل کوششیں انھیں اسلام سے پھیرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ یہی چیز ہے جو اسلام کی صداقت اور اسکے فطری مذہب ہونیکا زبردست ثبوت فراہم کرتی ہے۔

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کا حال تمہیں معلوم ہو چکا۔ یہ دردناک مظالم و شدائد بھی ایک شخص کو دین سے برگشتہ نہ کر سکے۔ یقیناً اسلام کے اندر کوئی خاص جذب و کشش تھی جس نے انکو ترک اسلام سے خارج ہونے دیا یقیناً خدا پرستی میں کوئی خاص لذت تھی جسے حاصل کرنے کے لئے بیشمار لوگ اس حالت میں ٹوٹے کہ وہ جانتے تھے کہ اسے قبول کرنا موت کو دعوت دینا ہے بشرکین مکہ کی بیرحمیوں اور سفاکیوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ مسلمان اپنے ایمان پر قائم رہے بلکہ اس میں اس درجہ دلاویزی اور کشش تھی کہ ان تمام خطرات و مصائب کے باوجود دوسرے لوگ اس پر پروانہ وار ٹوٹتے رہے قیصر نے جب ابوسفیان سے یہ سوال کیا کہ محمد کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں تو اسے اس کے دربار میں مجبوراً اعتراف کرنا پڑا کہ بڑھتے جاتے ہیں اور اس چیز کو قیصر نے اسلام کی صداقت و حقانیت کی دلیل قرار دیا۔ اسلام کے علاوہ دنیا میں اور بھی بیشمار مذاہب ہیں جن کے پیرو گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن پیروان اسلام میں جو نشہ دینی پایا جاتا ہے اور جس استقامت و جوانمردی کا ثبوت ان کی زندگی میں ملتا ہے اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب کے پیرؤں میں نہیں ملتی۔ یہ ایک حقیقت مسلمہ ہے جس کا اعتراف دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی ہے ایک نصرانی مورخ لکھتا ہے "عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (صلعم) کے مسائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا آپ کے پیرؤں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ کی ابتدائی پیرؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔۔۔ جب عیسیٰ کو سولی پر لیگئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشہ دین جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چلدیئے۔۔۔۔ برعکس اس کے محمد (صلعم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا"[۵]

مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کی ناکامی

اس زمانہ میں مسلمانوں اور اسلامی ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے کروڑوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے بہترین دل و دماغ رکھنے والے افراد شب و روز اس کام میں مصروف رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود عیسائیت کی تبلیغ کسی گوشہ میں کامیابی سے دوچار نہیں ہوتی۔ ابھی حال ہی میں مشہور عیسائی رسالہ "مسلم ورلڈ" میں ایک مشہور عیسائی مبلغ ڈاکٹر وائٹ کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا خلاصہ ہمارے بعض اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے نہایت صفائی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ "مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جس قدر کوششیں کی گئی ہیں ان کا نتیجہ نمایاں مسلسل ناکامی کے سوا کچھ نہیں۔" انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ اب ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمیں بعض میدانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام بالکل ترک کر دینا چاہئے" مضمون نگار نے چرچ کو مشورہ بھی دیا ہے

کو مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام بالکل چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ ان میں تبلیغ کی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ مضمون نگار ڈاکٹر وائٹ کوئی معمولی مبلغ نہیں بلکہ وہ امریکہ کے بیرونی مشنوں کے انتظامیہ بورڈ کے سکرٹری ہیں اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے بعض اسلامی ممالک کا دورہ کرنے اور وہاں کے مشنوں اور ان کے کاموں کو دیکھنے کے بعد لکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا تعلق اسلام سے ظاہری اور نہایت معمولی ہے مذہب کی تعلیمات سے وہ بالعموم جاہل و بیگانہ ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں اپنے ایمان کی دولت اس قدر عزیز ہے کہ عیسائی مبلغین انھیں عیسائی بنانے کی تمام کوششوں میں ناکام رہتے ہیں، اسلام نے خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو تعلیمات پیش کی ہیں اگر ان میں قلب و ذہن کے سکون و اطمینان کا کوئی زبردست خزانہ مستور نہ ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ عیسائی کروڑوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی عیسائیت کی تبلیغ میں ناکام رہتے! بلاشبہ اس قسم کی مثالیں معدوم نہیں کہ کوئی مسلمان حرص و طمع میں مبتلا ہو کر عیسائی ہوگیا ہو یا کوئی نومسلم اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا ہو۔ لیکن اس قسم کے واقعات نہایت شاذونادر پیش آتے ہیں اور عموماً اس قسم کے مذہب بدلنے والے یا ارتداد اختیار کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں میں مذہب گھر نہیں کرنے پاتا، یا وہ دنیاوی اغراض کے ماتحت اسلام قبول کرتے ہیں۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ کسی کے دل میں خدا پرستی کا اصلی کیفیت پیدا ہو جائے اور پھر اسے دنیاوی حرص و طمع یا تہدید و ترغیب متزلزل کردے۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آئے تو سمجھنا چاہئے کہ اسے ایمان کی دولت نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسی بنا پر بخاری شریف کی ایک روایت میں ایمان کی علامات میں ارتداد سے شدید نفرت کو بھی گنایا گیا ہے۔

ثلاث من کن فیه وجد حلاوة الایمان ان یکون الله ورسوله احب الیه مما سواهما وان یحب المرء لا یحبه الا لله وان یکره ان یعود فی الکفر کما یکره ان یقذف فی النار

تین شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت و شیرینی کا مزہ پائیگا (۱) خدا اور اس کا رسول تمام اسوا چیزوں سے اس کے نزدیک زیادہ محبوب ہوں (۲) جو شخص کسی سے محبت کرے۔ تو اس کی یہ محبت محض اللہ کے لئے ہو (۳) اور کفر میں واپس جانے کو . . . . ایسا ہی برا خیال کرے جیسا کہ وہ آگ میں ڈالے جانے کو برا سمجھتا ہے۔

ایمان کے بعد جب تک کفر سے اس درجہ نفرت نہ پائی جائے سمجھنا چاہئے کہ ایمان کامل نہیں کفر و شرک کی زندگی آگ کے مشابہ ہے۔ جو شخص توفیق الٰہی سے اس سے واقعی نجات پا جائے کیسے ممکن ہے کہ وہ از خود پھر اسی کو اختیار کرلے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے علم کے بعد انسان کے دل و دماغ کی کیفیت میں جو انقلاب پیدا ہوتا ہے وہ نہایت اہم اور غیر معمولی ہے . . . . . اس کو باقی رکھنے کے لئے انسان دنیا کی تمام تکلیفوں کو برداشت کرسکتا ہے اور ہر چیز کو دستبردار ہوسکتا ہے آج کی صحبت میں صرف اس انقلاب کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے آئندہ انشاءاللہ اس انقلاب کے خاص خاص ذہنی ...

تفسیر سورۃ بقرہ

(۱)

(از امام جلیل سید رشید رضا مصری مرحوم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

الم - وغیرہ حروف مقطعات، ان سورتوں کے نام ہیں جن کی ابتدا میں یہ مذکور ہیں۔ بعض حروف مقطعات جیسے الم کئی کئی سورتوں کے اوائل میں ذکر کئے گئے ہیں۔ گویا وہ متعدد سورتوں کے اسماء ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ چند سورتوں کے اسماء ایک ہوں کیونکہ بعض مشترک ایسے ہوتے ہیں کہ مسمی سے ان کے اتصال کی بنا پر ان کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔ سورتوں کے نام رکھنے اور ان کے اسماء کے اختلاف میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ یہ ہم صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی طرح نام رکھنے والے کے سپرد کرتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ خواہ مخواہ اس کی توجیہ و تعلیل کے لئے ہم اپنی طرف سے باتیں گھڑیں دراں حالیکہ ایسی لغزشوں سے بچنا بہت دشوار ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ استاذ امام کی تقریر کا خلاصہ ہے اب کچھ ..... میں اپنی طرف سے کہنا چاہتا ہوں۔

(۱) یہ حروف جو سورتوں کی ابتدا میں مذکور ہیں، الگ الگ بغیر اعراب کے اس طرح پڑھے جاتے ہیں، الف-لام میم۔ ان کے آخری حروف پر اعراب کا گذر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ترکیب کلام میں داخل نہیں۔

(۲) یہ حروف اعراب سے خالی ہوتے ہیں اس لئے یہ قول زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے کہ ان حروف سے بعض سورتوں کی ابتدا، قرآن کے وصف اور اس کے اعجاز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ چنانچہ جن سورتوں کی ابتدا میں حروف مقطعات ہیں ان کے بعد ہی قرآن کی توصیف ہے یا اس کے اعجاز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جن کی سورتوں میں حروف مقطعات سے ابتدا ہوئی ہے، ان سے مشرکین کو اور جن مدنی سورتوں میں ان حروف سے ابتدا ہوئی ہے ان سے خصوصیت کے ساتھ اہل کتاب کو قرآن کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور اس معجزانہ کلام کے ذریعہ ان پر حجت قائم کی جاتی تھی۔ اس کی پوری تفصیل سورۃ اعراف میں ملے گی۔

(۳) بعض محققین علماء لغت مثلاً فراء، قطرب، مبرد اور زمخشری اور بعض علماء حدیث مثلاً شیخ الاسلام احمد تقی الدین ابن تیمیہ اور حافظ مزی وغیرہ نے حروف مقطعات کی حکمت صرف اعجاز قرآن کی طرف اشارہ کرنا قرار دیا ہے۔ زمخشری نے

اس پر بہت طویل بحث کی ہے جو کشاف اور تفسیر بیضاوی وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(۴) ان حروف کے متعلق جتنی باتیں کہی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ ضعیف بات یہ ہے کہ حساب جمل کے اعتبار سے ان حروف مقطعات کے ذریعہ اُمت مسلمہ کی مدت حیات وغیرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق ابن اسحاق نے بعض ضعیف روایتیں بھی نقل کی ہیں۔

(۵) اسی کے لگ بھگ بعض شیعوں کا یہ قول بھی ہے کہ ان حروف سے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی فضیلت یا ان کی خلافت کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔ وہ اسے اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ حروف مقطعات میں جتنے حروف مکرر ہیں انھیں حذف کر دیتے ہیں اور باقی حروف کو ایسے جملوں میں ڈھال لیتے ہیں جن سے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی مدح یا فضیلت یا . . . ان کی خلافت کی ترجیح ثابت ہوتی ہو۔ لیکن اس قاعدہ کے ماتحت ایسے جملے بھی ڈھالے جا سکتے ہیں جو اس کے برعکس ہوں جیسا کہ ہم نے اپنے مضمون "مصلح و مقلد" میں واضح کیا ہے۔

(۶) اس وقت بھی لوگوں میں یہانتک کہ بعض علمائے تاریخ و لغت میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کا خیال ہے کہ ان حروف میں بعض دینی اور تاریخی حقائق کی طرف اشارے ہیں جو آیندہ کبھی ظاہر ہو کر رہیں گے۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ کتاب کے معنی مکتوب کے ہیں اور اس سے وہ خطوط و نقوش مراد ہوتے ہیں جو کسی معنی پر دلالت کریں اشارہ کبھی تعیین شخصی کا فائدہ دیتا ہے اور کبھی تعیین نوعی کا یہاں اشارہ (ذالک) سے کتابوں کی کوئی خاص نوع مراد نہیں ہے بلکہ ایک خاص متعین کتاب مراد ہے۔ آنحضور صلعم کو ایک کامل ترا ور دین و دنیا کے تمام معاملات میں پوری رہنمائی کرنے والی کتاب دینے کا وعدہ فرمایا گیا تھا اسی موعود کتاب کی طرف ذالک سے اشارہ کر دیا۔ قرآن کی اور سورتوں میں بھی اسی طرح اس کتاب کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، اگرچہ ان اشارات والی آیات کے نزول کے وقت مشارالیہ یعنی قرآن کریم تمامہ نازل نہیں ہوا تھا لیکن اشارہ کے صحیح ہونے کے لئے مشارالیہ کے ایک حصہ کا موجود ہونا ہی کافی ہے سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات کے نزول سے پہلے قرآن کا بہت کافی حصہ نازل ہو چکا تھا اور وہ آنحضور صلعم کے ارشاد کے مطابق لکھا اور یاد کیا جا چکا تھا پس اس حصہ کی طرف اشارہ کرنا گویا پوری کتاب کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ بلکہ صحت اشارہ کے لئے یہی کافی ہے کہ خود سورۃ بقرہ کو مشارالیہ قرار دے لیا جائے کیونکہ ھدی للمتقین کی صفت صرف اس سورۃ پر بھی صادق آسکتی ہے۔ لیکن پہلی صورت زیادہ بہتر ہے۔ کتاب کے ایک جزء کے نزول کے وقت پوری کتاب کی طرف اشارہ کرنا گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلعم سے کتاب نازل کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے اسے پوری کتاب نازل کرکے پورا کرے گا۔

قرآن کے لئے لفظ "کتاب" بمعنی مکتوب و مرقوم استعمال کرنے سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کی کتابت کا حکم خود آنحضور صلعم نے فرمایا تھا اور کتاب وہی ہے جو آپ کے حکم سے لکھی گئی۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ کتاب نزول کے وقت بالفعل لکھی ہوئی نہ تھی کیونکہ تم کتابت سے پہلے بھی کتاب کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے جیسے تم کہتے ہو "میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں"، یا تم

کہتے ہو آؤ میں ایک کتاب لکھاؤں"
اشارہ بعید سے شاراليہ کی بلندی و رفعت اور شاعر یا خطیب کے دسترس سے اس کا مرتبہ بلند ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اللہ کے کلام میں مخلوق کے اعتبار سے اشارہ قریب یا بعید استعمال کیا جاتا ہے اس کے اعتبار سے کوئی چیز بلحاظ مکان حسی نہ قریب ہے اور نہ بعید بلکہ سب ہی چیزیں برابر ہیں۔ البتہ معنوی قرب و بعد ہوتا ہے۔

لاریب فیه | ریب کے معنی شک اور گمان کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں کسی جہت سے شک کی گنجائش نہیں نہ اس جہت سے کہ وہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے اور نہ اس لحاظ سے کہ وہ ہدایت و رہنمائی کرنے والی ہے۔ یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ یہ کتاب اپنے دلائل و بینات کے اعتبار سے ایک ایسی کتاب ہے کہ کسی عقلمند اور منصف مزاج شخص کے لئے اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ وہ خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک ایسے شخص پر اتاری گئی ہے جس نے کبھی علوم و فنون کو ہاتھ نہیں لگایا اور جس کا کلام نبوت کے بعد بھی بلاغت و اسلوب کے اعتبار سے اس کتاب سے متشابہ نہ تھا اسی لئے تھوڑی ہی دور بعد فرمایا ہے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله | اگر تم شک میں ہو اس سے جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے تو اس کے مثل ایک سورة لے آؤ۔

غرض یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے نظم و اسلوب و بلاغت اور اپنے معانی و علوم اور تاثیر کے لحاظ سے ایک ایسی کتاب ہے کہ اس میں کسی قسم کے شک و گمان کی گنجائش نہیں ہو سکتی ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی اپنی جہالت یا عدم بصیرت کی بنا پر یا اپنے بغض و عداوت اور تقلید وغیرہ کی وجہ سے شک کرے۔

هدی للمتقین | یہ کتاب کے متعلق دوسری خبر ہے۔ هدی مصدر ہے جیسے تقی اور سری وغیرہ۔ یہاں ہدایت سے مراد مطلق رہنمائی کے نہیں ہیں بلکہ ہاتھ پکڑ کر اور خاص امداد کے ساتھ سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے کے ہیں جیسا کہ سورۃ فاتحہ میں اهدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ کیونکہ قرآن کی ہدایت دو طرح کی ہوتی ہے ایک ان لوگوں کیلئے ہوتی ہے جو بالفعل متقی ہیں، اور دوسری ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو اس کے راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

لفظ متقین "اتقاء" سے ماخوذ ہے اور اس کا اسم تقویٰ ہے۔ مادہ وقی یعنی وقایہ ہے۔ وقایہ کے معنی معلوم یا یعنی مضرت سے دور رہنا یا اس کو دفع کرنا۔ لیکن یہ لفظ خداوند تعالیٰ کی نسبت بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً فایای فاتقون۔ مجھی سے بچو واتقوا الله اللہ سے بچو۔ واتقون یا اولی الالباب لعلکم تفلحون۔ مجھ سے ڈرو اے عقلمندو تاکہ تم کامیاب ہو ان آیات میں اللہ سے ڈرنے اور بچنے کے معنی اس کے عذاب و عقاب سے ڈرنے کے ہیں۔ ورنہ اللہ کی ذات اور اسکی

---

[1] بعض قراء لفظ ریب پر ٹھہر جاتے ہیں اور فیه هدی للمتقین کو الگ ایک مستقل جملہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ صیغہ اور ظاہری نظم کے خلاف ہے جمہور کی قرات اور تفسیر کی تائید سورۂ سجدہ کی پہلی آیت سے ہوتی ہے اور وہ یہ ہے۔ الم۔ تنزیل الکتاب لا ریب فیه من رب العالمین۔ کیونکہ اس آیت میں "فیه" کا تعلق کسی طرح من رب العالمین سے نہیں ہو سکتا

قدرت کی تاثیر سے اور اس کی مشیت کے آگے فطری خضوع اختیار کرنے سے بچنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔

اللہ کے عذاب کو دفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے اجتناب کیا جائے اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان کی اتباع کی جائے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب عذاب اور صاحب عذاب سے ڈرا جائے۔ خوف ابتداءً تو عذاب ہی سے ہوتا ہے لیکن حقیقت میں عذاب ڈالنے والے کی ذات سے ہوتا ہے۔ پس متقی وہ ہے جو اپنے نفس کو عقاب سے بچائے۔ لیکن عقاب سے بچنے کے لئے نظر و رشد کی بھی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ بغیر ان کے، عقاب و آلام کے اسباب کا علم نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔

عقاب الٰہی کی کہ جس سے ہر شخص کو بچنا چاہیئے دو قسمیں ہیں۔

(۱) دنیوی عقاب (۲) اخروی عقاب۔ اور ہر ایک کے اسباب ہیں جن سے بچکر ہر دو قسم کے عقابوں سے اپنے کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ان اسباب کی دو قسمیں ہیں (۱) اللہ کے دین و شریعت کی مخالفت کرنا (۲) اس کے ان اصول و قوانین کی مخالفت کرنا جو نظام کائنات میں جاری ہیں۔ آخرت کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ ایمان صحیح، توحید خالص، عمل صالح اور شرک، کفر و معاصی سے محفوظ رہنا ہے۔ اسکو کتاب الٰہی اور سنت رسول میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ سلف صالحین کا نمونہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے سمجھنے اور ان کی اتباع میں کافی مدد پہونچاتا ہے۔

رہا دنیاوی عقاب تو اس سے بچنے کے لئے ان سنن الٰہی کا علم حاصل کرنا ضروری ہے جو اس دنیا میں کارفرما ہیں خصوصاً ان کا جو اعتدال مزاج اور صحت بدن وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

میدان جنگ میں شکست سے بچنے کے لئے فنون جنگ کی معرفت حاصل کرنا اور ان تمام محیر العقول آلات و اسلحہ کو مہیا کرنا اور ان کے استعمال میں مہارت پیدا کرنا واجب ہے جو اس وقت ایجاد ہو چکے ہیں۔ اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے۔

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل	اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے

ان ظاہری تیاریوں کے ساتھ شکست سے دوچار ہونے سے بچنے کے لئے قوت کے معنوی اسباب یعنی اتحاد و اتفاق، صبر و ثبات اور توکل وغیرہ کے اسلحہ سے بھی مسلح ہونا چاہیئے۔

يا يها الذين امنوا اذا لقيتم فئة فاثبتوا واذكروا الله كثيرا لعلكم تفلحون واطيعوا الله ورسوله ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا ان الله مع الصبرين	اے ایمان والو جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا کہ تم مراد پاؤ اور اللہ کا حکم مانو اور اس کے رسول کا اور آپس میں نہ جھگڑو پس نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا اور صبر کرو بے شک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔

تقویٰ قرآن میں جہاں جہاں استعمال ہوا ہے اور موقع کی مناسبت سے اس کے جو معنی وہاں مراد لئے گئے ہیں ہم انہیں ہر جگہ تفصیل سے بیان کریں گے۔ انشاء اللہ عمالے میں تقویٰ کا بیان سورۃ مائدہ ۵ : ۹۰ و ۹۶ میں ہوگا۔

استاذ امام نے متقین کی تعریف حسب ذیل باتیں ارشاد فرمائیں۔

زمانہ جاہلیت میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو بت پرستی کو برا سمجھتے تھے اور انھوں نے اپنی فطرت صالحہ کی بنا پر معلوم کر لیا تھا کہ بتوں کی پرستش معبود حقیقی کی مرضی کے خلاف ہے وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ خیر کو پسند کرتا ہے اور شر کو ناپسند اس لئے ان میں سے بعض لوگ بت پرستی چھوڑ کر حقیقی معبود کی پرستش کرنی چاہتے تھے لیکن انہیں عبادت وغیرہ کے طریقے معلوم نہ تھے اس لئے وہ صرف خدا کی بارگاہ میں گریہ وزاری اور التجائیں کرتے اور اسی چیز کا نام ان کی زبان میں نماز تھا۔ وہ بعض ان نیکی کے کاموں سے بھی واقف تھے جو عقل کی رہنمائی میں معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح اہل کتاب میں بھی بعض ایسے لوگ تھے جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمائی۔

من اہل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ آناء اللیل وھم یسجدون یؤمنون باللہ والیوم الآخر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات واولئک من الصالحین	اہل کتاب میں ایک فرقہ سیدھی راہ پر رات کے وقت اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں اور وہی لوگ نیک بخت ہیں۔

ایک دوسری جگہ انہی کے متعلق یہ فرمایا:

ولتجدن اقربھم مودۃ للذین امنوا الذین قالوا انا نصاری ذالک بان منھم قسیسین ورھبانا وانھم لا یستکبرون واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا امنا فاکتبنا مع الشاھدین	اور تو پائیگا سب سے نزدیک محبت میں مسلمانوں کے، ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس واسطے کہ نصاریٰ میں عالم ہیں اور درویش ہیں اور اس واسطے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب سنتے اس کو جو اترا رسول پر تو دیکھے ان کی آنکھوں کو کہ ابلتی ہیں آنسوؤں سے۔ اس وجہ سے کہ انھوں نے پہچان لیا حق بات کو۔ کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے سو تو لکھ ہم کو ماننے والوں کے ساتھ

پس متقین سے مراد، مشرکین اور اہل کتاب میں سے یہی لوگ تھے جو اپنی قوم کی گمراہیوں کو دل سے برا سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی حیرانیاں دور ہوں اور انہیں ہدایت کا راستہ مل جائے۔ ان لوگوں کی تعریف میں قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اسے بعض مفسرین مسلمانوں کے لئے ۔ ۔ ۔ یا ان لوگوں کیلئے مخصوص قرار دیتے ہیں جوان ہر دو فرقوں میں سے ایمان لائے تھے حالانکہ اس تخصیص کی کوئی ضرورت نہیں

غرض یہ ہے کہ اس آیت میں متقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی فطرت کی بنا پر یک گونہ عقلی ہدایت سے بہرہ ور ہیں اور ان کے اندر نور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد ہے اور وہ اپنے علم و اجتہاد کے مطابق خدا کے غضب سے بچنے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(باقی)

قدماء کا علم طب

(از ڈاکٹر بیتھو ڈوالین ۔ مترجمہ جناب مولوی نبی احمد صاحب اصلاحی)

ابتداہی سے علم طب کی تاریخ کو علم التشریح، فزیالوجی، اور فلسفے سے اسقدر گہرا تعلق رہ چکا ہے کہ اگر ہم اس فن کے کسی شعبہ کی بھی ابتدائی حالت پر غور کرنا چاہیں تو ہم کو ان علوم کے اختلاط کی بنا پر قدماء کے خیالات نہایت اُلجھے ہوئے نظر آئیں گے۔ طب اور یہ تمام علوم گو ترقی کر کے آجکل "علوم" کے ذی عزت نام سے بہرہ ور ہوگئے ہیں لیکن ان سب کی حیثیت پہلے محض ایک معمہ کی تھی۔ قدیم محققین کو ہر ہر مسئلہ میں ایک خفا نظر آتا تھا جو انسانی عقل کو اکثر مبہوت کر دیتا تھا، اور اپنا سب سے زیادہ ہولناک اثر امراض کے مسائل کے موقعوں پر ظاہر کرتا تھا۔ یہی وجہ عوام بلکہ عقلمند بھی اس وقت یہی خیال کرتے تھے کہ یہ بیماریاں محض ایک عذاب ہیں جن کو دیوتاؤں، یا شیطانوں نے مخلوق پر مسلط کر دیا ہے۔

بیماریوں کی علت کے متعلق اس عالمگیر خیال کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ لوگ دیوتاؤں کو مناسب قربانیوں، دعاؤں، اور مختلف قسم کے کفاروں کے ذریعہ سے راضی کر کے شفا یابی . . . . کی کوشش کرنے لگے اور چونکہ یہ سب مذہبی رسمیں محض عبادتگاہ کا پوجاری ہی انجام دے سکتا تھا، اس بنا پر طبیب وہی شخص ہوتا تھا جو کسی عبادتگاہ کا خادم ہو۔ پہلے پہل تو لوگوں نے طبیب کی اسکے مذہبی آدمی ہونے کی بنا پر بہت عزت کی لیکن بعد کو اس کا وقار نظروں سے گر گیا، انھوں نے جتنی زیادہ دیوتاؤں کو بیماری یا صحت یابی کی علت ہونے کو اہمیت دی اتنا ہی انھوں نے اس بچاری طبیب کو عاجز اور مجبور محض سمجھا۔ بیمار کو طبیب نہیں اچھا کرتا تھا بلکہ دیوتا اچھا کرتے تھے۔ طبیب قرونِ قدیمہ میں ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا حتی کہ ابھی کوئی تین ہی سو برس کا زمانہ گذرا ہوگا کہ وہ نائی جو جراحی کا پیشہ کرتا تھا، بہت ہی حقیر سمجھا جاتا تھا۔

علم طب کی موجودہ عزت

آجکل اطباء، جراح اور ڈاکٹروں کی جو عزت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوگئی ہے، اس کو واقعی اس دورِ جدید کا ایک انقلاب عظیم کہنا چاہیئے۔

ڈاکٹروں کا یہ دفعۃً حاصل کیا ہوا اعزاز اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام انکے تبحر علمی اور وسعت معلومات کے قدرداں ہیں چونکہ فن شفا کی تمام شاخیں پرانے زمانے میں محض نیم معلوم اور ناکمل تھیں، اسوجہ سے طبیب بھی محض معمولی نوشت وخواند اور منیہ اور قدرسے قلیل فلسفے سے آشنا ہوتا تھا، طب اور جراحی کے کسی ایک شعبہ میں بھی اسے پوری مہارت نہیں ہوتی تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ بخلاف اس کے آجکل حکیم اپنے پیشے کے تمام ضروریات سے اچھی طرح باخبر اور ہر ہر طبی مسئلہ کے متعلق ایک قابل استناد رائے رکھتا ہے۔ اسکے متعلق اتنا ہی ضروری نہیں کہ وہ اپنے کام میں مہارت کامل رکھتا ہو بلکہ اس کے علاوہ اسکو

اپنے اس دورِ جدید کا ایک ذکی الطبع، وسیع المعلومات اور شائستہ آدمی بھی ہونا چاہئے۔ علاوہ حکمت کے اسے علم الکیمیا، علم الحیات، طبعیات، بلکہ حق تو یہ ہے کہ علوم عقلیہ کی تمام شاخوں میں کامل دستگاہ رکھنی چاہئے تاکہ وہ اپنے حقیقی فرض یعنی انسان سے ہر قسم کی شکایت کے ازالہ کو انجام دے سکے

قدما کا علوم ریاضیہ و فنون لطیفہ میں خوب ماہر ہونا یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ انھوں نے علم التشریح فزیالوجی، اور کیمیائے اجسام نامیہ (Organic Chemistry) کا علیحدہ علیحدہ علم کی حیثیت سے کیوں نہیں مطالعہ کیا اور ان پر مفصل طریق سے کیوں نہیں بحث کی؟ اس غفلت کا ایک اہم سبب تو وہ انتشار ذہن تھا جو علوم طب کے فلسفہ و دینیات کے ساتھ مخلوط ہونے کی وجہ سے دماغ میں پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ رکاوٹ مذہبی توہمات نے پیدا کر دی تھی جنھوں نے آزادی رائے و آزادی مطالعہ کا دروازہ بالکل بند ہی کر دیا تھا۔

ترقی طب میں سیاسی مداخلت

تمام پہلے مذاہب تعلیم دیتے تھے کہ کسی جسم پر تنقید کی غرض سے ہاتھ رکھنا محض ناشائستہ نہیں بلکہ نجس کام ہے اور یہ خیال صدیوں دلوں میں اس طرح جاگزیں رہا کہ سیاسی قانون میں بھی اسکی مخالفت کے واسطے دفعہ موجود تھی۔ بہت سی صورتوں میں لاش زندہ جسم سے زیادہ مقدس اور عزت بلکہ عبادت کی بھی مستحق خیال کی جاتی تھی اور اب بھی وہ پرانا خیال مکمل طریقہ سے زائل نہیں ہوا ہے جس کی بنا پر تشریح کی بحث اور قطع برید ایک ناپاک حرکت سمجھی جاتی ہے، اس وقت علمی مسئلہ کا انکشاف کرنا خطرہ میں پڑ جاتا تھا، اور چونکہ علم التشریح و فزیالوجی کے مطالعہ کی عام مخالفت تھی اس بنا پر کوئی تعجب نہیں کہ قرون نکہ و متوسطہ میں اطبا محض ان وباؤں کو دفع نہ کر سکے جو ہر زمانہ بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فنا کر دیتی تھیں۔ انسانی نسل کی ترقی کی کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی جو انسان کی اولوالعزمی کو ان کوششوں سے زیادہ ثابت کر سکے جو اس نے زمانہ مابعد میں مذہبی وغیرہ بھی قیود سے الگ ہو کر امراض کی تکالیف دور کرنے میں کیں۔ انسان کے توہمات اور جہالت کے ورطہ سے نکلنے کے بعد زمانہ جتنا ہی متمدن اور مہذب ہوتا گیا، اتنا ہی زیادہ قطعی اور زیادہ معقول کوششیں بیماریوں کے ازالہ اور ان شدید اذیتوں کی تلافی کے واسطے کی گئیں جو انسانی جسم کو ہمیشہ لاحق ہوتی رہیں۔

چونکہ ہمیشہ سے جسم مضر اسباب کے اثر قبول کرنے پر مجبور رہا اور اعضا کے وظائف میں خلل اور ان کے قویٰ میں زوال اور مختلف قسم کی شکایتوں کے ہونے کا امکان موجود ہے، اس وجہ سے انسان کو ہمیشہ سے ان تکلیف دہ کیفیتوں کے ازالہ یا تخفیف کی فکر رہی ہے۔ اس طرح قدیم سے قدیم دور میں بھی انسان کو اسقدر ضرور احساس رہا ہوگا کہ پیٹ کی صفائی قوت ہاضمہ کے فتور میں تخفیف پیدا کرتی ہے اور کا ہے گا ہے اتفاق سے یہ تجربہ بھی ہوا ہوگا کہ بعض جڑی بوٹیوں کا استعمال اس قسم کے فتور کو دفع کرنے کا باعث ہے۔ بیرونی امراض کے موقعہ پر لوگ جانتے رہے ہوں گے کہ بیمار عضو کو آرام دینا، سردی یا گرمی پہونچانا، اور دبانا بھی مفید ہے خاص کر اس حالت میں جبکہ دبانے سے خون کا حد سے زیادہ

بیتا بند ہو جاتے ۔ اس قسم کی نامکمل طبابت اور جراحی آجکل بھی نئے دریافت شدہ خطوں میں خواہ وہاں کے باشندے کتنے ہی وحشی کیوں موجود ہے اور یقیناً جوں جوں وہ لوگ دوسرے علوم و فنون سے آشنا ہوتے جاتے ہیں اسی نسبت سے فن علاج بھی ان کے یہاں ترقی کرتا جاتا ہے ۔ چونکہ طب کا وحشی سے وحشی قوم میں ہونا لابدی ہے اس لئے آؤ ہم اس پر غور کریں کہ زمانہ جاہلیت میں قدمار کے اس علم کے سلسلہ میں کیا کیا خیالات تھے ۔

مصر قدیم اور طب

مصریوں کے یہاں متعدد دیویاں اور دیوتا تھے جن کے ہاتھ میں بیماریوں کے علاج کا انتظام تھا ۔ ان میں سب سے بڑی ایسیس ھندہ دیوی تھی جو اوسی ریس کی بہن اور بیوی بھی تھی ۔ اسنے اپنے بیٹے ہورس کو دوبارہ زندہ کرکے اپنی عظیم الشان طبی قابلیت کا ثبوت دیا تھا ۔ ایسیس کے بعد امھوتپ اور کنو کا مرتبہ تھا ، امھوتپ شہر ممفس کا ایک دیوتا تھا اور مصری اس کو اتنا ہی مانتے تھے جتنا کہ یونانی اپنے طبی دیوتا ایسکیولے پئیس کو مانتے تھے ۔ کنو کو مصری شیر المرضی سے تعقب کرتے تھے ۔ گرچہ سروبسٹس[1] اور دیوتا اپیس کو لوگ اس حیثیت سے پوجتے تھے کہ وہ عورتوں کو اولاد بخشتے تھے اور چونکہ اولاد مصر میں ایک بہت بڑی برکت سمجھی جاتی تھی ، اس وجہ سے ان ہستیوں کو وہ لوگ "اولاد کی برکت نازل کرنیوالے" دیوتا یا دیوی کہتے تھے ۔

قدیم مصریوں کا علم طب تو بہت وسیع تھا اور اگر ان کے معاصرین کے معیار سے اس کا اندازہ لگایا جائے تو وہ کسی حیثیت سے بھی فراہم نہیں تھا ۔ یہ ان کا امتیازی کمال تھا ۔ ان کا علم طب دو حصوں پر منقسم تھا ، طب اعلیٰ اور معمولی طب ۔ طب اعلیٰ میں بھوت پریت کے احضار بذریعہ دعا دیوتاؤں کے طلسموں کو توڑنے اور ان الہامات کے صحیح معنی کے متعلق بحث ہوتی تھی جو بیماروں کو عبادت گاہوں میں معتکف ہونے کے عرصہ میں ہوتے تھے ، اس قسم کی طبابت محض پوجاری کرتے تھے جو عوام پر زیادہ اثر جمانے کی غرض سے جھوٹ موٹ کہتے تھے کہ ہمیں کائنات کے قدرتی قوانین پر بھی اثر حاصل ہے ۔

ان کا معمولی طب تجربات امراض چشم کی واقفیت پر مشتمل تھا آنکھ کے علاج میں ان کے اطبا نے زمانہ قدیم میں خاص شہرت حاصل کی تھی اور حق تو یہ ہے کہ دنیا میں پہلے کحال (طبیب چشم) یہی لوگ تھے ۔ وہ دوسرے بادشاہوں کے درباروں میں بلائے جاتے تھے اور غیر ملکوں میں جانے اور اجنبیوں کی چارہ سازی کرنے کی بہت سی مثالیں انھیں لوگوں نے پیش کیں ۔

علم وظائف الاعضا اور مصر قدیم کی طب

علم وظائف الاعضا (فزیالوجی) میں ان کا خیال تھا کہ پچاس برس کی عمر تک دل میں ہر سال دو درہم کے وزن کی ترقی ہوتی ہے لیکن پچاس سال کے بعد ہر سال دو دو درہم کے وزن کی کمی ہونے لگتی ہے ۔ اس طرح بڈھے لوگ اخیر میں اس نقصان کی وجہ سے مرجاتے ہیں ۔ نیز ان کا عقیدہ تھا کہ جسم پر ہمیشہ چار بھوت مسلط رہتے ہیں ، بکنا[2] کے قول سے پتہ چلتا ہے

---

[1] دیوی بسٹیس کا سر بلی کے مشابہ تھا ۔ [2] نام مصنف

کہ بھوک اور پیاس جسمانی خواہشیں نہیں بلکہ زہریلی ادی چیزیں خیال کیجاتی تھیں جو زبردستی جسم میں داخل ہوجاتی ہیں اور ان کے زہریلے اثر سے بچنے کے لئے جسم کے واسطے کھانا پینا ضروری ہے۔ مُردوں کے متعلق بھی اسی قسم کا توہم پھیلا ہوا تھا۔ اور مصریوں کے زعم کے موافق وہ بھی خوراک و غذا کے محتاج تھے۔

مصری، جوکہ یونانیوں کی طرح انسانی جسم کے چیرنے پھاڑنے سے ہچکچاتے نہیں تھے، واقعی علم التشریح سے آشنا تھا گو اس میں انھوں نے وہ ترقی نہیں کی جو انھیں دوسری قسم کی طبی لیاقتیں حاصل تھی۔ شاہ مینس کے لڑکے ایتھوٹس [illegible] نے علم التشریح پر ایک کتاب لکھی۔ یہ دونوں باپ بیٹے بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی تھے اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ مصر میں حکمت اور حکیموں کی بڑی قدر تھی۔ مصری بدن کی تمام رگوں اور نسوں کے، جن کی تعداد ان کے نزدیک ۲۴ اور ۳۲ کے مابین تھی، اصولی طور پر دو حصوں میں منقسم ہونے سے باخبر تھے۔ ایک خاص نس ان کی تحقیقات کے مطابق چھوٹی انگلی سے شروع ہوکر قلب تک پہونچتی تھی۔ دیوتاؤں پر شراب انڈیلنے کے موقعہ پر وہ لوگ پہلے اس انگلی کو اس میں ڈبو دیتے تھے تاکہ وہ مذہبی رسم دل سے ادا ہو۔ ان کو قلب لیمفاوی غدود، اور آنکھ کے شفاف پردوں سے بھی واقفیت تھی۔

جب ہم ان کے طریقہ پر غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کرنے والے خواہ اسی جتھے کے آدمی ہوتے جیکے وہ بالعموم ہوا کرتے تھے یا دوسرے جتھے کے، اس سے کسی طرح بھی تشریحی معلومات میں اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کے ممی کا طریقہ کتابوں میں مفصل طور سے درج ہے، یہاں ہم اسے محض اسلئے بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ناظرین کو معلوم ہوجائے کہ ممی نے انکے علم التشریح کو کچھ فائدہ نہیں پہونچایا۔

ممی اور قدیم طب مصر

پہلے پہل متوفی کے اعزہ و احباب طے کرتے تھے کہ ممی کے مروجہ تین قسموں میں سے کون سی قسم انجام دی جائے اگر وہ لوگ سب سے "گراں قسم" درجہ اول کی ممی" پسند کرتے تھے تو ان کا ایک مذہبی محرر مردہ کے جسم پر آٹھ لکیریں کھینچتا جن میں سے ایک تو بائیں پہلو پر ہوتی اور سات داہنے پر۔ اس کے بعد ایک شخص جو ذلیل ترین مصری قوم پیرا سکائٹس Parasehiti کا ایک فرد ہوتا، ایک تیز پتھر کے ذریعہ سے پیٹ کے بیچ میں ایک زخم لگاتا جو لمبائی اور سمت کے لحاظ سے ان لکیروں کے متماثل ہوتا۔ زخم لگانے کے واسطے پتھر کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ رسم انتہا سے زیادہ قدیم تھی۔ زخم لگانیوالا اپنے کام سے فارغ ہوکر فوراً بھاگ جاتا کہ کہیں مردے کی بیحرمتی کے جرم میں سنگسار نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ممی کرنے والے جو رومی سلطنت کے زمانہ تک مصر میں ایک خاص جتھے کی حیثیت سے رہے، اپنا کام شروع کرتے تھے۔ آنتیں نکالکر خاص قسم کے ظروف میں جو مٹی، سنگ آہک، یا سنگ مرمر کے ہوتے تھے، رکھتے۔ یہ ظروف مُردوں کے چار فرشتوں امسیت، توامونیف، ہاپی، اور خیب سنوف کے نام سے معنون ہوتے اور ان کے ڈھکنوں پر ان

کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جب وہ لوگ کھوپڑی کو بھی بھیجے کی آلائشوں سے ناک کے راستے سے ٹیڑھی سلاخیں ڈالکر صاف کر لیتے تو دماغ اور شکم دونوں کی خالی جگہوں میں خوشبودار مصالحے وار چینی اور مُر بھر دیتے تھے، پھر کھار ملانے والے مردہ لاش کو کاربونیٹ آف سوڈا کی تحلیل میں ڈالدیتے جہاں یہ بالعموم ستر دن تک پڑی رہتی۔ اس مدت کے گذرنے کے بعد وہ پھر سوڈا سے دھوئی جاتی اور آخر میں تمام جگہ گوند کا لیپ کر کے ایک قسم کے باریک نفیس کپڑے میں لپیٹ دی جاتی۔ بہترین ممی میں بال اور ناخن محفوظ رکھے جاتے لیکن آنکھ کی پتلیاں نکالکر ان کی جگہ پتھر کی آنکھیں بھر دیجاتیں۔

ان سب چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد متوفی کے احباب لاش کو لکڑی کے ایسے صندوق میں رکھتے جس کا اندرونی حصہ اس کی عظمت و شکل کے موافق وسیع ہوتا۔ اس صندوق میں دو دستے بھی ہوتے اور یہ اکثر ہیرو غلیفی تحریروں سے مزین ہوتا، جب یہ سب کچھ ہو چکتا، تو صندوق قبر نما غاروں میں رکھ دیا جاتا، جہاں وہ، جیساکہ ہر شخص کو معلوم ہے، ہزاروں برس بعد بھی محفوظ حالت میں رہا ہے۔

درجہ دوم و سوم کی ممی

درجہ دوم کی ممی میں پیٹ اور دماغ میں انھیں آلائشوں کے باقی بغیر صنوبر کا گوند ٹپکایا جاتا اور پھر لاش کے کھار میں ستر روز رہنے کے بعد وہ گوند اور آنتیں وغیرہ ساتھ ہی ساتھ نکالی جاتیں۔ درجہ سوم کی ممی میں لاش محض دھوکر کھار میں چھوڑ دیجاتی۔ ان طریقوں کے علاوہ مصری اپنے مُردوں کو معمولی طریقے سے بھی دفن کرتے تھے۔ فی الحقیقت غریب آدمی ریت میں بلا کسی کفن کے بھی دفن کئے جاتے۔ اور جو لوگ خوشحال ہوتے وہ اپنے مُردوں کو اینٹوں سے بنے ہوئے محراب دار گنبدوں میں دفن کرتے۔

مصریوں کو بیشمار جڑی بوٹیوں اور انسے مختلف طریقوں سے دوائیاں تیار کرنیکا علم تھا۔ بالعموم انکے یہاں افیون، کچلہ، اسقیل، اور دوسرے قسم کی نباتاتی دوائیاں استعمال ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ حیوانات کے بدن سے اغذی ہوتی اور نیز ایسی دوائیاں استعمال کرتے جو زمانۂ حال کے نقطۂ نظر سے ناگفتہ بہ تھیں۔ زمرۂ معدنیات میں ان کے یہاں سنگِ اثمد، سرمہ کا پتھر، زنگار، سفید سیسہ بطور دوا کے کام آتے تھے۔ ان کے تیل اس قدر نفیس ہوتے کہ بقراط کے زمانے میں یونان تک جایا کرتے تھے۔ عمل دلوانا، اور بھاپ منہ اور ناک کے راستہ سے اندر کھینچنا بھی رائج تھا۔ علاوہ بریں متعدد قسم کے مرہم، گولیاں، ضماد، پھاہے، عرق شائع و ذائع تھے۔

دماغی امراض کے پیدا کرنیوالے، شیاطین خیال کئے جاتے تھے چنانچہ تعویذ بکثرت اور خاصکر اعصابی شکایتوں میں استعمال کئے جاتے تھے۔ بیماری کے علاج میں علم نجوم سے بھی استشارہ کیا جاتا۔ اور چونکہ قدیم مصری دیوتاؤں کی مدد سے قوانین قدرت کو متغیر کرنے کے قائل تھے، اس بنا پر عبادت کا تعمیر ستاروں کی خاصیت میں بھی تغیر پیدا کر سکتا تھا۔ غالباً ہر شخص کو معلوم ہوگا کہ زمانہ متوسط میں مصری عقل و حکمت محض جادوگری، پارس کی تلاش، کیمیاگری، اور علم نجوم پر مشتمل تھی۔ آجکل بھی جہلا کا طبقہ مصری سے ان جھوٹی چیزوں میں ماہر ہونے کی وجہ سے بہت قدرتا ہے۔ (باقی)

لہ تحلیل سے مری مراد سولیوشن (Paraeeluzes) ہے۔

جدید تمدن انسانی کی تخلیق اور اسلام

(از جناب ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب زبیری)

چند سال ہوئے دنیا کے چند مفکرین نے (World Congress of Faiths) مذاہب عالم کی کانگرس کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام عالم کے مذاہب میں رواداری اور اتحاد پیدا کیا جائے اور مذاہب کے مشترکہ روحانی بنیادوں پر دنیا میں امن و امان قائم ہونے کا کوئی مشترکہ لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ اس کانگرس کے اجلاس وقتاً فوقتاً دنیا کے مختلف مقامات میں منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال یہ خوش قسمتی لندن کے حصہ میں آئی۔ چنانچہ ۳ جولائی سے لے کر ۱۰ جولائی تک اس کے اجلاس وہاں منعقد ہوئے جن میں دنیا کے ہر حصہ سے سیکڑوں کی تعداد میں مختلف اقوام و ملل کے نمائندے شریک ہوئے اور مذہب کے مختلف پہلوؤں پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے مضامین پڑھے اور تقریریں کیں۔ اسلام اور ہندوستان کی نمائندگی کرنے کے لئے ہندوستان سے سر عبدالقادر اور ڈاکٹر سر رادھا کرشنن شریک ہوئے۔ اول الذکر نے اسلام اور اتحاد عالم کے عنوان سے اور مؤخر الذکر نے اصل مذہب اور مذاہب عالم کے عنوان سے بہترین تقریریں کیں، خالدہ ادیب خانم بھی کانگرس میں شریک ہوئی تھیں اور اسلام پر ایک بہترین تقریر کی تھی۔ شیخ جامع ازہر علامہ مصطفےٰ مراغی کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ البتہ ان کا ایک مقالہ اتحاد عالم کے لئے ایک لائحہ عمل کے عنوان سے کانگرس میں پڑھ کر سنایا گیا اور بہت پسند کیا گیا۔ اسی کانگرس میں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری نے بھی ایک تقریر کی تھی جس کا ترجمہ اجلاس کانگرس کے متعلق ضروری معلومات کے ساتھ انہی کی طرف سے جامعہ میں شائع ہوا ہے۔ گو جلسہ کی مناسبت سے اسلامی عقائد کی تشریح کرتے ہوئے مقرر نے دو ایک جملے ایسے بھی کہہ دئے ہیں جو بظاہر عام خیالات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن مقصد اعتبار سے یہ خطبہ بہت فاضلانہ ہے اسلئے ہم ذیل میں معاصر جامعہ کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ "فاران"

جناب صدر خواتین و حضرات

میں آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے مجھ جیسے نوجوان کو ایک ایسی وقیع مجلس کو خطاب کرنے کا موقع دیا جہاں مشرق و مغرب کے حکما، فضلا، امرا اور مذہبی رہنما جمع ہیں۔

انسانیت اس وقت ایک عجیب روحانی کشمکش میں مبتلا ہے جنگ عظیم کی خوں آشامیوں نے جہاں گذشتہ صدی کے معاشی اور سیاسی نظامات کو برباد کر دیا ہے وہاں انسان کے اخلاقی و مذہبی نظام کو بھی منہدم کر ڈالا ہے۔ تمام دنیا میں اس وقت ایک سخت مادی و ذہنی انتشار پھیلا ہوا ہے۔ اعلیٰ اقدار پر اب بیشتر لوگوں کو اعتماد نہیں ہے۔ یقین و ایمان کی جگہ شک و تذبذب نے لے لی ہے۔ ایک خدا کی جگہ اب مختلف خداؤں کا دور دورہ ہے۔ قوم و ملک۔ رنگ و نسل کے علیحدہ علیحدہ بت کھڑے کر دئے گئے ہیں جو آپس میں برسر پیکار ہیں اگر اس وقت ہم نے انسانیت کے تصور میں بنیادی تبدیلی پیدا

نہیں کی تو ڈر ہے کہ آپس کی خانہ جنگیوں کے باعث تہذیب و تمدن کا قصر بالکل برباد نہ ہو جائے۔

یہ مادی اور ذہنی انتشار کیوں پیدا ہو گیا ہے؟ انسانی روح میں یہ بے چینی اور اضطراب کیوں ہے؟ گذشتہ نظامات کو انسان کیوں تباہ و برباد کر ڈالنا چاہتا ہے؟ یہ ایسے بنیادی سوالات ہیں جن سے اب چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ کچھ لوگ مایوس ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انسانیت کا اب خاتمہ ہوا چاہتا ہے لیکن درحقیقت مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے اس امر پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ انسانیت باوجود عمل اور ردعمل باوجود تاریکی و ظلمت کے ارتقا کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ہم غیر شعوری زندگی سے تدریجاً شعوری زندگی کی طرف ارتقا کر رہے ہیں۔ ہماری عقلی جمالی اور اخلاقی قوتیں روز بروز واضح و متعین ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ اخلاقی احکامات جو شروع میں ہم صرف یقین و اعتقاد کی بنا پر قبول کر لیا کرتے تھے اب عقلی اصولوں پر استوار کر دئے گئے ہیں۔ کانٹ اخلاقیات کی بالذات حیثیت تسلیم کرتا ہے جو احکامات پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ضمیر انسانی میں مستقل اپنی جگہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا شعور مذہبی دائرہ میں بھی اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہا ہم خدا کے ایسے تصور کو جو عقل اور سائنس کی تحقیقات کے خلاف ہو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان مثالوں سے آپ کو واضح ہو گیا ہو گا کہ نفس انسانی کے شعوری اجزا ترقی کر رہے ہیں۔

انسانیت اپنی ارتقا کے ایک خاص دور سے اس وقت گذر رہی ہے۔ وہ ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ پرانے نظامات اس جدید روح کے حامل نہیں ہو سکتے جس طرح پھلوں اور پھولوں کے لئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح نفس انسانی کی نشو و نما کے لئے بھی ایک خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر عہد کے اجتماعی ادارے خصوصاً سیاسی اور معاشی اس ماحول کا کام دیتے ہیں۔ ایک حد تک یہ اجتماعی ادارے جو نفس انسانی اور ماحول کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں نفس انسانی کے ارتقا میں مدد پہنچاتے ہیں۔ لیکن نفس انسانی جب ارتقا کی منازل میں ایک حد سے آگے گذر جاتا ہے تو وہ ادارے بجائے ترقی میں مدد پہنچانے کے اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ فرد کی نفسی زندگی کے ارتقا کے ساتھ اس کا جسم بھی بدلتا رہتا ہے۔ بچپن۔ شباب اور کہولت میں جہاں نفس انسانی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہاں اس کا جسم بھی بدلتا رہتا ہے۔ انسانیت بھی اس وقت اپنی زندگی کے ایک عہد سے نکل کر دوسرے عہد میں داخل ہو رہی ہے وہ تمام ادارے جو اس وقت تک اُس کی نشو و نما کے لئے کارآمد تھے بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ نفس انسانی میں اس وقت ایک گہری تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت ہمیں اس نئی روح کا احساس نہیں ہے اس لئے ہم اپنے پرانے نظامات کو ترک کرنا نہیں چاہتے ہم اپنے مذہبی۔ اخلاقی۔ سیاسی اور معاشی اداروں میں تبدیلی پیدا نہیں کرنا چاہتے نفس انسانی میں بے چینی پیدا ہو چکی ہے۔ وہ تسکین کی طالب ہے۔ لیکن چونکہ بے چینی کے اسباب واضح نہیں ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ملک و قوم۔ رنگ و نسل کے کھلونوں سے اپنا دل بہلا لیں۔ لیکن یہ کوشش محض بے سود ہے۔

انسانیت کو اس وقت ایک سخت روحانی انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی جو اس کی تمام

دل کی گہرائیوں سے پیدا ہو۔ یہ روحانی انقلاب درحقیقت شروع ہوگیا ہے گر ہم کو اسے واضح و متعین کرنے کی ضرورت ہے نہیں اس کی ضرورت ہے کہ اس انقلاب سے متاثر ہو کر اپنے اجتماعی اداروں کی تشکیل کریں۔ صرف بعض اجتماعی اداروں میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ پہلے تو خود نفس انسانی میں اور بعد میں بحیثیت کل اجتماعی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر اجتماعی ادارے کا مثلاً معاشی اور سیاسی اداروں کا اخلاقی اور مذہبی اداروں سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بنیادی تبدیلی صرف مذہب کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ مذہب سے ہمارا مفہوم عیسائی کلیسا یا دوسرے مذاہب کی شریعت نہیں ہے۔ مذہب نفس انسانی کی بحیثیت مجموعی کلی ارتقا کا نام ہے مذہب انسان کے عقلی۔ جمالی اور اخلاقی احساس کی گہرائی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ مذہبی حس ان احساسات کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان پر حاوی ہے۔ مذہب نفس انسانی کا بلاواسطہ حقیقت اعلیٰ سے تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ مذہب کا تعلق انسان کی داخلی زندگی سے ہے وہ انسان کی دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ اس کے ذریعہ انسان خارجی دنیا کو باطن کی روحانی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ کائنات کے مختلف مظاہر میں ایک نظم و ترتیب پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن مذہب صرف باطن میں ڈوب جانے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ باطنی روحانی زندگی سے متاثر ہو کر خارج میں تمدن کی تشکیل کرنے کا نام بھی ہے۔ جن مذاہب نے صرف انسان کی داخلی روحانی زندگی پر زور دیا ہے اور ترک دنیا کی تعلیم دی ہے انھوں نے مذہب کے صرف ایک پہلو پر تو نظر رکھی ہے مگر دوسرے پہلو سے چشم پوشی کر لی ہے جن مذاہب نے صرف انسان کے خارجی پہلو پر نظر رکھی ہے اُنھوں نے دنیا میں اخلاقی نظامات تو قائم کئے مگر بحیثیت مجموعی کائنات کی زندگی میں کوئی نظم نہ پیدا کر سکے۔

اصل مذہب انسان کی داخلی اور خارجی زندگی پر حاوی ہے وہ نفس انسانی کی تربیت اور تمدن کی تشکیل کرنا چاہتا ہے وہ روح و مادہ دونوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ فطرت اور ماورائے فطرت میں تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے دو پہلو ہیں ابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی۔ اس کے ابعد الطبیعیاتی پہلو کا تعلق انسان کی داخلی زندگی سے ہے جہاں وجدان کا دور دورہ ہے اس کے اخلاقی پہلو کا تعلق انسان کی خارجی زندگی یعنی تمدن سے ہے جہاں عقل کی کارفرمائی ہے۔

جناب صدر!

مذہب کی ابعد الطبیعیاتی تعلیمات کا سب سے بڑا اصل اصول خدا کا تصور ہے یہ تمام مذاہب کی جان ہے اسے چاہے۔ خدا۔ اللہ۔ گاڈ۔ برہما نفس مطلق۔ حقیقت اعلیٰ۔ باطنی روشنی یا اور کسی نام سے یاد کیجئے لیکن سب کا مقصود ایک ہی ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر تمام دنیا کے مذاہب مجتمع کئے جا سکتے ہیں۔ خدا کے معنی ہیں اس تصور اعلیٰ کے جس کے تحت میں کائنات کی تمام زندگی کام کر رہی ہے۔ یہ کائنات کا اخلاقی نصب العین ہے۔ اس کا احساس

مختلف مذاہب نے مختلف طریقہ پر کیا ہے۔ بعض نے اس کے بعض پہلوؤں پر نظر کی ہے تو دوسروں نے اس کے دوسرے پہلوؤں کو دیکھا ہے۔ عقلیین نے اس کو عقل کل قرار دیا ہے اور علت و معلول کے سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دیا ہے۔ جمالیین اس کو ہم آہنگی و حسن کا مکمل ترین مظہر قرار دیتے ہیں۔ اخلاقیین اسے نظم و ترتیب کا مبدا سمجھتے ہیں۔ افلاطون اسی کو صداقت جمال اور نیکی کا عین سمجھتا ہے۔ اہل تصوف اپنے نفس میں پاکیزگی اور لطافت پیدا کرکے حقیقت اعلیٰ سے بلاواسطہ تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بعض اسے دنیا سے ماورار سمجھتے ہیں بعض اسے دنیا میں بالذات موجود جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کائنات میں ساری بھی ہے اور اس سے ماورار بھی ہے۔ وہ نفس انسانی میں بھی جلوہ افروز ہے اور اس سے بلند و بالا بھی ہے۔

خدا کا علم صرف عقلی استدلات پر مبنی نہیں ہے۔ عقلی استدلالات ہماری رہنمائی اس راہ میں صرف ایک حد تک کرتے ہیں خدا کا تصور عقلی قوانین کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اگر حقیقت اعلیٰ کا کوئی تصور واضح دبین عقلی قوانین کے خلاف ہے تو وہ غلط ہے البتہ یہ اس کیفیت نفسی کا نتیجہ ہے جو انسان کی عقلی جمالی اور اخلاقی حس کی گہرائی کے باعث پیدا ہو جاتا ہے خدا کا احساس اسی داخلی نفسی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے اس نفسی کیفیت کا اظہار بدرجہ اتم پیغمبروں میں ہوتا ہے اسی لئے وہ اس دنیا کے روحانی پیغمبر ہوتے ہیں۔

مذہب کا دوسرا ما بعد الطبیعاتی اصول بقائے روح ہے انسان روح کائنات کا مظہر ہے۔ کائنات کی وہ روح جو ازلی اور ابدی ہے، یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ عارضی مادہ کی فنا کے ساتھ یہ روح خود بھی فنا ہو جائے جو ازلی اور ابدی روح سے ظہور میں آئی ہے۔ یہ انفرادی روح روح کلی کا ایک جزو ہے اس لئے ناقص اور نامکمل ہے یہ "مدریجاً" ارتقا کر رہی ہے۔ ارتقا کے لئے اس کو مادہ کی ضرورت ہے روح کو ارتقائی منازل میں مختلف مادوں کے ضرورت ہوتی ہے جس قدر کہ روح میں پاکیزگی اور لطافت پیدا ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کو اظہار کے لئے لطیف مادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ روح کی مکمل تربیت اس دنیا میں نہیں ہوتی۔ یعنی وہ ان صفات سے پوری طور پر متصف نہیں ہوتی جو روح کلی کی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ باقی رہے جمادات۔ نباتات۔ حیوانات وغیرہ سے ترقی کرکے ہم انسانیت کی منزل میں آ داخل ہوتے ہیں آئندہ ارتقا کی منازل ہم کو فرشتوں کی صفوں میں لاکر کھڑا کر دیں اور ہماری آخری منزل یہ ہو کہ ہم روح کل میں جذب ہو جائیں۔ خدا کی طرح روح کے وجود کا احساس بھی وجدان پر مبنی ہے جس کا تعلق عقل سے زائد اعتقاد وایمان سے ہے۔

مذہب کا دوسرا پہلو خارجی ہے جس کو ہم تمدن کہہ سکتے ہیں۔ اخلاق اس کی بنیاد ہے۔ اس کا مطمح نظر انسانیت کی فلاح و بہبود ہے جو عقل کے ذریعہ معلوم کی جاسکتی ہے خدا کو ایک تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام مخلوق کے حق ارتقا کو تسلیم کریں۔

۱۔ اس مذہبی مساوات کے معنی یہ ہیں کہ تمام اقوام اور افراد روحانی ترقی کر سکتی ہیں۔ بعض اقوام صرف خدا کی منظور نظر نہیں ہیں اور بعض مغضوب۔ ہر قوم اور ہر شخص جو روحانی اخلاقی اصولوں کے مطابق زندگی گذارے وہ خدا سے قریب ہوسکتا ہے

۲۔ روحانی مساوات تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کی جماعتی مساوات بھی تسلیم کر لی جائے۔ چونکہ روحانی ترقی کیلئے جماعتی نظام صرف بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام انسانوں کو مکمل مساوی جماعتی حقوق حاصل ہیں اور اس میں کسی قسم کی کوئی تمیز نہیں ہے چاہے یہ حقوق خانگی ہوں یا عامہ، سیاسی ہوں یا معاشی۔

معزز خواتین و حضرات!

ہم نے اب تک مذہب کی اصولی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ایک جامع مذہب کو انسان کی داخلی نفسی اور خارجی تمدنی ضروریات پر حاوی ہونا چاہئے۔ اس کو کس طرح انسانیت کی رہنمائی کرنی چاہئے کہ وہ اس کی ارتقا میں زیادہ سے زیادہ ممد ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کو ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے یا دنیا کے مذاہب میں سے اس وقت کوئی ایک مذہب موجود ہے جو ہماری ان تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اور جس کی بنیاد پر ایک عالمگیر تمدن کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ کیا کوئی ایسا مذہب موجود ہے جو انسانیت کی روحانی ضروریات کو پورا کرے اور ساتھ ہی موجودہ تمدنی گتھیوں کے لئے ایک حل بھی پیش کر سکے۔ اگر اس قسم کا کوئی مذہب موجود ہے تو پھر ہمیں ایک نئے مذہب کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک تاریخی مذہب کے اوپر نئی عمارت کی بنیاد رکھنے سے اس میں اور زیادہ ثبات اور استحکام پیدا ہوگا۔ ہماری رائے میں یہ مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے معنی ہیں خدا کی کمل اطاعت، خود کو خدا کی مرضی میں گم کر دینا۔ نفس انسانی کو نفس مطلق کی مدد سے اس قدر متاثر کر دینا کہ ہر انسانی عمل نفس مطلق کا ہی عمل ہو جائے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ یہ دین نفس انسانی میں ازل سے پوشیدہ ہے۔ یہ ابدی اور ازلی قانون کی پیروی کرنے کا نام ہے۔ یہ سرچشمہ حقیقت سے بلاواسطہ تعلق ہے یہ خود خدا کے نفس انسانی میں اظہار کا نام ہے آدم و ابراہیم۔ ہارون و موسیٰ، عیسیٰ و محمد کا یہی دین تھا۔ غلطی سے یورپین لوگوں کو محمڈن کہا جاتا ہے جو نام قرآن نے اس دین کے پیرؤں کو دیا ہے وہ مسلم ہے یعنی قانون خدا کا اطاعت گذار بندہ۔ ابراہیم۔ مسیح کرشن بدھ محمد سب مسلم تھے اور آج بھی جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں وہ سب مسلم ہیں۔ اسلام جن مابعد الطبیعاتی اصولوں پر زور دیتا ہے ان میں سب سے اہم تصور خدا ہے۔ اسلام کی رو سے خدا واحد ہے۔ خالق، منصف، رحمٰن۔ رحیم اور رب العالمین ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ہے وہ عرش زمین کی روشنی ہے۔ ازلی و ابدی ہے۔ حسین و جمیل ہے صفات ربانی سے خود کو متصف کرنا انسانی زندگی کا مقصد ہے خدا کے ازلی قوانین کے مطابق انسانی زندگی گذارنا اسلامی تعلیمات کی جان ہے۔ اس کی خلاف ورزی گناہ ہے بعض اعمال اس لئے گناہ ہیں کہ وہ انسان کی روحانی ترقی میں حائل ہوتے ہیں اسلام انسان کی مکمل ترقی کا قائل ہے اس ترقی کے لئے انسان کی روح باقی رہتی ہے تاکہ وہ ارتقا کے بقیہ مدارج طے کرے۔ موت کے بعد کی زندگی کو اسلام اسی زندگی کی مسلسل کڑی سمجھتا ہے اگر انسانی نفس اسی زندگی میں تربیت یافتہ ہو جاتا ہے تو وہ دوسری زندگی کے مدارج ترقی آسانی اور اطمینان سے طے کر لیتا ہے، اگر وہ تربیت یافتہ نہیں ہوتا تو ارتقا کے مدارج طے کرنے میں اسے دشواری اور دقت اٹھانی پڑتی ہے۔ مذہبی اصطلاح میں راحت و اطمینان کی کیفیت کو جنت اور دشواری او دقت کی کیفیت کو دوزخ

سکتے ہیں۔ وہ روح ابدی نہیں ہے۔ نفس انسانی دوبارہ اپنی خامیوں کو دور کر کے ارتقا کی آئندہ منازل طے کرتا ہے حتیٰ کہ وہ خود کو صفات اللہ سے متصف کرے۔

جناب صدر، خواتین و حضرات!

اب تک ہم نے اسلام کے نصب العین سے بحث کی ہے۔ جس طرح ہر انسانی انفرادی روح کو عمل کے لئے ایک جسم کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کوئی نصب العین موثر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ایک ایسے تمدن کی تشکیل نہ کرے جو اس نصب العین کو عملی جامہ پہنائے۔ ان قوانین کو جو روح اسلامیہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں مذہبی اصطلاح میں شریعت اسلامیہ کہتے ہیں۔ اس شریعت اسلامیہ کے بنیادی قوانین قرآن میں درج ہیں اور جس کے قائم کرنے والے ہمارے رسول محمد رسول اللہ تھے۔ میں اس وقت مختصراً چند بنیادی اصول تمدن اسلامیہ کے بیان کر دینا چاہتا ہوں تاکہ آپ پر واضح ہو جائے کہ کس طرح یہ ہمہ گیر ہیں اور ان کی بنیاد پر ایک جدید تمدن کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ ایک ایسا عظیم الشان تمدن جو انسان کی روحانی اور مادی بنیادوں پر استوار ہوا اور جو موجودہ تمدن کی دماغی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی گتھیوں کو سلجھا سکے۔ یہ تمام اصول قرآن کی تعلیم اور اس تعلیم کی عملی تفسیر یعنی رسول اللہ کی زندگی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ البتہ اس تعلیم کے ذریعہ موجودہ تمدنی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) اسلام تمدن کی بنیاد روحانیت پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ اسلام مادیت کا سخت مخالف ہے وہ دنیا کو صرف مادہ کی اندھی کشمکش کا جولانگاہ نہیں سمجھتا جس میں نہ کوئی نظام ہو اور نہ جس کا کوئی مقصد ہو۔ وہ تلقین کرتا ہے کہ بحیثیت مجموعی کائنات کا ایک مقصد ہے۔ اسلام کے شرعی احکامات مثلاً نماز روزہ وغیرہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق ابدی روحانی سرچشمہ سے باقی رہے۔

(۲) اسلام کا اخلاقی نصب العین انسانوں کو صفات اللہ سے متصف کرنا ہے وہ ان صفات کو حاصل کرنے کے لئے دنیا کو جولانگاہ عمل سمجھتا ہے اس لئے وہ زندگی کے منفی نہیں بلکہ مثبتی پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے۔ وہ ترک تمدن کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ روحانی اصولوں پر ایک تمدن کی تشکیل کرنا چاہتا ہے وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں ترک دنیا کر کے ریاضت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ روحانی اصولوں کے مطابق اس دنیا میں زندگی گذارنا اس کا مقصد ہے۔

(۳) اسلام فطرت انسانی کو نیک تصور کرتا ہے۔ وہ اس تصور کا مخالف ہے کہ انسان فطرۃً گناہ گار پیدا کیا گیا ہے اسی لئے اس کے قوانین جبر و اکراہ پر مبنی نہیں ہیں وہ انسان کے فطری جذبات اور خواہشات کو مکمل طور پر برباد نہیں کرنا چاہتا بلکہ صرف اُن کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماحول کے خراب اثرات سے بچا کر انسان کی اصل نیک فطرت کو ابھارنا چاہتا ہے۔

(۴) اسلام عقل کا مخالف نہیں ہے۔ بلکہ عقلی غور و فکر کی تلقین کرتا ہے۔ خدا اور بقائے روح کا تصور ضرور

اعتقاد و ایمان پر مبنی ہے لیکن وہ ایمان جو عقلی قوانین کا مخالف نہ ہو۔ سائنس اور اسلام میں کبھی تصادم نہیں ہو سکتا۔ سائنس نتیجہ ہے عقلی جدوجہد کا اور اسلام بھی چاہتا ہے کہ فطرت کے رموز آشکار کئے جائیں۔ ان قوانین کا پتہ چلایا جائے جو فطرت میں جاری و ساری ہیں۔ اسلام تو صرف اس بات کا طالب ہے کہ فطرت کے مختلف اجزا یا انسانی تمدن کے مختلف شعبوں مثلاً سیاست یا معیشت کو بالذات مقصد قرار نہ دے لیا جائے۔ بلکہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ان کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور بحیثیت مجموعی فطرت اور تمدن انسانی ایک نظام کے تحت کام کر رہے ہیں اور ان کا ایک مقصد ہے جو سب کو ایک دوسرے سے باہم مربوط کئے ہوئے ہے۔ جس قدر علم کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اسی قدر ہمارا کائنات کا تصور بھی وسیع تر ہوتا جائے گا۔ اور ہم حقیقت اعلیٰ کا بہتر تصور رکھ سکیں گے۔ اسی باعث اسلام علوم نظریہ۔ مثلاً ریاضیات طبیعات وغیرہ کا موید ہے۔ وہ علم النفس کی تائید کرتا ہے چونکہ نفس انسانی کی رموز معلوم کرلے سے انسان نفس اعلیٰ کا تصور کر سکتا ہے وہ ان علوم کے مطالعہ کا حامی ہے جو انسان سے متعلق ہیں مثلاً اخلاقیات معاشیات۔ سیاست وغیرہ تاکہ جامعی نظام کو مطالعہ کے ذریعہ زیادہ بہتر بنایا جا سکے۔

(۵) انسانی زندگی کے متعلق اسلام کا تصور جامد نہیں ہے بلکہ ارتقائی ہے۔ جماعت کے قوانین زمان و مکان کے پابند ہوتے ہیں۔ ہر قوم کو کسی پیغمبر کی اخلاقی تربیت کے لئے اس قوم کی بس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ تاریخ۔ اخلاقی روایات رسم و رواج نسلی خصوصیات۔ زبان وغیرہ کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔ یہ قوانین ابدی نہیں ہوتے بلکہ قوم کی زندگی کے ایک خاص دور کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ زمانہ اور زمانہ کی ضروریات تبدیل ہوتی رہتی ہیں اس کے قوانین کو بھی بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے اسلام میں انسان کی بنیادی روحانی اور اخلاقی ضرورت کے لئے جماعت کے قوانین بدلنے کی اجازت ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اس اصول کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔

(۶) اسلام صرف انسان کے داخلی ارتقا ہی پر زور نہیں دیتا بلکہ خارجی طور پر جماعت کی بھی ایسے اصولوں پر تشکیل کرنا چاہتا ہے جو اس اخلاقی اور روحانی ارتقا میں ممد ہوں۔ ایک مخصوص مادی ماحول کی اسلام اخلاقی اور مذہبی زندگی کے لئے ضرورت سمجھتا ہے۔ وہ اسی لئے تمام انسانوں میں مساوات قائم کرنا چاہتا ہے۔ نسل و رنگ۔ ملک و قوم کی اسلام میں کوئی تمیز نہیں ہے۔ عورتوں اور مردوں کا درجہ اسلام میں مساوی ہے اور دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ غرضیکہ وہ ایک ایسی جماعت کی تشکیل چاہتا ہے جہاں مساوات۔ عدل و انصاف اور محبت کا دور دورہ ہو۔

(۷) تمدن کے ایک اہم شعبہ سیاست میں وہ جمہوریت کا حامی ہے۔ حکومت کا تخیل اسلام میں قوۃ اور ملک گیری پر مبنی نہیں ہے۔ نہ ہی حکومت کو وہ ایک ایسا ادارہ تسلیم کرتا ہے جو پولیس کی طرح صرف منفی فرائض انجام دے۔ اسلام کا سیاسی تصور اخلاقی اور روحانی ضروریات پر مبنی ہے۔ سیاست اسلام میں بالذات کوئی حیثیت نہیں رکھتی جب تک کہ وہ اعلیٰ مقاصد اخلاقی اور روحانی میں ممد نہ ہو۔ مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود میں سے ایک امام کا انتخاب کریں۔ یہ امام اپنے مشیروں کی

مشورہ سے اس وقت تک حکومت کرسکتا ہے جب تک کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصولوں کی مخالفت نہ کرے اور قوم کے مفاد کے خلاف نہ ہو جائے۔ اس قسم کی ایک حکومت رسول اللہؐ اور ان کے جانشین خلفا نے قائم کی تھی جو جمہوریت اور عدل وانصاف کی بہترین مظہر تھی اگر عربی قبائل کی روح جو قوم و نسل کی برتری اور جمہوریت کی بجائے امرائیت کی حامل ہے اس حکومت کا خاتمہ نہ کردیتی تو جماعت اسلامیہ بہت پہلے ایک مکمل جمہوری نظام حکومت کی تشکیل کر چکی ہوتی۔

(۸) اسلام صحیح قومیت کے تخیل کا مخالف نہیں ہے۔ وہ وطن کی محبت کی تعلیم دیتا ہے چونکہ ایک مخصوص وطن کی خدمت ہی کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ اسلامی قومیت کا تخیل انسانیت کے تخیل کا مخالف نہیں ہے بلکہ موئد ہے چنانچہ اسلامی قومیت کی بنیاد نسل و رنگ کے حقوق پر مبنی نہیں ہے اور نہ صرف معاشی و سیاسی مفاد کی ہم آہنگی پر۔ اسلام صرف ایسی قومیت کے قیام کی اجازت دیتا ہے جو اس قوم کے مفاد کا خیال کرے لیکن جس کا وجود ساتھ ہی انسانیت کے لئے بھی مفید ہو۔ اس قسم کی ایک عرب قومیت کی تشکیل ہمارے رسولؐ نے کی تھی۔

اسلام تمام اقوام کی آزادی اور مساوات کا قائل ہے وہ شہنشاہیت کا سخت مخالف ہے۔ اس کی سیاسی روح ایک ایسا بین الاقوامی نظام سیاست قائم کرنا چاہتی ہے جس میں اقوام آزاد رہ کر اپنے فطری قویٰ کے مطابق مختلف تمدنوں کو نشو ونما کریں لیکن ساتھ ہی دنیا کی ترقی اور امن وامان کے لئے مل جل کر کام کریں۔

(۹) حقیقت میں اسلام اجتماعیت کا قائل ہے۔ وہ سرمایہ داری کا بدترین مخالف ہے۔ وہ فرد کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ لامحدود دولت کمانے اور جمع کرنے کا حق ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ ذرائع پیداوار پر چند افراد قبضہ کرلیں جس کے باعث جماعت کے معاشی نظام میں کوئی توازن قائم نہ رہ سکے اور غربت و فلاکت کے باعث جماعت کے جسمانی۔ ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی قویٰ برباد ہوں۔ اسلامی حکومت کو معاشی جدوجہد پر نگہبانی کرنے کا پورا حق ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعہ اسلام افراد کی دولت کا ایک حصہ جماعت کی فلاح وبہبود کے لئے مخصوص کردیتا ہے۔ زر کو صرف زر کے ذریعہ کمانا یعنی سود اسلام میں حرام ہے۔ جسمانی محنت کی اسلام میں بڑی عزت ہے۔ مال و دولت کی اسلام میں بالذات کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ صرف اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے دنیاوی مال و دولت کے حصول میں اسلام نے قناعت کی تعلیم دی ہے تاکہ انسانی احتیاجات پوری ہونے کے بعد دوسرے اعلیٰ کاموں میں منہمک ہوسکے۔ رسول اللہؐ۔ ابوبکرؓ۔ عمرؓ علی اور دیگر صحابہ غریبوں کی طرح زندگی گذارتے تھے۔ بیت المال سے وہ صرف اس قدر لیا کرتے تھے جو ان کی احتیاجات کے لئے کافی ہو۔

یہ معاشی احکامات اسی زمانہ کے لئے دیے گئے تھے جبکہ عرب کی معاشی زندگی سادہ تھی۔ مشین کے باعث جدید نظام سرمایہ داری کا وجود نہ تھا۔ ہمارے زمانہ میں معاشی توازن قائم نہ رہنے کے باعث انسانوں میں ایک عظیم الشان خلیج واقع ہوگئی ہے۔ امارت وغربت کے وہ مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جس سے انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ غربت کے باعث انسان

کی دنیوی اور دینی زندگی برباد ہو رہی ہے ایسے مفلوک الحال انسانوں سے جن کے دن رات فاقوں میں گذرتے ہیں جن کے
بچے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے تڑپتے ہیں جنہیں نہ تعلیم و تربیت کے مواقع حاصل ہیں اور نہ غور و فکر کے یہ توقع رکھنا
کہ وہ اخلاقی اور روحانی اقدار میں یقین کریں گے ستم ظریفی ہے۔ ایک بھوکے انسان کو مشکل ہی سے اس کا یقین دلایا
جا سکتا ہے کہ ایک خدا موجود ہے جو رزاق اور رب العالمین ہے۔ خود غرض انسان خود اپنے غلط نظامات کے باعث غربت و
فلاکت پیدا کرتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہے اور پھر اسی غربت و فلاکت کو یہ کہہ کر قائم رکھنا چاہتا ہے کہ یہ منشاء الٰہی ہے
اسلام غربت کو ایک لعنت سمجھتا ہے جو کہ یہ انسان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو برباد کر ڈالتی ہے۔ لیکن وہ
امارت کو بھی پسند نہیں کرتا بلکہ توازن کی تعلیم دیتا ہے۔ معاشی جدوجہد میں خود غرضی، ذاتی نفع، حرص و آز، اور مقابلہ کی بجائے
اسلام جماعت کی بہتری و بہبودی کا خیال پیش کرتا ہے۔ جدید تحریک اجتماعیت بھی معاشی جدوجہد میں انفرادی مقابلہ اور حرص و
آز کی بجائے جماعت کی بہبودی اور برتری کو مدنظر رکھنا چاہتی ہے وہ معیشت کو اخلاقی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتی ہے اگر اجتماعیت
کی تحریک کے مادی فلسفہ کو ترک کر دیا جائے تو جہاں تک معاشی جدوجہد کے نصب العین کا تعلق ہے اسلام اور تحریک اجتماعیت
ایک دوسرے سے متفق ہیں اور موجودہ نظام سرمایہ داری کے نظام کی موجودگی میں دونوں کے معاشی حل بھی بہت کچھ متفق ہونگے

جناب صدر، خواتین و حضرات!

(۱۰) مذہب اسلام اور اسلامی تمدن کے یہ چند بنیادی اصول ہیں جو مختصراً میں نے آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں
آپ نے جس گرمجوشی سے میری معروضات کو سنا اس کا میں بہت ممنون ہوں۔ خصوصاً مذاہب عالم کی کانگریس ...
[illegible] کے منتظمین کا جنھوں نے مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع دیا

اسلام کے یہ اصول قرآن میں واضح طور پر درج ہیں۔ ہمارے رسول نے ان کی عملی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ لیکن
اسلام ہر انسان کو آزادی ضمیر دیتا ہے وہ اس کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ تمام مذاہب کی بنیادی تعلیمات ایک ہی روحانی سرچشمہ سے
سیراب ہوتی ہیں۔ وہ ہر اس قوم اور مذہب کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے آمادہ ہے جو اس اعلیٰ روحانی نصب العین کو
عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہمارے رسول نے آج سے چودہ سو برس پہلے متبعین موسیٰ اور عیسیٰ کو دعوت دی تھی کہ "آؤ تم اور ہم مل کر اس خدا کی پرستش
کریں جو تم میں اور ہم میں مشترک ہے"۔ آج بھی ہم اسی رسول کے پیرو تمام دنیا کو دعوت دیتے ہیں کہ "آؤ تم اور ہم مل کر ایک نئی
انسانیت کی تخلیق کریں تمام مذاہب کی واحد روحانی بنیاد پر ایک عالیشان قصر تمدن استادہ کریں۔ کائنات کا واحد مقصود
ہماری جدوجہد کا مرکز ہو اپنے اخلاقی نظامات کو ہم تمام بنی نوع انسان کے لئے وسیع کر دیں اپنی سیاست اور معیشت
کو حرص و آز کے پنجوں سے چھڑا کر اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر مستحکم کر دیں۔ آؤ ہم اس خواب کی تعبیر کر دیں جو خواب انسانیت
نے ہمیشہ سے دیکھا ہے۔ جہاں رنگ و نسل، قوم و ملک، مذہب و ملت کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

یاد اندلس!

(۳)

گاہے گاہے باز خواں این دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گذشتہ نمبر میں تم یہ معلوم کر چکے ہو کہ فتح اندلس کے بعد مسلمانوں نے مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ نہ تو انھیں بودست دیا سمجھ کر قتل عام کا حکم دیا، نہ بے بس پاکر انھیں زبردستی مسلمان بنایا اور نہ ہی نشۂ غلبہ میں ان کے ساتھ کسی ذلت واہانت کا سلوک روا رکھا۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ کیا کہ فاتحانہ انداز غرور و نخوت کو چھوڑ کر ان کی طرف محبت و مودت کا ہاتھ بڑھایا۔ انتظام سلطنت میں انھیں اپنا دست و بازو بنایا۔ بڑے بڑے مناصب پر انھیں سرفراز کیا۔ ان سے اس طرح گھل مل گئے کہ باہم ان کے درمیان شادی بیاہ کے رشتے قائم ہونے لگے اور انھیں اس حد تک مذہبی آزادی بخش دی کہ وہ خود مسلمانوں میں حتیٰ کہ مسجدوں کے دروازوں پر علانیہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے اور اس پر کوئی قانونی پابندی عائد نہ کی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل اندلس کے ساتھ مسلمانوں نے جس مصالحت و رواداری کا برتاؤ کیا، اس کا اس زمانہ میں تو تصور نہیں کیا جا سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ بھی اپنے بلند آہنگ دعوائے تہذیب و انسانیت کے باوجود اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عیسائیوں کی احسان فراموشی

عیسائی نہایت احسان فراموش قوم ہے مسلمانوں کے اس حسن سلوک کے جواب میں انھوں نے ان کے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا اس کا تذکرہ کہیں آگے آئیگا البتہ یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس حسن سلوک اور مصالحانہ رویہ سے بھی ان کے دلوں میں کوئی زبردست اور دیرپا انقلاب نہیں پیدا ہوا۔ اِں فوری طریقہ پر ان کی منافرت میں اس حد تک کمی آگئی کہ وہ طوعاً و کرہاً مسلمانوں کے ساتھ ملکر ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے پر راضی ہوگئے۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی انھیں کسی کمزور یا غافل خلیفہ کے زمانہ میں موقع ملتا فوراً بغاوت و شورش پر آمادہ ہو جاتے اور زیادہ تر ان کے مذہبی پیشوا انھیں اس پر آمادہ کرتے۔

اسپین کا مبارک انقلاب

اسپین مسلمانوں کے حدود سلطنت میں داخل ہونے سے پہلے ایک نہایت پست اور حد درجہ غیر ترقی ملک تھا صنعت تجارت زراعت کسی چیز میں اسے کوئی خاص قابل ذکر اہمیت حاصل نہ تھی۔ مگر عربوں نے جب اپنی حکومت استوار اور ملک کو

فتنہ و فساد سے پاک کر لینے کے بعد اپنی توجہ تعمیری کاموں کی طرف منعطف کی تو ملک کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ علم و فن کا دور دورہ ہوا، تجارت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و زراعت کو فروغ حاصل ہوا، صنعت و حرفت کا درجہ بہت بلند ہوگیا غرض تھوڑے عرصہ میں اندلس علم و فن کا مرکز، تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور صنعت و حرفت کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ اگر اسلامی خلفا اپنی حکومت کے زمانہ میں ملک کی اندرونی شورشوں اور بغاوتوں سے مامون رہے ہوتے اور انھیں اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے عزائم اور حوصلہ مندیوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملا ہوتا تو یقیناً اندلس کا درجہ علم و فن اور تجارت و صنعت کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ بلند ہوتا۔ جو اسے اس وقت کی تاریخ میں حاصل ہے۔ اندرونی خلفشار اور خانہ جنگیوں کے باوجود شاہان اندلس نے علم و فن کی جو خدمت کی، تجارت و صنعت کو جو فروغ بخشا اور ملک کو دوسرے اعتبارات سے جس بلند رتبہ تک پہونچایا وہ ان ناموافق حالات میں جن سے کہ وہ دوچار تھے، صرف انہی کی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی سے ممکن تھا۔ آج کی صحبت میں ان کے بعض انہیں کارناموں کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔

مسلمانوں کے کارنامے

شاہان اندلس نے اپنے زمانۂ حکومت میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دئے ہیں انھیں تفصیل بیان کرنے کی نہ فرصت ہے اور نہ گنجائش۔ البتہ ان کی طرف ایک سرسری اشارہ کر دیا جاتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علمی و تعمیری کارناموں سے پہلے زراعت، صنعت اور تجارت کی ان ترقیوں کا تذکرہ کیا جائے جو ان کی بدولت حاصل ہوئیں کیونکہ انھیں چیزوں کی ترقی پر تمام ترقیوں کا دارومدار ہوتا ہے۔

زراعت، صنعت، تجارت

اندلس ایک نہایت زرخیز ملک ہے۔ صنعت و حرفت کے مواد بھی یہاں کثرت و فراوانی کے ساتھ موجود ہیں لیکن عربوں سے پہلے نہ ملک کی زرخیزی کچھ کام آتی تھی اور نہ صنعت و حرفت کے مواد کی کثرت و بہتات سے کچھ فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ جب عربوں کی حکومت کی بنیادیں اندلس میں مضبوط ہوگئیں اور انھیں اندرونی فتنہ و فساد سے ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف توجہ کا موقع ملا تو سب سے پہلے انھوں نے صنعت و زراعت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی جس سے تجارت کا دائرہ خود بخود وسیع ہوگیا۔ مسلمانوں کی عنایت و توجہ سے تھوڑے ہی دنوں کے اندر تمام افتادہ زمینیں آباد ہونے لگیں۔ ملک کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگیا۔ گوشہ گوشہ میں صنعتی کارخانے قائم ہوگئے۔ طرح طرح کی چیزیں بننے اور ڈھلنے لگیں۔ تجارتی سامان کشتیوں اور دوسرے وسائل حمل و نقل کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگے اور اندلس تجارت، صنعت اور زراعت کا مرکز سمجھا جانے لگا۔

زرعی ترقیاں

عربوں نے اندلس میں زراعت کو فروغ دینے کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کیں۔ افتادہ زمینوں کو آباد کرنے

کے لئے حکومت کی جانب سے طرح طرح کی سہولتیں فراہم کیں کھیتوں کی آب پاشی کے لئے کوئیں اور نہریں کھدوائیں، تالاب بنوائے[1] بندوں کے ذریعہ بارش کے پانی کو روکنے کا انتظام کیا۔

ملک شام اپنی زرخیزی اور قسم قسم کے درختوں کی فراوانی کے اعتبار سے بہت مشہور تھا۔ عرب یہاں کے مختلف قسم کے درخت، پھول اور ترکاریاں وغیرہ اپنے ساتھ اندلس لے گئے اور انھیں نہ صرف اندلس میں بلکہ سارے یورپ میں پھیلایا۔ انہی چیزوں میں پستہ، کیلا، کھجور، چاول۔ روئی، توت۔ نیشکر۔ زعفران، ہلیوں۔ نارنگی اور لیموں وغیرہ داخل ہیں، خود یورپ کو اعتراف ہے کہ اہل عرب سے پہلے یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں یورپ میں نہیں پائی جاتی تھیں۔

عربوں نے جس طرح زراعت کی ترقی کے لئے دوسرے ملکوں سے قسم قسم کے پھول، ترکاریاں اور درخت منگائے اسی طرح اس فن کو درجہ کمال تک پہونچانے کے لئے خود بھی بہت زیادہ تفحص سے کام لیا اپنے تجربات سے کاشت وغیرہ کے نئے نئے طریقے معلوم کئے اور نئے نئے آلات وغیرہ ایجاد کئے کہا جاتا ہے کہ اس وقت عربوں کی عنایت و توجہ سے اندلس کی زرخیزی و شادابی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اکثر خاص خاص زرخیز و شاداب علاقے سال میں تین تین بار پھل دیتے تھے۔

صنعتی ترقیاں

عربوں نے زراعت کے ساتھ ساتھ۔ صنعت کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی۔ ایک طرف ملکی صنعتوں کو ترقی و فروغ دیا، دوسری طرف شام وغیرہ دوسرے ملکوں کی بہت سی مفید صنعتیں وہاں منتقل کیں اور پھر سارے یورپ میں پھیلائیں اندلس اس زمانہ میں مشرق و مغرب کے درمیان واسطہ کا کام دیتا تھا۔ عرب مشرقی ممالک کی جو صنعتیں اندلس میں منتقل کرتے تھے وہ سارے یورپ میں پھیل جاتی تھیں۔ یورپ میں آج بہت سی صنعتیں ایسی ہیں جو اب تک اپنے قدیم نام سے یاد کی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس ملک کی یادگار ہیں فرنچ زبان میں تلواروں کو صیقل کرنے کو اب تک Damasquinage یا Damasquiner کہتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ صنعت عربوں کے ذریعہ دمشق سے اندلس پہونچی اور وہاں سے دوسرے یورپین ممالک میں پھیلی۔

یورپ میں روئی یا ریشم سے منقش کپڑے بننے کی صنعت بھی دمشق کی یادگار ہے اسی لئے فرنچ زبان میں [illegible] کے معنی "دمشقی طرز کا کپڑا بنا" سمجھے جاتے ہیں۔

تن زیب کو یورپ میں Mousseline کہا جاتا ہے کیونکہ یہ صنعت موصل کی یادگار ہے۔

کاغذ کو Charta Damascena کہا جاتا ہے۔ یہ شامی صنعت بھی اندلس کے راستہ یورپ پہونچی تھی۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں شاطبہ، بلنسیہ اور طلیطلہ کے اندر کاغذسازی کے بڑے بڑے کارخانے قائم تھے۔ ان کی جلاوطنی کے بعد یہ سب مقامات، فرنگیوں کے قبضہ میں آگئے اور اس کے بعد انہی کارخانوں کے نمونے

---

[1] حاضر الاندلس و غابرہا ص[illegible]

پر سارے یورپ میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہوئے۔

یورپ کو صنعتی اعتبار سے عربوں سے جو فائدہ پہونچا ہے اس کا ذکر مضمون "مغربی تہذیب وتمدن پر مشرق کا اثر" میں کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے۔ یہاں ان چند مثالوں سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ عربوں نے ملکی صنعت کو فروغ دینے کے لئے دوسرے ممالک کی مفید صنعتیں بھی اندلس میں منتقل کر لی تھیں۔ جو رفتہ رفتہ سارے یورپ میں پھیل گئیں۔

اندلس کے صنعتی کارخانے

اندلس میں عربوں کی توجہ وعنایت سے صنعت کو جوں جوں ترقی ہوتی گئی وہاں بڑے بڑے کارخانے قائم ہونے لگے جن میں روزانہ ہزاروں آدمی مصروف کار رہتے تھے۔ قرطبہ میں چمڑے کی دباغت کا اور اشبیلیہ میں ریشمی کپڑے بننے کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا تھا۔ ۱۵۰۰ء میں اشبیلیہ کے اندر کپڑے بننے کی ۱۶ ہزار کارگاہیں قائم تھیں جن میں ایک لاکھ تیس ہزار اشخاص کام کرتے تھے مگر جب عربوں کی جلاوطنی کے بعد اندلس کی صنعت وحرفت پر زوال آیا تو ان کارگاہوں کی تعداد میں بھی رفتہ رفتہ کمی آنے لگی۔ چنانچہ ۱۶۷۳ء میں ان کی کل تعداد صرف ۴۰۰ تھی۔

مالقہ اپنی شیشہ سازی کی صنعت کی بنا پر بہت مشہور تھا اور یہاں کے مٹی کے ظروف نہایت خوشنما اور عجیب ہوتے تھے اور دور دور تک ان کی تجارت ہوا کرتی تھی گو عربوں کے بعد مالقہ سے اس صنعت کا خاتمہ ہو گیا لیکن اب تک اس صنعت کی نسبت اسی کی طرف کی جاتی ہے چنانچہ شام وغیرہ میں مٹی کے خاص خاص قسم کے برتنوں کو مالقی مٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مریہ بانات پشمین اور منقش کپڑوں کے لحاظ سے شہرت رکھتا تھا۔ ۶۰۰ کارگاہیں صرف بانات کے لئے اور ایک ہزار عمدہ چادروں اور دیباج فاخرہ کے لئے قائم تھیں۔ جرجانی، اصفہانی، عتابی اور معلوم نہیں کن کن اقسام کے کپڑوں اور چادروں و خوبصورت پردوں وغیرہ کے لئے کتنے الگ الگ کارخانے قائم تھے۔ کپڑوں کے علاوہ یہاں اسلحہ اور شیشہ سازی وغیرہ کے بھی کارخانے تھے۔

دیباج اور منقش کپڑوں کے لحاظ سے ابتداً قرطبہ کو بہت زیادہ شہرت حاصل تھی لیکن بعد کو مریہ کا مرتبہ اس سے بڑھ گیا اور سارے اندلس میں اہل مریہ بہترین ریشمی کپڑے بننے میں ممتاز سمجھے جانے لگے۔ سرقسطہ کا علاقہ، عمدہ سمور کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا اور یہاں کتان وحریر کا بھی کام ہوتا تھا۔ جیان میں بھی ریشمین کپڑوں کے لئے ۶۰۰ کارگاہیں تھیں۔ مریہ میں قالین وغیرہ بنے جاتے تھے اور اسلحہ وزیورات کا کام قرطبہ، مریہ، طلیطلہ اور سرقسطہ کے لئے مخصوص تھا۔

شاطبہ کاغذ سازی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یاقوت کے بیان کے مطابق "یہاں عمدہ قسم کا کاغذ تیار کیا جاتا اور اندلس کے تمام اطراف وجوانب میں بھیجا جاتا تھا"

علامہ سیجن کا بیان ہے کہ اندلس میں فسیفسا کی صنعت کے لئے بھی متعدد کارخانے تھے۔

سدیلیو نے باول ناخواستہ جہاں عربوں کے بعض اوصاف ومحامد کا اعتراف کیا ہے، وہیں ان کی صنعتی وزراعتی

فوقیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ عرب اپنے اخلاق، علم اور صنعت میں ہسپانیوں سے بہت آگے تھے
کرم، اخلاص اور احسان کے اعتبار سے اپنے دشمنوں پر بھی فائق تھے۔ ان میں وہ حد سے بڑھا ہوا عزت نفس کا خیال بھی تھا
جس میں وہ ہمیشہ سے مشہور ہیں ان کے زمانہ میں اسپین میں علوم و فنون اور زراعت و صنعت کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی
اور ہر طبقہ میں عقلی علوم کو سیکھنے اور پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ علوم و فنون کی اشاعت اور صنعت و زراعت کی ترقی نے
عربوں کی عظمت بہت زیادہ بڑھادی ان کے زمانہ میں اندلس میں بکثرت کارخانے قائم تھے جن پر بنانے والوں اور
بنوانے والوں کے نام لکھ دیئے جاتے تھے اور پبلک دونوں کی مدح و ستائش کرتی تھی۔ ان کے دور میں علم ہندسہ، موسیقی
اور رقص کو بھی بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ اب تک یورپ میں ان کی طرز تعمیر اور نقش گری وغیرہ کو نہایت حیرت و استعجاب کیساتھ
دیکھا جاتا ہے۔ اندلس میں دولت موحدین کو تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ ان لوگوں نے عظیم الشان مسجدیں، اسپتال، چھاؤنیاں
اور سرائیں وغیرہ ہر ہر شہر میں قائم کیں، پل تعمیر کرائے، تالاب بنوائے، کنوئیں کھدوائے، نہریں جاری کرائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ عربوں نے زمانۂ حکومت میں دوسری ترقیوں کے ساتھ ساتھ اندلس صنعت و حرفت کا مرکز تھا اور
اس کا ہر چھوٹا بڑا شہر اس زمانہ کے مشہور صنعتی مقامات کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ اگرچہ عیسائیوں نے اندلس سے مسلمانوں کو نہایت
ذلت اور بے آبروئی کے ساتھ نکال دیا لیکن وہ ان کے آثار کو مٹانے میں کامیاب نہ ہوسکے جو اب تک وہاں ہر گوشہ
میں پائے جاتے ہیں۔ اندلس سے عربوں کی جلاوطنی پر صدیاں گذر گئیں لیکن اب تک وہاں انکی شاندار عمارتیں اور بڑے
بڑے کارخانے قائم ہیں جو اپنی زبان حال سے عربوں کی عظمت کا فسانہ سنا رہے ہیں اور ان متعصب یورپین مورخین
کی علانیہ تکذیب کر رہے ہیں جن پر عربوں کے احسانات اور ان کے کارناموں کا اعتراف نہایت شاق گذرتا ہے۔

تجارت

اندلس میں عربوں کی بدولت صنعت و حرفت اور زراعت کو جو ترقی حاصل ہوئی اس کا حال تو تمہیں معلوم ہی ہوچکا
اس سے تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ اس زمانہ میں تجارت کا کیا حال رہا ہوگا۔ اندلس میں جو چیزیں پیدا ہوتی تھیں یا تیار کی
جاتی تھیں وہ اندلس سے باہر شرق و مغرب کے دوسرے ملکوں تک بھیجی جاتی تھیں۔ عرب تاجر ملکی مصنوعات وغیرہ لیکر
دوسرے ملکوں کا سفر اختیار کرتے اور خرید و فروخت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھتے اس زمانہ میں متعدد تجارتی بیڑے بھی
قائم ہوگئے تھے جو وہاں کی مصنوعات اور تجارتی سامان لے کر افریقہ، ایشیاء اور یورپ کے سواحل تک جاتے آتے رہتے
اس زمانہ میں اندلس صرف اپنی مصنوعات و پیداوار ہی کے اعتبار سے ممتاز نہ تھا بلکہ معدنیات کے اعتبار سے بھی
خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ لوگ زمینیں کھود کھود کر سونا، چاندی، سیسہ، لوہا، پارہ، توتیا وغیرہ نکالتے تھے اور ان کی خرید
فروخت کرتے تھے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عربوں کے دور حکومت میں اندلس نے تجارت، زراعت، صنعت کے اعتبار سے اس حد تک

ترقی کی تھی کہ کوئی یورپین ملک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ان شعبوں میں عربوں کی غیر معمولی فضیلت کا اعتراف خود یورپین مصنفین کو بھی ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف کا بیان ہے کہ عربی حضارت کے زمانہ میں اندلس میں ۴۰ ملیوں کا رگیر او ر مزدور تھے اس وقت اسپین کے باشندوں کی تعداد ۱۲ ملیوں اور پرتگال کے باشندوں کی تعداد ۶ ملیوں ہے) اور اسی زمانہ میں وہ تمام اہم شہر آباد ہوئے جن کے کھنڈر دیکھ کر اس وقت لوگ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں زراعت بہت ترقی پر تھی اور عرب انجنیروں کی بدولت پانی زمین کے ہر ہر حصہ میں پہونچتا تھا جس سے اس کی زرخیزی و شادابی بڑھتی گئی

بہت سے متعصب و غیر متعصب مصنفین نے عربوں کے کارناموں کو نہایت بسط و تفصیل سے بیان ہے اور نہایت صراحت کے ساتھ ان کے احسانات کا اعتراف کیا ہے لیکن اختصار کے خیال سے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

ملک کی خوشحالی اور حکومت کی آمدنی

ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کا دار و مدار تمامتر زراعت، صنعت اور تجارت کی ترقی پر موقوف ہے۔ اور تم یہ معلوم کر چکے ہو کہ عربوں کے زمانہ حکومت میں ان شعبوں کو کس حد تک ترقی ہوئی۔ اس سے یہ اندازہ کرنا بہت آسان ہے کہ اس وقت ملک کی آسودہ حالی اور فارغ البالی کا کیا حال رہا ہوگا اس کا اندازہ خراج کی اس کثیر مقدار سے بھی ہوسکتا ہے جو سلاطین اندلس ہر سال وصول کیا کرتے تھے اور جس کا حال تاریخ کی کتابوں میں درج ہے

۳۵۰ھ میں کل ملک کا خراج ۵۰ لاکھ دینار تک پہونچ گیا تھا اور ابن خلدون نے کسی معتبر اندلسی مورخ کے واسطہ سے بیان کیا ہے کہ عبدالرحمٰن ناصر جب انتقال ہوا تو اس نے بیت المال میں تقریباً پانچ لاکھ قنطار چھوڑے حالانکہ بادشاہ خراج کا صرف ایک ثلث روپیہ بیت المال میں جمع رکھتا تھا اور دو حصہ فوج اور تعمیر میں صرف کر دیتا تھا۔

خراج کی اس کثرت سے تمہیں ان سلاطین کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی نہ ہو کیونکہ شاہان اسلام، نہایت عدل و انصاف کے ساتھ لوگوں کی آمدنی کے اعتبار سے ان کی جان و مال کی حفاظت کی عوض میں نہایت حقیر رقم وصول کیا کرتے تھے اور اس میں ہرگز کسی قسم کی سختی یا ظلم روا نہیں رکھتے تھے اس پر مفصل بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ (باقی)

عہدِ حاضر کی ایک مشہور شخصیت

مصطفیٰ کمال پاشا

(۶)

(از جناب عبدالحکیم صاحب بی اے)

ٹھیک اس وقت جبکہ وحشی یونانیوں نے اناطولیہ میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور ترکی کے سیاسی رہنما اپنی تمام
دماغ جنگ میں صرف کر رہے تھے، اتحادیوں میں ترکی کی آیندہ تقسیم کے متعلق پروگرام بن رہے تھے۔ لندن اور سان ریمو
مخصوص کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور وہ شرائط صلح طے پائیں جو ترکی کے سامنے پیش کی جانے والی تھیں ان شرائط کا ایک متن
ن کے پاس بھیجا گیا تاکہ اگر انھیں اس کی کسی دفعہ سے اختلاف ہو تو اپنے اعتراضات پیش کریں لیکن جیسا کہ پہلے ہی سے طے تھا۔
ن کے کسی اعتراض کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہ کی گئی اور ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو حکومت قسطنطنیہ کے نمایندوں نے معاہدہ سیورس
خط کر دئے۔ اعلان کیا گیا کہ ارض حجاز ترکوں کی محکومیت سے آزاد کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت برطانوی استعماریت کا دیو اس پر
قابض کر دیا گیا۔ آرمینیا بین الاقوامی محافظت کے تحت ایک آزاد عیسائی ریپبلک بنا دی گئی، فلسطین، عراق اور شام ترکی سے
علیحدہ کر دئے گئے، سائلیشیا پر فرانسیسی اقتدار اور جنوبی اناطولیہ پر اطالوی کا برتری تسلیم کر لی گئی سمرنا اور اس سے ملا ہوا ایشیائے
کوچک کا ساحلی خطہ تھریس، ایڈریانوپل، جزیرہ نما گیلی پولی امبروز اور ٹینی ڈوز کے جزیرے نہایت سیر چشمی اور فیاضی کے ساتھ
یونانیوں کے حوالے کر دئے گئے۔ آبنائے باسفورس اور دردانیلس بین الاقوامی قبضہ و نگرانی میں آگئیں ترکی کے پاس صرف
ایشیائے کوچک کا اندرونی حصہ بچ رہا تھا وہ بھی کرنسی، جنگی ٹیکس اور دوسری معاشی پیچیدگیوں کی بنا پر بیرونی اثرات کے
ماتحت تھا مسٹر آرنلڈ ٹوائنبی اور مسٹر پی کرک ووڈ نے اس معاہدے کو مغربی استعماریت کی سب سے زیادہ بھیانک اور مکروہ
صورت سے تعبیر کیا ہے آگے چل کر یہ لوگ لکھتے ہیں کہ جنگ عظیم کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ دنیا سے حکم استبداد کا وجود مٹا دیا جائے
پسماندہ اور کمزور اقوام و ملل کے حقوق کی نگہداشت کی جائے۔ پریسیڈنٹ ولسن نے اپنے اعلانات میں کمزور اقوام کی
خود اعتمادی اور ان کے جائز حقوق و امتیازات کو حصول آزادی و اتحاد کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے
سیاست دانوں کے اجتماع میں بھی صلح و آشتی کا دلاویز ترانہ گایا جاتا تھا لیکن ان ظاہری حقوق نوازیوں کی تہ میں جو
جذبہ کام کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ اتحادیوں کو اس کی جدوجہد کا معاوضہ اس طرح عطا کیا جائے کہ توازن قوت کا نازک رشتہ
ان سے ٹوٹنے نہ پائے باقی اور جو کچھ کہا سنا گیا تھا اس کی حیثیت تفریح طبع اور سخن گستری یا دوسرے لفظوں میں

منافقانہ رویہ بھی سے زیادہ نہ تھی۔ اس طرح لندن، سان ریمو اور سیوراس میں ٹرکی کی تقسیم کی جتنی بھی کانفرنسیں ہوئیں سب کا ماحصل یہ تھا کہ اس مریض عثمان کے نہ صرف اعضا و جوارح ہی قطع کرلیے جائیں بلکہ عظیم الشان بندرگاہوں پر قبضہ کرکے اس کے سرچشمہ زندگی ہی کو خشک کردیا جائے۔ مغربی سامراج کی یہ ایک ایسی جیت تھی جس نے ایشیائے مائنر کے ہر بڑے شہر کو اتحادیوں کے حرص و ہوس کی بھینٹ چڑھادیا شکست یافتہ ٹرکی ایک اشکبار تصویر تھی جس میں اب شکایت و احتجاج کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ سلطان ہر معنوں میں اتحادیوں کا قیدی تھا اتحادی اُسے باسفورس کے شاہی قصر سے نکلنے نہیں دیتے تھے وہ سلطان کی ضروریات پوری کررہے تھے اس لئے سلطان کو اُن سے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔

صلحنامہ کے شرائط اور ترکوں کا غیظ و غضب

لیکن صلحنامہ کے شرائط نے شدید غصہ و غضب کی ایک عام لہر ترکوں کے دلوں میں دوڑادی۔ مغرب، مغربی تہذیب اور ہر چیز جو مغرب سے وابستہ تھی ان کے دلوں میں نفرت و حقارت کا ایک طوفان بپا کردیتی تھی۔ انھوں نے اس تہذیب کے استیصال کا محکم ارادہ کرلیا اور سختی سے اپنے ارادہ پر کاربند ہوگئے۔ ایک نیا نصب العین تیار کیا گیا ترک اسے مشرقی آئیڈیل کہتے تھے۔ خالدہ ادیب خانم اپنی کتاب مقابلہ ترکی و یورپ (Turkey Faces Europe) میں لکھتی ہیں کہ یہ آئیڈیل اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ ترکوں کی ناتمام آرزوؤں اور مجروح تمناؤں کی ایک بے ڈھنگی تصویر تھی۔ ترکوں نے انقلاب روس اور تحریک اشتمالیت سے بھی جو کارل مارکس کی تحریروں کی پروردہ تھی بہت کچھ استفادہ کیا مصطفےٰ کمال نے بھی اس تحریک سے ہمدردی ظاہر کی اس وجہ سے نہیں کہ وہ درحقیقت اس کا حامی اور پیرو تھا بلکہ اس وجہ سے کہ روسیوں کی ہمدردی و اعانت حاصل کرنے کا یہی ایک راستہ تھا یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تمام مغربی ممالک میں صرف روس ٹرکی سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔

مصطفےٰ کمال اقتدار تو پسند کرتا تھا لیکن ذمہ داریوں سے گھبراتا اس کی سیرت کی اس کمزوری سے بعض مرتبہ اس کے دوستوں اور ساتھیوں میں بھی اسکی مخالفت کا جذبہ پیدا ہوجاتا تھا ایسی حالت میں یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اسمبلی کے بعض ذمہ دار ارکان کمال کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگے اور اسکے بعض بعض افعال پر نکتہ چینی کی۔ اختلافات پیدا ہونے لگے اور کبھی کبھی ناگوار صورتیں بھی پیدا ہوگئیں۔ ایک مرتبہ جیع بے جو کمال کے اشاروں پر کام کرتا تھا ارکین اسمبلی کا اعتراضات کی زد میں آگیا اور لطف یہ کہ کمال نے بھی اس نازک موقع پر اسکی حمایت سے ہاتھ اٹھالیا۔ غریب جیع سخت مصیبت میں پھنس گیا لیکن قسمت کا زبردست تھا اسکے خلاف بے اعتمادی کا ووٹ پاس نہ ہوسکا۔ خالدہ ادیب خانم جنھیں کمال کی سیرت کے مطالعہ کا سب سے زیادہ موقع ملا تھا فرماتی ہیں جو کبھی کبھی وہ (کمال) زبردست تنوطی ہر چیز کو بدگمان چڑچڑا اور اپنے افعال و حرکات میں مبعوث ہوجاتا، صحیح معنوں میں ایک آوارہ مزاج انسان بن جاتا اور اس پر فخر بھی کرتا اور کبھی خودغرض سیاستدانوں کا پارٹ کرنے لگتا۔ کبھی واشنگٹن ثانی معلوم ہوتا اور کبھی نپولین اعظم۔ کبھی تو وہ نہایت

لل اور مجروح نظر آتا اور کبھی شجاعت و شہامت کا پتلا بن جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ کسی اہم مسئلہ پر تقریر کرتے وقت اپنے دلائل کی
نگاہیوں اور زور بیان کی گمراہیوں میں خود گم ہو جاتا یہاں تک کہ ایک پیچیدہ مسئلے کو پیچیدہ تر بنا دیتا لیکن ایک ہی جست
سا اصل موضوع پر بھی آ جاتا اور ہر عقدہ ہر الجھاؤ کو صاف روشن اور عیاں کر دیتا۔ بعض بعض موقعوں پر وہ اس درجہ
ں و پیش غور و تامل سے کام لیتا کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا وہ دنیا کا سب سے کمزور انسان ہے اور یہ کہ وہ صرف باتیں کرنا
انتا ہے لیکن یکایک وہ ایک راہ عمل نکال لیتا اور اس پر اس طرح کاربند ہو جاتا گویا وہ اپنی جان اس مقصد کے لئے
ربان کر دے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ کمال کے ساتھیوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو ذہنی علمی اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے
س پر شرف و امتیاز رکھتے تھے لیکن پھر بھی کوئی اس کا مقابل اس لئے نہ ہو سکا کہ وہ جرأت و صلابت فطرت جو کمال کی
صوصیت تھی کسی میں بھی نہ تھی۔ مندرجہ ذیل مکالمہ جو ایک موقع پر مصطفےٰ کمال اور خالدہ ادیب خانم کے درمیان ہوا اس کی
سیرت کے ایک پہلو پر تیز روشنی ڈالتا ہے

کمال اور خالدہ ادیب خانم کا ایک مکالمہ

کمال نے پوچھا "خانم آفندی تمہارا کیا خیال ہے میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا وہ بالکل درست نہیں ہے"؟
"پاشام میں صاف سمجھی نہیں آپ کیا فرما رہے ہیں۔"
"آپ قریب آ جائیں اس کرسی کے پاس میں بتلاتا ہوں . . . . . . میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر شخص کو چاہیے کہ میری
خواہشات اور میرے احکام پر سختی سے کاربند ہو جائے۔"
"کیا، جہاں تک ملک کے اہم ترین مسائل کا تعلق ہے لوگوں نے ایسا ہی نہیں کیا ہے"
"آپ نہیں سمجھیں میں کوئی تبصرہ یا نصیحت آپ کی زبان سے نہیں سننا چاہتا میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو
میں کہوں ٹھیک اسکے مطابق عمل ہونا چاہئے۔ ہر شخص وہی کرے جس کا میں حکم دوں۔"
"پاشام! کیا میں بھی!!"
"جی ہاں آپ بھی۔"
"میں آپ کی اطاعت کروں گی اور جو بھی آپ کہیں گے کرنے کے لئے اس وقت تک تیار رہوں گی جب تک میرے
خیال میں آپ ملک کی بھلائی کر رہے ہونگے۔"
"آپ کو میرے احکام کے مطابق میری اطاعت کرنی ہوگی" کمال کے لہجے میں ذرا خفگی تھی۔
"پاشام! کیا یہ مجھے دھمکی دی جا رہی ہے"
"معاف کرنا مجھے دھمکانا نہیں چاہئے تھا۔ خصوصاً آپ کو"
اگرچہ کمال نے براہ راست معافی مانگ لی لیکن جیسا کہ خالدہ خانم بیان کرتی ہیں ان کی اس گفتگو سے کمال کو

بہت رنج ہوا اور اسی وقت سے کمال دنیا میں جس ہستی کی موت کا سب سے زیادہ آرزومند ہے وہ خالدہ خانم ہی ہیں۔

سلسلہ بیان صلحنامہ سیوا سے متعلق تھا حقیقت یہ ہے کہ اس صلحنامہ کو گورنمنٹ انگورہ نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ اتحادی ہی اس پر مہر جواز ثبت کر سکے۔ سلطان کی حکومت جب اس صلحنامہ پر دستخط کر رہی تھی تو ترک اپنی تاریخ کی سب سے زیادہ خوفناک جنگ میں مشغول تھے یہ ایسی جنگ تھی جس میں فتح و ظفر کے لئے ترکوں کو اپنی ساری جرأت و جانبازی کام میں لانی پڑی کمال پاشا اس آڑے وقت میں بہترین سپہ سالار، بہترین مدبر و مفکر اور بہترین پروپیگنڈسٹ ثابت ہوا۔ سمرنا پر یونانیوں کے قبضہ کے بعد ہر ہر مقام پر یونانیوں اور ترکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ترکوں نے بھی جواب میں پے بہ پے حملے شروع کر دئے۔ یونانیوں کی تربیت شدہ اسی ہزار (۸۰۰۰۰) کی ایک عظیم الشان منظم اور مسلح فوج جمع کرلی ترکوں کے آدمیوں کی تعداد کل چالیس ہزار کے زیادہ نہ تھی۔ عموماً انہیں نظمی و ترتیبی تھی اور سلیحے بھی ناکافی تھے لیکن ان سب کی تلافی ترکوں کی جرأت، حمیت جذبۂ قربانی اور جوش حب الوطنی سے ہو گئی تھی۔ مصطفےٰ کمال کے دانشمندانہ پروپیگنڈے سے ہر ترک تخت یا تختے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ یونانیوں کی درندگی اور ان کی انسانیت سوز حرکات نے جو انھوں نے بچوں بوڑھوں اور عورتوں کے ساتھ روا رکھی تھیں ہر ترکی دل کو غیظ و غضب کا ایک دہکتا الگارہ بنا دیا تھا اور انتقام کی آگ نے سینوں کو آتشکدہ بنا ڈالا تھا۔ اتحادی ہر ممکن طور پر یونانیوں کی بربریت کو سہارا دے رہے تھے۔ ان حقائق کے انکشافات نے ترکی عزم و استقلال ترکی جانبازی اور جاں سپاری کی رفعتوں کو کہیں اور بلند کر دیا وہ نئے نئے کرشمے دکھانے لگے۔ یہ آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوئی کچھ عرصہ تک یونانی برابر ملک کے اندرونی حصوں میں گھستے گئے ایڈریا نوپل اور بعض دوسرے شہروں پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا اور ترکوں کو شدید نقصانات سے دوچار ہونا پڑا لیکن جانباز ترک ہمت نہ ہارے بلکہ پیہم ہزیمتوں نے ان کی شجاعت و ہمت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ انھیں اپنی فتحیابی کا یقین سا ہونے لگا۔ لڑائی کبھی شدید گھسان ہو جاتی اور کبھی معتدل صورت اختیار کر لیتی۔ بالآخر دسمبر ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ استامبول یعنی توفیق پاشا کی دوسری کیبنٹ نے جس میں علاوہ توفیق پاشا کے عزت پاشا اور صابر پاشا جیسے وطن پرست اور کارآزمودہ وزراء شامل تھے گورنمنٹ انگورہ کی دستگیری کی اور جنگ جاری رکھنے کے لئے افسر اور اسلحہ جات بھیجے۔ یہ طے ہوا کہ حکومت انگورہ اور حکومت قسطنطنیہ کے مشترکہ نمائندوں کا ایک وفد اتحادیوں کے پاس جائے اور برطانوی حکام سے یہ درخواست کرے کہ وہ یونانیوں کو اناطولیہ خالی کرنے پر مجبور کریں اور اس طرح ساری خونریزی و خونخواری کا خاتمہ از خود ہو جائے گا۔

- - - - - - کمال پاشا جو اس وقت بالموجیت Bileojik - میں تھا نہایت سرعت کے ساتھ انگورہ پہنچے تاکہ وزراء سے قسطنطنیہ سے گفتگو کرے اسے یقین تھا کہ عزت پاشا کی تجویز خلوص اور نیکی پر مبنی ہو لیکن یہ کہ برطانوی حکام ان کی درخواست پر توجہ کریں گے اس سے وہ قطعاً مایوس تھا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو بالکل آسان ہے کہ ترکی فوجوں کو اس وقت منتشر کر دیا جائے اور جنگ سے ہاتھ روک لیا جائے لیکن اگر یوں ہوا کہ وفد کی گفت و شنید کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو اس وقت ہماری ناکامی بالکل یقینی ہو جائے گی اس وقت ترک سپاہیوں کا جوش جنگ افسردہ ہو چکے گا اور

لڑائی کے لئے پھر ان کے جذبات کو برانگیختہ کرنا بے معنی ہوگا وہ ایسا وقت ہوگا کہ تیر چلّے سے نکل چکا ہوگا اور پھر ہم کچھ بھی نہ کرسکیں گے۔ خلاصہ کلام اسنے وزراء قسطنطنیہ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کردیا اور کہا کہ میں جنگ ختم کردینے کے لئے قطعاً تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ اتحادیوں سے گفت وشنید کے بعد معتد بہ فائدہ کے حصول کا مجھے یقین دلا دیا جائے عزت پاشا اور اس کے ساتھیوں سے اس نے یہ بھی درخواست کی کہ آپ حضرات ذاتی طور پر آئیں اور ہماری قومی جنگ میں حصہ لیں لیکن جیسا کہ پہلے ہی سے گمان تھا عزت پاشا نے جواب دیا کہ جن حالات اور جس ماحول میں اس وقت میں ہوں وہ مجھے لڑائی میں شرکت کی قطعاً اجازت نہیں دیتے لیکن پھر بھی میری ہمدردی قوم کے ساتھ ہے میں اس جنگ میں قوم کو ہر طرح حق بجانب پاتا ہوں۔ جنگ جاری رہی ترکوں کے عزم واستقلال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اب یونانی میدان چھوڑنے لگے۔ پہلی مرتبہ ترکوں نے ان انو [illegible] کے مقام پر ۸ رجنوری ۱۹۲۱ء کو یونانیوں کو شکست دی۔

یونانیوں پر ترکوں کی فتح اور دول متحدہ کی پریشانی

ترکوں کی اس غیر متوقع فتح نے دول متحدہ کے کیمپ میں ایک ہلچل بپا کردی انھوں نے لندن میں ایک کانفرنس منعقد کی اور اسمیں انگورہ۔ قسطنطنیہ اور یونانی حکومت کے نمائندے طلب کئے گئے اتحادیوں کی طرف سے کہا گیا ہم صلحنامہ سیوا س کی بعض سخت دفعات اور بعض فوجی پابندیاں ترکی پر سے اٹھا دینے کے لئے تیار ہیں۔ باقر سمیع اسے قبول کرنے کے لئے تیار تھا لیکن مصطفےٰ کمال نے صاف انکار کردیا اس نے کہا ہم ایسی موہوم اور خیالی رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے کانفرنس ناکام رہی دول متحدہ نے اعلان کردیا کہ آئندہ ہم ترکی۔ یونانی جنگ سے قطعاً بے تعلق رہیں گے۔

جنگ کی از سر نو ابتدا اور کمال کی ڈکٹیٹر شپ

جنگ از سر نو جاری ہوگئی اور ترکوں کو پیہم ہزیمتیں بھی ہوتی رہیں قریب تھا کہ یونانی انگورہ پر قبضہ کرلیں لیکن انگورہ کی نیشنل اسمبلی نے اس وقت ایک نہایت ہی دانشمندانہ کارروائی کی۔ مصطفےٰ کمال کو حکومت اور فوج دونوں کا ڈکٹیٹر بنا دیا یہی چیز تھی جس کا وہ مدت سے آرزومند تھا چنانچہ ۵ اپریل ۱۹۲۱ء کو اس نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور لڑائی میں نفس نفیس شریک ہوگیا لیکن سوئے اتفاق کہ گھوڑے سے گر پڑا اور پسلی کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی۔ لوگ اسے انگورہ لے گئے لیکن انگورہ میں اس کے لئے سکون کہاں ۲۴ گھنٹے کے اندر ڈاکٹروں کی ہدایات کے بالکل خلاف درد اور تکلیف کے باوجود پھر میدان جنگ میں موجود تھا۔ اگرچہ کھڑے ہونے اور حرکت کرنے میں اسے سخت تکلیف تھی لیکن شاید انگورہ میں بستر مرض پر لیٹے رہنے کی تکلیف زیادہ تھی اور اسکی برداشت سے باہر۔ میدان میں آیا بے جگری سے لڑا اور لڑاتا رہا۔ وہ اپنی ساری دماغی اور جسمانی استعداد کو بروئے کار لا رہا تھا اور حق یہ ہے کہ اسی کے ملکۂ تنظیم، جوش وہمت نے ترکی کی آبرو رکھ لی۔ اسی وقت لوگوں پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ انگورہ کو دارالسلطنت بنانے میں کیا کیا مصلحتیں پوشیدہ تھیں شمال میں کوہستانی سلسلہ اور جنوب میں نمک کے ریگستان دشمنوں کی راہ میں سد سکندری کا کام کر رہے تھے۔ کمال دارالسلطنت کو دشمنوں سے

محفوظ رکھنے میں ہر ممکن کوشش سے کام لے رہا تھا۔ یہ جنگ ۲۲ دن اور رات جاری رہی لیکن آخر میں یونانی سورماؤں نے ہمت ہار دی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ مصطفےٰ کمال کے لبوں پر تبسم تھا وہ کہہ رہا تھا "وہ جا رہے ہیں اس طرح کہ واپس لوٹنے کی کوئی امید نہیں ہے" مصطفےٰ کمال کی یہ شاندار کامیابی تھی۔

جوں ہی کہ یونانی پیچھے ہٹنا شروع ہوئے ترکوں نے اپنی آتش انتقام یونانی قیدیوں زخمی سپاہیوں کے خون سے بجھانی شروع کی حتیٰ کی عورتوں نے بھی اس جذبۂ انتقام میں مردوں کا پورا پورا ساتھ دیا غرض یہ ہے کہ یونانی دہشت و بربریت کا جواب ادھر سے بھی دہشت و بربریت ہی کے ساتھ دیا گیا۔ لطیفی خانم (انکا ذکر بعد میں آئے گا) نے اپنی رپورٹ میں اس قسم کے جستہ جستہ واقعات لکھ کر ان کی مذمت کی ہے۔ مصطفےٰ کمال کو یہ بات گراں گذری اس نے لطیفی خانم کو فہمائش کی کہ آپ کو اس قسم کی رائے زنی کی چنداں ضرورت نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ کمال ترکوں کی ان جوابی کاروائیوں کو بنظر استحسان دیکھ رہا تھا۔ اب وہ انگورہ لوٹا نیشنل اسمبلی نے اُسے الغازی کے معزز لقب سے سرفراز کیا اور فیلڈ مارشل بنایا ان سارے اعزاز و القاب کے جواب میں اس نے نیشنل اسمبلی کے سامنے یوں تقریر کی۔

"پارلیمنٹ کے صدر کی حیثیت سے میں آپ کے سامنے اس حقیقت کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم کسی طرح بھی جنگ کے خواہاں نہیں ہیں امن امان ہماری دلی آرزو ہے اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہماری اس نیک خواہش کی تکمیل کے باب میں دنیا کی کوئی روک روک نہیں بن سکتی لیکن اگر یونانی فوج اس خیال میں ہے کہ ہم سے ہمارے جائز حقوق چھین لے سکتی ہے تو یقیناً وہ بر خود غلط ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ ہم ہر اس قوم کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کرینگے جو ہمارے ملک کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دینے کا ارادہ رکھتی ہے ہمارے طرز عمل سے زیادہ معقول اور حق بجانب اور کونسا طرز عمل ہو سکتا ہے لوگو! میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم دشمنوں کے خلاف اپنی جارحانہ کارروائی اس وقت جاری رکھیں گے جب تک ہمارے ملک میں دشمنوں کا ایک فرد بھی باقی ہے۔"

صلح کی گفتگو اور اس کی ناکامی

ترکی۔ یونانی لڑائی کے فیصلے کی خاطر مارچ ۱۹۲۱ء میں پھر ایک کانفرنس پیرس میں طلب کی گئی لیکن دول متحدہ کی تجاویز سے پھر حکومت انگورہ نے اختلاف کیا نتیجہ وہی ہوا جو پچھلی کانفرنسوں کا ہو چکا تھا۔ حالات نہایت سرعت کے ساتھ بدلتے جا رہے تھے اور آخری لڑائی نے دول متحدہ پر یہ حقیقت کھول دی تھی کہ ترک ایسی قوم نہیں ہے جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں فرانس نے برطانیہ سے الگ ہو کر اور بغیر اسکے مشورہ کے ترکوں سے ایک معاہدہ کیا اس سے انگورہ کی حکومت کا وقار و اقتدار بہت بڑھ گیا اسکے علاوہ سلیشیا سے جب فرانسیسی فوجیں ہٹ گئیں تو کمالی ترکوں کو بہت تقویت پہنچی۔ فرانسیسی کمانڈر لے اتنے اسلحہ جات چھوڑ رہے تھے جو چالیس ہزار سپاہیوں کے لئے بالکل کافی تھے یہ گویا فرانسیسیوں کی ترکوں کے حق میں ایک قسم کی بالواسطہ مدد تھی۔ اٹلی نے بھی عدلیہ سے اپنی فوجیں واپس بلالیں

اور ترکوں کے ساتھ ایک دوستانہ معاہدہ کی طرح ڈالدی یہ سارے معاہدے یونانیوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوئے مارچ ۱۹۲۲ء
میں دول متحدہ کی طرف سے پھر صلح کی تحریک شروع ہوئی۔ کہا گیا کہ یونانی اناطولیہ کو خالی کردیں گے اور اناطولیہ پر ترکی حکومت تسلیم
کر لی جائے گی بشرطیکہ صلحنامے کے بعد یونانیوں کو چار مہینے کی مہلت دیجائے۔ یونانی گورنمنٹ اور حکومت قسطنطنیہ دونوں نے
رضامندی ظاہر کی لیکن کمالیوں نے کہا کہ یونانی پہلے اناطولیہ کو خالی کردیں انھیں چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے اس کے
بعد صلحنامہ ہوجائے گا۔ یونانیوں نے یہ تجویز نہ مانی چنانچہ صلح کی گفت وشنید پھر ختم ہوگئی۔ اگست ۱۹۲۲ء میں یونانی پھر میدان
جنگ میں اُترے لیکن اس مرتبہ کمالیوں نے انھیں اس طرح پسپا کیا کہ پھر سر اٹھانے کی تاب نہ رہی۔ یونانی بھگا دئے گئے اور پوری
اناطولیہ پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا لیکن سمرنا اب تک یونانیوں کے قبضے میں تھا کمال نے خود اس پر حملہ کیا اور یونانیوں کے چار دستے
گرفتار کرلئے اسی اثنا میں اتحادیوں کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی کہ یونانی خود سمرنا خالی کردیں گے انھیں موقع دیا جائے
لیکن لائڈ جارج نے ترکوں کو کچھ ایسے متکبرانہ انداز میں مخاطب کیا تھا جو مصطفےٰ کمال کی برداشت سے باہر تھا وہ غصہ میں چلا
اٹھا "یہ ہیں کون؟ سمرنا کس کا شہر ہے؟ اور یہ کسے دے رہے ہیں" کمال نے برطانوی درخواست سے یکسر بے پروا ہوکر پھر
حملہ کیا ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو اس کی فوجیں سمرنا میں داخل ہوگئیں اور رہے سہے یونانی بھی اب ترکی چھوڑکر بھاگ گئے لیکن انھوں نے
سمرنا میں جگہ جگہ بارود وغیرہ اس طرح رکھے تھے کہ جب انھوں نے شہر چھوڑا تو شہر میں اس طرح آگ لگی کہ ایک چیز بھی نہ بچ سکی۔
ترکوں کو پورا شہر از سر نو تعمیر کرنا پڑا۔

یونانیوں کی سمرنا اور مشرقی تھریس سے دستبرداری

اب کمال نے مشرقی تھریس کی طرف توجہ کی اور یونانیوں سے مطالبہ کیا وہ اسے فوراً خالی کردیں لیکن یونانیوں نے جب
پس وپیش کیا تو اسنے اپنی فوجیں تھریس میں داخل کردینی چاہیں لیکن برطانوی افواج نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا کہ یہ علاقہ
ملک بین الاقوامی محافظت کے تحت میں ہے پچھلے عہدناموں کی رو سے اس پر کوئی حملہ نہیں کرسکتا لیکن کمال نے آگے بڑھنے
پر اصرار کیا اور قریب تھا کہ کمالی اور برطانوی افواج میں تصادم ہوجائے کہ فرانسیسی سپاہیوں نے برطانیہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور
چناق Chanaq سے ہٹ گئے اب برطانوی فوج کی بھی اہمیت جاتی رہی چنانچہ کمال کے اصرار کے سامنے سپر
ڈالدینی پڑی اور یہ طے ہوگیا کہ یونانی تھریس کو فوراً خالی کردیں گے۔ غرض اب اتحادیوں کی تمام خفیہ اور علانیہ کوششیں جو ترکوں
کو یورپ سے نکالدینے کے لئے جاری تھیں ختم ہوگئیں۔ یونانیوں نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو معاہدہ مدنیہ [illegible]
پر دستخط کئے اور سمرنا نیز مشرقی تھریس سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہوگئے۔ میثاق قومی کی جتنی باتیں تھیں ایک ایک کرکے ترکی
کو حاصل ہوگئیں۔ لائڈ جارج اپنی پالیسی یعنی ترکوں کو فنا کردینے میں ناکام رہا چنانچہ اس نے استعفا داخل کردیا انگلستان میں
پھر سے الیکشن ہوا اور ایک کنزرویٹو حکومت برسر اقتدار آئی جس کے سامنے امن وامان صلح وآشتی کا نصب العین تھا۔

لوسین کانفرنس اور ترکوں کی کامیابی

معاہدہ مدینہ کے بعد ایک صلح کانفرنس لوسین میں منعقد ہوئی۔ حکومت انگورہ اور قسطنطنیہ دونوں کو مدعو کیا گیا لیکن حکومت انگورہ نے اعتراض کیا کہ حکومت قسطنطنیہ کا وجود ختم ہوچکا ہے وہ اس کانفرنس میں شریک ہونے کی مجاز نہیں ہے کیبنٹ قسطنطنیہ نے ۴ر نومبر ۱۹۲۲ء کو استعفا داخل کر دیا اور کو سلطان نے ترکی کو خیرباد کہا اب حکومت انگورہ پوری ترکی کی واحد مالک ہوگئی۔ لوسین کانفرنس کا افتتاح ۲۰ر نومبر ۱۹۲۲ء کو ہوا عصمت پاشا ترکی وفد کا رئیس مقرر کیا گیا برطانیہ کی نمائندگی لارڈ کرزن کر رہے تھے لیکن یکایک ۴ر فروری ۱۹۲۳ء کو کانفرنس ختم ہوگئی اور کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ ۲۳ر اپریل کو پھر کانفرنس شروع ہوئی اب کی بار لارڈ کرزن کے بجائے سر ہوریس رمبولٹ برطانوی نمائندے مقرر ہوئے۔ ۲۴ر جولائی کو فیصلہ ہوسکا اسی روز صلحنامے پر دستخط کئے گئے اس میں ترکی کے نئے حدود کی وضاحت کی گئی تھی۔ ترکی۔ حجاز، فلسطین، عراق اور شام سے دست بردار ہوگئی اور اسکے قبضہ میں اناطولیا، انڈریہ، سلیشیا، عدلیہ، سمرنا۔ قسطنطنیہ گیلی پولی، ایڈریانوپل اور شرقی تھریس رہ گئے۔ باسفورس اور داردانلس کے آبنائے بھی وقف عام کردئے گئے۔ ترکی بیرونی اثرات کے بیجا استبداد سے بڑی حد تک آزاد ہوگئی اور اسے تقریباً وہ تمام ممالک مل گئے جن کا ذکر میثاق قومی میں کسی عنوان سے بھی موجود تھا اور جن کے حصول و حفاظت کو مصطفےٰ کمال نے اپنا آیڈیل بنا لیا تھا۔ موصل کی سرحد کا سوال البتہ اب تک طے نہ ہوسکا تھا۔ ان کے علاوہ عثمانی قرضہ کی نئی تقسیم۔ ترکی میں بیرونی اثرات کا استیصال۔ اقلیتوں کا تحفظ اور تعیر آبادیات کے مسائل سے بھی صلحنامے میں بحث کی گئی تھی۔ (باقی)

تحریک اتحاد اسلامی

یوگوسلاویہ کے مسلمان میدان عمل میں

جنگ عظیم کے بعد یوگوسلاویہ میں کئی علاقوں کو ملاکر ایک حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت یہاں کے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ اور انھوں نے دیکھا کہ پرچم اسلام جو واسنا کی دیواروں پر لہراتا تھا وہ اب ترکیہ کی سرزمین میں نظر آتا ہے تو اُن میں حرکت پیدا ہوئی۔ اُن کے علماؤں نے کفر کے فتوے نہیں دئے۔ اُن کے رہنماؤں نے ذاتی اغراض کی خاطر فرقہ بندی کی دعوت نہیں دی بلکہ اُن کے لیڈر، مشائخ اور رہنما متحد ہوگئے۔ اور انھوں نے قوم کو اتحاد کی دعوت دی اور سب کو ایک مرکز لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے نیچے جمع کر دیا۔ آخر حکومت نے اُن کے اتحاد کو دیکھا اور اُن کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگئی۔ اب ان کی شرعی عدالت قایم ہوگئی ہے۔ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی کوئی شرعی عدالت قائم ہے آہ نا اتفاقی پر جس قدر ہوسکے آنسو بہاتے رہو۔ اگر ہوسکے تو عبرت حاصل کرو اور متحد ہوجاؤ۔ (کشفی شاہ نظامی)

فلسفۂ جنگ اور جہدِ حیات

کیا زندہ رہنا کمزور اور نا اہل افراد کا حق ہے؟

دورِ حاضر کے ذرائع جنگ پر ایک معنی خیز تبصرہ

(ترجمہ از جناب حلیمی صاحب صدیقی [illegible] ایڈیٹر)

ذیل کا مضمون ایک مکتوب کا اقتباس ہے جو مضمون نگار نے ۱۹۱۱ء میں میدانِ جنگ (محاذِ فرانس) سے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ کیونکہ آج جنگ کا مسئلہ جنگ کے مباحث عام دلچسپی کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ معنی خیز اور فکر انگیز مضمون یقیناً دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ مترجم

افسوس! محبِ عزیز! ہمارے نظریات کے برعکس جو لوگ مارے گئے یا مارے جا رہے ہیں۔ وہی ہم میں بہترین افراد ہیں۔

زندگی ایک جدوجہد ہے۔ عدم اور وجود کے مابین ایک مسلسل خوفناک اور بے دردانہ جنگ۔!!

تمام زندہ انسان فطرت کی انہی دو متصادم طاقتوں اور لاتعداد بے درد قرنوں سے گذر کر وجود میں آئے ہیں۔ انواع و اقسام کی نسلیں پیدا ہوئیں۔ کچھ عرصہ دنیا پر ان کا تسلط رہا اور وہ نیست و نابود ہو گئیں۔ سائنس کی اصطلاح پر آجکل دنیا میں "جہدِ انسانیت" کا دور ہے۔

علم حیات کے فلسفیانہ نظریات کے ماتحت یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ جس نے اکثر عظیم شخصیتیں پیدا کیں جو جنگ کے ناگزیر اور لابدی ہونے پر عقیدہ رکھتی ہیں۔ جب ہم ازمنۂ قدیم پر نظر ڈالتے اور آثارِ قدیمہ کی "خاموش زبان" کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواہ وہ بوسیدہ ہڈیاں ہوں یا ناقص قسم کے آلات۔ آرائشی سامان ہوں یا فنونِ لطیفہ کی یادگار۔ ہم ان سے ایک اہم سبق حاصل کرتے ہیں۔ یعنی انسانِ قدیم نے جنگ آزمائیاں کی ہیں اور اسے اپنی جنگ جوئی پر فخر رہا ہے۔ امن "کی حیثیت کبھی آئندہ جنگ کی تیاریوں کے لئے زائد مہلت سے زیادہ نہیں سمجھی گئی۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہی بتلاتا ہے کہ اقوامِ حاضرہ یا وہ افراد جن سے ان قوموں کی تشکیل و ترکیب ہوئی ہے۔ گذشتہ جنگوں ہی کا براہِ راست حاصل ہیں۔ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں کسی فراموش گشتہ ہیرو کی ہڈیاں مدفون نہ ہوں۔ دراصل ہم سب ایک خونیں مقابلہ کی پیداوار ہیں۔

ان مباحث سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ "فطرت کا قانونِ انتخاب" جو آج بھی یقیناً غیر محسوس طور پر مصروف

ممکن ہے ہمیں کسی آئندہ جنگ میں مبتلا کر دے گا تاکہ نیرنگ عالم کے حسب حال بہتر سے بہتر افراد منتخب کر سکے۔

لیکن آیئے اس مسئلہ پر ذرا باریک بینی اور عمیق نظری کے ساتھ غور کریں اور دیکھیں کہ آیا یہ قانون جو پہلی مرتبہ عہد عتیق کے دیوہیکل مخلوق کے لئے وضع کیا گیا تھا جس کے بعد انہیں فنا کر دیا گیا، موجودہ نسل انسانی کے لئے بھی اسی طرح مناسب و درست ہے؟ اور کہ فطرت کا یہ قانون انتخاب کن بنیادوں پر مبنی ہے؟ فلسفۂ ارتقاء۔ جو اُس مخلوق کے مدفون پنجروں (انسانی ڈھانچوں) کے مشاہدات اور مطالعہ کا ناقابل انکار نتیجہ ہے۔ ہمیں بتاتا ہے کہ بقائے اشیاء کی تقدیرات معلوم کرنے کے دو اصول ہیں اول اندرونی یا نسلی۔ دوم بیرونی یا ماحولی۔ بالفاظ دیگر کسی نسل کی بقا اس کے ماحول کے انقلابات کو قبول کرنے کی صلاحیت پر مبنی ہے مثال کے طور پر کسی بیل کی ترکیب خلقی کو لیجئے جس سے اسکی نشوونما ہوتی ہو فرض کیجئے کسی سبب سے یہ بیل خشک ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ترکیب خلقی بھی رفتہ رفتہ نابود ہو جانی چاہئے یا یہ کہ اس میں اتنی صلاحیت ہو کہ دوسرا بیل پیدا کر کے اپنے وجود کو برقرار رکھ سکے۔ پس انسان قدیم کے معاملہ میں بھی یہ کلیہ صحیح ہونا چاہئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ انسان قدیم محض گوشت خور تھا یا صرف سبزی پر بسر اوقات کرتا تھا تاہم اپنی اندرونی ترکیب خلقی کی صلاحیتوں اور ماحول کی ضروریات کے پیش نظر وہ اس قابل ہو گیا کہ دانتوں کی ایک ایسی تراش اور قوانین ہضم بنا سکا جو مرکب غذاؤں کو ہضم کر سکیں۔ فی الواقع انسانی دانت اس اصول موضوعہ کے شاہد عادل ہیں کہ "زندہ رہنا صرف بہترین افراد کا حق ہے" (Survival of the fittest)

مگر ہمارا خیال ہے کہ اس نوع انسانی کے اندر کوئی اور چیز پیدا ہو گئی ہے جو قانون انتخاب کے استعمال یا معیار انتخاب پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہو رہی ہے اور وہ چیز "عقل یا فہم" ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ عہد عتیق کا انسان جوہر عقل سے بالکل محروم تھا وہ ضرور عقل رکھتا تھا مگر اس قدر جتنی کہ ایک سانپ یا کچھوا رکھتا ہے۔ جیسا کہ اُن کی بڑی بڑی کھوپڑیوں میں مضحکہ خیز دماغی جوف سے پتہ چلتا ہے۔ اس سے ہم جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان قدیم کی عقل اپنی ترکیب خلقی کی ضروریات اور مناسبات کے مطابق اپنے ماحول میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے ہمیشہ قاصر رہی۔

ـــــ ہم انسانی عقل کی عہد بعہد ترقیات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ البتہ اس پر ہم سب متفق ہیں کہ ہم اپنی سائنٹفک ترقیات کی بدولت نہایت سرعت کے ساتھ جہاں ایک طرف اپنے فطری دشمنوں پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں۔ وہاں دوسری طرف اس کے پہلو بہ پہلو اپنی بہتری اور مفاد کے پیش نظر دنیا میں انسانی زندگی کو روز افزوں آسان اور محفوظ بنا رہے ہیں فطرت کے قانون انتخاب کا یہ ایک منطقی نتیجہ ہے اگرچہ اتنا فرق ضرور ہے کہ فطری طاقتوں میں ہم نے مصنوعی امکانات کو بھی شامل کر لیا ہے۔

ایک حامی جنگ انہیں مفروضات اور مباحث سے استدلال کرتا ہے وہ کہتا ہے ـــــ "دنیا اس قدر آرام طلب و محفوظ ہوتی جا رہی ہے کہ عام قانون ارتقاء کی رو سے انسان کی آئندہ نسلیں یقیناً کمزور اور بزدل ہوتی جائیں گی۔ اس لئے

مفادِ انسانی اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر جن کے حصول کے لئے ہم نے ہمیشہ کوششیں کی ہیں ضروری ہے کہ قوموں کے اختلافات دور کرنے کے لئے جنگ کو آخری اور بالادست منصف قرار دیا جائے۔ آیئے ان مباحث و نتائج کی صحت و عدم صحت پر غور کرنے کے لئے ہم عہد حاضر کی جنگ کے "انتخابی حقائق" کی چھان بین کریں۔ آجکل کی لڑائیاں معاوضہ شہنشاہوں کی خود غرضیوں یا "تقدیر کے سہاروں" پر منحصر نہیں ہیں۔ جب کسی جنگ کا اعلان ہوتا ہے تو پوری قوم حرکت میں آجاتی ہے۔ "قابل آدمیوں" کو چن چن کر محاذ جنگ پر بھیجا جاتا ہے۔ قابل آدمی کی تخصیص سے مراد یہ ہے کہ ہمارا انتخاب ابتدا ہی میں دماغی یا جسمانی طور پھسکو ور آدمیوں کے حق میں رہتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ ہم ان کو مختلف درجوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، کم طاقت والوں کو کم خطرہ کا کام دیا جاتا ہے۔ یہاں پھر "قانونِ انتخاب" کمزور کی حمایت کرتا ہے۔ جب ہم عین لڑائی میں پہونچتے ہیں تو بزدل دستوں کو خطرناک مورچوں کی مدافعت یا حملے کے لئے نہیں بھیجتے لیسے موقعوں پر قدرتاً ہم بہترین دستوں کو ہی بھیجتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ بہادر وہی جو زیادہ ذمہ داری سنبھال سکے۔ اس میں شک نہیں کہ عہد حاضر کی جنگ میں ایک بزدل کے لئے زندہ رہنے کے زیادہ مواقع ہیں۔ وہ آدمی جو خندق میں چھپا رہتا ہے نہ بولتا ہے نہ باہر کی طرف جھانکتا ہے بالفاظ صحیح تر ایک "جنگی چوہے" کی ہو بہو نقل اتارتا ہے۔ وہ ان آدمیوں میں سے ہے جن کی زندہ واپسی کا زیادہ امکان ہے۔

اور پھر آجکل کے مشین اور کیمیائی ذرائع حرب کے مقابلہ میں "ذاتی بہادری" ——— یعنی یہ ؟ ہمارے "موجودہ ذرائع بربادی" ہی ایسے ہیں کہ اکثر زیادہ اچھی صحت والا آدمی جلد مارا جاتا ہے۔ اب قدیم زمانہ بناتات کے جراثیم تو ہیں نہیں جن کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط جسم کا آدمی زیادہ زندہ رہ سکتا تھا۔ مسموم گیس اور پھوٹ پڑنے والے مادوں کے مقابلہ میں تمام علوم تشریح الابدان اور جسمانی توانائیاں بیکار رہیں اسی پر بس نہیں۔ بلکہ موجودہ طریق جنگ میں اور بھی ایسے طریقے شامل ہیں جو انسانی آبادی کے تنزل کے ضامن ہیں۔ جن میں پہلا اور نہایت اہم غذا کی کمیابی اور رسد کی تباہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "بہترین فرد" وہ ہے جو ان امتحانات میں کامیاب ہو کر آخری "معیار انتخاب" میں پورا اتر سکے۔ مگر یہ غلط فہمی بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ توانا سے توانا آدمی بھی اس امتحان کے بعد تباہ و برباد و بیکار ہو جاتا ہے کہ ان "نام نہاد بہترین افراد" کی زندگی ایسی ہی بار ہو جاتی ہے جیسی سابقہ نسلوں کے "بدترین افراد" کی کہی جا سکتی ہے۔

لیکن اس واقعی بربادی کے متعلق کیا کہا جائے جو ایک آنے والی جنگ کے یقینی نتائج میں سے ہے ؟ اندیشہ ہے کہ یہ "مسلسل نسلی بربادیاں" بالآخر جنگ جو اور غیر جنگ جو افراد میں ایک نئی ذہنیت پیدا کر کے انھیں قدرتی طور پر "دھات اور پتھر کے زمانہ" کی طرف واپس کر دے گی۔

اس طرح عہد حاضر کی ایک جنگ صحیح معنی میں طریق انتخاب ثابت ہونے کی بجائے نسبتاً سخت اصول پیش کرتی ہے کیونکہ ایک عالمگیر انسانی بربادی کی ترغیب دلاتی اور کمزور انسانوں کو زندگی کا حق دیتی ہے ——— گر اپنی آئندہ نسلوں کی روز افزوں کمزوری کو دیکھ کر ہم جلد ہی اسے اپنی اولاد اور اولاد کے بچوں کے لئے بہتر قرار دیتے ہیں۔

لمعات اختر

(از جناب اختر جمال صاحب مسلم یونیورسٹی)

حکایت غم پنہاں انہیں سنا نہ سکے ۔۔۔ بقدر خواہش دل اشک ہم بہا نہ سکے
یہ بات اور ہے ہم تم کو یاد آ نہ سکے ۔۔۔ مگر نہیں کہ کبھی دل سے ہم بھلا نہ سکے
نزاکتیں دل محزون کی آہ کیا کہیے ۔۔۔ یہ بار وہ ہے کہ تم بھی جسے اٹھا نہ سکے
ہزار نقش تمنا مٹا دیا تو کیا! ۔۔۔ جو نقش دل پہ ہے۔ تصور وہ مٹا نہ سکے
نمود جلوۂ پیہم بھی کیا قیامت تھی ۔۔۔ مجال دید تو کیا۔ آنکھ بھی اٹھا نہ سکے
یہ کیا کیا کہ سبھی فاش کر دیا آخر ۔۔۔ غضب ہے راز محبت بھی تم چھپا نہ سکے
اٹھا چکی ہیں مری ناتوانیاں اکثر ۔۔۔ وہ ناز تیرے جو کون و مکاں اٹھا نہ سکے
جفائیں لاکھ وہ کرتے رہے جمال مگر ۔۔۔ مری وفاؤں سے دامن کبھی چھڑا نہ سکے

تبرکات حمید

(از استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ)

چاہو تم اتنا ہی جتنا چاہیے ۔۔۔ اور نہ چاہو کچھ تو پھر کیا چاہیے
اس جہانِ پست میں کیا چاہیے ۔۔۔ چاہنے کو اس سے بالا چاہیے
وہ نہیں ملتا تو چاہیں اور کیا ۔۔۔ اور جو ملتا ہے تو پھر کیا چاہیے!
کب سے دیکھیں یہی دیکھا کیے ۔۔۔ آگے کیا دکھلائیں، دیکھا چاہیے
ہے بقدر ساز و سامان بار دل ۔۔۔ راہ رو کا بوجھ ہلکا چاہیے
صحبتوں سے دل مکدر ہو گیا ۔۔۔ یاں ہمیں ایک گوشۂ تنہا چاہیے
آج سے کل دور کچھ اتنا نہیں ۔۔۔ بس ابھی سے فکر فردا چاہیے
کون ہے جس پر کریں ہم اعتماد ۔۔۔ بس خدا ہی پر بھروسا چاہیے
زندگی بیکار میں ساری کٹی ۔۔۔ اب تو کرنا کام اپنا چاہیے

تابشِ سہیل

شورشِ پیہم کا طالب ہے جہانِ زندگی

(از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی (علیگ))

اس طرف آئیں کہاں ہیں طالبانِ زندگی — ہے دمِ شمشیر خضرِ آستانِ زندگی
تو نفس کی آمد و شد کو سمجھتا ہے حیات — میں یہ کہتا ہوں وداعِ جاں ہے جانِ زندگی
راحتِ کنجِ قفس سے زندگی کو کام کیا؟ — بجلیوں سے کھیلتا ہے آشیانِ زندگی
تیری نادانی ہے گر تو ان کو سمجھا نغمہ سنج — ہیں اسیرانِ قفس تو نوحہ خوانِ زندگی
وہ تو گورستاں سمجھتا ہے غلام آباد کو — جس نے دیکھے ہیں زمین و آسمانِ زندگی
کر تلاشِ کنجِ مرقد اے طلبگارِ سکوں — شورشِ پیہم کا طالب ہے جہانِ زندگی
رخصتِ پرواز کیا اذنِ فغاں تک بھی نہیں — کفر ہے اس زندگانی پر گمانِ زندگی
ایک ٹھوکر مار دیتا ہے جہاں پائے طلب — خود ابلتا ہے وہاں سیلِ روانِ زندگی
دستِ قدرت خود لپک کر انکو لیتا ہے سنبھال — لڑکھڑاتے ہیں جہاں شوریدگانِ زندگی
رو پڑے راہِ طلب میں جس جگہ دو آبلے — لہلہا اٹھا وہیں اک گلستانِ زندگی
سعیِ آزادی میں پیشانی سے ٹپکے جو عرق — اس کا ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانِ زندگی
سرفروشِ عشق کا جس خاک پر ٹپکے لہو — اس کے ہر ذرہ سے پیدا ہو جہانِ زندگی
کھال تک مردوں کی بکتی ہے سستے دام پر — دیکھ افسردہ نہ ہو خونِ روانِ زندگی
ہیں نہاں ذوقِ طلب میں زندگی کی توقیر — مشہدِ توحید ہے سنگِ فسانِ زندگی
کربلائے عشق سے آتی ہے اب تک یہ صدا — رفعتِ نوکِ سناں ہے نردبانِ زندگی
فدیۂ جاں پیش کر اے پیروِ دینِ حنیف — ذوقِ قربانی ہے پہلا امتحانِ زندگی
استقامت کا سبق لے اسوۂ صدیقؓ سے — پھر زمانے کو سنا دے داستانِ زندگی
ہاں جنونِ شوق اٹھ پھر لے کے فاروقی علم — پھر دکھا دے دیدۂ عالم کو شانِ زندگی
خرمنِ باطل کو خاکستر بنا کر چھوڑ دے — ہر نفس تیرا ہو اک برقِ تپانِ زندگی

سوال وجواب

(از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

ایک دوست اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

انبیاء کرام کی معصومیت پر تمام امت کا اجماع ہے لیکن بعض مفسرین نے قرآن کی بعض آیتوں کی تاویل اس طرح کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ انبیاء کرام بھی عیوب ونقائص سے پاک نہ تھے۔ حدیث کی روایتوں سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ اس قسم کی آیتوں اور روایتوں کی تعداد بہت کافی ہے آج میں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق دو آیتیں اور روایتیں درج کرتا ہوں جن سے مفسرین وشارحین کے قول کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی جھوٹ بولتے تھے۔ اگر انبیاء کرام معصوم ہیں تو پھر اس قسم کی آیتوں اور روایتوں کا کیا جواب ہوگا؟

(۱) بل فعله كبيرهم هذا الخ

(۲) فقال انی سقيم الخ

(۳) ما كذب ابراهيم الا ثلاث كذبات الخ

اس مسئلہ پر اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر ایک نظر ڈال لی جائے ممکن ہے ان کے بیانات سے یہ عقیدہ حل ہو جائے۔

حضرت ابراہیمؑ کے کذب کے متعلق جو آیتیں اور روایتیں پیش کی جاتی ہیں ان کی تاویل وتفسیر میں مفسرین نے دو راہیں اختیار کی ہیں۔ ایک راہ محققین کی ہے اور دوسری پرستاران روایت کی۔

فریق اول کے نزدیک ان آیات اور روایات سے حضرت خلیل اللہ کی جانب انتساب کذب نہیں ہوسکتا۔

فریق ثانی کے نزدیک انتساب کذب میں کچھ حرج نہیں بلکہ اس کی تائید میں نقلی وعقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں

امام رازی نے تفسیر کبیر میں "بل فعله كبيرهم هذا" کے تحت میں دونوں فریق کے عقلی ونقلی دلائل نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں، پہلے علماء محققین کی متعدد تاویلیں نقل کی ہیں، جن سے حضرت ابراہیم کی طرف انتساب کذب کا بطلان ثابت ہوتا ہے پھر حاملین روایت کی، توجیہیں بیان کی ہیں اور اس کے بعد اپنی رائے درج کی ہے۔

امام رازی نے آیت مذکورہ کی تاویل میں محققین کے متعدد اقوال نقل کئے ہیں لیکن ہم ان میں سے وہ قول نقل کرتے ہیں جو بہت زیادہ چسپاں خیال کیا جاتا ہے اور جو تفسیر کی اکثر کتابوں میں مذکور ہے۔

امام صاحب فرماتے ہیں "محققین نے آیت بل فعلہ کبیرھم کی متعدد ایسی تاویلیں کی ہیں جن سے حضرت ابراہیم کی طرف جھوٹ کا انتساب نہیں ہو سکتا ان میں سے ایک یہ ہے کہ بل فعلہ کبیرھم ھذا کہنے سے حضرت ابراہیمؑ کا مقصد یہ نہ تھا کہ اپنے فعل کو بت کی جانب منسوب کر دیں بلکہ آپ نے اس فعل کو علی سبیل التعریض اپنے لئے بایں طور ثابت کیا ہے کہ اس میں ایک گونہ ان کی تجہیل و تبکیت بھی ہے اس کو یوں سمجھو کہ تم اپنی خوشخطی میں بہت مشہور ہو اور تمہارا ایک ساتھی ہو جو اس فن سے بالکل نابلد ہے اور سوائے ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچنے کے کچھ نہیں جانتا۔ اگر یہ شخص تمہاری خوشخطی کا کوئی بہتر نمونہ دیکھ کر ازراہ حیرت یہ دریافت کرے کہ کیا اسے تم نے لکھا ہے؟ اور تم اس کے جواب میں کہو کہ "نہیں بلکہ آپ نے تحریر فرمایا ہے" تو اس جملہ سے تمہارا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ اپنی ذات سے فعل کتابت کی نفی کر کے اس کے لئے ثابت کرو۔ بلکہ اس کا مقصود تو اسے اپنے ہی لئے محقق کرنا ہے البتہ اس میں اس کیساتھ ایک طرح کا استہزاء ہے"۔ تفسیر کبیر جلد ۶

پھر دوسرے فریق کے دلائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا یہ قول واقعی جھوٹ ہے وہ اس کی تائید اس حدیث سے کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنے کو بیمار کہا حالانکہ بیمار نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ بتوں کو خود توڑا پھوڑا لیکن اس کی نسبت بڑے بت کی طرف کر دی اور تیسرے یہ کہ انہوں نے اپنی بیوی سارہ کے متعلق کہا کہ یہ میری بہن ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ محشر والے جب حضرت ابراہیمؑ سے شفاعت کی درخواست کریں گے تو آپ فرمائیں گے میں تو تین جھوٹ بولا ہوں" اس جماعت نے اپنے قول کو عقلا بھی ثابت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جھوٹ فی نفسہ قبیح نہیں ہے اگر نبی کسی ظالم کے خوف سے بھاگنے پر مجبور ہوا ہو اور گھر میں چھپ گیا ہو اور اس کے بعد ظالم آئے اور گھر والے نبیؑ کے متعلق پوچھے تو ایسی صورت میں جھوٹ بولنا اس پر واجب ہے جب ایسا ہو سکتا ہے تو اس میں کیا استحالہ ہے کہ خدا نے نبی کے لئے کسی ایسی مصلحت کی بنا پر جسے وہی جانتا ہے اجازت دے دی ہو"

اس کے بعد امام صاحب نے فریق ثانی کی رائے پر نکتہ چینی کر کے ایک نہایت ہی عمدہ اصول بیان فرمایا ہے جسے ہم یہاں بجنسہ درج کرتے ہیں۔

واعلم ان هذا القول مرغوب عنه اما الخبر الاول وهو الذی [illegible] فلان يضاف الكذب الى رواته اولى من ان يضاف الى الانبياء والدليل القاطع عليه انه لو جاز ان يكذبوا لمصلحة ويأذن الله فيه فليجوز هذا الاحتمال فی کل ما [illegible] اخبروا عنه وفی کل ما اخبر الله عنه وذلك يبطل الوثوق بالشرائع وتطرق التهمة الى كلها ؎ تفسیر کبیر جلد ۶

یقین کرو کہ یہ قول بہت ہی ناپسندیدہ ہے رہی روایت اول جسے لوگوں نے استدلال میں پیش کیا ہے تو اس کے راویوں کو متہم بالکذب کرنا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ انبیاء کی جانب جھوٹ کی نسبت کی جائے اور اس پر دلیل قطعی یہ ہے کہ اگر مصلحتاً وہ جھوٹ بول سکتے ہیں اور خدا اس کی اجازت دے سکتا ہے تو ان تمام باتوں میں کذب کا احتمال، جائز ہو سکتا ہے جو انبیاء نے یا خود اللہ تعالیٰ نے ہم سے متعلق بیان کی ہیں یہ چیز شریعت کا اعتماد باطل کر دیتی ہے اور اس سے تمام امور شرعیہ میں کی گنجائش نکلتی ہے

آیت انی سقیم کی تاویل

اسی طرح آیت انی سقیم کے تحت میں بھی امام صاحب نے ہر دو فریق کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جو لوگ انہیں بتفصیل دیکھنا چاہتے ہیں وہ تفسیر کبیر کی طرف مراجعت کریں۔ یہاں بھی ان کا مسلک وہی ہے جو آیت بل فعلہ کبیرہم ہذا کے تحت میں بیان فرمایا ہے البتہ یہاں نہایت شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اپنا ایک دلچسپ مکالمہ بھی درج کیا ہے فرماتے ہیں۔

قال بعضهم ذالك القول (انى سقيم) من ابراهيمؑ كذبة ورووا فيه حديثا عن النبىؐ انه قال ما كذب ابراهيمؑ الا ثلث كذبات قلت لبعضهم هذا الحديث لا ينبغى ان يقبل لان نسبة الكذب الى ابراهيمؑ لا يجوز فقال ذالك الرجل فكيف يحكم بكذب الرواة العدول فقلت لما وقع التعارض بين نسبة الكذب الى الراوى وبين نسبته الى الخليل كان المعلوم بالضرورة ان نسبته الى الراوى اولى

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انی سقیم کہنا حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ ہے اور اسکی تائید میں روایت اکذب ابراہیم الا ثلث کذبات پیش کرتے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے کہا اس حدیث کو مقبولیت کا درجہ نہ دینا چاہئے اس لئے کہ ابراہیمؑ کی جانب جھوٹ کی نسبت جائز نہیں ہوسکتی تو اس آدمی نے کہا پھر راویان عدول کے متعلق کذب کا حکم کیسے لگایا جائے گا۔ میں نے کہا جب نبی اور راوی کی جانب انتساب کذب میں تعارض ہو تو ظاہر ہے کہ راوی کی جانب انتساب کذب اولیٰ ہے۔"

علامہ ابن حزم اپنی کتاب ملل ونحل میں روایت اکذب ابراہیمؑ الا ثلث کذبات کی حمایت میں فرماتے ہیں ضروری نہیں کہ ہر جھوٹ معصیت ہو بلکہ بسا اوقات تو اسکا بولنا عین موجب طاعت الٰہی ہوتا ہے چنانچہ نص صریح ہے کہ وہ شخص جو جھوٹ کے ذریعہ لوگوں میں صلاح و برکت پیدا کرتا ہے جھوٹا نہیں ہے اور یہ بھی منصوص ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنی بیوی کو جلب محبت کے لئے جھوٹ بولنا مباح کیا ہے، اور ایسے ہی جنگ میں بھی اسے جائز رکھا گیا ہے اور اس پر تو جمیع اہل اسلام کا اجماع ہے کہ اگر کوئی آدمی بادشاہ کے خوف سے کسی کے یہاں چھپ جائے اور صاحب مکان کے سامنے ظالم بادشاہ پر لعن طعن کرتے لیکن اس کے باوجود گھر والا بادشاہ کے دریافت کرنے پر سب کچھ سے انکار کردے۔ جب بھی وہ گنہگار نہ ہوگا بلکہ خدا کے یہاں ماجور ہوگا اور اگر اس نے وہ تمام باتیں جو اسکے متعلق اسے معلوم ہیں بادشاہ سے ظاہر کردیں تو فاسق و گنہگار متصور ہوگا۔ یہ بھی منصوص ہے کہ بطور تقیہ کے جھوٹ بولنے میں کوئی ہرج نہیں" پھر فرماتے ہیں، جو کچھ حضرت خلیل اللہ کے تینوں جھوٹوں کے متعلق مروی ہے وہ کذب حسنہ میں داخل ہے نہ کہ کذب منہی عنہ میں،، اسکے بعد الگ الگ تینوں مستحسن جھوٹوں کی تاویل بیان کی ہے چونکہ ہمیں ان سے اصولی اختلاف ہے اس لئے ان کی تاویلات کا ذکر یہاں عبث سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ علامہ ابن حزم نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف ان کی روایت پرستی کا نتیجہ ہے۔ اولاً تو یہ روایات بحث و تمحیص کی محتاج ہیں ثانیاً اگر ہم انہیں صحیح تسلیم بھی کرلیں تب بھی کذب کو وجوب کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ افسوس ہے کہ موقع نہیں ورنہ ان روایتوں پر اصولی بحث کی جاتی۔

(باقی)

دلچسپ معلومات

وسط ایشیا میں عربی قبائل

وسط ایشیا میں بہت سے ایسے قبائل پائے جاتے ہیں جن کے لب و لہجہ اور معاشرتی خصوصیات وغیرہ کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص عربی قبائل ہیں۔ ان قبائل کے افراد کی تعداد . . . ہے۔ یہ لوگ ان عرب فاتحین کی نسل سے ہیں جنہوں نے وسط ایشیا پر حملے کئے تھے اور پھر وہیں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی ۱۹۲۵ء میں دو روسی عورتوں نے جو شام و فلسطین میں ایک مدت تک رہنے کی وجہ سے عربی زبان سے بخوبی واقف تھیں ان قبائل کی زیارت کے بعد ان کے متعلق بیان شائع کیا تھا کہ وہ عربی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور ان کا لب و لہجہ اہل عراق سے ملتا جلتا ہے اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں مجمع علمی مشرقی نے اپنا ایک وفد وہاں اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ ان کی زبان، حالات وغیرہ کے متعلق تحقیقات کرے۔ اسی زمانہ میں ایک مشہور فاضلہ عورت، کلثوم عودہ نے بھی ان قبائل کی سیاحت کی تھی، ذیل میں اس عورت کے سفرنامہ کا ایک دلچسپ اور مفید ٹکڑہ درج کیا جاتا ہے۔

. . . . پھر میں تاشقند پہونچی یہ شہر دو حصوں میں تقسیم ہے ایک حصہ جو جدید طرز پر بنا ہوا ہے، اپنے مکانات کی نوعیت اور صفائی وغیرہ کے اعتبار سے یورپین شہروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ البتہ اس کا مشرقی حصہ، عام مشرقی شہروں کی طرح نہایت تنگ و تاریک ہے لیکن یہ حصہ اب زیادہ دنوں تک باقی نہ رہے گا کیونکہ دوسری پنج سالہ اسکیم کے ماتحت یہ حصہ ویران کر دیا جائے گا اور پھر وہاں از سر نو نئی طرز کی عمارتیں بنوائی جائینگی جس میں راحت و صحت کا کافی لحاظ ہوگا۔ شہر کے اکثر باشندے ازبک ہیں۔ ان کی عورتیں پردہ کی مطلق پابند نہیں وہ یورپین عورتوں کی طرح ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں ان میں بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو انجینیرنگ، ڈاکٹری اور فوٹوگرافی وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتی ہیں۔ حکومت نے ان کی تعلیم کے لئے اسکولوں اور کالجوں کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ بلکہ ہر ممکن طریقہ سے ان میں تعلیم عام کرنا چاہتی ہے۔ ایک روز میں ایک گاؤں کے مدرسہ میں ٹھہری ہوئی تھی۔ صبح میرے اٹھنے سے پہلے ہی کچھ عورتیں مدرسہ میں پڑھنے کے لئے آگئیں جن کی آواز سے میں خواب سے بیدار ہوئی۔ یہ عورتیں ہر روز مدرسہ جاتی ہیں اور اپنے تین گھنٹے پڑھنے لکھنے میں صرف کرتی ہیں۔ اس اثنا میں اپنے بچوں کو مدرسہ کی دایہ کے سپرد کر دیتی ہیں۔

بخارا

تاشقند سے میں بخارا پہونچی۔ یہ شہر بہت ویران نظر آیا صرف کچی اینٹ کے بوسیدہ مکانات ادھر اُدھر نظر آتے تھے۔ راستے نہایت تنگ اور پیچدار تھے۔ ان پر اسقدر گرد ہوتی تھی کہ پاؤں اس میں "غوطے" لگایا کرتے تھے۔ یہ شہر اندرونی خانہ جنگیوں میں برباد ہو گیا ہے۔ لوگ اپنے گھروں کی اصلاح و مرمت کی طرف اسلئے توجہ نہیں کرتے کہ اب وہاں ایک دوسرا شہر نئے طرز کا آباد کیا جا رہا ہے

بخارا کی تاریخی یادگاریں

شہر میں بہت سی تاریخی یادگاریں ہیں۔ موت کا وہ بلند مینارہ بھی موجود ہے جس کی بلندی سے ان لوگوں کو گرایا جاتا تھا جنھیں سزائے موت دینا مقصود ہوتی تھی۔ قلعہ اور وہ شاہی محل بھی اب تک محفوظ ہے جس میں شاہان بخارا کبھی کبھی ٹھہرا کرتے تھے اثری تحقیقات کے سلسلہ میں زمین کے نیچے ایک مسجد برآمد ہوئی ہے جو عربی فتوحات کے زمانہ کی یادگار ہے۔

بخارا کی گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے اسی لئے وہاں کے لوگ سبز چائے بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ میں بھی دن میں چالیس پیالیوں سے کم چائے نہیں پیتی تھی تیز و تند ہواؤں سے ناک میں دم رہتا ہے۔ . . . . فضا میں گرد و غبار کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آنکھ کو کوئی چیز سوجھائی نہیں دیتی بسا اوقات دم گھٹنے لگتا ہے۔

عربوں کی آبادی

عربوں کی آبادی زیادہ تر، بخارا اور قشقا دریا کے نخلستانوں میں ہے یہ لوگ مختلف زمانوں میں تھوڑی تعداد میں آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب قریش سے ملتا ہے لیکن ان کے لہجوں کو تفاوت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے ہیں ازبکی اور ترکمانی عورتوں کے ساتھ شادیاں کرنے کی وجہ سے ان کے اصل چہرے بشرے میں بہت فرق آگیا ہے لیکن وہ اب تک اپنی لڑکیوں کی شادی کسی غیر عرب کے ساتھ نہیں کرتے اسی لئے ان میں اب تک بہت کچھ عربی حسن و جمال کی بھی جھلک پائی جاتی ہے۔ سڈول جسم، پتلی کمر، بھرے ہوئے بازو، سیاہ سرگیں آنکھیں ان کے عربی ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ امراء بخارا انھیں اجنبی اور غیر ممالک کے باشندے سمجھ کر ان سے بھاری بھاری ٹیکس وصول کیا کرتے تھے، اس لئے یہ لوگ اس سے بچنے کے لئے اپنی اصلیت کو چھپاتے تھے مگر ان کی آنکھیں ان کی پردہ دری کر دیا کرتی تھیں یہ لوگ اب عام طور سے ازبکی اور تاجیکی زبان بولتے ہیں۔ اس لئے چند الفاظ خبز، لحم، نجوم وغیرہ کے سوا اپنی اصل عربی زبان بھول گئے ہیں۔ البتہ بعض عربی زبان میں بھی گفتگو کرتے ہیں لیکن صرف گھر کے اندر۔ یہ عربی۔۔ قبائل یہاں جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں، مختلف اوقات میں آئے ہیں۔ مثلاً قشقا دریا کے عرب، امیر تیمور کے زمانہ میں اس کے ظلم و ستم سے گھبرا کر اپنے گلوں کے ساتھ حدود افغانستان سے گذرتے ہوئے ازبکستان چلے آئے تھے۔ ان میں جو قصص و حکایات مشہور و رائج ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ تیمور کو کس نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو عرب اور دوسروں کو حضر کہتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خانہ بدوش بدو ہیں۔ یہ میری رائے ہے۔ یقیناً بحث و تحقیق اور ان کی زبان وغیرہ کے مطالعہ

کے بعد فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان کا اصل وطن کہاں ہے اور وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ترکستان بخارا کے عرب جیسا کہ خود ان کا بیان ہے، دو سو سال پہلے اندخوی (افغانستان) سے یہاں پہونچے ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب چار شخصوں تک پہونچتا ہے جو افغانستان کو چھوڑ کر قشقا دریا میں آباد ہو گئے تھے اور یہیں شادیاں کرلی تھیں

عربی مہینوں سے ناواقفیت

ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ لوگ ہجری مہینوں سے بالکل ناواقف ہیں اور ان کے بجائے اپنے حساب وکتاب میں کلدانی (یا سامی) مہینے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مہینوں کے نام یہ ہیں۔ حوت، حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، دلو، بشیلا، رمل۔

معلوم نہیں یہ لوگ مہینوں کے یہ نام افغانستان سے لے کر آئے ہیں یا عرب میں کچھ قبائل ایسے بھی ہیں جن میں یہ مہینے رائج ہیں؟ ان قبائل نے عربی گنتی بھی فراموش کردی ہے۔ صرف پانچ ابتدا کے اعداد انھیں یاد ہیں بقیہ اعداد ازبکی اور تاجیکی زبان کے مستعمل ہیں ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ ان کے تمام معاملات انہی لوگوں سے ہوتے ہیں جن کی زبان ازبکی اور تاجیکی ہے۔ ان لوگوں نے اعضاء جسم کے نام بھی فراموش کردئے ہیں۔ مجھے صرف ایک اسی سال کا بوڑھا ملا جو "اصبع" کے معنی سے واقف تھا۔ "جبہہ" کے معنی سے ایک شخص بھی واقف نہ ملا۔ چونکہ بکریاں وہ اب تک چراتے ہیں اسلئے بھیڑوں اور بکریوں کے نام انھیں حفظ ہیں۔

عربی الفاظ

یہ لوگ اپنی گفتگو میں جو الفاظ استعمال کرتے ہیں ان میں عربی الفاظ کافی تعداد میں ہوتے ہیں لیکن دوسری زبان بولنے والوں کے ساتھ ایک مدت تک مخلوط رہنے کی وجہ سے ان کے تلفظ وغیرہ میں بہت کچھ فرق آگیا ہے ان کے صرف ونحو کے قواعد بھی بہت کافی حد تک ازبکی زبان کے اصول وقواعد سے متاثر ہوئے ہیں۔ وہ ازبکی زبان کے قاعدہ کے مطابق خبر ہمیشہ جملے کے آخر میں بولتے ہیں۔ بعض کلمات ایسے ہیں جن کی آواز دوسرے مشابہہ کلمات کی آواز سے بدل گئی ہے مثلاً منہ کے بجائے میہ۔ جاء کے بجائے جاع۔ اعطی کے بجائے احطی حط کے بجائے حت وغیرہ

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لوگ اجنبیوں اور مسافروں پر بہت زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ اور انسے بہت ڈرتے رہتے ہیں۔ غالباً یہ امراء بخارا کے ظلم وستم کا اثر ہو۔ وہ مجھے بھی شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور میرے عرب ہونے پر یقین نہیں کرتے تھے وہ مجھسے اکثر بہت سی چیزوں کے عربی نام پوچھتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی قرآن مجید اٹھا لایا کرتے تھے کہ میں انھیں پڑھ کر سناؤں۔ لیکن ان سب امتحانوں کے بعد بھی وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ وہ میری پنڈلیوں اور سر کو عریاں دیکھ کر بھی معترض ہوتے تھے کہ مردوں کے سامنے ان اعضاء کا کھولنا حرام ہے۔ اس لئے مجبوراً دماغ کھولا دینے والی گرمی کے باوجود میں اپنے سر اور پنڈلیوں کو چھپائے رکھتی لیکن ان تمام احتیاطوں کے بعد بھی وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرسکے انکو گمان تھا کہ مجھے حکومت نے ان پر ٹیکس لگانے کی غرض سے بھیجا ہے میں برابر انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ میں صرف ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے آئی ہوں لیکن وہ باور نہ کرسکے۔

کوائف عالم اسلامی

ایران

خدا کا شکر ہے کہ ایران نے اسلامی اتحاد کی قدر و قیمت کو محسوس کر لیا ہے، اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ شیعہ، سنی اختلافات مسلمانوں کے دور تنزل اور عہد بیکاری کا کام تھے، جہاد و عمل کے اس دور میں اس قسم کی خرافات کو برداشت نہیں کیا جا سکتا ایران کے مدبرین اور شیعہ مجتہدین سے بھی اعلیٰحضرت کو زبردست امداد ملی ہے وہ سب لوگ اسی نظریہ کے حامل ہیں اور یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ جزئیات اور کو اتنی اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ان اصولوں پر غالب آجائیں جو قومی وحدت کے لئے ضروری ہیں۔

مہلک رسوم کا خاتمہ

ایران میں مہلک رسوم کا خاتمہ کیا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ اتنا تدریجی انداز سے ہو رہا ہے کہ عوام خود اس طرف آرہے ہیں ایران میں کوئی شخص کسی مسلمان پر تبرا نہیں بھیج سکتا۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے سامنے ماتم نہیں کر سکتا ہر مسلمان اپنی جائز عقائد میں آزاد ہے اور اسکو مناسب شہری حقوق حاصل ہیں جدید ایران کی یہی رواداری ہے جس کی وجہ سے اسکے روابط کا جدید سلسلہ، ترکی، افغانستان عراق اور مصر سے قائم ہو رہا ہے اور روبہ استحکام ہے۔

فلسطین!

شاہی کمیشن فلسطین سے اپنا کام ختم کر کے واپس چلا گیا مفتی اعظم فلسطین نے کمیشن کو بیان دیتے ہوئے حکومت برطانیہ سے حسب ذیل مطالبات کئے ہیں،

(۱) یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے سے منع کر دیا جائے۔
(۲) فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔
(۳) فلسطین کو نمائندہ حکومت دے دی جائے۔
(۴) برطانوی انتداب کا جلد از جلد خاتمہ کر دیا جائے۔
(۵) اعلان بالفور پر خط تنسیخ کھینچ دیا جائے۔
(۶) عربوں اور حکومت برطانیہ میں ایک معاہدہ ہونا چاہئے۔

فلسطین کے اعلیٰ افسروں کے تبادلے

فلسطین کے سیاسی حلقوں میں یورپین افسروں کے عام تبادلوں کے متعلق آجکل خصوصیت سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ افسروں کے تبادلے آئندہ چند ماہ میں عمل میں آنے والے ہیں ۱۹۳۶ء کے فسادات کے بعد بھی اسی طرح کے تبادلے عمل میں آئے تھے۔ یہ بھی سنا جاتا ہے کہ ممبران تحقیقاتی کمیشن نے افسروں کو تبدیل کئے جانے کی سفارش کی ہے۔

عربی ممالک کا اتحاد

جریدہ الاقدام رقمطراز ہے کہ اتحاد اعراب کی تحریک روز بروز کامیاب ہو رہی ہے الاحصر و جنوبی افریقہ اور دوسرے ممالک کو عرب کو متحد کرنے کی کوششوں میں اس وقت چالیس ہزار عرب شامل ہو گئے ہیں۔ یہ چالیس ہزار اپنے لیڈروں کے حکم پر جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں اور ان تمام قوتوں سے لڑنے پر آمادہ ہیں جو عربوں کو غلام بنانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

حجاز

مکہ معظمہ کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ جناب فواد بک حمزہ وزیر خارجہ حجاز مصر سے واپس ہو کر حجاز پہونچ گئے ہیں۔ ان کا یہ سفر بہت کامیاب رہا اور دو اسلامی ملکوں (مصر و حجاز) کے تعلقات از سر نو قائم ہو گئے اب یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ماضی کے اختلافات کا قطعاً خاتمہ ہو گیا ہے۔

مصر کی جنگی سڑکیں

مصری برطانوی معاہدہ کے مطابق مصر کی سڑکوں کو جنگی مقاصد کے لئے مفید بنانے کے لئے تعمیر و اصلاح کا کام جلد شروع کیا جائے گا۔ وزارت مال نے اس سلسلہ میں ۵۰ لاکھ پونڈ کا بجٹ تیار کیا ہے۔

مصر میں ایک جدید دفتر کا قیام

چونکہ اس وقت بین الاقوامی سیاست تیزی سے جنگی حرکات کو تقویت پہونچا رہی ہے اور یورپ کی حکومتوں کا اثر لازماً مصر پر بھی پڑتا ہے اس لئے مجلس وزراء مصر نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ صدر اعظم کے ماتحت شعبۂ سیاست فرنگ کے نام سے ایک مستقل دفتر قائم کیا جائے۔ اس دفتر میں سیاسی اور فوجی معاملات کے مبصرین کو مقرر کیا جائیگا جو مبصرین تمام دنیا کی سیاست کا بغور مطالعہ کریں گے اور ہر ہفتہ تازہ ترین حالات کے ساتھ اپنی رائے سے وزارت کی رہنمائی کریں گے۔

روابط عراق و مصر

معلوم ہوا ہے کہ انقلاب عراق کے بعد استاذ حافظ عامر سفیر مصر متعینہ بغداد نے وزیر اعظم عراق سے پہلی ملاقات کی بیان کیا جاتا ہے کہ ملاقات امید افزا رہی ہے اور دونوں ملکوں کے سیاسی تعاون کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ امید ہے کہ اس گفتگو کے نتائج عنقریب بہتر صورت میں نمایاں ہوں گے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

حج معظم :- مولفہ جناب مولانا الحاج قاضی سید عبدالغفار صاحب ضخامت ۲۰۴ صفحات تقطیع متوسط، قیمت قسم اعلیٰ ۱۲؍، قسم ادنیٰ ۸؍
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اسلام کے ضروری رکن حج اور اس کے متعلقات پر لکھی گئی ہے۔ اب تک اُردو زبان میں حج کے متعلق متعدد تصنیفیں شائع ہو چکی ہیں یہ کتاب ان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اس کتاب کے سرسری مطالعہ سے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس نوع کی دوسری کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔

کتاب کے ابتدائی حصہ میں، جو مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے، مختصر طور پر فلسفہ حج .... حج کی تاریخ، خانہ کعبہ کی تاریخی حیثیت، حج غیر مسلم اقوام کی نظروں میں وغیرہ مسائل پر دلچسپ اور عام فہم انداز میں بحث کی گئی ہے۔ حج کے تمام ضروری مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ متعدد عنوانات کے ماتحت بیان کئے گئے ہیں "سیر طور" کی شرح کے ماتحت قرآن کی ان آیتوں کی تفسیر کی گئی ہے جو حج سے متعلق ہیں۔ حج کے تمام اقسام بھی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اور مسائل کے حفظ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے "حج سے پہلے امتحان حج" کے عنوان سے سوال و جواب کا ایک عنوان قائم کیا گیا ہے۔ متعدد نقشوں اور تصویروں کے ذریعہ اہم راستوں اور مقامات کی تشریح کی گئی ہے ایک خاص خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں صرف مسائل حج کے بیان پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے حج کا شوق پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اگر حضرت مصنف نے حج کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا خزانہ جمع کر دینے کے ساتھ حسن ترتیب کا بھی خاص طریقے سے خیال رکھا ہوتا تو کتاب کا پایہ تصنیفی اعتبار سے بہت بلند ہو جاتا۔ بہر حال جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی ہے اسے بطریق حسن پورا کر رہی ہے۔ اُمید ہے مسلمان اس کتاب کی قدر کریں گے۔

جواب شکوہ :- از جناب شمس العلماء مولانا محب الحق صاحب حجم ۸۰ صفحات تقطیع چھوٹی قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ پرفضا۔ پٹنہ

علامہ سر اقبال نے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے درد فرسا مناظر سے متاثر ہو کر بارگاہ خداوندی میں جو شکوہ کیا تھا اس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ حضرت اقبال نے اپنے اس شکوہ کا خود ہی جواب بھی تصنیف فرمایا تھا جو "جواب شکوہ" کے نام سے مشہور ہے۔ پیش نظر کتاب بھی علامہ اقبال کے اسی مشہور شکوہ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بقول مصنف "خدائے عز و جل کی طرف سے مصنف کتاب کے واسطے سے اس شکوہ کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ جواب شکوہ بھی منظوم ہے لیکن اس کی بنیاد تخیل کے بجائے زیادہ تر قرآن پر رکھی گئی ہے۔ اشعار میں جو جوابات دئے گئے ہیں مقابل کے

صفحہ پر قرآن کی وہ آیتیں درج کر دی گئی ہیں جن سے ان کے نزدیک ان جوابات کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۱ پر یہ اشعار درج ہیں

ہم نے تم سے نہ کہا تھا کہ مدد ہم دیں گے — نعمتیں جن کی نہیں کوئی بھی مدد ہم دیں گے۔
ڈٹے بیٹھے تھے ہو شیطاں سے مدد ہم دیں گے — جیتے ہم دیتے رہے تا بہ ابد ہم دیں گے
پیش کیں تم نے فقیروں سے مرادیں اپنی — تم لگے مانگنے پیروں سے مرادیں اپنی

اس کے مقابل کے صفحہ پر حسب ذیل آیتیں نمبروار ترجمہ کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔ نمبر ۱ کان حقا علینا نصر المومنین۔ نمبر ۲ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا نمبر ۳ قاتلوا اولیآء الشیطان نمبر ۴ انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب نمبر ۵ الیس اللہ بکاف عبدہ نمبر ۶ ان الذین تدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئاً وھم یخلقون۔ اموات غیر احیآء وما یشعرون ایان یبعثون۔

اگرچہ فاضل مصنف نے جوابات کی تائید میں جو آیتیں نقل کی ہیں اور ان کے جو معنی بیان فرمائے ہیں، ان سے دو ایک جگہ ہمیں اختلاف ہے مثلاً آیت واذا اردنا ان نہلک قریۃ الخ کا ترجمہ "جب ہم کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم وہاں کے رئیسوں کو فسق و فجور میں مبتلا کر دیتے ہیں تو الزام ان پر ٹھیک اتر جاتا ہے تو ہم سب کو برباد کر ڈالتے ہیں" گو بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق ہے لیکن محققین کی تفسیر کے خلاف ہے مگر اصلاحی نقطۂ نظر سے کتاب کے مفید ہونے میں شبہ نہیں شاعری کے اعتبار سے جیسی کچھ بھی ہو ہمیں اس سے بحث نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اسکی اشاعت ایک حد تک مسلمانوں میں قرآن کی ان تعلیمات کی اشاعت کا باعث ہوگی جن سے ان کی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔

سالنامہ "ادب لطیف" مرتبہ جناب چودھری برکت علی صاحب بی اے و جناب مرزا ادیب صاحب بی اے۔ حجم ۱۲۹ صفحات۔ کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ادب لطیف لٹرل روڈ لاہور

ادب لطیف لاہور کا ایک مشہور ادبی رسالہ ہے جو کئی سال سے علم و ادب کی بہترین خدمات انجام دے رہا ہے۔ جنوری میں اس کا ایک خاص نمبر شائع ہوا ہے جس کی ترتیب و تدوین میں کافی سعی و محنت کی گئی ہے مضمون نگاروں کی فہرست میں ملک کے چند مشاہیر اہل قلم جیسے مولانا ظفر علیخاں و مولانا عبدالمجید سالک وغیرہ کے اسماء درج ہیں۔ مضامین کے انتخاب کا معیار بلند رکھا گیا ہے۔ دلچسپ افسانے اور بلند پایہ غزلوں کے علاوہ چند تاریخی اور علمی مضامین بھی درج ہیں متعدد تصاویر سے پرچہ کی دلکشی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُمید ہے شائقین اس سالنامہ کی قدر کریں گے۔

بہارستان:۔ یہ ایک سو صفحات کا ماہوار رسالہ ہے جو جالندھر شہر کو جناب اختر ارتی صاحب کی ادارت میں نکلتا ہے اس وقت ہمارے پیش نظر جلد ۲ نمبر ۱ ہے کتابت و طباعت اچھی ہے۔ کاغذ بھی سفید اور چکنا ہے سیرت و سوانح "مقالات" "افسانے" "ادب لطیف" اور منظومات وغیرہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ بعض مضامین بلند پایہ اور علمی ہیں "سیرت و سوانح" کے ماتحت ہوا اور اسکی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں بزم ادب کے عنوان کے ماتحت بعض ادبی رسالوں کے مختصر اور دلچسپ اقتباسات دو تین صفحوں میں درج کئے گئے ہیں چندہ سالانہ چھ روپیہ۔

ترجمان القرآن جلد اول و دوم

ترجمان القرآن جلد اول کے بعد جو لوگ جلد دوم کی تیاری کے منتظر تھے ان کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد مد ظلہ العالی کے معارف نگار قلم سے ترجمان القرآن جلد دوم تیار ہو گئی ہے۔ کلام الٰہی کی یہ بے نظیر تشریح و تفسیر جو علامہ آزاد کی تحقیقات اور خداداد قابلیتوں کا بیش بہا خزانہ ہے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اس کی نسبت صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ جلد دوم کی تشریحات اور تفسیری مطالب نے فہم قرآن کی ساری مشکلات دور کر دی ہیں اور معرفت کی بہت سی راہیں کھل گئی ہیں۔ جلد دوم میں سورہ اعراف سے سورۂ مومنون تک کل مطالب آگئے ہیں اب کتاب کی نوعیت محض نوٹوں اور ترجمہ ہی کی نہیں رہی ہے جیسی کہ پہلی جلد کی رہ چکی ہے۔ بلکہ تفسیریہ مباحث و تفصیلات کا بھی معتدبہ حصہ شامل ہو گیا ہے کتاب کے ساتھ ہر سورۃ کے مطالب کی جو فہرست دی گئی ہے وہ صرف فہرست ہی نہیں ہے بلکہ بجائے خود نظر و مطالعہ کی چیز ہے۔ یہ جلد مدینہ پریس بجنور میں نہایت اہتمام کے ساتھ ہر سورۃ کے مطالب کی جو فہرست دی گئی ہے وہ صرف فہرست ہی نہیں ہے بلکہ بجائے خود نظر و مطالعہ کی چیز ہے۔ یہ جلد مدینہ پریس بجنور میں نہایت اہتمام کے ساتھ چھپی ہے کتابت نفیس و خوشنما کاغذ اعلیٰ قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible]۔ جلد اول مجلد [illegible]، غیر مجلد [illegible]

محصول ڈاک ہر حال میں بذمہ خریدار ہوگا۔

آئینہ حقیقت نما (جلد اول)

مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی

یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ پر سے ان تمام سیاہ پردوں کو اٹھا دیتی ہے جو نہایت چالاکی سے ہندو مسلم نااتفاقی پیدا کرنے کے لئے تمام نہاد و مستند اول درسی تاریخوں میں ڈالدیئے گئے۔ ہندوستان کے ہر شخص کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے ملک کے تمام اخباروں اور ہندوستان کے تمام مشاہیر علماء نے اس کتاب کے متعلق نہایت شاندار اور حوصلہ افزا ریویو لکھے ہیں قیمت [illegible]

احقاق حق

گاندھی جی کی خود نوشت سوانحعمری موسومہ تلاش حق جن لوگوں نے مطالعہ کی ہے ان کا فرض ہے کہ اس کتاب کو بھی ضرور ملاحظہ کریں یہ کتاب گاندھی جی کی زندگی پر ایک محققانہ و عالمانہ ریویو ہے اور ہندوستان کا مشہور سیاسی لیڈر اس کتاب کے اندر اپنے حقیقی اور اصلی خط و خال میں صاف نظر آجاتا ہے قیمت [illegible]

مسلمان اندلس

جن لوگوں کو اندلس کے مسلمانوں کی طویل تاریخوں کے پڑھنے کی فرصت نہیں ہے وہ اس چھوٹے سے رسالہ کو مطالعہ کر کے مسلمانان اندلس کے متعلق صحیح اور ضروری علم حاصل کر سکتے ہیں قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ :- محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور یو۔پی

غنچہ کے مضمون نگاروں اور ناظرین سے التجا

۱۔ مضامین مرسلہ عام فہم اور آسان زبان میں ہونا چاہئیں۔

۲۔ ادق مضامین جو بچوں کی سمجھ سے باہر ہوں درج نہ کئے جاسکیں گے۔

۳۔ صنعتی و حرفتی اور دیگر مضامین مع تصاویر و اشکال ہوں تو بہتر ہے۔

۴۔ مضامین مرسلہ جامع اور مختصر ہوں تاکہ دو صفحے سے نہ بڑھ سکیں۔

۵۔ بچوں کے سب سے بہتر مضمون پر انعام پیش کیا جائے گا۔

۶۔ ماہرین تعلیم اور مدرسین کے تعلیمی مضامین خاص طور سے ضروری ہیں

۷۔ غیر شائع شدہ مضامین واپس نہ کئے جائیں گے۔

۸۔ جملہ خط و کتابت میں چٹ نمبر کا حوالہ اور جواب طلب باتوں کے لئے جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۹۔ تاریخہائے اشاعت۔ ہر ماہ انگریزی کی یکم۔ ۸۔ ۱۶۔ ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

قیمت غنچہ:۔ سالانہ تین روپیہ (۳) ششماہی ایک روپیہ ۸ر ممالک غیر سے سالانہ للعہ۔ فی پرچہ ایک آنہ

نرخنامہ اشتہارات رسالہ غنچہ

مقدار صفحہ	ایک بار	چار بار	تین ماہ	چھ ماہ	ایک سال	اجرت تقسیم ضمیمہ
پورا صفحہ	ےؔ	عے	صہ	ماصہ	ا/للعہ	۸ر سیکڑہ
نصف صفحہ	ہے	ہے	صہ	صہ	ماصہ	
چوتھائی صفحہ	ع	معہ	عہ	صہ	صہ	

اشتہار بچوں کی ضرورت سے باہر نہ ہو زبان صاف اور سلیس ہو۔ مخرب اخلاق اشتہار درج نہ ہوں گے۔

جملہ خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ:۔ محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ و غنچہ بجنور۔ (یو پی)

فاران

مالک: محمد مجید حسن

مدیر: ابو اللیث ندوی اصلاحی

ہر ماہ انگریزی کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

نمبر ۳ | بجنور ماہ مارچ ۱۹۳۶ء مطابق ماہ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ ہجری | جلد ۳

فہرست مضامین

بحث و نظر

"علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں"

آج سے تقریباً ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ مدت قبل، جبکہ میرا قیام ندوہ میں تھا کسی صاحب نے دہلی سے ایک رسالہ کے کچھ صفحات، میرے اور ندوہ کے ان چند اساتذہ کے نام، جن کا تعلق اعظم گڈھ سے تھا، الگ الگ بھیجے تھے۔ ان صفحات میں ایک صاحب مولانا امداد صابری، کی طرف سے علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں دکھائی گئی تھیں۔ ہر چند یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ کسی صاحب نے سید صاحب کی مخالفت میں کوئی مضمون لکھا اس سے پہلے متعدد حضرات مختلف عنوانوں سے... سید صاحب کی مخالفت میں بہت کچھ لکھ چکے تھے اور کامیاب اور مقبول مصنفین کو اپنے زمانہ میں مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہی ہے لیکن صابری صاحب کے مضمون کا عنوان کچھ ایسا مہیب تھا کہ بغیر کسی تاخیر کے اسے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا چنانچہ اولین فرصت میں ہم نے اس کا مطالعہ کیا۔ سید صاحب کی متعدد تصانیف سے کچھ "غلطیاں" نکال کر ان پر تنقید کی گئی تھی لیکن ہم نے اسے کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دی، کچھ تو اس لئے کہ اس زمانہ میں شہرت طلبی کے لئے مشاہیر کی جا و بیجا مخالفت ایک عام بات ہوگئی ہے اور کچھ اس لئے کہ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے ساتھ غایت درجہ عقیدت رکھنے کے باوجود ہم نے کبھی انہیں معصوم نہیں خیال کیا۔ علامہ سید سلیمان ہی کے ساتھ منحصر نہیں۔ انبیاء کرام کے سوا کون ہے جس کی معصومیت کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے؟ البتہ اس وقت ایک بات کھٹکی ضرور تھی کہ اس رسالہ کی کاپیاں ندوہ میں انہی تین چار اشخاص کو کیوں موصول ہوئیں جن کا وطنی تعلق اعظم گڈھ سے تھا۔ جن لوگوں کے پاس رسالہ آیا تھا، ان میں سے بعض ایسے تھے جن کے نام سے بھی دہلی میں بمشکل دو تین شخص واقف رہے ہوں گے، اس لئے ہم نے بآسانی فیصلہ کرلیا کہ اس کے بھیجنے یا بھجوانے والے کون صاحب ہیں اور کس غرض سے انہوں نے اُسے خصوصیت کے ساتھ، اعظم گڈھ والوں کے پاس بھجوایا ہے۔ ممکن ہے ندوہ میں اس مضمون کے ساتھ زیادہ اعتنا رکیا جاتا لیکن یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس کی تصنیف واشاعت کے حقیقی اغراض کیا ہیں اور اس بظاہر "مصلحانہ" اقدام کے پردے میں کون سا جذبہ اور کس کا ہاتھ کام کر رہا ہے، ہم میں سے بہتوں نے شاید پورا رسالہ پڑھا بھی نہیں اور غالباً لکھنے نے بھی حضرت مصنف کی تحقیقات اور جانفشانیوں کی پوری طرح داد نہیں دی۔ ممکن ہے ایک محدود حلقہ میں کچھ دنوں اس کا چرچا رہا ہو لیکن جیسا کہ توقع تھی، اس مضمون کی بنا پر اہل علم کے نزدیک نہ سید سلیمان کی وقعت کچھ کم ہوئی اور نہ جناب مصنف کی عزت میں کچھ اضافہ ہوا یہاں تک کہ کچھ ہی دنوں کے بعد لوگوں کو یاد بھی نہ رہا کہ کسی صاحب نے امت مسلمہ کو سید صاحب کی "گمراہیوں" سے بچانے کے لئے ایک نہایت مبارک اور مستحسن اقدام کیا تھا۔ ہم بھی اس واقعہ کو بالکل بھول گئے

لیکن گذشتہ سال ۱۰ اکتوبر یا نومبر میں جب اعظم گڈھ جانے کا اتفاق ہوا تو وہیں ہمیں معلوم ہوا کہ جس جذبہ نے مولانا صابری صاحب کو اس مضمون کے لکھنے پر آمادہ کیا تھا، اسی جذبہ ذاب دہلی کی ایک "انجمن خدام القرآن" کے غیور اور جذبہ خدمت دین سے سرشار اراکین کو اس مضمون کو رسالہ کی شکل میں شائع کرنے اور ملک کے ہر ہر حصہ میں مفت تقسیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے پہلے تو ہماری نظروں کے ایک اشتہار گذرا جس سے یہ معلوم ہوا کہ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کی مذہب کے خلاف کسی نہایت خطرناک سازش کا انکشاف ہوا ہے اور کسی بزرگ نے مسلمانوں کو سید صاحب کے "الحاد وا ہمال" سے بچانے کے لئے نہایت دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ ۵، صفحات کا ایک رسالہ تصنیف فرما دیا ہے۔ اس اشتہار کو دیکھ کر قدرتی طور پر ہمیں بھی شوق پیدا ہوا کہ اس رسالہ کا جلد مطالعہ کریں۔ یہی نہیں بلکہ ہم اس مسئلہ پر بھی غور کرنے لگے کہ اگر واقعی علامہ سید سلیمان مدظلہ دشمن اسلام ہیں اور مذہب کی جا در اوڑھ کر مسلمانوں میں اپنی تصانیف سے الحاد اور اہمال کے جراثیم پیدا کر رہے ہیں، تو آئندہ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت بجائے نیاز مندانہ کیا ہوگی۔ اتفاق سے اس رسالہ کی زیارت جلد نصیب ہوگئی۔ کیونکہ جس طرح ہمیں اپنا ایمان بچانے کی فکر تھی، ہمارے ائمہ دین اور خدام مذہب کو بھی بے قراری تھی کہ یہ رسالہ جلد اطراف ہند میں لوگوں کے ہاتھوں تک پہونچ جائے ایسا نہ ہو کہ سید سلیمان کی کتابوں کا زہر کسی میں سرایت کر چکا ہو اور اس کے پاس انجمن خدام القرآن کا تریاق موجود نہ ہو۔ چنانچہ اسی خیال سے کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کا اشتہار بھی پورے اہتمام کیا تھا ہر جگہ خصوصیت کے ساتھ ان مقامات میں جہاں انجمن خدام القرآن کے خیال کے مطابق سید صاحب کا زہر زیادہ سرایت کر چکا تھا، پہونچایا گیا اور کتابت وطباعت پر معتدبہ رقم خرچ کرنے کے باوجود کتاب مفت تقسیم کی جانے لگی۔

اسی زمانہ میں قصبہ سرائے میر ضلع اعظم گڈھ کے ایک مولوی صاحب جن کا اسم گرامی مولانا حمید الدینؒ اور مولانا شبلیؒ کی تکفیر کے سلسلہ میں اس فتنہ کے بانی ہونے کی حیثیت سے بارہا اخبارات کے صفحات پر آچکا ہے، غالباً مدرسۃ الاصلاح والوں کے خلاف فتوائے کفر حاصل کرنے یا ان کی تکفیر کے پہلے فتوی کی تائید و توضیح کیلئے دہلی تشریف لے گئے تھے۔

انجمن خدام القرآن کو بجا طور پر یہ خیال تھا کہ اعظم گڈھ سید صاحب قبلہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے ان کے "جراثیم" سے زیادہ متاثر ہوا ہوگا اس لئے وہ خصوصیت کے ساتھ اپنا یہ تریاق وہاں زیادہ عام کرنا چاہتی تھی۔ اتفاق سے اس کا خاطر خواہ سامان بھی از خود ہوگیا۔ مولوی صاحب کو جب اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے اسی رسالہ کو بہت غنیمت خیال کیا۔ چنانچہ وہ اس کی کافی کاپیاں لے کر واپس آئے اور بہت اہتمام کے ساتھ لوگوں میں تقسیم کرنے لگے۔ اگرچہ بظاہر ان کا مقصد بھی اس رسالہ کی تقسیم سے وہی تھا جو انجمن خدام القرآن کا تھا یعنی خدمت اسلام بدقسمتی سے اس وقت اسلام کی تخریب بھی اسی نام سے ہوتی ہے لیکن لوگوں کی بدگمانی کو کیا کیا جائے کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ "خدمت اسلام" بھی حقیقت میں مدرسۃ الاصلاح کو جس کی مخالفت بعض معلوم وجوہ کی بنا پر وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں، نقصان پہونچانے کی ایک نئی ترکیب ہے۔ ان کی انتہائی کوششوں کے باوجود مدرسۃ الاصلاح کے دونوں بانی، علامہ شبلی اور علامہ حمید الدین جب کافر نہ ٹھہر سکے تو انھوں نے چاہا کہ کم از کم لوگ سید سلیمان ہی کو

ملحد و بے دین سمجھیں تاکہ ان گوناگوں تعلقات کی بنا پر جو مدرسہ کو حضرت سید صاحب قبلہ سے ہیں، مدرسہ والوں کو بھی ملحد و بے دین مشہور کیا جا سکے۔ بہرحال ابھی مولانا صاحب کی بدولت رسالہ مذکور کی ایک کاپی ایک صاحب کے ذریعہ ہمیں بھی کچھ دیر ورق گردانی کے لئے مل گئی۔ رسالہ کا عنوان چونکہ بہت زیادہ مہیب تھا اور اس کے اشتہار نے پہلے ہی سے ہمیں خوفزدہ کر رکھا تھا اس لئے کتاب کھولتے ہوئے دل دھڑکنے لگا کہ معلوم نہیں سید صاحب کی کیسی کیسی خطرناک "قرآنی غلطیاں" دکھائی گئی ہوں گی اور مسلمانوں کو قعرِ ہلاکت و ضلالت" سے بچانے کے لئے ان کے "خرافات و ہفوات" کو کس کس طرح نمایاں کیا ہوگا! بہت ہمت کر کے کتاب کھولی تو معلوم ہوا کہ یہ تنقیدات بیشتر وہی ہیں جو دہلی کے پرچے میں بہت پہلے شائع ہو چکی ہیں البتہ اس مرتبہ رسالہ کا وزن بڑھانے کے لئے مصنفِ رسالہ نے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ اپنی تحقیقات کی تصدیق و تائید میں ایک درجن سے زائد علمائے کرام کی رائیں معلوم نہیں کن کن ہیبتوں کو حاصل کر کے شامل کر دی ہیں۔

رسالہ کی تنقیدات کا اہم حصہ تو ہم کسی زمانہ میں پڑھ ہی چکے تھے اس لئے ان پر ہمیں کچھ زیادہ استعجاب نہیں ہوا اور نہ انہیں اس وقت لائقِ اعتنا سمجھنے کا موقع ملا البتہ مقدمہ اور بعض تقریظ نگار حضرات کی تقریظیں پڑھ کر بہت زیادہ رنج و ملال ہوا۔ اسی وقت جی چاہا کہ اس کا اظہار کسی تحریر کے ذریعہ کر دیا جائے لیکن مشغولیتوں اور اس سلسلہ سے زیادہ بعض ضروری مسائل نے اس وقت اس کا موقع نہیں دیا یہاں تک کہ اس کتاب کی اشاعت پر دو ایک ماہ گذر گئے۔ اس مدت میں کتاب کی تنقیدات پر ان کی حیثیت کے مطابق جو کچھ چرچا ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اس لئے اب اس پر کچھ لکھتے ہوئے خیال ہوتا تھا کہ خواہ مخواہ اس مسئلہ کو چھیڑ کر اسے کیوں بہت زیادہ اہم بنا دیا جائے مگر اسی اثناء میں بعض خریداران فاران نے کتاب مذکور کے متعلق ہمیں اظہارِ رائے کے لئے لکھا نیز بعض اخبارات سے معلوم ہوا کہ یہ بحث ابھی بعض حلقوں میں زندہ ہے اس لئے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس کے متعلق چند حروف لکھ دئے جائیں تاکہ فاران کی تاریخ ایک زبردست مذہبی اور علمی خدمت سے ناآشنا نہ رہے۔

کتاب کے متعلق تو معلوم ہو چکا ہے کہ ایک سو صفحات کا رسالہ ہے جس میں حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی قرآنی غلطیاں دکھائی گئی ہیں کتاب کے مصنف کوئی مولانا احمد صابری صاحب ہیں دہلی کی کسی انجمن "خدام القرآن" نے اس کو شائع کیا ہے۔ مصنف صاحب سید صاحب کی اغلاط کا ایک حصہ جمع کر کے صاحبِ فراش ہو گئے تھے۔ مگر ناشر صاحب کو . . . . . سید صاحب کی غلطیاں کھولنے کی اس قدر جلدی اور ملک کو جلد از جلد ان کے "فتنوں" سے بچانے کی اس درجہ بے قراری تھی کہ مصنف صاحب کی صحت اور بقیہ اغلاط کے جمع کرنے کا انتظار بھی نہ کر سکے اور یہ اغلاط ہی کو اپنی اصطلاح میں بشکل ضمیمہ چھاپ کر مفت تقسیم کرنے لگے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مصنف کی صحت کے انتظار میں مذہب جو ہندوستان میں پہلے ہی سے "مریض نیم جان" کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید صاحب کے زہر کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

ممکن ہے اس رسالہ کو پڑھ کر . . . . بعض لوگوں کو خوشی ہوئی ہو لیکن ہمیں تو انتہائی رنج و افسوس ہوا اس لئے نہیں کہ اس میں حضرت سید صاحب کی غلطیاں کیوں دکھائی گئیں - یہ تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہمیں تو خوشی ہوئی کہ مولانا امداد صابری نے سید صاحب کی غلطیاں کھول کر دکھا دیں - اگر کسی مصنف کی تصنیف میں خصوصاً جس کا تعلق مذہب سے ہو غلطیاں ہوں تو ان پر تنبیہ کرنا ایک علمی خدمت اور اسلامی فریضہ ہے سید صاحب بہر حال معصوم نہیں جس طرح دوسروں سے غلطیاں ہوتی ہیں ان سے بھی ہونے کا امکان ہے - خود انھیں بھی اپنی معصومیت کا دعویٰ نہیں - چنانچہ رسالہ مذکور کی تنقیدوں کو پڑھ کر حضرت سید صاحب نے اخبارات میں جو مختصر تحریر شائع کی ہے اس میں جہاں ناقد کی تنقیدوں پر روشنی ڈالی ہے وہیں ان کے حق میں دعا بھی کی ہے کہ انھوں نے ان کی تصانیف پر تنقیدی نگاہ ڈال کر انھیں زحمت سے بچا لیا - افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس قسم کی علمی کتاب کے لئے لب و لہجہ کی جس متانت کی ضرورت تھی، اس کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بجائے نہایت رکیک، عامیانہ اور دلآزار کلمے استعمال کئے گئے نہ صرف ناشر و مصنف کی طرف سے بلکہ بعض ان ذمہ دار علمائے کرام کی طرف سے بھی جن کی تائید و تصدیق سے کتاب کی اہمیت بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے اور جو دن رات دوسروں کو شیریں کلامی اور بدگوئی و بدگمانی سے احتراز کی دعوت دیتے رہتے ہیں -

حضرت سید صاحب قبلہ کی شان میں ناقد اور بعض تقریظ نگار اصحاب کی طرف سے جو سخت اور درشت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، انھیں یہاں نقل کرتے ہوئے بھی ہمیں تکلیف ہوتی ہے لیکن آپ کی عبرت کے لئے چند فقرے نقل کئے جاتے ہیں آپ انھیں پڑھئے اور اپنے "علماء" اور "خدام دین" کی "غیرت ایمانی" کی داد دیجئے کہ اگر ان کے خیال کے مطابق علامہ سید سلیمان کی ہزارہا صفحات کی کتابوں میں چند اتفاقی فروگذاشتیں بھی مل گئی ہیں تو وہ کس طرح بے قابو ہو جاتے ہیں اور کس طرح جوش غضب میں ان کی مدت العمر کی علمی اور اسلامی خدمات کو یک جنبش قلم کالعدم قرار دیتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں . . . . کاش اس غیرت دینی کا مظاہرہ اس موقع پر بھی ہوتا جبکہ اپنے نہیں بلکہ بیگانے اسلام کے فروع پر نہیں بلکہ اس کی جڑوں پر تیشے مارتے ہیں ہر پہلو سے اس پر حملے کرتے ہیں قرآن پاک میں غلطیاں نکالتے ہیں، عقائد اسلام کا مضحکہ اڑاتے ہیں شعائر اسلام کی توہین کرتے ہیں اور یہ مقدس علماء اطمینان کے ساتھ اپنے مقدس حجروں میں بیٹھ کر ان سب کا تماشہ دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں

"..... جن کو صابری صاحب کی پیش کردہ غلطیاں) دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اتنا بڑا ذمہ دار اور معروف آدمی جو مسلمانوں میں علمی اعتبار سے راست گو اور دیانتدار مشہور ہو اس طرح صریح تحریف کا ارتکاب کرے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے قرآن مجید کی آیات کے متعلق جو لفظی اور معنوی تحریف کی ہے اور صحیح واقعات کو مسخ کیا ہے اس سے ان کے نصب العین اور دیرینہ مقصد کو بے نقاب کر دیا (از ایک مجاہد اعظم و مفتی)

(فاضل تنقید نگار) ایک زبردست فتنہ کے انسداد کا بیڑا اٹھا رہے ہیں"

رسالہ صفوت الالہ

"آپ نے امت مرحومہ پر زبردست احسان فرمایا کہ ندوی کی تفسیر بالرائی کی غلطیاں اور خلاف اسلام موشگافیوں کو طشت از بام فرما دیا کہ ندوی صاحب کے مزخرفات و ہفوات سے متاثر ہو کر کوئی مسلمان ورطۂ ہلاکت و ضلالت میں نہ گرے۔"

(ایک دوسرے حضرت العلامہ)

"افسوس ہوتا ہے کہ مذہب کے نام پر زندگی گذارنے والے مذہب کے ساتھ عداوت پر کیوں تل جاتے ہیں" (ناشر رسالہ)

اوپر جو عبارتیں پیش کی گئی ہیں ان سے ان تقریظ نگاروں کے طرز تحریر کا نمونہ ہیں اب ذرا خود مصنف کتاب کا انداز بیان ملاحظہ ہو۔

"آیات کا حاصل یہ ہے۔ قرآن تو دیکھا نہیں گیا۔ واللہ اعلم کس قاری نے کون سی قرأۃ سنائی جو یہ نکات حل ہوئے۔ "العلم حجاب الاکبر" کو عالم حقیقی کھول رکھے ص۲۶

"کلام اللہ العظیم کو استدلال پیش کرنا کوئی گناہ نہیں، اس سے زیادہ اور پختہ ثبوت ایک مسلمان کے لئے کیا ہو سکتا ہے مگر قرآن اپنا وقار ضرور چاہتا ہے منافقین کی طرح لاتقربوا الصلوۃ کی صدا اس کے لئے سم قاتل ہے۔ اس کی خفگی بہت سخت ہوتی ہے۔ اس کا مصنف خون سلتا ہے۔ ڈھیل پر ڈھیل ہے کچھ پوچھ نہیں اور پوچھنے پر آئے تو پوری طرح پوچھ لیا۔ بھلا تائب التجا کا تعلق بہشت سے کیا جبکہ آغاز ہی میں "یوم" کا لفظ موجود ہے اور اغفرلنا کہا جا رہا ہے مگر ہے ایک عادت" ص۴۴

"اس میل ملاپ اور چھپا چھپی سے مطلب براری کچھ زیب نہیں دیتی۔ جان حتی کا تماشہ کیس کی انیٹ کیس کا روڑا تاریخ ہی کو نئے موزوں ہے، جو بہ تحقیق و تصدیق وہیں دکھائے جا سکتے ہیں دیکھنے اس راہ میں قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہی مناسب ہے۔ اور اسب تو یہی ہے کہ محقق و مورخ یہ گمان خود محقق و مورخ ہی رہ رہ۔ نہ یہ کلام الٰہی ہر محققانہ و مورخانہ پھیر چھاڑ بھون دے گی۔" ص۴۰-۴۲

"یہ وہ فحش اور ارادی غلطیاں ہیں جو مولانا کے پیکر عقیدت کو عریاں کر رہی ہیں۔ . . مولانا کے اکثر و بیشتر قلمی خدمات کا مقصد دین خالص کی تبلیغ و اشاعت کے بجائے صرف الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا کرنا ہے (ص۱۰)

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس قسم کی عبارتوں کی موجودگی میں بھی نصف درجن تقریظ نگار علماء نے خصوصیت کے ساتھ مصنف کے لب و لہجہ کی متانت اور شائستگی کی تعریف کی ہے، ایک "علامۃ العصر" نے تو یہاں تک تصریح کر دی ہے کہ مصنف کتاب نے "سلاست و متانت تحریر" کو کسی سطر میں بھی نہیں چھوڑا ہے . . . . . ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حضرات کی اصطلاح میں متانت اور شائستگی کس چیز کو کہتے ہیں۔ اگر اسی کا نام متانت اور شائستگی ہے جس کا نمونہ صابری صاحب نے اپنی کتاب میں جا بجا پیش فرمایا ہے تو اب فحش گوئی اور درشت کلامی کی کچھ اور تعریف کرنی پڑے گی۔ ممکن ہے بعض تقریظ نگار اسی "متین" لب و لہجہ میں گفتگو کرنے اور لکھنے کے عادی ہوں اس لئے انہیں مصنف کا لب و لہجہ کچھ اجنبی نہ معلوم ہوا ہو لیکن تہذیب اور متانت لہجہ کو سراہنے والوں میں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب اور حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب بھی داخل تھے ہمیں کم از کم ان دونوں بزرگوں کی طرف سے یہ پڑھ کر نہایت متانت سے اصلاح کی،، "صابری صاحب نے تہذیب و متانت کے دائرہ میں یہ تنقید لکھی" انتہائی تعجب

تھا مگر صدق نمبر ۲۲ میں کشف حقیقت کے ماتحت ان ہر دو ہنگاموں کے جو خطوط شائع ہوئے یک گونہ ہمارے اطمینان وسکون کے موجب ہوئے حضرت مفتی صاحب کے خط میں نہ صرف اس امر کا بیان ہے کہ مذکورہ بالا جملوں کے ہوتے ہوئے مصنف کے لب ولہجہ کی تعریف کس طرح انہوں نے کر دی بلکہ اس بات پر بھی اظہار افسوس فرمایا گیا ہے کہ ان کی تنقید "ایسی تنقیدوں کے ساتھ جن میں بدظنی کی حد سے بھی گذر کر ایک قسم کی تہمت تراشی اور مزید براں سوقیانہ انداز کلام" اختیار کیا گیا اور ایسے پمفلٹ میں جس میں سید صاحب پر اپنی تصنیفات میں ارادۃً غلط معانی ومفاہیم کو لانا ذکر کیا گیا ہے شائع ہو گئی۔

مصنف کتاب اور تقریظ نگاروں نے "تہذیب و متانت" کے دائرہ میں" جذبہ حمیت مذہبی" سے مجبور ہو کر جن جذبات کا اظہار کیا ہے ان کا نمونہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ غور کیجئے الحاد واہمال کے جراثیم پیدا کرنے والا کس کو قرار دیا جا رہا ہے؟ اس کو جس کی بدولت بیشمار بندگان خدا کو راہ راست ملی۔ مذہب کے نام پر زندگی گذارنے والا اور در پردہ اس کی بنیادیں کھودنے والا کس کو کہا جا رہا ہے؟ اس کو جس نے اپنی زندگی مذہب کے لئے قربان کر دی اور جس نے اسلام کی وہ خدمتیں انجام دیں جو صرف اس کے لئے مقدر تھیں۔ "مزخرفات اور ہفوات" سے کس چیز کو یاد کیا جا رہا ہے؟ خطبات مدراس کو جو آنحضور صلعم کی سیرت پاک کا نچوڑ ہیں اور جو غیر مسلموں کے دلوں میں بھی آنحضرت صلعم کی محبت وعقیدت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ سیرت النبی کو جس کے ذریعہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق نہ صرف اپنوں کے شکوک وشبہات دور کئے گئے ہیں بلکہ غیر مسلموں کے اعتراضات ومطاعن کا بھی قلع قمع کیا گیا ہے ارض القرآن کو جو اردو میں اپنے رنگ کی نرالی کتاب ہے اور جو قرآن کے بیشمار مقامات میں ایک مشعل کا کام دیتی ہے، ان مضامین ومقالات کو جو اعدائے اسلام کے جواب میں اس وقت لکھے گئے جبکہ سید سلیمان کے علاوہ کوئی ان کا مقابلہ کرنے والا نہیں تھا۔ سید صاحب جن کی ساری عمر خدمت اسلام میں گذری ان "مہذب اور شائستہ" تنقیدوں کا ہدف کیوں بن رہے ہیں محض اس جرم میں کہ ان سے اپنی ساری زندگی میں چند مسامحتیں ہو گئیں، ہزارہا صفحات کی کتابوں میں کچھ فروگذاشتیں رہ گئیں بعض آیتوں کا مطلب انہوں نے وہ نہیں سمجھا جو ان علمائے کرام کے ذہن میں تھا جو جلالین اور بیضاوی میں لکھا ہوا تھا۔ یہ تو ان کے جوش غضب اور شدت کلام کے ظاہری اسباب ہیں۔ باقی دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا جانتا ہے کہ کس کو کس جذبہ نے ان مغلظ و نا ملائم الفاظ کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا تعلق مصنف کتاب اور تقریظ نگار حضرات کے لب ولہجہ اور طرز بیان سے تھا اب کچھ باتیں نفس مضمون کتاب کے متعلق بھی سن لیجئے۔

مصنف کتاب نے علامہ سید سلیمان مدظلہ کی پہلی تصنیف ارض القرآن سے لے کر آخری تصنیف "عربوں کی جہازرانی" تک چن چن کر کچھ غلطیاں جمع کی ہیں جن کی کل تعداد ۱۱ ہے۔ ان گیارہ غلطیوں کی نوعیت کیا ہے اور انہیں کہاں تک سید صاحب کی "غلطیاں" کہا جا سکتا ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ غلطیاں واقعی غلطیاں ہیں، جب بھی ہم سمجھتے ہیں کہ قوم کو سید صاحب کو مبارکباد دینی چاہئے اور خود انہیں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ باوجود اس کے کہ وہ اس وقت

ہندوستان کے سب سے بڑے مصنف ہیں اور ہزارہا صفحات کی کتابیں ان کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کی غلطیاں اس قدر کم ہیں۔ دنیا میں کیا کوئی ایسا مصنف بھی ہے جس نے کبھی غلطیاں نہ کی ہوں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس پر تعجب کیوں کیا جائے کہ حضرت سید صاحب کے ہزارہا صفحات میں کچھ غلطیاں نکلیں! تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس قدر کم نکلیں یہاں کسی ایسے مصنف کا نام بتایا جائے جس کی تصنیفات میں کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو۔ کیا سید صاحب کی غلطیاں واضح کرنے کے لئے جو رسالہ لکھا گیا ہے وہ خود بھی مختصر ہونے کے باوجود اغلاط سے محفوظ ہے؟ اگر کوئی تنقید کرنا چاہے تو کیا . . . ۵۰ صفحات کا یہ دو ورقہ رسالہ تیار نہیں ہو سکتا! استدلال و استشہاد کی غلطیوں کو چھوڑ دیجئے کہ اس میں بڑے بڑے لوگ غلطیاں کر جاتے ہیں صرف صفحہ اول کے لفظی اغلاط کی فہرست ملاحظہ ہو۔

معزور	(معذور)	شاین	(شائع)
اسرار	(اصرار)	پل جاتے ہیں	(تل جاتے ہیں)
ضمرہ	(زمرہ)		

مصنف صاحب نے سید صاحب کے جو اغلاط ۱۱ جمع کئے ہیں ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کا اس وقت موقع نہیں۔ سید صاحب نے معارف بابت ماہ دسمبر میں جو مختصر جواب شائع فرمایا ہے وہ ان کی نوعیت اور حیثیت واضح کرنے کے لئے کافی ہے واقعہ یہ ہے کہ اس رسالہ میں سید صاحب کی جو غلطیاں دکھائی گئی ہیں، انہیں زیادہ سے زیادہ سامحات یا اتفاقی فرو گذاشتوں کا درجہ دیا جا سکتا ہے جن سے کسی مصنف کے قلم کا محفوظ رہنا ناممکن ہے۔ ان اتفاقی فروگذاشتوں کی بنا پر سید صاحب پر، ان کی مدت العمر کی دینی خدمات سے آنکھیں بند کر کے، . . . الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا کرنے اور بالقصد قرآن کریم کے اندر معنوی تحریف کرنے کا الزام، انتہائی جرأت اور دلیری کا ثبوت ہے۔

سید صاحب نے اپنے جواب میں واضح کر دیا ہے کہ ان ۱۱ غلطیوں میں سے دو چھاپے کی غلطیاں ہیں جن میں سے ایک کا اعلان دو برس پہلے معارف میں ہو چکا ہے اور دوسری کے چھاپے کی غلطی ہونے کا قرینہ کتاب ہی میں پایا جاتا ہے کہ خود آیت کے ترجمہ میں ہر ایک[1] کا لفظ موجود ہے۔

چند غلطیاں ایسی ہیں "جیسی غلطیاں" اس وجہ سے کہہ لیجئے کہ حضرت ناقد نے سید صاحب کی غلطیاں دکھانے کے شوق میں انہیں بھی غلطیوں میں شمار کر لیا ہے ورنہ حقیقت میں وہ ان کی خوش فہمی کا نتیجہ ہیں علامہ سید صاحب ارض القرآن میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"عام طور پر مشہور ہے کہ عذاب کے بعد قوم عاد میں کوئی زندہ نہ بچا یہ غلط خیال ان آیتوں سے سمجھا گیا ہے فاصبحوا لا یری الا مساکنہم (وہ اس طرح ہوگئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا)، فتری القوم فیہا صرعی کانہم اعجاز نخل خاویہ فہل تری لہم من باقیہ) اس ہوا میں یہ قوم اس طرح افتادہ تھی جیسے کھوکھلے درخت کی جڑ ہو کیا ان میں سے اب کوئی زندہ نظر آتا ہے؟

[1] عربوں کی جہازرانی صفحہ ۳۲

لیکن یہ تو زمانہ نزول قرآن کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس سے دو ہزار برس پہلے کا حال کیا تھا۔ خود قرآن کہتا ہے۔

فانجینه والذین معه برحمة منا وقطعنا دابر الذین کذبوا بآیاتنا (اعراف - ۹)
ہم نے ہود کو اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے نجات دی اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کی تکذیب کی ان کی جڑ کاٹ دی۔

ولما جاء امرنا نجینا هودا والذین آمنوا معه برحمة منا ونجیناهم من عذاب غلیظ
اور جب ہمارا حکم آیا ہم نے ہود کو اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے نجات دی اور اس ہم نے ان کو بڑے عذاب سے نجات دی۔

اور تیسری جگہ قرآن نے تفصیل کر دی ہے اور ان ہلاک ہونے والوں کو عاد اولی کہا ہے۔ وانہ اہلک عادا الاولی (اور اس نے عاد اولی کو ہلاک کر دیا) اس آیت سے خود بخود یہ سمجھنا چاہئے کہ نجات پانے والوں کا نام عاد ثانیہ ہے۔ (ارض القرآن جلد اول صفحہ ۱۲۸)

سید صاحب کی عبارت بالکل واضح اور محکم ہے اور اس پر کہیں سے اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن جب اعتراض کرنا ہی ٹھہرا تو کس چیز پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا! مصنف نے پوری عبارت میں سے صرف ایک جملہ "لیکن یہ تو زمانہ نزول قرآن کا حال بیان کیا گیا" پکڑ لیا اور اپنی طرف سے اس کو ایک خاص معنی پہنا کر جس کی عبارت میں کوئی گنجائش نہیں لکھ دیا "گویا حضور اکرم کے عہد نبوت میں قوم عاد عذاب باد سے ہلاک کی گئی۔ ان کی لاشیں نزول قرآن کے زمانہ میں کھوکھلے درختوں کی جڑوں کی طرح پڑی تھیں۔ تو سید صاحب کے مفہوم کے لحاظ سے ماننا پڑے گا کہ حضرت ہود علیہ السلام عہد خاتم النبیین میں حیات تھے کیونکہ عاد کی تباہی کے وقت وہ بچائے گئے تھے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے . . . اور اگر دور محمدی میں ہود علیہ السلام کی زندگی تسلیم نہیں تو خود نتیجہ کو کی تغلیط ہو جاتی ہے اور کہنا پڑے گا کہ آیت مذکور کا تعلق زمانۂ نزول قرآن سے نہیں بلکہ اس سے دو ہزار برس قبل کے عہد سے ہے۔"
حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب جس چیز کو زمانۂ نزول قرآن سے متعلق ظاہر فرما رہے ہیں وہ قوم عاد کا بے نام و نشان ہونا ہے نہ کہ دور محمدی میں حضرت ہود علیہ السلام کا موجود ہونا اور ان کی قوم پر ہلاکت کا آنا۔

ارض قرآن کی ایک اور عبارت پر اسی طرح خواہ مخواہ اعتراض کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ خطبات مدراس کی ایک عبارت کے لئے صفحے کے صفحے وقف کر دیے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ سید صاحب نے انبیاء کے متعلق جو یہ لکھ دیا ہے کہ فلاں صرف مبشر تھے فلاں صرف نذیر تھے وغیرہ وغیرہ یہ تقسیم قرآن کے خلاف ہے اور خود سید صاحب نے سیرت النبی جلد چہارم میں ایک جگہ ان انبیاء کو بیک وقت انہی متعدد اوصاف سے جنھیں الگ الگ ہر نبی کے لئے ثابت کیا تھا متصف تسلیم کیا ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سید صاحب کی دونوں کتابوں کی عبارتوں میں تناقض پایا جاتا ہے، جب بھی خطبات مدراس کی عبارت کی بنا پر سید صاحب پر الحاد و اہمال کا الزام تو نہیں لگایا جا سکتا اور اس حالیکہ ناقد صاحب خود ہی فرما رہے ہیں کہ سید صاحب کی موخر کتاب میں صحیح خیال پیش کیا گیا ہے۔ ان گیارہ اغلاط میں سے بقیہ چھ غلطیوں کی نوعیت سمجھنے کیلئے سید صاحب قبلہ کا جواب سن لیجئے "بقیہ چھ غلطیاں یہ ہیں کہ مباحث برزخ میں اہل قرآن کے مقابلہ میں جو اقوال مفسرین سے الگ ان آیتوں کو محل سمجھے ہیں یعنی جو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں وہ برزخ پر چسپاں کر دی ہیں اور جو پل صراط کے پر لکھی جانی چاہئے تھیں وہ بہشت کے موقع پر لکھ دی ہیں گو اقوال مفسرین سے اتنا بھی اختلاف الحاد ہے تو مفتی کو تنہا غریب سید سلیمان کے

بلکہ زندیقی وعلماء کے الحاد کا فتوی دینا ہوگا۔ "اہل قرآن کیلئے حدیث کا اثبات حدیث و تفسیر کے ذریعہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ ان چیزوں کو لائق اعتنا نہیں خیال کرتے اسلئے سید صاحب نے خود قرآنی آیات سے اس پر استدلال فرمایا مگر فقد کے نزدیک وہ استدلال غلط تھے تو قرآن و حدیث اور لغت . . . سے ان کی غلطی واضح کرتے لیکن اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا ہے کہ آیت کے متعلق مفسرین کے اقوال جمع کردئے ہیں گویا وہ زمرۂ معصومین ہیں جس سے کبھی غلطیاں ہوئی ہی نہیں اور گویا تفسیر سراج بعید (جسے مصنف نے جابجا سراج بعید لکھا ہے اس لئے لکھا ہوگا کہ المسمی بسراج بعید مین حرف پ نام کا جزء سمجھ لیا ہے حالانکہ وہ صلہ ہے) تفسیر درّ الاسرار تفسیر نظم الجواہر اور تفسیر فاضل کاشفی جیسی بے اثر نامستند اور گمنام کتابوں میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ سب حجت ہے اور اس سے سر موانحراف کفر و الحاد ہے۔ سید صاحب نے ان آیتوں کے جو مفہوم بتائے ہیں ان کے خلاف، نا قد صاحب نے مفسرین کے اقوال بہت محنت سے جمع کردئے ہیں حالانکہ انہی مفسرین کی تفسیروں میں ایسے اقوال بھی مل سکتے ہیں جن سے سید صاحب کے استدلال اور مفہوم کی بھی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً آیت وما انزلنا علی قومہ من جند من السماء کی تفسیر میں سید صاحب نے لکھا تھا کہ پیغام دیکر ہم نے وحی کو نہیں اتارا۔ اس پر معترض نے بڑی ہنسی اڑائی ہے اور مفسرین کی کتابوں سے متواتر یہ نقل کیا ہے کہ وحی کو پیغام دیکر نہیں بلکہ عذاب کیلئے نہیں بھیجا۔ حالانکہ ابن جریر طبری میں پیغام دیکر بھیجنے کی روایت بھی شروع ہی میں موجود ہے۔

واختلف اهل التاویل فی معنی الجند الذی اخبر الله ان لم ینزل الی قوم هذا المومن بعد قتلهم وه فقال بعضهم عنی بذالك انهلم ینزل بعد ذالك رسالة ولا بعث الیهم نبیا ذکر من قال ذالك عن مجاهد قوله جند من السماء قال رسالة تفسیر طبری ص ۲۳۲

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ سلف کے اقوال مختلفہ پر عبور حاصل کئے بغیر عالم کیوں بن بیٹھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نہ وقت ہے اور نہ گنجائش اس پوری کتاب پر مفصل تنقید نہیں کیجا سکتی۔ بہرحال گذشتہ سطروں سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ معترض صاحب کے اعتراضات اور تنقیدوں کی کیا حیثیت اور ان میں کتنا وزن ہے۔ اعتراضات اور تنقیدوں کی نوعیت معلوم کرلینے کے بعد ایک نظر مصنف کے ان فقروں پر جو ابتدا مضمون میں نقل کئے گئے ہیں اور اگر آپ کے پاس رسالہ موجود ہو تو تقریظ نگار اصحاب کی مداحانہ عبارتوں پر ڈال لیجئے۔ دعاوی کتنے مہیب اور پرشکوہ ہیں اور دلائل کس قدر گرد

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے	دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا ہوا

یوں تو کتاب میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو حیران اور مبہوت بنادیتی ہیں لیکن ہمیں سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ناشر اور مصنف دونوں حضرات نے لکھا ہے کہ ان اغلاط کو تصحیح کیلئے سید صاحب کو متعدد بلکہ بقول ناشر نصف درجن خطوط جوابی لکھے گئے لیکن سید صاحب نے جواب تک نہیں دیا۔ سید صاحب نے اخبار اعلان میں اسکی تغلیط کی ہے جو لوگ سید صاحب کے اخلاق و کردار سے واقف ہیں وہ یہ باور کرنے کیلئے تیار نہیں ہوسکتے کہ سید صاحب کو انکی اصلاح کیلئے نصف درجن جوابی خطوط واقعی لکھے گئے اور اب وہ جھوٹ بولکر اسکا انکار کررہے ہیں کسی کو بدنام کرنے کیلئے غلط بیانی سے کام لینا حد درجہ مکروہ فعل ہے۔

بعض تقریظ نگار علماء نے مصنف کتاب کو مشورہ دیا ہے کہ آپ محنت کرکے اگر سید صاحب کی تصانیف میں سے اس قسم کی غلطیوں کو جمع کردینگے تو امت کے نزدیک آپکی یہ سعی مشکور ہوگی بلکہ عنداللہ بھی ماجور ہونگے۔ ہمارے خیال میں یہ مشورہ بہت مناسب ہے۔ سید صاحب کی غلطیاں جمع کرنیکا کام ضرور جاری رکھنا چاہئے ورنہ لوگ واقعی گمراہ ہو جائینگے لیکن اسی کیساتھ ہمارا مشورہ بھی اگر قابل قبول ہو تو عرض کریں کہ خدا کے لئے آپ سید صاحب کی تصنیفات کیساتھ ساتھ ان کتابوں کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کیجئے جنکی طرف اگر توجہ نہ کی گئی تو ہندوستان میں اسلام کی بنیادیں متزلزل

یادِ اندلس

(۴)

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گذشتہ نمبر میں بتایا جا چکا ہے کہ عربوں کے دورِ حکومت میں اندلس کی فارغ البالی اور مال و دولت کی فراوانی اور کثرت کا کیا حال تھا۔ تجارت زراعت اور صنعت کی ترقی اور فروغ کی وجہ سے رعایا بھی خوش حال تھی اور حکومت کے خزانے بھی مالا مال تھے ملک اور حکومت کی اس فارغ البالی اور مرفہ الحالی کے جو خوش گوار نتائج ظاہر ہونے چاہئیں وہ سب اندلس میں ظاہر ہو کر رہے۔ شاہانِ اندلس کی عنایت و توجہ سے جب سرزمین اندلس کا ذرہ ذرہ سیم و زر بن گیا اور ان کے خزانے اخراج اور محاصل کی آمدنیوں سے پر رہنے لگے تو ان کے دل کے ولولے بڑھے اور امنگوں میں اضافہ ہوا ملک کی تکمیل ضروریات سے فارغ ہو کر وہ اپنے ذوق و رجحان کے مطابق اپنے عزائم اور حوصلہ مندیوں کی تکمیل پر آمادہ ہوئے۔ ان میں جس کو جس چیز کا شوق ہوا اس کی قسمت لوٹ آئی اور وہ چیز دیکھتے دیکھتے اپنے اوجِ کمال کو پہونچ گئی۔ لیکن جو چیزیں ان سب کی عنایت و توجہ کا مرکز بنیں انہیں خصوصیت کے ساتھ اور چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ عظمت و اہمیت حاصل ہوئی۔ انہی میں علم و فن کی قدر افزائی اور تعمیرات کا شوق تھا۔ گو شاہانِ اندلس میں سب کے سب علم و فن کے دلدادہ اور فن تعمیر کے شیدائی نہ تھے لیکن پھر بھی جس سے جہاں تک ہو سکا ان کی قدر افزائی میں کوتاہی نہیں کی۔ ان کی علم و فن کی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ عربی سلطنت کے زمانہ میں اندلس علم و فن کا ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جہاں فرانس اٹلی اور دوسرے یورپین ممالک کے طلبہ جوق در جوق آتے اور اپنی تشنگی علم کو یہاں کی یونیورسٹیوں میں بجھا کر اپنے ملکوں کو واپس جاتے اور وہاں علم و فن کی روشنی پھیلاتے تھے اور ان کی تعمیری حوصلہ مندیوں کا نتیجہ تھا کہ وہاں ایسی ایسی شاندار اور پُرعظمت عمارتیں جا بجا تعمیر ہو گئیں جو اب تک زمانہ کے انقلاب و حوادث کے باوجود موجود ہیں اور جنہیں دیکھ کر بیسویں صدی کا انسان بھی حیران اور ششدر ہو کر رہ جاتا ہے عربوں کے قدر دانی علم نے وہاں علوم و فنون کو جس درجہ تک پہونچا اس کا تذکرہ کہیں آگے آئے گا۔ آج ان کی تعمیرات پر کچھ عرض کیا جائیگا

خلفاء اندلس اور فن تعمیر

اسپین عربی دورِ حکومت سے پہلے اپنی تعمیرات کے اعتبار سے عام یورپین ممالک سے بہت پست تھا۔ اگرچہ اس پر ایک زمانہ تک رومیوں کی حکومت رہی جو فن تعمیر کی مہارت اور شوق میں کافی شہرت رکھتے ہیں لیکن اسپین ان کے زمانۂ حکومت میں ان کی توجہ سے بہت حد تک محروم رہا۔ عربوں نے جب اسپین کے اندر قدم رکھا تو شروع شروع میں ان کی توجہ قدرتی طور پر ملکی نظم و نسق کی طرف مبذول رہی اور تعمیرات کی طرف سے عام بے اعتنائی برتی جاتی رہی مگر جب ملکی بندوبست سے انہیں اطمینان ہو گیا اور ان کی حکومت

کی بنیادیں وہاں مضبوط ہوگئیں تو اس وقت ان کی توجہ تعمیرات کی طرف منعطف ہوئی۔ عربی خلفاء میں عبدالرحمٰن داخل پہلا شخص ہے جس نے خصوصیت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی۔ عرب اسلام سے پہلے تہذیب و تمدن اور اس کے اثرات و لوازم سے ناآشنا تھے۔ اس لئے وہ کسی خاص طرز تعمیر کے بھی مالک نہ تھے مگر جب فتوحات کے سلسلہ میں ان کا مختلف قوموں سے میل جول ہوا اور مختلف ممالک کے اسلوب تعمیر دیکھنے کا انہیں موقع ملا تو رفتہ رفتہ ہر ایک کے امتزاج اور آویزش سے ان کے یہاں ایک خاص طرز تعمیر پیدا ہوگیا جو بعد کو ان کا خاص طرز بن گیا اور اسی کے مطابق دمشق وغیرہ میں عمارتیں بننے لگیں۔ عبدالرحمٰن داخل کے زمانہ میں بلکہ اس سے پہلے ہی اندلس دمشق کی درجہ بدرجہ اسی کی طرح دمشقی طرز تعمیر سے بھی آشنا ہوا رومیوں کو طرز تعمیر کا تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ ان دونوں کے امتزاج نے یہاں ایک نئی شکل اختیار کرلی جو دمشقی طرز تعمیر سے جدا گانہ تھی یہی عربی اندلسی طرز تعمیر کہلاتا ہے یہ طرز یورپ میں صدیوں بہت مقبول رہا۔ اب تک وہاں بہت سے ایسے گرجے اور مکانات پائے جاتے ہیں جو عربی اندلسی طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔

عبدالرحمٰن داخل کے بعد بہت سے ایسے خلفاء گذرے ہیں جنہیں تعمیرات کا انتہائی ذوق تھا۔ انہی میں عبدالرحمٰن ناصر بھی داخل ہے اس کا تعمیری انہماک بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانہ میں ملک کی سالانہ آمدنی چونسٹھ لاکھ اسی ہزار درہم تھی وہ اس کا ایک ثلث حصہ تعمیرات پر صرف کرتا تھا۔ تعمیر میں اس کا انہماک اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس زمانہ کے صلحاء عموماً اس پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قاضی منذر بن سعید نے جب کہ وہ کسی گذشتہ منبر پر جا رہے تھے جامع مسجد میں خطبہ جمعہ کے اندر مجمع کے سامنے اس کو سخت ملامت کی۔ ان خلفاء کے ذوق تعمیر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مختلف انقلاب و حوادث کے باوجود اب تک اندلس کے گوشہ گوشہ میں بیشمار قدیم عمارتیں موجود ہیں جو اپنی زبان حال سے شاہان اندلس کے تعمیری ذوق اور حوصلہ مندیوں کا افسانہ سنا رہی ہیں

سلاطین اندلس کے عمرانی کارنامے

اوپر کی تفصیلات پڑھ کر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ شاہان اندلس نے اپنی توجہ زیادہ تر تعمیرات تک محدود رکھی اور ملکی ضروریات سے غفلت اختیار کی بے شک اندلس کی شاندار پر عظمت اور کثیر عمارتیں دیکھ کر ایک ایسے شخص کو جس کے سامنے شاہان اندلس کے ہر قسم کے کارناموں کی تفصیلات نہ ہوں، ان کے متعلق ہر قسم کی بدگمانی کا موقع مل سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بدگمانی ان پر ظلم ہے۔ تعمیرات کا یہ شوق درحقیقت اس دولت و ثروت کا لازمی نتیجہ تھا جو محض ان کی بدولت، تجارت، صنعت اور زراعت وغیرہ کے فروغ و ترقی سے جمع ہوتی تھی یہ غلط ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا معتدبہ حصہ صرف فضول عمارتوں کی تعمیر پر صرف کر دیا کرتے تھے۔ بلاشبہ بعض بعض خلفاء کو عمارتیں بنوانے کا بے انتہا شوق تھا لیکن یہ شوق صرف اپنے ذاتی آرام اور تکمیل ذوق کے لئے عمارتیں بنوانے تک محدود نہ تھا بلکہ اس سے زیادہ انہیں نفع عام کے لئے عمارتیں بنوانے سرائیں مدارس کتبخانے وغیرہ قائم کرانے کا شوق تھا۔

عبدالرحمٰن ناصر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے دور حکومت میں تعمیرات پر جو توجہ صرف ہوئی کسی دوسرے خلفہ کے زمانہ میں نہیں ہوئی اگرچہ تعمیرات کا بہت زیادہ شائق تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دوسرے کاموں سے غافل تھا۔ اس

کارناموں پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف اس نے عظیم الشان قصر تعمیر کئے، خوبصورت باغات اور سیرگاہیں بنائیں تو دوسری طرف مدارس قائم کئے، سڑکیں اور شاہراہیں تیار کرائیں کتب خانے قائم کئے پل اور تالاب بنوائے غرض بہت سے شاندار عمرانی کارنامے انجام دئے۔ اس نے اپنے زمانہ حکومت میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا وہ اس عہد کا دنیا میں سب سے بڑا کتبخانہ تھا اس میں چھ لاکھ کتابیں موجود تھیں کیا ان کارناموں کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اسے صرف تعمیرات کا شوق تھا؟ یہی حال دوسرے خلفاء کا بھی تھا یہی وجہ ہے کہ آج اندلس میں جہاں شاہی قصر و ایوان اپنی خراب و خستہ حالت میں تعداد کثیر نظر آتے ہیں وہیں نفع عام کی تعمیرات کے آثار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہان اندلس اپنی ذاتی عمارتوں سے زیادہ عام نفع رسانی کے کاموں پر توجہ کرتے تھے۔ عربوں نے صنعت کو ترقی دینے کے لئے جو بڑے بڑے کارخانے قائم کئے تھے اس کا تذکرہ کہیں آچکا ہے۔ مساجد کا تذکرہ مشہور عمارتوں کے ضمن میں اور مدارس کا ان کے علمی کارناموں کے بیان میں آئے گا

اسپین اور عربی آثار

اسپین سے مسلمانوں کی حکومت کو نابود ہوئے صدیاں گذر گئیں لیکن اب تک وہاں ان کے دور حکومت کے بے شمار آثار موجود ہیں۔ صرف شاہان اندلس کی تعمیر کی ہوئی عمارات ہی ان کی یادگار نہیں ہیں بلکہ اندلس کا ایک ایک ذرہ زبان حال سے اس عہد زریں کا فسانہ سنا رہا ہے آج بھی اندلس میں خصوصاً اس کے جنوبی حصہ میں جس کا عربوں سے خاص تعلق رہا جب کوئی قدم رکھتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عربی ملک میں پہونچ گیا اسپین کے باشندوں کا لب و لہجہ ان کی زبان ان کا اخلاق عادات بہت حد تک عربوں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کے چہروں کی ساخت سے بھی عربیت نمایاں ہے۔ اگرچہ دینی تعصب نے عربوں کے ہر قسم کے آثار کو وہاں سے مٹا دینا چاہا مگر آٹھ سو برس کی طویل مدت میں عربوں نے جو گہرے نقوش قائم کئے تھے ساڑھے چار برس کی مدت انھیں مٹانے کے لئے ناکافی ثابت ہوئی

اندلس کے مشہور مقامات اور عمارتیں

اندلس میں عربوں نے اپنے زمانہ عروج میں جو شاندار عمارتیں تعمیر کی تھیں ان کا اکثر حصہ دست برد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا عیسائیوں کی تنگ نظری اور تعصب دینی نے نہایت بے دردی کیساتھ بہتوں کو برباد کر دیا اور جو کچھ باقی بچ رہا وہ ان کی جہالت اور غفلت کی نذر ہو گئیں۔ پھر بھی وہاں اس وقت جو کھنڈر اور بگڑے ہوئے مکانات موجود ہیں وہ دیکھنے والوں کے لئے ایک مستقل درس عبرت ہیں ایک اندلسی شاعر نے قرطبہ کی بربادی کے موقع پر کہا تھا:۔

عانت بساحتك الظبا یا دار ومحا محاسنك البلی والنار

اے گھر تیرے صحن میں اب انسانوں کے بجائے ہرن بستے ہیں اور آگ اور حوادث زمانہ نے تیرے محاسن مٹا دئے

فاذا تردد فی جنابك ناظر طال اعتبار فیك واستعبار

جب کوئی دیکھنے والا تیرے اندر چل پھر کر دیکھتا ہے تو وہ بہت زیادہ عبرت پذیر ہوتا اور اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگتی ہیں

ارض تقاذفت الخطوب باہلہا — وتمخضت بخرابہا الاقدار
اس سرزمین کے لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے — اور گردش زمانہ نے اس کے کھنڈروں کو تہ وبالا کر دیا
کتبت ید الحدثان فی عرصاتہا — لا انت انت ولا الدیار دیار
زمانہ کے ہاتھوں نے اس کے درودیوار پر لکھ دیا ہے — نہ تو تو ہے اور نہ گھر گھر ہیں

یہی اشعار اب پورے اندلس کی حالت پر صادق آتے ہیں۔

اسپین سے عربوں کی جلاوطنی کے بعد عیسائیوں کی توجہ ان کے ہر قسم کے آثار کے مٹانے کی طرف مائل ہوگئی عربی کتابیں جلا ڈالی گئیں، عربی زبان بولنا جرم قرار پایا بلکہ فلپ ثانی کے زمانہ میں عربی آثار سے ان کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ کسی کو شرقی کپڑے پہننے اور عربی اسماء کے مثل نام رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی مذہبی دیوان تفتیش نے اسپین سے ہر قسم کا عربی اثر مٹا دینا اپنا مقدس فرض سمجھا اور عرصہ دراز تک عربی حضارت و مدنیت سے بغض وعداوت کا برتاؤ کیا جاتا رہا۔ عربوں کی بہت سی شاندار عمارتیں ان کی اسی مذہبی جنون اور تعصب کی نذر ہوگئیں اور جو باقی رہیں وہ اس جنون کے کم ہونے کے بعد ان کی غفلت اور بے اعتنائی کا شکار ہوگئیں

علامہ کرد علی رئیس مجمع شرقی علمی نے سوئزرلینڈ کی ایک مشہور یونیورسٹی کے سابق پرنسپل ڈاکٹر رینڈیہ کی ایک گفتگو اپنے ایک مقالہ میں نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ علامہ موصوف نے اپنی سیاحت اسپین کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا "بلاد اندلس میں عربوں کے زمانہ کے جو آثار پائے جاتے ہیں انھیں دیکھ کر میں دنگ ہوگیا۔ جو چیزیں میرے مشاہدہ میں آئیں ان میں وہ بند بھی ہیں جو اب تک بلنسیہ میں اچھی حالت میں قائم ہیں اور اس صوبہ کے لوگ اب تک انھیں بندوں کی بدولت جنھیں عربی انجنیروں نے بنایا تھا، زندہ ہیں۔ قرون وسطی میں عربوں نے جس طرح کے بند بنائے تھے ان سے بہتر بیسویں صدی کا تمدن بھی نہ بنا سکا۔ خوش قسمتی سے وادی احمر وغیرہ کے یہ بند اس تعصب دینی سے محفوظ رہے جس نے اندلس کی بہت سی عربی یادگاریں مٹا دیں ورنہ اس اقلیم کے رہنے والے پیاسے مر جاتے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ تمدن جس کے بعض آثار یہ ہیں، مٹ رہا ہے اور اس پر کوئی آنسو بہانے والا نہیں۔"

علامہ موصوف نے عربی آثار اور ان کی بربادی پر جن جذبات حسرت وغم کا اظہار کیا ہے یہ کم از کم جذبات ہیں جو اسپین کے کھنڈر، اور اسکے اجڑے ہوئے مکانات کو دیکھ کر دل پر طاری ہو سکتے ہیں۔

زمانہ کے انقلاب وحوادث کے باوجود عربوں کے دور عظمت کی یادگار جو آثار پائے جاتے ہیں، ان پر تفصیلی گفتگو کرنا اس وقت ہمارے دائرہ امکان سے باہر ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ نہایت اختصار کے ساتھ خاص خاص مقامات کی مشہور عمارتوں کی طرف سرسری اشارہ کر دیں۔

عربی دور حکومت میں غرناطہ اشبیلیہ اور قرطبہ کو اندلس میں خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ تین صوبے اس زمانہ میں زبردست مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھیں مختلف اوقات میں مختلف سلاطین کا پایہ تخت ہونے کا شرف حاصل رہا ہے اس لئے ہم صرف انہی تین اہم مرکزوں کے اہم آثار کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔

آثار قرطبہ

قرطبہ اپنی شان و شوکت کے زمانہ میں اندلس کا سب سے زیادہ عظیم الشان شہر سمجھا جاتا تھا۔ پانچ لاکھ اس کی آبادی تھی (اس وقت اس کی کل آبادی ۸۰ ہزار ہے) کہا جاتا ہے کہ اس وقت وہاں ۱۶۰۰ مسجدیں ۶۰۰ حمام دو لاکھ گھر اور اسّی ہزار قصر موجود تھے۔ علامہ مراکشی کا بیان ہے کہ قوت، کثرت عمارت اور کثرت آبادی کے لحاظ سے کوئی شہر قرطبہ کا جواب نہ تھا یورپین مصنفین بھی اس کی عمارات اسیرگاہوں اور باغات وغیرہ کی کثرت کے معترف ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت وہاں قدیم آثار کا نام سے صرف اس مسجد کا ایک ٹکڑا باقی رہ گیا ہے جسے عبدالرحمن داخل نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد جہاں آباد ہے وہاں پہلے عیسائیوں کا ایک معبد تھا جسے قیمت اور معاوضہ دے کر مسلمانوں نے خرید لیا تھا۔ عبدالرحمن داخل کے بعد اس مسجد میں عبدالرحمن ناصر نے اپنے زمانہ میں بہت کچھ اضافہ کرایا تھا۔ یہ مسجد کسی زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی اور عظیم الشان مسجد سمجھی جاتی تھی۔ ۱۴۱۸ اس میں ستون تھے جو فرانس اور افریقہ وغیرہ سے منگائے گئے تھے اب ان ستونوں میں سے صرف ۸۶۰ باقی رہ گئے ہیں۔ مسجد کا محراب اب تک محفوظ ہے اور دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اس کا قبہ نو فیٹ بلند ہے جو مرمر کے ایک ہی ٹکڑے کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ اس پر مختلف قسم کی پچے کاریاں اور قرآن مجید کی آیتیں منقوش ہیں۔ اس کے ۲۲ دروازے تانبے کے بنے ہوئے تھے جن میں سے اب صرف ۱۲ باقی رہ گئے ہیں۔ اس مسجد میں سات ہزار چراغ جلتے تھے جن کی روشنی سنہری نقوش اور زمرد و یاقوت پر پڑ کر مسجد کے حسن و جمال کو دوبالا کر دیتی تھی۔ اگرچہ مسجد متعدد انقلابات سے دوچار ہو چکی ہے اور اس کی پہلی حالت میں بہت فرق آچکا ہے مگر اب بھی اس کا شمار دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں ہے۔ گوٹیہ کا قول ہے "اس قدیم اسلامی مسجد میں داخل ہوتے وقت انسان کے دل پر جو اثرات طاری ہوتے ہیں ان کا اظہار ناممکن ہے۔ تمہیں ایسا معلوم ہوگا کہ تم کسی انسان کی بنائی ہوئی عمارت کے بجائے کسی مسقف جنگل میں چل رہے ہو۔ جس طرف تم رخ کرو گے تمہاری آنکھیں ان لمبے لمبے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ستونوں میں گم ہو جائیں گی جو حد بصر تک نور و مرمر کے درختوں کی طرح کھڑے ہیں،، عیسائیوں نے جامع قرطبہ کے وسط اور اس کے گوشوں میں کنیسے قائم کر کے اس کے حسن و جمال کو غارت اور اس کی شکل و ہیئت کو بدل دیا ہے۔ جوسیہ کا قول ہے کہ شارلکان کے زمانہ میں وسط جامع میں جو کنیسہ بنایا گیا ہے اگر وہ کسی اور جگہ ہوتا تو بہت زیادہ شاندار نظر آتا لیکن وہ اس وقت جامع قرطبہ کے سامنے اپنی تعمیر کا نہایت برا نمونہ پیش کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دنیا میں اپنی نوع کی ایک نرالی عمارت میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔"

مدینۃ الزہرا

قرطبہ سے چار میل کے فاصلہ پر مدینۃ الزہرا آباد ہے اس کو ۳۲۵ھ میں ناصر لدین اللہ نے ۱۵ سال کی مدت میں آباد کرایا تھا۔ اس کی تعمیر کے لئے مختلف امصار و ممالک سے انجینئر اور ماہران فن تعمیر بلائے گئے تھے اور دور دور سے اس کے لئے پتھر اور سامان تعمیر منگائے گئے تھے۔ زمانہ تعمیر میں اس پر حکومت کی سالانہ آمدنی کا ایک تہائی ستصرف ہوتا تھا۔ دس ہزار مزدور پندرہ سال تک اس کی تعمیر میں مصروف رہے۔

مدینۃ الزاہرہ

وادی کبیر کے شرقی جانب مدینۃ الزاہرہ واقع ہے جسے منصور بن ابی عامر نے آباد کیا تھا۔ یہ وہی شہر ہے جسے ویران دیکھ کر ابن عربی نے دردناک اشعار کہے تھے۔

دیار بأکناف الملاعب تلمع	وما ان بها من ساکن فھی بلقع
کچھ مکانات کھیل کود کی جگہوں کے کناروں پر چمک رہے ہیں	ان میں کوئی رہنے والا نہیں ہے اسلئے وہ اجاڑ پڑے ہیں
ینوح علیها الطیر من کل جانب	فتصمت احیانا وحینا ترجع
چڑیاں ہر طرف سے ان پر نوحہ کرتی ہیں	کبھی چپ ہو جاتی ہیں اور کبھی سسکیاں بھرتی ہیں
فخاطبت فیها طائرا متفردا	له شجن فی القلب وهو مروع
میں نے ایک چڑیا کو مخاطب کیا جو	الگ غمگین اور سوگوار بیٹھی ہوئی تھی
فقلت علی ماذا تنوح وتشتکی	فقال علی دهر مضی لیس یرجع
میں نے کہا کس کا نوحہ کرتی ہو اور کس کے غم میں آنسو بہاتی ہو	اس نے جواب دیا اس عہد رفتہ پر جو واپس نہیں آسکتا۔

[illegible]ھ کے لگ بھگ قصر زہرا آگ سے برباد ہو گیا۔ اب صرف اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ قرطبہ کی عالیشان عمارتیں اور شاندار محلات بھی بربر کی جنگ میں برباد ہو گئیں [illegible]ھ میں یہ بالکل دشمنوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد وہاں پھر عربی حکومت واپس نہ آسکی۔ قرطبہ کی بربادی کے بعد اشبیلیہ آباد ہوا اور عربی حضارت و مدنیت نے کچھ دنوں کے لئے وہاں پناہ لی۔

اشبیلیہ کی عمارات

قرطبہ کی بربادی کے بعد اشبیلیہ کی قسمت جاگ اٹھی اور اسے اسلامی بادشاہوں کا دارالسلطنت ہونے کا فخر حاصل ہوا یہ شہر عربی زمانہ عروج میں اندلس کا بہت بڑا شہر تھا، آب و ہوا اور زمین کی سرسبزی و شادابی وغیرہ کے اعتبار سے بہت ممتاز تھا۔ پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے اس نے عمارات وغیرہ میں بہت ترقی کی تھی لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ اس وقت اشبیلیہ میں عربوں کے آثار بہت کم پائے جاتے ہیں۔ عمارتوں کے سلسلہ میں برج اللہ اور جامع اعظم کے منارہ کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر چیز باقی نہیں رہی۔

اشبیلیہ کا منارہ، وہاں کی نہایت عجیب و غریب عمارت ہے [illegible]ھ ۱۱۸۴ء سے [illegible]ھ ۱۱۹۶ء میں ابو یوسف بن یوسف کے لئے جو دولت موحدین کا ایک حکمراں تھا، ایک عربی انجینئر نے اسے تعمیر کیا تھا یہ منارہ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے، جوں جوں اوپر ہوتا گیا ہے اس کا حجم کم ہوتا گیا ہے۔ اس کی بلندی اتنی ہے کہ بہت دور سے نظر آتا ہے

جب یہ عربوں کے قبضہ سے نکل کر اسپینوں کے ہاتھوں میں آیا تو انھوں نے اس میں بہت کچھ ترمیم اور اضافہ کیا جس کی وجہ سے اس کی اصلی خوبصورتی باقی نہیں رہی۔ اب اس منارہ سے ناقوس اور گھنٹے کی آواز بلند ہوتی ہے کیونکہ یہ بڑے گرجا کا گھنٹہ گھر بنا دیا گیا ہے۔

(باقی)

تفسیر سورہ بقرہ

(۲)

(از امام جلیل سید حمید الدین فراہی مرحوم)

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

ایمان کے معنی پورے عزم و یقین اور اطمینان و انشراح کے ساتھ تصدیق کرنے کے ہیں اور اس کی علامت ان چیزوں پر عمل کرنا ہے جن کا ایمان مقتضی ہے بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ ایمان لانے والوں کے درجات یقین میں تفاوت ہوتا ہے اس لئے مومنین کے اعمال میں بھی اختلاف و تفاوت ہوتا ہے۔

غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو نظروں سے غائب ہیں مثلاً ذات باری تعالیٰ۔ ملائکہ اور دار آخرت وغیرہ

نماز کھڑی کرنے (اقامۃ الصلوٰۃ) سے مقصود اس روحی و بدنی عبادت کو بقدر امکان اکمل طریقے سے ادا کرنے کے ہیں۔ نماز صورت و روح کے مجموعہ کا نام ہے۔ اعضاء کی عبادت اس کی صورت ہے اور قلب کی عبادت اس کی روح ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت خاص عرب کے مسلمانوں یا مطلق مسلمانوں سے متعلق ہے اور بعد کی آیت میں خصوصیت کے ساتھ اہل کتاب مراد ہیں۔ استاذ امام نے ان دونوں آیتوں کی تفسیر ایک دوسرے طریقہ سے کی ہے جو گو روایات کے اعتبار سے بعید ہے لیکن نظم کلام اور سیاق و سباق کے لحاظ سے بہت چسپاں ہے۔ استاذ امام فرماتے ہیں :-

"لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو مادی ہیں اور صرف محسوسات پر یقین رکھتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو غیر مادی ہیں اور ایسی چیزوں کا بھی یقین رکھتے ہیں جو گو ان کے ظاہری حواس کے ادراک سے باہر ہیں لیکن دلیل یا وجدان سلیم ان کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اللہ اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانا بھی مغیبات ہی پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص خدا پر ایمان نہیں رکھتا وہ قرآن سے ہدایت بھی حاصل نہیں کرسکتا اگر کوئی کسی منکر خدا کو دعوت ہدایت دینا چاہے تو سب سے پہلے اسے عقلاً یہ ثابت کرنا چاہئے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو بہت سے صفات کمال سے متصف ہے اور اس کے بعد یقین دلانا چاہئے کہ یہ قرآن اسی خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے"

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان متقین کی صفت میں جو قرآن سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ ایمان بالغیب کو ذکر فرمایا الذین یؤمنون بالغیب۔ ایمان بالغیب محسوسات کے ماوراء کسی موجود پر اعتقاد رکھنے کا نام ہے جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں ان کے بارے میں استاذ

امام ارشاد فرماتے ہیں :-

یہ لوگ راہ ہدایت بکھرے ہوتے ہیں۔ ان کے تمام طرق رشد تک پہونچ چکے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے صرف اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر منزل تک پہونچا دے۔ کیونکہ جو شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ محسوسات کے علاوہ بھی موجودات ہیں جو کہ حواس کے دائرہ سے خارج ہیں لیکن عقل ان کے وجود کو تسلیم کرتی ہے، جب اس کے سامنے دلائل سے یہ ثابت کر دیا جاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو مادہ اور اس کے لوازم سے منزہ اور مخصوص اوصاف کے ساتھ متصف ہے، تو وہ آسانی سے اس کی تصدیق اور ان دلائل کے عام علمی مقدمات پر غور و فکر کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور جب رسول یوم آخرت کے احوال و اوصاف بیان کرتا ہے یا کسی ایسے عالم کا ذکر کرتا ہے جس کا علم خدا نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے مثلاً عالم ملائکہ تو نبی کی نبوت کے ثابت ہو جانے کے بعد ان باتوں کی تصدیق بھی مومن بالغیب پر گراں نہیں گذرتی یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایمان بالغیب کو، قرآن سے ہدایت پانے والوں کے اوصاف میں سب سے مقدم رکھا ہے لیکن جو لوگ محسوسات کے علاوہ کسی اور چیز کے وجود کے قائل نہیں وہ مشہود یا شبیہ مشہود کے ماوراء اشیاء کا تذکرہ سن کر بہکتے ہیں اور اس دعویٰ کو ابتداءً قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بحث و مباحثہ اور دلائل و مقدمات کے ذریعہ تم انہیں اپنے مدعا سے قریب کر لو لیکن اس میں دشواری بہرحال ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے سامنے جب قرآن پیش کیا جاتا ہے تو ان کے کان اس کی آواز کو اجنبی محسوس کرتے ہیں اور ان کے قلوب اس کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، ایسے لوگ کس طرح قرآن سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں ؟"

عام لوگوں کے نزدیک ایمان بالغیب کا اطلاق اس تقلیدی انقیاد پر ہوتا ہے جو عقل و وجدان کے شائبہ سے خالی ہونے کی بنا پر نہ قلب میں کوئی انقلاب پیدا کرتا ہے اور نہ اعمال پر کچھ اثر انداز ہوتا ہے اس قسم کا ایمان قلب میں کسی طرح قرآن سے روشنی حاصل کرنے کی استعداد پیدا نہیں کر سکتا اس لئے یہاں اللہ نے بیان فرما دیا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے اور کس قسم کا ایمان رکھنے والے قرآن سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ بعد کے جملوں میں قرآن سے ہدایت حاصل کرنے والے مومنین بالغیب کی علامتیں بیان کر دی گئی ہیں اور وہ علامتیں یہ ہیں :-

ویقیمون الصلوٰۃ الخ صلوٰۃ کے معنی ہیں معبود کے سامنے اپنے قول و عمل یا دونوں کے ذریعہ اظہار حاجت کرنا۔ صلوٰۃ کے معنی جو لوگوں نے دعا (دعا مانگنا) کے لکھے ہیں وہ اس معنی سے متغائر نہیں ہے کیونکہ کسی جلیل القدر ہستی کے سامنے اپنی حاجت کا خواہ صرف کسی فعل ہی کے ذریعہ ہو، اظہار کرنا، حقیقت میں اس سے مدد مانگنے اور اسے اپنی اعانت پر متوجہ کرنے کے مترادف ہے اسی لئے بادشاہوں کے درباروں میں لوگ سر جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں یا ان کے پیروں پر گر کر بوسہ لیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ اپنے ان افعال سے رحم و کرم کی درخواست کرتے ہیں یہ نماز زمانہ جاہلیت میں بھی پائی جاتی تھی اور بعض حنفاء کہلانے والے اور بعض اہل کتاب اسے ادا کرتے تھے۔

استاذ امام نماز کے متعلق فرماتے ہیں:-

"نماز کے جو معنی اوپر بیان کئے گئے ہیں اس کے اعتبار سے اس کی سب سے بہتر شکل وہ ہے جو اسلام نے تجویز کی ہو کیونکہ وہ تمام اقوال و افعال جن کی ابتدا سنت متواترہ کے مطابق تکبیر تحریمہ سے ہوتی ہے اور جن کا سلام پر خاتمہ ہو جاتا ہے اگر ٹھیک ٹھیک ادا کئے جائیں تو ان سے معبود کی حاجت کا احساس اور اس کی انتہائی عظمت کے قلبی شعور کا نہایت بہتر طریقہ سے اظہار ہوتا ہے۔"

اسی لئے یہاں "یصلون" کے بجائے "یقیمون" فرمایا کیونکہ تنہا "اوراقامت صلوٰۃ" میں معنی کے اعتبار سے بہت فرق ہے نماز کی جو ظاہری شکل و ہیئت متعین فرما دی گئی ہے جو شخص اس کے مطابق نماز ادا کرے گا اس کے لئے "مصلی" (نماز پڑھنے والا) کہا جا سکتا ہے اگرچہ اس کا یہ عمل نماز کے حقیقی معنی اور ظاہری ہیئت کے اصل منشاء سے خالی ہو۔ بخلاف اس کے جب تک نماز اس کے اصل معنی و روح کے ساتھ ادا نہ کی جائے گی اسے اقامت صلوٰۃ کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے قرآن نے اس لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ اقامت صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ وضو وغیرہ ٹھکانے سے کیا جائے اور اس کے ارکان و سنن کو اچھی طرح انجام دیا جائے لیکن یہ تعریف نماز کے ظاہری وصف سے آگے نہیں بڑھتی نماز کا حقیقی قوام توجہ الی اللہ کامل خشوع اور اس کی ضرورت کا شدید احساس ہے

استاذ امام یہاں پر فرماتے ہیں:-

جب تک نماز میں یہ معنی نہ پائے جائیں نماز پڑھنے والے کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے نماز قائم کی (اقام الصلوٰۃ) اس نے تو اس کا اصلی رکن چھوڑ کر نماز کی پوری عمارت منہدم کر دی اور اس کی روح نکال کر اس کے تن کو مردہ بنا ڈالا۔ جو لوگ اپنے کو مسلمان کہلاتے ہیں ان کا ایک عجیب و غریب خیال یہ ہے کہ نماز کے ہر حصہ میں قلب کا حاضر ہونا اور خدا کا خوف و خشیت محسوس کرنا نہایت دشوار بلکہ امر محال ہے کیونکہ نماز پڑھنے والوں کے ذہن پر خطرات و وساوس کا اس طرح ہجوم ہوتا ہے کہ ان سے بچنا ممکن نہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ کہنا کہیں نماز کے اصل معنی کا انکار نہ ہو جائے۔ یہ نہایت فاسد و باطل خیال ہے جو سخت غفلت اور شدید مرض کی بنا پر ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے میں ان لوگوں کو ایک ایسا طریقہ بتاتا ہوں کہ اگر اس پر عمل کریں تو نماز صحیح طریقہ پر ادا ہو سکتی ہے اور ذہن ہر قسم کے خطرات و خیالات بلکہ خود نماز کے خیال سے خالی ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ جو لفظ بھی اپنی زبان سے نکالے اس کے معنی ذہن میں مستحضر کرے مثلاً جب الحمد للہ رب العالمین کہے تو حمد کے معنی اور اس کی اللہ کی طرف اضافت کا استحضار کرے اور ساتھ ہی یہ تصور بھی کرے کہ اس کی صفت ربوبیت ہے اور وہ تمام علوی و سفلی اکوان کا پروردگار ہے۔ اور جب مالک یوم الدین کہے تو مالک کے معنی اور یوم الجزاء کے ساتھ اس کے تعلق کا تصور کرے غرض اس طرح آخر تک جو کلمہ بھی اس کی زبان سے نکلے اس کے معنی کو ضرور مستحضر کرے۔ اس طرح جو شخص نماز ادا کرے گا وہ حقیقت میں نماز قائم کرنے والا ہوگا اور اس کے نماز پڑھنے کو اقامت صلوٰۃ لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن جو شخص بے سوچے سمجھے اور بغیر غور و فکر کے الفاظ محض زبان سے ادا کر دیتا ہے وہ اپنے متعلق تو یہی گمان کرتا

کر اس نے نماز پڑھی (صلی) چہ جائیکہ یہ کہنا کہ اس نے نماز قائم کی (اقام الصلوٰۃ)
ومما رزقناھم ینفقون لغت میں رزق کے معنی حصار (عطا) کے ہیں اس کا اطلاق، حسی اور معنوی دونوں قسم کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ حسی مثلاً مال وغیرہ اور معنوی مثلاً علم و تقویٰ۔ رزق سے خاص معاشی اشیاء مراد لینے کے لئے کوئی لفظی یا غیر لفظی قرینہ ہونا چاہئے۔ علماء اہل سنت کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس سے انتفاع ہوسکے رزق کہلانے کی مستحق ہے خواہ حلال ہو یا حرام لیکن معتزلہ اس کا حلال ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔
نفاق کے معنی ختم ہونے کے ہیں اور کسی چیز کے "انفاق" کے معنی یہ ہیں کہ اسے صرف کر کے اور اپنے ہاتھ سے نکال کر ختم کر دیا جائے جمہور کہتے ہیں کہ اس آیت میں انفاق سے مراد غیر واجب صدقہ و خیرات اور وہ نفقہ ہے جو اہل و عیال اور رشتہ داروں وغیرہ پر صرف کیا جاتا ہے کیونکہ یہ آیت زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل نازل ہوئی تھی۔ ومما رزقناھم میں "من" تبعیضیہ استعمال کرنے سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان کو اپنے مال کا ایک جزء صرف کرنا چاہئے نہ کہ کل۔ خدا کی راہ میں صرف کرنا ایمان صحیح کی روشن ترین علامت ہے استاذ امام نے اپنی تفسیر کے مطابق اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:۔

"یہ وصف ایمان بالغیب کی نہایت قوی علامت ہے کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نماز روزہ اور مختلف قسم کی بدنی عبادتیں کرتے ہیں لیکن جب کبھی مال خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اپنا ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں اور کچھ خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔
یہاں پر انفاق سے مراد وہ نفقہ نہیں ہے جو اہل و عیال پر صرف کیا جاتا ہے اور نہ وہ جس کا نام جود وکرم رکھا جاتا ہے مثلاً شہرت جاہ یا تفریح و دلچسپی کا سامان پیدا کرنے کے لئے مہمان نوازی وغیرہ کرنا اس قسم کا انفاق، ایمان بالغیب کے آثار میں داخل نہیں ایمان بالغیب کے آثار میں وہ انفاق داخل ہے جو اس شعور کے ماتحت عمل میں آئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے فضل وکرم کے مال و دولت دی ہے تاکہ خدا کے ان بندوں پر صرف کی جائے جو کسی کمزوری یا اسباب رزق سے محرومی کی بنا پر تنگ دستی میں مبتلا ہوگئے ہیں یا اس احساس کے ساتھ کسی فائدہ عام کے کام میں صرف کیا جائے کہ خدا کے حکم کے مطابق اس کا ہر غیر مستطیع پر حصہ لینا فرض ہے پس وہ شخص جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے، اس کے افضال کا شکریہ ادا کرنے اور اس کی محتاج مخلوق بندوں پر شفقت کرنے کے لئے اپنی محبوب ترین چیز یعنی مال خرچ کرتا ہے اپنے اندر جذبہ پائے وہ بے شبہ قرآن کی ہدایت قبول کرنے کی اپنے اندر استعداد رکھتا ہے۔ ایسے شخص کو جب قرآن کی طرف دعوت دی جائے گی تو وہ فوراً اس آواز پر لبیک کہے گا اور خدا کے سامنے سر اطاعت جھکا دے گا۔"
قرآن سے بالفعل ہدایت پانے والوں میں سے یہ پہلی جماعت کا بیان ہوا جس پر ..... استاذ امام کی تفسیر کے مطابق "متقین" کا اطلاق ہوتا ہے اور اس میں جیسا کہ گذر چکا، زمانہ جاہلیت کے نیکوکار، جاہلین اور بعض صالحین اہل کتاب داخل ہیں اس جماعت کے لئے قرآن کے ہدایت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے مستعد اور اس سے روشنی حاصل کرنے پر آمادہ ہیں۔ کیونکہ وہ قرآن سے پہلے خدا اور دار الجزا پر اجمالی ایمان رکھتے تھے اور اپنے ناقص اور غیر تسلی بخش اجتہاد کے مطابق عبادت

ستے میں حائل ہونے والی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی عقلی حیرانیاں دور کرنے اور روح کی فطری پیاس بجھانے کے لئے فوراً قرآن کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

اس فرقہ کا حال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے فرقے کا حال بیان کیا جو قرآن سے بالفعل ہدایت حاصل کرتا ہے اور جو اپنے جمیع افعال و حرکات میں قرآن کو اپنا رہنما سمجھتا ہے چنانچہ پہلے فرقہ پر عطف کرتے ہوئے فرمایا:۔

والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرۃ هم یوقنون۔

ابن عباس کی روایت ہے کہ اس آیت میں مومنین سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو آنحضور صلعم اور قرآن پر ایمان لا چکے تھے اور پہلی آیت میں مشرکین عرب میں سے ایمان لانے والے مراد ہیں۔ اس قول کو ابن جریر اور دوسرے مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اور مجاہد، ابو العالیہ، ربیع بن انس اور قتادہ کے نزدیک دونوں آیتوں میں عام مومنین بغیر کسی تخصیص کے مراد ہیں اور یہاں عطف صفات کا ہے نہ کہ موصوفین کا۔ ایک تیسرا شاذ قول یہ ہے کہ ان ہر دو آیات میں مومنین اہل کتاب مراد ہیں۔ استاذ امام نے ان دونوں آیتوں کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے وہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ مزید تشریح آگے آتی ہے اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ والذین یومنون بما انزل الیک الخ میں گذشتہ آسمانی صحیفوں پر اجمالی ایمان لانا مراد ہے۔

ہمارے شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:۔

"متقین کے دوسرے طبقہ کا بیان ہے دونوں طبقوں میں تمیز پیدا کرنے کے لئے لفظ "الذین" کو یہاں ذکر کر دیا گیا ہے جس طبقہ کا اس آیت والذین یومنون بما انزل الیک الخ میں ذکر ہوا ہے وہ پہلے طبقہ سے زیادہ بلند ہے کیونکہ جو اوصاف پہلے طبقہ میں پائے جاتے ہیں وہ بالضرور ان میں بھی پائے جاتے ہیں . . . . لیکن کچھ ایسے اوصاف بھی ہیں جو صرف ان کے لئے مخصوص ہیں۔ اس لئے قرآن اس فرقہ کے لئے بدرجہ اولیٰ ہدایت کا باعث ہوتا ہے یعنی ان کے جملہ افعال و اقوال میں ان کا امام ہوتا ہے اور وہ قرآن کے بتائے ہوئے راستے سے ادھر اُدھر نہیں ہوتے۔" (باقی)

حیوانات کا فطری علاج

ڈاکٹر ولد جو جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں فرماتے ہیں کہ حیوانات کے لعاب میں جراثیم کو فنا کر دینے کا زبردست خاصہ ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر جانور زبان سے اپنے زخم کو چاٹتے رہتے ہیں، ڈاکٹر موصوف مختلف تجربوں کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ حیوانات اپنے زخموں کو گرد و غبار وغیرہ سے صاف کرنے کے لئے نہیں چاٹتے بلکہ فطرت انھیں مجبور کرتی ہے کہ اپنے زخموں کو سڑنے اور خراب ہونے سے بچانے کے لئے ایسا کریں

قدماء کا علم طب

(۲)

(از ڈاکٹر تھیوڈ [illegible] ترجمہ جناب مولوی نبی احمد صاحب اسلامی)

بابلستان (عراق) کا پرانا طب | [illegible] عراقی وادی [illegible] کی وہ [illegible] نہیں کی بہت ہی پرانے زمانے میں عراق میں شمال کی جانب سے ایک [illegible] تھے بہت زیادہ تھے۔ یہ [illegible] لوگ بعد کو ایک ذمی [illegible] مذہبی جماعت بن گئے [illegible] ان تمام [illegible] اور ان کے مذہبی اشخاص کو [illegible] باشندہ رہنے کا [illegible] نام عطا کیا۔ یہ کلدانی ' وہی ہیں جن کو کتاب مقدس میں مجوسی کہا گیا ہے۔ ان لوگوں نے ریاضی، ہیئت، تنجیم، تعبیر خواب، اور جھاڑ پھونک والی طبابت میں [illegible] کمال حاصل کیا تھا۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ ان کلدانی مجوسیوں کے علاوہ بابلستان (عراق) میں دوسرے طبیب نہیں تھے جو مریضوں کو دیکھتے بھالتے۔ ہاں بعض اوقات مریض سڑکوں پر بٹھا دئے جاتے اور ہر راہ گیر ان کا حال پوچھتا اگر ان میں سے کسی کو بھی اس مرض کا ذاتی تجربہ ہوتا جس میں وہ بیمار مبتلا ہے تو وہ اس کو مشورہ دیتا کہ تم فلاں فلاں کام کرو کیونکہ میں بھی اسی طریقے سے اچھا ہوا تھا۔

ایرانیوں کا طریقہ علاج | جہاں تک معلوم ہے قدیم ایرانیوں کا بھی علم طب جھاڑ پھونک تھا۔ جذام کا سبب آفتاب کی بے حرمتی اور اس کے ناموس کی بے احترامی بتایا جاتا تھا اور جذامی صحیح و سالم لوگوں سے الگ رہنے پر مجبور کیا جاتا۔ چونکہ ہر صوبہ اور ہر شہر کا الگ الگ "جن" ہوتا تھا اس وجہ سے تعویذ بکثرت مستعمل تھے۔ جنوں کے نام پر لوگ چمکیلے پتھر پہنتے تھے جس سے رفتہ رفتہ پتھروں کی خاصیتوں کا یقین اور اعتقاد پیدا ہوگیا۔ وہ ہر قسم کی بلا کے دفع کرنے میں کام آنے لگے اور خاص کر سانپ و بچھو کے زہر کو دور کرنے کے لئے بہت مفید مانے گئے۔ ان پتھروں کے بارے میں خیال تھا کہ ان کے اندر دنیا کے دو بزرگ ترین جن آگ اور پانی اپنا اپنا کام کرتے ہیں، اسی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ ان کا استعمال بیماریوں اور زخموں کی تکالیف کی تخفیف یا ازالہ کا باعث ہے۔ مجوسی اسی بنا پر انہیں بیماریوں کو بطور دوا کے دیتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے ان پتھروں کے کیمیائی ترکیب کے بارے میں عجیب و غریب خیال قائم کیا جس کی تمام تر بنیاد اسی مذکورہ بالا توہم پر تھی۔ ایرانیوں کو متعدد قسم کے زہر کا بھی علم تھا ھومہ کسی پودے کا نام ہے، اس سے مجوس ایک شراب تیار کرتے تھے جس میں عجیب و غریب خاصیتیں ہوتی تھیں، حکیم اس کو اعضاء کے درد کے ازالہ، زکام کی رطوبتوں کے اخراج، اور سنگ مثانہ کی تفتیت کے لئے تجویز کرتے تھے۔

فنیقیوں کا طب | فنیقیوں کی طبی لیاقت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم یہ بات اہمیت کے ساتھ بیان کرسکتے ہیں کہ نوشتۂ ابرس Papyrus Ebers میں جن کتابوں کا ذکر آیا ہے ان میں سے ایک بلوس کے ایک حکیم کی تصنیف ہے

[illegible]

اس کتاب کے متعلق جو کچھ معلوم ہے۔ اس سے اتنا اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس سامی قوم کے طبی معلومات کے متعلق جو کچھ اب تک لوگوں کا خیال تھا اس سے وہ لوگ کہیں زیادہ جانتے تھے۔ یہ قوم محض صنعت وحرفت، جہازرانی، علم کائنات، اور نوآبادیاں قائم کرنے ہی میں ممتاز نہیں تھی بلکہ اس نے یونانیوں کے علم طب پر بھی اپنا معتدبہ اثر ڈالا جو محقق کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ فنیقیوں کی پوجا پاٹ اگرچہ بہیمی و مخرب اخلاق امور سے پُر تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا سب سے بڑا دیوتا بعلزبوب، جس کا ذکر توریت میں بھی ہے، طبابت کا دیوتا تھا اور اس سے لوگ مرض وصحت کے متعلق استخارہ یا غیبی خبر حاصل کرتے تھے۔ اس کے پجاری سرخ کپڑا پہنتے تھے جو غالباً اطبا کے سرخ لباس کی سب سے قدیم مثال ہے۔ باشندگانِ کارتھیج فنیقی ستور[illegible] کی حیثیت سے طبابت کی رسموں میں اپنے آبائی ملک والوں سے بہت کم مختلف تھے۔

اسرائیلی طب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے قدیم اسرائیلیوں میں صحیح طبابت کا سرے سے نام ونشان بھی نہیں تھا چونکہ مُردہ چھونا سخت ممنوع تھا، اس وجہ سے کسی کو تشریحی امور کے انکشاف کا خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ ہڈیوں اور رگوں کا کہیں کہیں مبہم و مجمل ذکر آگیا ہے لیکن وظائف الاعضا کا تو کہیں پتہ ہی نہیں۔ سب سے بڑھ کر حیرت اس بات کی ہے کہ انھوں نے جڑی بوٹیوں کو دوا کے طور پر کیوں نہیں استعمال کیا حالانکہ انھیں بے شمار پودوں سے واقفیت تھی اور نیز مصری جن کے درمیان وہ رہتے تھے کثیر التعداد دواؤں سے واقف تھے اگر وہ چاہتے تو ضرور ان سے کچھ نہ کچھ نسخے حاصل کر لیتے۔ کہیں کہیں بعضیوں کے دل، جگر، اور پت بطور دوا کے مذکور ہیں اور دریائے اُردُن میں غسل کرنا جذامی کے لئے مفید بتایا گیا ہے۔ دواؤں کی اس ندرت کا سبب یہی تھا کہ بنی اسرائیل بیماریوں کا علاج محض جھاڑ پھونک کے ذریعے کرتے تھے لیکن باایں ہمہ ان کے مریض ان دوسری قوموں سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں جو اپنے زعم کے مطابق بیشمار دوائیاں استعمال کرتی تھیں۔

دوسری قوموں کی طرح عبرانی بھی بیماریوں اور خاص کر اہم وباؤں کے پھیلنے کو آسمانی عذاب سمجھتے تھے جسے خدا گناہوں کی بنا پر نازل کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شفا تو پودائی دعاؤں اور اپنے پجاریوں کے مذہبی اعزاز کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، وہ حکیموں کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ مقنن اعظم موسیٰ نے اگرچہ طبابت اور جراحی کی بابت کچھ نہیں کیا لیکن انھوں نے پہلے پہل اپنی قوم کو عمومی حفظانِ صحت کے اصولی قوانین عنایت کئے۔ ان قوانین میں کھانے کی نوعیت اور اس کے تیار کرنے، جانوروں کو ذبح کرنے، مُردوں کو دفن کرنے کے طریقے مذکور تھے، نیز ان میں شادی اور ازدواجی تعلقات کے اصول، برص اور مختلف چھوت والی بیماریوں کے طریقِ شناخت کا ذکر تھا اور اس قسم کے مریضوں سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ جراحی کے ضمن میں صرف رسم ختنہ کا نام لیا جاسکتا ہے جس کو پجاری انجام دیتا تھا۔

یہودیوں کے دور مابعد کا طب تالمود میں ملتا ہے جس میں بالتفصیل اس کی وہ تمام باتیں درج ہیں جو اس زمانہ میں معلوم تھیں۔ ان بیما سے امورِ جراحیہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو کھوپڑی کے چوٹ لگنے، سدے، حلقوم، پیٹ، آنتوں، اور پتے میں سوراخ ہوجانے، ریڑھ، پھیپھڑے، اور پردۂ دماغ میں زخم پیدا ہوجانے، پسلیوں کے ٹوٹ جانے، ورم اور ناک کے سوجنے کے متعلق تجربہ

ہوچکا تھا۔ ان تمام بیماریوں کا اگر فوری تدارک نہ کیا جاتا تو ان کے نزدیک وہ مہلک ثابت ہوتیں۔ موخرالذکر بیماری گذشتہ گناہوں کی سزا تصور کی جاتی تھی۔ دیدکر کا علاج عجیب تھا یعنی ران ساٹھ مرتبہ شوربے سے مل جاتی۔ جراحی عمل کاریگر یا حجام کے ہاتھوں انجام پاتا۔ یہ لوگ بالعموم خون کی رگیں کھولتے۔ ختنہ کرتے اور فصد والی نی کا مسدود سوراخ صاف کرتے۔ موخرالذکر عمل بہت ہی تفصیل کے ساتھ تالمود میں مذکور ہے۔

تالمودی علم الامراض نے مزاج کی خرابی، جادو کے اثرات دوسرے قسم کے غیر جسم خارجی اسباب کو بیماریوں کی علت قرار دی ہے۔ اسکی لحاظ سے یرقان کا سبب احتباس بیت ولاستقا کا سبب احتباس بول ہے، موخرالذکر بالعموم تین ہی قسم کا بتایا گیا ہے۔ استسقاء لحمی، استسقاء رباحی، استسقاء ماء البطن۔ یہ بھی لکھا ہے کہ دماغ پر پانی آجانے کے موقع پر "اگر پانی اندر پہونچ گیا ہو تو مہلک ہے ورنہ نہیں"۔ گردوں کا پھٹ جانا یا نحیف ہو جانا مہلک ہے لیکن جگر پر آبلوں کا ظہور مہلک نہیں ہے۔ ریڑھ کا فاسد مواد سے بھر جانا اور پھیپھڑوں کا سخت ہو جانا لاعلاج ہیں۔ شاید جانوروں کے جسم چیر پھاڑ کر یہ نتائج اخذ کئے گئے تھے اور یہ ایک حیثیت سے امراضی علم التشریح کے اصل اصول کہے جاسکتے ہیں۔ تالمودی طب میں چھینک آنا، پسینہ ہونا، اچھے خواب دیکھنا بیماری کے لئے بری علامتیں نہیں تھیں۔

فن علاج میں اگانے اور کھانے پینے کی فطری دوائیوں اور نیز جادو کے منتر سے کام لیا جاتا۔ دبی اور موقعوں پر سخت تھی لیکن بیمار جب ممنوع مطاعم کی خواہش کرتا تو فوراً اجازت دیدیتے۔ ان کے خصوصی دواؤں میں ہیں کہ دوانہ کے لئے پیاز، معدہ کی خرابیوں کے لئے شراب، دمکالی مرچ، ضیق النفس کے لئے بکری کا دودھ، سگ گزیدہ کے لئے کتے کا کلیجہ، سنگ مثانہ کے لئے تارپین کے تیل کا انجکشن، آشوب چشم کے لئے صبح کو ایک قطرہ آب سرد آنکھ میں لگانا اور شام کو گرم پانی سے ہاتھ پاؤں دھونا، اور تلی کے لئے تیل اور دوائیں تجویز کی ہوئی ملتی ہیں۔ متعدد امراض میں فصد لینے اور طبریہ کے گرم پانی میں نہانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ہینگ اور بہت سی دوسری جڑی بوٹیاں یقیناً یونانی طب سے اخذ کی گئی ہیں بخلاف اس کے ان کی تنا صنی، دعا، اور ٹوٹکے کا یقینی ماخذ یونان نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ان کا علم الاغذیہ اس امر کی ہدایت کرتا تھا کہ چالیس برس کی عمر کے پیشتر اشربہ کم اور اطعمہ زیادہ استعمال کرنے چاہئیں لیکن اس کے بعد اس کے برعکس کرنا چاہئے، شراب بکثرت پینا یا پیکر ٹہلنا یا سونا نہیں چاہئے۔ بلا ناغہ نہانے اور خوشبودار تیل لگانے کی عادت ڈالنی چاہئے۔

تالمودیوں کے علم التشریح کی بنیاد خاص کر جانوروں کے چیر پھاڑ پر تھی لیکن چونکہ تالمود نے علمی مصلحت کی بنا پر تشریح کو ناجائز نہیں قرار دیا تھا، اس وجہ سے ربی اشماعیل نے پہلی صدی کے اخیر میں جسم انسانی کو ابال کر اس کی ہڈیوں کیئے کہ محض اس کے ڈھانچے کی تشریح کی، اس موقع پر اس نے بجائے ۲۴۸ ہڈیوں کے ۲۵۲ ہڈیاں دریافت کیں۔ یہ بات مسلم تھی کہ ریڑھ کی ابتدا دماغ کے بڑے سوراخ سے اور انتہا سرین کی درمیانی ہڈی پر ہوتی ہے۔ وہ اس کو مانتے تھے کہ حلق اور پھیپھڑے کے دو دو پردے ہوتے ہیں اور گردے کی چربی پر بھی ایک خاص قسم کا پردہ ہوتا ہے۔

ان کے علم طبعیات کا مسئلہ تھا کہ برودت، حرارت، رطوبت، اور یبوست کائنات کے ترکیبی قوی ہیں، ان کی طبعیات کی

میں اس بات کا اشارہ تھا کہ طحال کا ازالہ مہلک نہیں ہے۔ تحلیل شدہ نمک اور البومن Albuman میں وہ نیز اس طرح کر سکتے کہ حرارت کے اثر سے اول الذکر تو رقیق ہو جاتا ہے لیکن موخر الذکر جم جاتا ہے۔

ویدک علاج ہندوؤں کا ویدک طب بہت زیادہ قدیم ہے۔ مذکورہ بالا طرز علاج کی طرح یہ بھی مذہبی لوگوں کا مشغلہ تھا، گو زمانہ مابعد میں غیر ملکوں خصوصاً یونان کی کچھ باتیں اس میں لی گئیں لیکن اس کی تمام تر نشو و نما ہندوستان ہی کی سرزمین میں ہوئی اور ابتدا ہی سے ہندو حکیموں کی طبابت اور تحقیق ان اصول و ضوابط کے ماتحت رہی جن کی صداقت آج بھی بہت کچھ مسلم ہے اور جو اس فن کے متعلق صحیح و قابل قدر تخیل قائم کرنے کے پختہ ثبوت ہیں۔

طبیب میں چند خاص صفتوں کا ہونا ضروری تھا۔ گو اس قسم کی شرط کا عائد کرنا قدما کے طفلانہ ذہنیت کا خاصہ تھا، تاہم آج کل بھی طبیب میں ان ہی غیر ضروری صفتوں میں سے بعض کا ہونا خالی از فائدہ نہیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ شراب خوری، غصہ اور گھمنڈ سے مبرا، طبیعت کے لحاظ سے مستعد، بیماروں کا ہمدرد، باحیا، رازدار، محنتی، فیاض، پرہیزگار، راست باز، اور خوش خلق آدمی ہو، علم کا اتنا شائق ہو کہ دشمن سے معلومات حاصل کرنے سے نفرت نہ کرے، اور ان سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ وہ ایک سوچنے والا اور آزاد رائے متنفس ہو۔

علاوہ بریں ان کے یہاں لکھا ہے کہ "طبیب اگر اپنی طبابت کی کامیابی، اپنی ذاتی منفعت، نیکنامی، اور آخر میں نجات ابدی چاہتا ہے تو اسے روزانہ تمام ذی روح اور خصوصاً برہمنوں اور گئو ماتا کی بہبودی کی دعا کرنی چاہئے ..... طبیب کے بال چھوٹے ناخن صاف اور خوب کٹے ہوں، اور اس کے لباس میں خوشبو کی باس ہو، اس کی گفتگو نرم، صاف، اور خوشگوار ہو، جو معاملہ وہ گھر میں دیکھے اسے باہر نہ کہے" آخر والی نصیحت بقراطی معاہدہ میں بھی موجود ہے

طبی تعلیم جس میں امور طبیہ کو حفظ کرنا پڑتا، برہمن دیتا تھا۔ یہ اوائل عمر میں شروع ہوتی تھی جیسا کہ یونانیوں کے یہاں بھی دستور تھا۔ شاگرد پہلے ایک عمدہ درسی کتاب پھر عمدہ استاد منتخب کرتا۔ تعلیم دواؤں کے اصول یاد کرنے، بیمار کے بستر کے پاس مشق طبابت کرنے، اور قدرے جراحی عمل کرنے پر مشتمل تھی۔ شاگرد صبح سویرے منہ دھونے اور دیوتاؤں اور گئو ماتا سے مناجات کرنے کے بعد مطالعہ کرنا شروع کرتا اور اخیر شام کو چھٹی پاتا۔ باہم شریک طالب علموں سے استفسارہ کرنا طالب طب کے مطالعہ میں بصیرت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا

سیجے۔ ایچ۔ پاس اپنی گرانمایہ "تاریخ طبابت" میں لکھتا ہے کہ ہندوؤں کے علم الامراض کے لحاظ سے تندرستی کی خصوصیات یہ ہیں، طبیعت میں صفائی، فہم و ذکا میں پختگی ہو، اخلاط اور عناصر کے یکساں امتزاج سے ہمیشہ یکساں گرمی بدن میں رہے، اعضا کے نظام، اور ہاضمہ، بول و براز کی صفائی میں خلل نہ ہو۔ بیماریوں کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں طبعی اور خارق الطبیعۃ (آسیبی) ان میں سے ہر ایک کی مختلف لحاظ سے مختلف تقسیمیں کی گئی ہیں۔ مثلاً عارضی، جسمانی، دماغی، اصلی، اشترکی، اندرونی بیرونی وغیرہ وغیرہ۔ درد تمام بیماریوں اور بخار محض سخت بیماری کا لازمی اثر سمجھا گیا ہے۔ بیماریاں عناصر خمسہ اثیر، ہوا، آگ، پانی، مٹی کے عمل میں عدم اعتدال یا فساد واقع ہونے کی طرف منسوب ہیں۔ یہ بات کہ کھانے، موسم کو الانقضا آب و ہوا کے اثر کے توسط سے بیماریوں کا قریبی سبب مانی گئی ہے بخلاف اس کے تینوں عنصری اخلاط صفرا، بلغم، اور ہوا تنفس کی خرابی سبب بعید تصور کی گئی ہے۔

گندے مکان، گندی عادتیں، ناکافی کپڑا، غیظ و غضب کے جذبات، خراب پانی پینا بھی بیماری کے دیگر اسباب شمار کئے گئے ہیں کیڑوں کو بھی بدن اور اس کے حصوں کی بیماری کا سبب بننے میں بہت کچھ دخل ہے اور اس قسم کے آج کل کے توہم کی اصلیت غالباً یہی پرانا ہندوستانی خیال ہے۔

علم جراحی نے ہندوؤں کے درمیان دو مرتبہ کمال کیا تھا کہ وہ بڑے سے بڑے اور مشکل سے مشکل مرہم پٹی اور چیر پھاڑ سے نہ ہچکچاتے۔ مہابھارت کے مندرجہ ذیل الفاظ سے مرہم پٹی کے وجود اور اس کی اہمیت کا ثبوت ملتا ہے۔

"لڑائی کے زخمی جلدی سے اٹھا لئے جاویں اور انھیں خیمہ میں لیجا کر ان کا سیلان خون روکا جاوے، زخموں پر کوئی مسکن درد اور شفا بخش بوٹیوں کے عرق کے ساتھ ٹپکایا جاوے"۔ دوسرے موقع پر ایک شخص ذکر کی گئی ہے جس میں پھوڑوں کے چیرنے پھاڑنے کا خاص اشارہ موجود ہے۔

"آپ ان بیماریوں کو اچھا کر لیتے ہیں جن کو یہ اطبا اور جڑی بوٹیاں نہیں اچھا کر سکتیں"۔ ان کے مجموعہ علم الامراض نے بہت سی اندرونی بیماریوں کے متعلق بتایا ہے۔ مثلاً وجع مفاصل، نقرس، بواسیر، بطن اور نہار والی سوجن، بخار، زکام، میٹھے پیشاب والی ذیابیطس جس کو یونانیوں میں پہلے پہل ہیرڈیس ماکس نے بیان کیا، اسہال، یرقان، کھانسی، امراض دودیہ، صرع، اندھا، گرمی کی پھنسیاں، دو مطاریا، تپ دق، وغیرہ وغیرہ۔

تشخیص میں حواس خمسہ سے کام لیا جاتا، بیمار کا معائنہ ہوتا اور طبیب سے توقع ہوتی تھی کہ مریضوں کی نبض، جسمانی درجہ حرارت، کھال کی رنگت، اس کے پیشاب و پاخانہ، آنکھوں، آواز کے زور اور تنفس کی سنسناہٹ پر خاص توجہ کرے۔

دواؤں کی تعیین مرض کے قابل علاج ہونے پر منحصر تھی۔ اگر مرض لا علاج قسم کا ہوتا تو اطبا بیمار کو اچھا کرنے کی کوشش بالکل ہی نہ کرتے بلکہ منقول ہے کہ اسے بلا کسی ذاتی غرض کے ایمانداری کے ساتھ مشورہ دیتے کہ "ایک تنگ راستے سے ملک کے ناقابل تسخیر شمالی مشرقی گوشے میں چلے جاؤ، وہاں برابر پانی اور ہوا پر گذارہ کرو جب تک کہ یہ کالبد خاکی پست نہ ہو جائے اور اس کی روح خدا سے نہ مل جائے"۔

ہیروڈوٹس اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے "ہندوستانیوں میں جو کوئی بیمار پڑتا ہے، ایک صحرا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ لیٹ جاتا ہے پھر اس کے متعلق کوئی بھی نہیں پوچھتا کہ آیا وہ ہنوز بیمار ہے یا مر گیا"۔

لیکن اگر مرض قابل علاج ہوتا تو طبیب کی توجہ تشخیص مرض کے علاوہ موسم، مریض کی عمر، جسمانی عادت، طاقت، فطرت، مزاجی خصوصیات، معدہ کی حرارت، بود و باش کی جگہ اور ذات کی طرف بھی خاص طور پر مبذول ہوتی کیونکہ ہندوستانی خیال کے لحاظ سے بیوقوف بہ نسبت ذہین لوگوں کے جلدی شفایاب ہوتے ہیں جس کی علت راست گو سسرت[1] نے یہ بیان کی ہے کہ کم عقل والے بہت جلد مان جاتے ہیں۔ یہ تمام تحقیقات کرنے کے بعد طبیب بیمار کے لئے دوا تجویز کرتا تھا۔

ہندوؤں کے یہاں دوائیوں کے سامان بکثرت تھے۔ ان میں تقریباً اتنی ہی وسعت تھی جتنی آج کل کی ادویہ میں ہے۔ ان میں حیوانی، نباتی، معدنی اشیا کے علاوہ جادو کے کچھ منتر بھی تھے۔ دوائیں لگانے کی بھی ہوتی تھیں اور کھانے پینے کی بھی کبھی کبھی

[1] ایک مصنف کا نام ہے۔

— بالکل مفرد ہوتیں لیکن زیادہ تر مختلف مفردات سے بہت ہی پیچیدہ طریقہ سے مرکب ہوتیں۔ ہندو اطبا نے زور تاثیر کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی تھی۔ پچھنے لگانا اور بالخصوص رگ کھولنا عام طور پر رائج تھا۔ نلیوں کے ذریعے سے منہ اور ناک میں بھاپ اور دھواں لینا بھی مروج تھا۔

قدما ہنود نے بہت سے شفا خانے قائم کئے تھے۔ چیچک کے اصلی اور نقلی زہریلے مادے کی تعلیم (ٹیکہ) بطور حفظ ماتقدم کے عمل میں لائی جاتی تھی۔ برہمن ہمیشہ اس کام کو موسم گرما کے آغاز میں کرتے۔ کھال کو خوب ملکر اس پر چند زخم لگائے جاتے پھر اس قسم کے ایک سال بیشتر نکلے ہوئے مادے سے ترکی ہوئی کپڑے کی بتیاں ان زخموں میں بھر دی جاتیں۔ ہندوستانی ٹیکہ کا طرز اس قسم کے ٹیکہ لینے والوں کو کچھ عرصے کے لئے کھلی فضا میں رہنے پر مجبور کرتا۔ لڑکیوں کو ہمیشہ کہنی کے اوپر اور لڑکوں کو کہنی کے نیچے ٹیکہ دیا جاتا۔ آجکل ہندوستان میں نئے قسم کا ٹیکہ حکومت نے لازمی کر دیا ہے لیکن اب بھی بعض غیر متمدن جگہوں میں وہی پرانا ٹیکہ رائج ہے۔

علم الاغذیہ میں انھوں نے انتہائی نظام اور تفصیل سے کام لیا۔ گوشت کھانا ممنوع تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

ان کا علم السموم بھی بہت وسیع تھا۔ موجودات کا اس قدر علم جتنا ادویہ کی معرفت کے لئے لابدی ہے، انھوں نے کافی طور پر حاصل کیا تھا لیکن انھوں نے علم التشریح میں چنداں کمال نہیں پیدا کیا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مردہ چھونا ان کے یہاں وہ گناہ تھا جس کا کفارہ ادا کرنا لازمی تھا گو وہ بہت سخت نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ لاش میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے بعد تشریحی تحقیقات کی اجازت تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ اس تبدیلی کا طریقہ اور اس کے سامان و آلات بالکل نرالے تھے، تاہم یہ تمام باتیں انسانی جسم کی ساخت کے متعلق خاطر خواہ آگاہی بخشنے کے واسطے موزوں نہیں تھیں۔ ان کے یہاں حکم تھا کہ،

"طبیب لاش کو، بشرطیکہ اس میں کوئی عضو ننگا ہو نہ زہر یا کسی بیماری کی وجہ سے خرابی آئی ہو، اور نہ بجائے خود مرض سے زائد ہاتھ لگائی گئی ہو، اس کے کپڑے اتار کر اس کے ظرف بست باندھے۔ اور کسی صاف چشمہ میں چھوڑ دے۔ جب وہ مکمل طریقہ سے گل جائے تو نکال لے۔ پھر سات روز کے بعد چھال کے ٹکڑوں سے اسے ملے۔ اس کے بعد اس کو اجازت ہے کہ اس کی کھال اور تمام اندرونی و بیرونی اعضا کو آنکھوں سے دیکھے"

بہر صورت، ہندوؤں کے ویدک طب کو المودیوں اور مصریوں کے طب پر یقینی فوقیت حاصل ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ طبابت کی ان تمام نوعیتوں کے مابین جنھوں نے متواتر ترقی نہیں کی یہ سب علیا کا حق ہے۔ یہ کہنا کہ مسائل کی وسعت نیز روحانی پختگی کے لحاظ سے یونانی طب سے بہت پیچھے نہیں تھا، ایک معقول قاعدہ کا ثبوت ہے۔ باایں ہمہ جب ہم اس زمانہ کی حالت اپنے پیش نظر رکھتے ہیں جس میں اس نے یک بیک ترقی کر کے اتنا اونچا مرتبہ حاصل کر لیا تو ہم اس کی تعریف کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔

علم اور مذہب

(از جناب مولوی صدر الدین صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ)

علم اور مذہب کی باہمی آویزش زمانۂ حال کی کوئی مخصوص شے نہیں ہے بلکہ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے بہت پہلے دنیا کی اکثر قومیں ان نامبارک مناقشات میں مبتلا رہ چکی ہیں اور پرستاران علم و ارباب مذہب ہمیشہ سے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہ چکے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرون اولیٰ کا مذہبی و علمی تنازع دور حاضر کی نسبت کہیں زیادہ سخت افسوسناک اور ہلاکت آفریں تھا چنانچہ تاریخ میں کتنے حکما، و فلاسفہ آپ کو ملیں گے جو زہر کا تلخ جام بکف دم توڑتے ہوں گے کتنے ایسے نظر آئیں گے جو قید و بند کی مصیبتوں میں گرفتار ہو کر زندگی کے دن گزارتے ہوں گے اور ایک گروہ ایسا بھی آنکھوں کے سامنے آئے گا جن کا خرمن حیات آگ کے انگاروں میں جل رہا ہوگا۔ یہ کیوں؟ محض اس جرم کی پاداش میں کہ انھوں نے انسانی عقل کو اوہام و خرافات کی ان کثافتوں سے پاک اور منور کرنا چاہا جنھوں نے عقل کی فطری صلاحیت سلب کر لی تھی اور اس کے حقیقی نور پر ظلمت کا پردہ ڈال دیا تھا۔

لیکن تہذیب و تمدن کے موجودہ دور میں جیسا کہ فرانس کے مشہور عالم مسٹر برٹن نے لکھا ہے "علم اپنی دنیا میں آزاد ہے اسے مکمل خود مختاری حاصل ہے اور مذہب کی چیرہ دستیوں سے بالکل بے فکر"، موصوف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے چنانچہ ارباب علم کی وہ تصنیفیں اس قول کی تصدیق کرتی ہیں جن کا ایک ایک لفظ ادیان و ملل کی گردن پر صاعقۂ ہلاکت بنکر گرتا اور اس کے وقار کو بری طرح صدمہ پہونچاتا۔ ان تصنیفوں میں مذاہب کو طعن و تشنیع کا ہدف بنا کر ان کے معائب کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جس سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ علم و عقل کے یہ علمبردار مذہبی قیود سے بالکل آزاد اور اس سے قطعاً بے نیاز ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یاران طریقت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ملل عامہ کے متعلق یہ تہدید آمیز پیشین گوئی کی کہ "عنقریب یہ مذہبی نقوش انسانی پردۂ خیال سے محو ہو جائیں گے اور دنیا کا معاشرتی و اجتماعی نظام ان دھبوں سے پاک ہو جائے گا کیونکہ اس کے اساسی اصول قواعد علمیہ کے خلاف اور ان نوامیس طبعیہ کے مقابل صف بستہ ہیں جو انسانیت کو اس کی معراج کمال تک پہونچا سکتے ہیں اور جن کے سایہ میں دنیا ترقی کے بام عروج تک پہونچ سکتی ہے۔"

علامہ کونشان نے مذہب، ضرورت مذہب اور اسکے نشو و نما پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے ان روحانی امراض کی تشخیص کی ہے جس نے "انسانی اجتماعیت کو باطل اعتقادات اور دور از فہم اوہام کے ذریعہ پارہ پارہ کر رکھا ہے پھر ان امراض کا علاج یہ بتلایا ہے کہ انسانی ضمیر کو بالکل آزاد ہونا چاہیئے اس کے معتقدات کسی خاص خیال کے ماتحت نہ ہوں اور خود انسان ذاتی اعتبار سے اپنا ہی مقلد ہو اسے وہ تمام آزادیاں حاصل ہوں جن کا ہونا ضروری ہے" پھر کہتا ہے "اس طرح مذاہب سے موجودہ خرابیوں کا قلع قمع ہو سکتا ہے اور وہ ان آلودگیوں سے پاک ہو سکتے ہیں جنھوں نے حقیقت کو مسخ کر ڈالا ہے۔ لیکن ہمارے خیال

میں اس امر کا تحقق غیر ممکن ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ دین اپنے اساسی اصول کو ترک نہیں کر سکتا لیکن چونکہ اس کے اصول علم و عقل کے مطابق نہیں ہیں لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ ایک روز زوال و انحطاط کی زد میں آکر مذہب سسکیاں لے لے کر دم توڑ دے گا اور اس کا جنازہ دنیا سے اٹھ جائے گا۔"

ایسے عدیم النظیر عالم کے اس نظریہ پر ہمیں سخت تعجب ہے کہ اس نے بلا استثناء تمام مذاہب کے بارے میں یہ رائے قائم کر دی کہ "عنقریب یہ سب صفحۂ وجود سے محو ہو جائیں گے" حالانکہ موصوف نے ہر ایک مذہب کے اصول و فروع پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ اگر صدر اسلام کے زریں عہد کا دھندلا سا عکس آپ کی "حقیقت شناس" نگاہوں کے سامنے ہوتا اور آپ نے ذرہ برابر بھی عقل و انصاف کی روشنی میں غور کیا ہوتا تو یہ امر روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتا کہ دین حنیف کی یہی نمایاں خصوصیت ہے جو اسے اوروں سے ممتاز کرتی ہے یعنی اس کی بنیاد علم و عقل کے مطابق ہے دونوں میں درحقیقت کوئی تفاوت نہیں۔

مذہب اور مشاہیر یورپ کی نکتہ چینیاں

لیکن ہم اس مختصر بحث میں مشاہیر یورپ کی ان رایوں کا تذکرہ کریں گے جن میں مذاہب پر مطاعن کی بوچھار کی گئی ہے اور ان کو ضعیف و ناقابل اعتنا ہونے کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں، تاکہ ناظرین ان مدعیان عقل و دانش کے معاندانہ رویہ سے بخوبی واقف ہو جائیں ان کے علمی غور و فکر کی رفتار کا مشاہدہ کر سکیں اور یہ معلوم کریں کہ مذہب پر ان کے اعتراضات اور مطاعن کی بنیاد کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارباب عقل، اسلام کے اصول بھی پیش نظر رکھیں تاکہ یہ امر تشنۂ بحث نہ رہ جائے کہ اسلام ہی فطرت انسانی کا آئینہ اور ضمیر انسانی کی صدائے بازگشت ہے۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ کونت (Comte) نے ادیان عالم کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ یقیناً ایک دن زوال پذیر ہوں گے اب ہم اس کے اس دعوی پر اس کا ایک فلسفیانہ استدلال نقل کرتے ہیں، کہتا ہے "جو اصول و قواعد کسی ایک زمانہ کے لئے سود مند ہیں یقیناً وہ ایسے اجزاء سے مرکب ہوں گے جو آئندہ چل کر ترقی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوں گے کیونکہ یہ قواعد تغیر زمانہ کے بعد فرسودہ اور ناقابل اعتنا ہو جائیں گے۔ اس وقت ان کی اتباع عقل انسانی کے لئے غیر ممکن ہو گی خصوصاً ان عقلی و علمی اختراعات میں جن کی بدولت عقل برابر ترقی و پاکیزگی کے مدارج طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دینی احساس موجودہ قواعد علمیہ کی پابندی کرنے سے بالکل قاصر ہو گا لہٰذا وہ اپنے محدود اور تنگ قواعد کی پابندیوں سے دست کش ہو کر ایسے اصول تلاش کرے گا جو اس کے لئے موزوں ثابت ہوں اور جن کے سائے میں دنیا ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکے ورنہ مذہب کی بنیاد ہمیشہ متزلزل رہے گی اور اس میں ثبات و استواری اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک اسے ان جدید قواعد کی ہم آہنگی نہ حاصل ہو۔"

مغربی روشن خیالوں نے انسانی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور بزعم خود اس صراط مستقیم پر آ پہونچے جو فطری سعادت اور انسانی فوز و فلاح کی شاہراہ تھی۔ انجام کار یہ حقیقت ان کے سامنے آئی کہ انسان امانت الٰہی کے بارے اس وقت تک سبکدوش نہیں ہو سکتا جب تک قدرت کے ان تمام عطایا سے مستفید نہ ہو جنہیں مشیت نے خاص کر بنی نوع انسان کو مرحمت کیا ہے۔ اور انہوں

ماضی کے حالات پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے یہ نظریہ قائم کیا کہ انسانیت کے اس منتہائے عروج تک پہونچنے میں جو چیز حائل ہوئی وہ داعیان مذہب کی اطاعت اور ان کی کورانہ تقلید ہے۔ بس پھر کیا تھا ان پاک ہستیوں پر شناعت آمیز مطاعن کی بارش کی گئی کہ ان کی تعلیمات نے انسان کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے سے روک دیا یعنی انھوں نے انسانی قوائے طبعیہ کو معطل کر کے منشاء الہی کی علانیہ مخالفت کی۔ مثال کے طور پر فویرباش کا طنزیہ مقولہ پیش کیا جاتا ہے۔

"مذہب کی فضیلت بلکہ نمایاں فضیلت یہ ہے کہ تمدن و سیاست کو خیرباد کہہ دیا جائے، دنیوی معاملات سے دامن داغدار نہ ہونے پائے، انسان زندگی کی نعمتوں سے بے نیاز ہو کر ایک موہوم جنت الفردوس کا شیریں خواب دیکھا کرے اسکے لئے سراپا انتظار بن جائے اور اپنی فطری صلاحیتوں کا خون کر کے اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف تسلیم و رضا کا مجسمہ یعنی عجز و انکسار کی پوری تصویر بن جائے"

علمائے مغرب کا خیال ہے انسان کی ترقی کا انحصار سراسر علمی ترقیات پر مبنی ہے اور علم کی ترقی و اس کا عروج صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ عقل کا جوہر خارجی اثرات سے پاک ہو کسی قسم کے اصول، اور قوانین اس کی نشو و نما پر اثر انداز نہ ہوں بلکہ وہ اپنے ہر فعل میں آزاد ہو نیز علمی مباحث کسی خاص اعتقاد کے پابند نہ ہوں ورنہ وہی صورت حال پیش آئے گی جس کا منظر دنیا کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ مذہبی و علمی منازعات میں آچکا ہے۔

فرانس کا مشہور عالم بلوک کہتا ہے "ہم اپنی ان وسیع معلومات کی بنا پر جس نے کائنات کے مخفی اسرار کا انکشاف کر کے ہماری صدیوں کی گمراہیوں کا قلع قمع کر دیا ہے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ قوت متخیلہ کی ترقی اور حسن رائے محض علمی ترقیات پر منحصر ہے"

ان علماء کا عقیدہ ہے کہ روحانی اور مادی ہر قسم کی سعادتوں کا دارومدار محض علم و عقل کی آزادی پر ہے۔ بایں وجہ جس وقت یہ لوگ دور گذشتہ کی عقلی و علمی پستیوں اور ان جواہر گرانمایہ کی بربادیوں کا نقشہ کھینچتے ہیں اس وقت امم سابقہ کی ناحق شناسیوں پر کمال تاسف اور غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں اور ان لوگوں کی، جو مذہب کے سامنے سر جھکانے کو فخر شمار کرتے ہیں نہایت حقارت آمیز کلمات کے ساتھ تواضع کرتے ہیں۔ اس جگہ ہم مشہور عالم لاروس کے خیالات کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام مغربی علماء کے انتہائی تشدد کا اندازہ کر سکیں۔

"اگر ہم کہیں کہ مقتضائے عدل و انصاف یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کو اپنے نزدیک قابل اعتبار سمجھیں اور ایسی امور کو اپنے معتقدات کی صف میں جگہ دیں جو میزان عقل میں پورے اتریں تو یہ جہل و نادانی کے علمبردار اعتقادات پرست فوراً ناک و بھوں چڑھا کر مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گے، اور اپنی تمام ذہنی و دماغی قوتیں عقل انسانی کی منقصت میں صرف کر دیں گے وہ عقل جو حق و باطل، سیاہ و سفید اور کھرے کھوٹے کے اندر تمیز کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے اور جس کی تمام توجہ حسن و قبح، ظلم و انصاف اور نور و ظلمت کا حقیقی امتیاز پیش کرنے میں صرف ہو رہی ہے، یہاں تک کہ جب جہالت و کج باطنی کی تمام منزلیں طے کر لیں گے، عقل کی آنکھوں پر پردہ ڈالیں گے، تمام احساسات طبعیہ کو فنا کر لیں گے۔ اور حیوانیت کے اس مرتبہ پر پہونچ جائیں گے جہاں سے حق و باطل کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور انسانی فطرت اپنے احساس کو اسقدر کھو بیٹھتی ہے کہ بلبل کی نواسنجیاں اور زاغ و زغن کی شمع خراشیاں ان کے نزدیک ایک

حیثیت رکھتی ہیں اس وقت گویا "سعادت" کی تکمیل ہوجاتی ہے اور اسی کو مذہب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اپنے معتقدین کو اطاعت انقیاد کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن کس کی اطاعت کی؟ کیا عقل یا ضمیر کی آواز یا فطری جذبات یا انسانیت کو بام ترقی پر پہونچانے والے اصول کی اطاعت کی؟ نہیں بلکہ جوہر عقل کو معطل کر کے نوامیس طبعی کو پس پشت ڈال کر داعیان مذہب کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کی اور ان کی ہر جنبش لب کو فرمان الٰہی سمجھ کر امتثال امر کے لئے تیار ہو جانے کی۔ خواہ وہ تمھیں سلطان وقت کے قتل کا حکم دیں یا باپ کی ہلاکت کا یا خدا کی بے گناہ مخلوق کی خونریزی کا۔ اس لئے کہ تم ان کے سامنے مجبور محض اور ایک جسد بے جان ہو۔ ان کے احکام کے مقابل میں تمہاری فطری آواز کوئی چیز نہیں اور نہ تم ان کے بارے میں کوئی ذاتی رائے اور اعتبار رکھتے ہو اس لئے ان کی ہر آواز پر لبیک کہنا تمہارا عین فرض ہے"

مشاہیر یورپ اور مذہب کے فطری ہونے کا اعتراف

یورپین روشن خیالوں نے ادیان مروجہ کی مخالفت اور ... پر طعن و تشنیع میں جو متعصبانہ اور معاندانہ پہلو اختیار کیا ہے وہ نہایت شرمناک ہے جس کی چند مثالیں اوپر دی گئی ہیں ورنہ اس بارے میں ان کے اقوال کا ایک بھرا ہوا دفتر ہے لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے دین و مذہب کا جامہ بالکل ہی سر سے اتار پھینکا ہے اور کیا وہ اپنی علمی ترقیات کے غرور میں اس معبود حقیقی کے سامنے سر عجز و نیاز خم کرنے سے بالکل منکر ہو گئے ہیں، جس کی مقتضائے حکمت کے مطابق کائنات کا ذرہ ذرہ معرض وجود میں آتا ہے اور پھر اسی نظام کے ماتحت فنا ہو جاتا ہے؟ نہیں بلکہ خود ان کے اقوال مذہب پرستوں کے عقلی استدلال کو تقویت پہونچاتے ہیں اور انھیں اس امر کا اعتراف ہے کہ دینی احساس انسان کی عین فطرت ہے اور اس کو مذہب کی حاجت اسی طرح محسوس ہوتی ہے جس طرح کھانے پینے کی۔

جرمن فلاسفر ... اپنی کتاب "تاریخ الاعتقادات" میں لکھتا ہے کہ مذہب غیر فانی ہے جس طرح کہ وہ احساس غیر فانی اور لازوال ہے جو اس کے وجود کی علت بنتا ہے لیکن دینی علوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ارتقاء عقل کے مطابق خود ترقی پذیر ہوں اور ان کی وسعت عقل کی جولانگاہ کے برابر ہو"

مسٹر ارنسٹ رینان اپنی کتاب تاریخ الادیان میں لکھتا ہے:

"ممکن ہے ہماری تمام محبوب چیزیں فنا ہو جائیں، ہوسکتا ہے کہ زندگی کی تمام نعمتیں ہم سے ایک ایک کر کے رخصت ہو جائیں اور اس کا بھی امکان ہے کہ ہم قوائے عقلیہ و علمیہ کی آزادانہ روش کو پامال کر دیں لیکن یہ محال اور غیر ممکن ہے کہ صفحۂ قلوب سے مذہب کا نقش محو ہو جائے بلکہ یہ فطری احساس عالم امکان کی آخری ساعت تک اس غلط خیال اور طرز نظام کی سرکوبی کرتا رہے گا جس کا مقصد یہ ہے کہ فکر انسانی کو ان خرافات میں الجھا دے جن کا تعلق محض اس عالم آب و گل تک ہے اور جو صرف دنیا کی چند روزہ زندگی میں کارآمد ہو سکتے ہیں"

خلاصہ بحث یہ ہے کہ علمائے مغرب جو علوم و معارف، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت غرضیکہ تمام شعبہ ہائے ترقی

ہیں موجودہ نسل آدم کے امام سمجھے جاتے ہیں متفق اللفظ ہوکر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ مذہب فطرت انسانی میں اسی طرح دخل رکھتا ہے جس طرح غیظ و غضب، الفت و محبت وغیرہ جذبات فطرت انسانی کے لوازم ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی نظریہ ہے جیسا کہ ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ مذاہب میں سے ایک مذہب بھی اپنے اندر یہ ہمہ گیری اور صلاحیت نہیں رکھتا کہ دور حاضر یا مستقبل میں جمیع بنی نوع انسان کے لئے ایک عالمگیر مذہب ثابت ہوسکے اور اپنی وسعت کے لحاظ سے تمام لوگوں کی ضرورت کا کفیل ہوسکے، کیونکہ ان کے آئین و قوانین، علمی قواعد سے شباہت نہیں رکھتے اور نہ ان کے احکامات معیار عقل پر پورے اترتے ہیں۔ نیز قدم قدم پر ایسی ایسی قیدیں اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں جن کی وجہ سے انسانی عقل کا فطری جوہر خاک میں مل جاتا ہے اور انسان کے احساسات و ادراکات مذہبی قیود کی تاب نہ لاکر مردہ ہو جاتے ہیں اسی بنا پر ایک مغربی فلسفی کہتا ہے "مذہب اس وقت تک زوال پذیر نہیں ہوسکتا جب تک اسکے اصول بندشوں سے آزاد ہوں، جس طرح ایک انسان خارجی اثرات سے آزاد ہوکر علم و عقل کی روشنی میں برابر ترقی کی منزلیں طے کرسکتا ہو اور اسکی راہ عمل میں ایسی مشکلات کبھی بھی مانع نہیں ہوسکتیں جو اسے زوال و انحطاط کی بدنصیبی میں مبتلا کرسکیں"۔

مغربی ارباب علم کا یہ خیال ہے کہ اگر موجودہ مذہب میں سے کوئی مذہب اپنے اندر اتنی جامعیت اور ہمہ گیری رکھتا کہ انسان کو دنیوی جذبات اور زندگی کی عام ضروریات دونوں کا پوری طور پر کفیل ہوسکتا اور انسان کو سعادت کی اس معراج تک پہونچا دیتا جس کی مثال ہماری علمی جدوجہد آج پیش کر رہی ہو تو دنیا یقیناً اسکی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کردیتی اور اسکی ضرورت کا اعتراف کرتی۔

مسٹر نارڈوس نے مذاہب کے نظم و نسق اور اس کے آئین و قوانین پر کتنی کیسا نکتہ چینی کی ہے اور انھیں ناقابل اتباع ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مذہبیت انسان کے اندر ادائگی فرض کا احساس نہیں پیدا کرتی بلکہ اس کا محرک درحقیقت آزادانہ غور و فکر، انسان کی طبعی قوت اور اس کے وہ احساسات و جذبات ہیں جو قوت فکر کے سایہ میں پرورش پاتے ہیں۔ لیکن اگر مذہب کی تعبیر یوں کی جائے کہ وہ ان افکار صالحہ کا نام ہے جو تمام بنی نوع انسان کو ایک نقطہ پر لاکر جمع کردیں اور ان کے اندر وحدت و اجتماعیت کی وہ روح پھونکدیں جس کے ذریعہ مادی فوائد کے وسائل بآسانی فراہم ہوسکیں اس وقت تمہارا یہ دعویٰ ایک حد تک صحیح ہوسکتا ہے کہ مذہب ایک ضروری شے ہے"

مذہب کے اصول یورپ کے نقطۂ نظر سے

عقلاء مغرب کے ان اقوال کے علاوہ اس بات پر بے شمار دلائل موجود ہیں کہ عقل انسانی خواہ وہ ارتقاء کی کسی منزل میں ہو بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ علمائے یورپ کے ایک گروہ نے ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی ہے جس کا نام انھوں نے دین فطرت رکھا ہے، اس کے اصول و قواعد عقل و حجت کی ترازو میں تولنے کے بعد منضبط کئے گئے ہیں جن کا ماحصل یہ ہے:۔

(۱) کوئی عقیدہ مذہبی عقل کے خلاف نہ ہو
(۲) مذہب کی صحت کا مدار عقل کو قرار دیا جائے نہ کہ تقلید کو
(۳) عبادات کے یہ معنی نہ قرار دئے جائیں کہ وہ مقصود بالذات ہیں اور خدا ہمارے تکلیفات شاقہ اٹھانے سے خوش ہوتا ہے بلکہ عبادات سے خود نوع انسانی کا فائدہ مقصود ہو اور وہ اعتدال سے متجاوز نہ ہوں۔
(۴) دینی اور دنیوی فرائض کو اس اعتدال کے ساتھ قائم کیا جائے کہ ایک سے دوسرے کو ضرر نہ پہنچے بلکہ ایک دوسرے کا دست و بازو بن جائے۔
(۵) مذہب تمدن کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کا ساتھ دے سکے۔ بلکہ خود اس ترقی کا راستہ دکھلائے۔
اگر ارباب عقل تعصب و عناد کی بندشوں سے آزاد ہو کر اسلام کے بنیادی اصول کو سامنے رکھیں اور پھر ان سے اس جدید مذہب کے ان دفعات کا موازنہ کریں تو بادنیٰ تامل ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا۔ کہ اسلام نے کسی متلاشی حق اور محقق کے لئے میدان حقانیت کا کوئی گوشہ خالی نہیں چھوڑا ہے۔
افغیر اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعا و کرھا و الیہ یرجعون

دعوت عمل

مسلمان کیونکر ترقی حاصل کرسکتے ہیں

مسلمانو! دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور دنیا کے تم ہی وارث ہو۔ مگر نا اتفاقی کے باعث تم سے یہ حق غیروں نے چھین لیا اور تم دروں کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گئے ہو۔ انسانی زندگی کے سے محکومی آخری ذلت ہے جس کے بعد اور سب ذلتیں ہیچ ہیں اگر تم اب بھی کلام الٰہی قرآن مقدس پر تدبر کرو۔ غور کرو اور عقل سلیم کو استعمال میں لاؤ تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ جس قوم کے پاس کلام الٰہی قرآن شریف جیسی مقدس کتاب ہو۔ وہ قوم کبھی ذلت میں نہیں رہ سکتی مگر باوجود اس کے مسلمان ذلت پر ذلت برداشت کر رہے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں نے قرآن شریف پر تدبر نہیں کیا۔ قرآن شریف کو پڑھا مگر عمل نہیں کیا۔ قرآن شریف ریشمی غلافوں اور الماریوں میں رکھا مگر استعمال نہیں کیا صحابہؓ کے پاس یہی قرآن شریف تھا جس کے باعث تمام دنیا پر حکمرانی کرتے رہے۔ دنیا کے حکمران ہو گئے تھے اور دنیا کو امن و امان علم و تہذیب اسلامی سے منور کر دیا تھا۔
مسلمانو! . . . قرآن شریف پر غور کرو۔ اس پر عمل شروع کرو۔ پھر دیکھو تمہارے ہی ہاتھوں سے ایک دن دنیا میں عظیم انقلاب برپا ہوتا ہے یا کہ نہیں۔ اور دنیا کے وارث تم ہی بنتے ہو یا نہیں۔
مسلمانوں! عمل کی طرف آؤ۔ قرآن شریف سے اپنا عمل شروع کرو پھر دنیا کے بادشاہ بن جاؤ۔ خادم (کشفی شاہ نظامی)

عہدِ حاضر کی ایک مشہور شخصیت

مصطفیٰ کمال پاشا

(۷)

(از جناب عبدالحکیم صاحب بی اے)

"حضرات بلاشبہ ہم نے عظیم الشان فتح حاصل کی ہے، عظیم الشان اور جلیل القدر لیکن یہ ہمارے پروگرام کی انتہا نہیں ابتدا ہے تعلیم کی مہم ہمارے سامنے ہے اگر اس زبردست مہم کو بھی آپ نے سر کر لیا تو یقیناً یہ آپ کے پچھلے کارنامے سے زیادہ درخشاں کارنامہ ہوگا لیکن اگر بفرض آپ سرانجام نہ کر سکے تو جو کچھ کر سکے ہیں وہ بھی بے سود نا حاصل ہوگا۔ حضرات یاد رکھئے میری یہ درخواست آپ سے اور صرف آپ سے ہے" اسکے بعد کمال نے اپنی تقریر میں آزادی نسواں۔ قدیم رسم و رواج میں اعتدال و معقولیت پر زور دیا اور پھر آخر میں کہا "لیکن یہ ساری اصلاحات اور ساری سرگرمیاں بے سود و بے معنی ہوں گی تاآنکہ ہم مقتضائے وقت کو سمجھ لیں اور اس کی روشنی میں اپنا نظام عمل درست کریں۔ ماحول اور موجودہ زندگی کے اقتضا کو اگر نظر انداز کر دیا گیا تو یاد رکھئے کہ زندگی بے جنون اور ننگوں کی زندگی ہوگی صحت و توانائی کی زندگی نہ ہوگی۔ تم وہیں رہو جہاں اس وقت ہو لیکن مغرب سے ہر وہ چیز بھی لیتے رہو جو مہذب اور ترقی یافتہ اقوام کے لئے ناگزیر ہے سائنس اور تازہ ایجادات و معلومات کی پذیرائی کے لئے اپنے دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھو اگر ایسا نہیں کروگے تو یہی چیزیں تمہیں نگل جائیں گی اور صفحۂ ہستی پر تمہارا وجود باقی نہ رہے گا۔"

یہ چند فقرے مصطفیٰ کمال کی اس تقریر سے لئے گئے ہیں جو فتح سمرنا کے بعد اس نے برسہ میں کی تھی۔ مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی جماعت اس تقریر میں حاضر تھی اور ایک بڑا ترکی جھنڈا دوران تقریر میں برابر لہرایا گیا تھا۔

ترکی کا تعمیری دور

کمال نے ملک کو بیرونی اثر و اقتدار کے پنجوں سے چھڑا لیا تھا، اندرونی جنگ و جدال کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن اب اس کے سامنے ایک نہایت صبر آزما اور دشوار کام تھا وہ چاہتا تھا کہ ترکی کی تعمیر ایسی ٹھوس اور محکم بنیادوں پر ہو کہ کھویا ہوا وقار و اقتدار دوبارہ پیش نظر ہو جائے صلحنامۂ لوزین کے بعد سپاہی نے اپنے ہتھیار ڈال دیئے تھے وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا اب سیاستدان اور مصلح قوم کی باری تھی لیکن راہ میں مشکلات کی بڑی زبردست چٹانیں تھیں جو ہٹائے نہ ہٹتی تھیں۔ ان کو عبور کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مصطفیٰ کمال اپنی پوزیشن اور اپنا اقتدار ہر طرح محفوظ کر لے اور جہاں تک ہو سکے لوگوں کے دلوں میں اپنے خلوص و نیک نیتی کا نقش جما دے۔ اسی خیال کے تحت سب سے پہلا کام جو ہوا وہ یہ تھا کہ نیشنل اسمبلی نے اپنے لئے ایک جدید نام کا انتخاب کیا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے ایک اہم دستوری

اصلاحات کے بموجب حکومت ترکی کو ریپبلک کا نام عطا کیا گیا۔ مصطفےٰ کمال نے یہ نام خود تجویز کیا تھا جسے اسمبلی نے منظور کر لیا۔ بظاہر یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مصطفےٰ کمال جو جمہوری نظام حکومت کے اس درجہ خلاف تھا اور یورپ میں اس قسم کے تمام دستوروں کو وہ مکمل ناکامی سے تعبیر کرتا تھا، اپنی رائے ایک دم سے بدل دے اور خود وہی چیز ترکی کے لئے تجویز کرے لیکن شجاعت و جوانمردی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ ایک مقتدر اور آمر شخصیت اقتضائے وقت اور قوم کی خواہش کے سامنے سپر ڈال دے۔ کمال نے یہی کیا اور قوم نے بھی اپنی مسرت اور مردم شناسی کا ثبوت اس طرح دیا کہ مصطفےٰ کمال ہی کو اس نوخیز جمہوریت کا صدر بنایا اور صدر ہی کی رائے سے اسمبلی نے صدر کے اختیارات خاص Veto power کو دستور سے نکال دیا۔ اگرچہ ترکی میں ریپبلک قائم ہو گئی اور جمہوری اصول نظام حکومت کے ہر شعبہ میں نافذ ہو گئے لیکن مصطفےٰ کمال ایک آمر اور ڈکٹیٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ زمانہ کے بعض شناسوں کی رائے میں ترکی کو اپنے مخصوص گرد و پیش اور احوال کے اعتبار سے اپنی معاشی مذہبی اور سیاسی نقائص کو دور کرنے کے لئے مصطفےٰ کمال جیسے ڈکٹیٹر کی ضرورت تھی جس میں دل و دماغ اور عزم و استقلال کی بہترین خصوصیات مجتمع ہیں۔ بڑے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کمال اپنی تجاویز پر عمل پیرا ہو گیا اور کچھ عرصہ تک اپنی ہر دلعزیزی اور محبوبیت کے سبب سے اپنی کوششوں میں وہ کامیاب بھی رہا۔ وزیر اعظم عصمت پاشا پوری وفاداری کے ساتھ کمال کے پہلو بہ پہلو کام کرتا رہا اور ایک متنفس نے بھی صدر یا وزیر میں سے کسی کی مخالفت نہیں کی۔

حکومت کی مخالف قوتیں اور مصطفےٰ کمال کا تشدد

لیکن یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ سارے اختیارات کا ایک ہی شخصیت کے گرد جمع ہو جانا چاہے وہ کتنی ہی ہر دلعزیز و محبوب کیوں نہ ہو لوگوں کے لئے خوش آئند نہیں ہوتا چنانچہ یہی ہوا۔ پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ کے باہر ہر جماعت اور ہر حلقے کے لوگ حکومت پر تنقید و اعتراض کی نظریں ڈالنے لگے ایک مخالف پارٹی کی بنیاد پڑ گئی جو گورنمنٹ کے تدبر و دانشمندی پر بری طرح تنقید کرنے لگا۔ مجبوراً حکومت کو سختی سے کام لینا پڑا "دنیا کو یہی طرح جان لینا چاہئے" مصطفےٰ کمال نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ "میں کسی طرح خاموش نہیں بیٹھ سکتا، میں ترکی جمہوریت کا ایک فرد ہوں

ترکی کی ذہنی اور معاشیاتی زندگی میں مکمل انقلاب پیدا کر دینا میرا نصب العین ہے اور یہی میری جماعت کا عین مقصود ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کوئی دانشمند ترک اس کی مخالفت بھی کر سکتا ہے۔ اتحاد ملک کی سب سے بڑی قوت ہے اس لئے مخالف نظریوں اور مخالف پارٹیوں کا وجود سم قاتل سے کم نہیں۔" اسمبلی نے چند ایسے قوانین پاس کئے جن کی رو سے اسمبلی اور فوج کے افسروں سے آزادی کے حقوق چھن گئے۔ جگہ جگہ مخصوص عدالتیں گورنمنٹ کے مخالفین کو سزا دینے کے لئے قائم کی گئیں۔ اسی اثنا میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہز ہائینس آغا خاں اور سید امیر علی نے حکومت ترکی کے نام ایک کھلی چٹھی بھیجی جس میں نیازمندانہ لیکن زوردار الفاظ میں حکومت کو انقطاع خلافت کے باب میں تدبر و دانشمندی کی دعوت دی گئی تھی اور استدعا کی گئی تھی کہ مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں ہندی مسلمانوں کے جذبات و معتقدات کا لحاظ رکھا جائے۔ قسطنطنیہ کے تین اخباروں نے یہ چٹھی شائع کی چنانچہ ان کے ایڈیٹر بموجب

قوانین اسمبلی گرفتار کر لئے گئے۔ یہ بالکل ظاہر ہے اگر مکتوب نگار ترک ہوتے تو وہ بھی تینوں ایڈیٹروں کی طرح حکومت کے مہمان بننے پر مجبور کئے جاتے لیکن وہ زیادہ خوش قسمت تھے لیکن حکومت کے اس جارحانہ رویہ کے باوجود اسمبلی میں مخالفین کی تعداد بڑھتی گئی۔ ایڈیٹروں کی گرفتاری نے اس آگ پر تیل ڈالنے کا کام کیا، حکومت کو اندیشہ پیدا ہوگیا کہ جمہوری پارٹی یعنی کمال کی پارٹی اقلیت میں نہ آجائے یہ اندیشہ بالکل صحیح نکلا۔ کیبنٹ کو مستعفی ہونا پڑا۔ مخالف پارٹی کا لیڈر فتحی بے وزیر اعظم مقرر کیا گیا (نومبر ۱۹۲۴ء) لیکن نئی کیبنٹ کامیاب نہ ہوسکی۔ اسی زمانہ میں کردستان میں بغاوت ہوگئی خیال کیا گیا کہ انجمن ترقی (اکثریت اس وقت خود کو اسی نام سے پکارتی تھی) کے رہنماؤں کا اس میں ہاتھ تھا۔ فتحی بے پر باغیوں کے ساتھ ہمدردی کا الزام لگایا گیا غرض کیبنٹ جلد ختم ہوگئی۔ عصمت پاشا پھر وزیر اعظم ہوگیا اب کی بار حکومت نے اُسے مخصوص اور وسیع فوجی اور عدالتی اختیارات عطا کئے ہوئے اس مدت قلیل کے جب مصطفےٰ کمال صدر تھا اور کیبنٹ مخالفین کی تھی ہمیشہ اس نے ڈکٹیٹری کی طرح حکومت کی ہے وہ آج بھی ترکی کا عزیز و محبوب لیڈر ہے قوم نے چار بار مسلسل اسے اسمبلی کا صدر منتخب کیا ہے آخری انتخاب ماہ مئی ۱۹۳۱ء کو عمل میں آیا۔

منزلی زندگی

کمال ابھی بچہ ہی تھا کہ علی رضا اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی شکل و صورت بھی اُسے یاد نہ تھی البتہ ماں نے جو حلیہ بیان کیا تھا وہ اس کے دل پر نقش ہوگیا۔ مشرقی ممالک میں یہ بات ضرب المثل ہوگئی ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ ترکوں میں بھی والدین خصوصاً ماں کی تعظیم و احترام کا جذبہ شدت کے ساتھ موجود ہے۔ کمال کا بھی یہی حال تھا بچپن میں ماں کے اشاروں پر چلنا وہ اپنی سعادت سمجھتا تھا اگرچہ ملکی اور سیاسی فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں جن کا تذکرہ گزشتہ ابواب میں آچکا ہے اُسے ماں کا ساتھ بہت جلد چھوڑ دینا پڑا تھا تاہم ماں سے اس کی والہانہ محبت کسی طرح کم نہ ہوسکی اسے وہ وقت یاد تھا اور اسی طرح یاد تھا جب مصائب و آلام کی ساری سختیاں جھیل کر بھی ماں اس کی تربیت و تعلیم کے لئے ہر امکانی کوشش کرتی تھی۔ کمال کی ماں کا حال پھر ہم اس وقت پڑھتے ہیں جب اس کا سن ستر سال کو پہنچ چکا ہے اور وہ اس کبرسنی میں انگورہ کا سفر کرکے اپنے عزیز بیٹے اور ملک کے محبوب و مقتدر لیڈر سے ملنے جارہی ہے۔ کمال اگرچہ اس وقت ترکی کا سب سے جلیل القدر شخص اور ملک کی تقدیر کا مالک تھا لیکن ماں کی نظروں میں ابھی وہ وہی صغیر السن بچہ تھا جو ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے کارناموں پر ماں نے شاد باش کہا اور اس کے حق میں دعائے خیر کی اور پھر غلطیوں پر ٹوکا اور سختی سے ڈانٹا۔ کمال نے سعادتمندانہ اور نیازمندانہ ماں کی ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کردیا۔

مصطفےٰ کمال اگرچہ ماں کا پرستار تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ کسی دوسری عورت کے لئے اپنے دل میں جگہ نہ پیدا کرسکا اور یہ شاید اس کے لئے بہتر بھی ہوا۔ اسکولی زندگی میں جب اسکے ساتھیوں کی ساری دلچسپیوں کا مرکز تھیٹر اور حسین لڑکیاں تھیں وہ اپنا سارا وقت انقلاب فرانس کے مطالعہ میں صرف کرتا یا روسو کے مقالات پڑھا کرتا جو اسنے جمہوریت کی حمایت میں لکھے تھے ایک مرتبہ اپنے ایک فوجی دوست سے دوران گفتگو میں اس نے کہا کہ تم لوگ عورتوں کے پیچھے اپنا وقت خراب کرتے ہو لیکن میں اپنے گھوڑوں میں زیادہ کشش اور جاذبیت پاتا ہوں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال اپنی توجہ اور دلچسپیوں کا مرکز کسی خاتون کو

اسی عہد میں بنا لینا جس عہد میں عموماً لوگ ایسا کیا کرتے ہیں تو یقیناً آج ترکی کی تاریخ دوسرے الفاظ میں لکھی جاتی۔ عجیب تر یہ کہ کمال کے گرد ایسی خواتین موجود تھیں جو اس سے محبت کرتی تھیں۔ اُسے پوجتی تھیں اور اس کے لئے مٹ جانے کی آرزو رکھتی تھیں۔ مصطفےٰ کمال بالآخر صرف فخری خانم اور لطیفی خانم کی طرف توجہ کر سکا لیکن شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ کمال "کار دبار محبت" میں فیروزمند ثابت ہو سکا

فخری خانم کے عشق و محبت کا حسرتناک انجام

۱۹۱۶ء میں کمال کی صحت خراب ہو گئی تھی اور ڈاکٹر عدنان نے کہہ دیا تھا کہ اگر پوری توجہ اور التفات کے ساتھ تیمارداری نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ بیماری جڑ نہ پکڑ لے۔ کمال کو اس نے مشورہ دیا کہ آپ کسی خاتون کی خدمت بطور نرس کے حاصل کریں۔ فخری خانم لے جو صدمی الافادی مرحوم کی زبان میں کمال کی حسین و جمیل بنتِ عم تھی اپنی خدمات پیش کیں اور اس کے پاس فوراً پہنچ گئی ڈاکٹر عدنان کے الفاظ میں "وہ حسن تربیت" کا مجسمہ اور نہایت اداشناس تھی۔ صحت بہت اچھی نہیں تھی لیکن باعتبار حسن و جمال عالم بالا کی ایک مخلوق معلوم ہوتی تھی"۔ اسے دیکھ کر خالدہ ادیب خانم کو گمان ہوا کہ شاید وہ ان کی کوئی گمنام بہن ہے لیکن خاتون محترم کو اس کی کوئی یقینی شہادت نہ مل سکی۔ شدہ شدہ فخری خانم نے کمال کے ساتھ ایک شدید قسم کا تعلق خاطر پیدا کر لیا بہت سے لوگوں نے اس سے شادی کی درخواست کی لیکن کمال کی امید پر اس نے سب مسترد کر دیں۔ کمال کو اپنا بنانے کے لئے اس نے ہر امکانی کوشش کی اس آرزو میں بعض مرتبہ اس نے ایسے اہم فرائض بھی اپنے سر لے لئے جو اس کے ذہن و دماغ کی دسترس سے قطعاً باہر تھے لیکن جو بات وہ چاہتی تھی وہ کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

کمال اُسے پسند ضرور کرتا تھا اور کبھی کبھی اس سے محبت بھی کرنے لگتا لیکن غریب فخری خانم کی نادرستی صحت تکمیل آرزو کی راہ میں حائل ہو جاتی اور اس طرح وہ کبھی شادی نہ کر سکی لیکن وہ مایوس نہ ہوتی تھی اس نے اپنی دنیا کو ہمیشہ اپنی رعنائی تصور سے آراستہ رکھا اسکا یقین نہیں ایمان تھا کہ مصطفےٰ کسی نہ کسی روز ضرور اس کا اور صرف اس کا ہوگا۔ اسی اثنا میں اُسے خیال ہوا کہ یورپ کی کسی صحتگاہ میں جانے اور وہاں سے صحیح و سالم ہو کر لوٹنے لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ تقدیر فریب دے رہی ہے۔ چنانچہ وہ میونک پہنچی یہ آرزو لے کر کہ شفایاب ہوتے ہی کمال سے شادی کرے گی لیکن اس کے دل و دماغ پر بجلی گر پڑی جب میونک میں مصطفےٰ کمال اور لطیفی خانم کی شادی کی خبر شائع ہوئی۔ دنیا اس کی آنکھوں میں اب صرف مایوسیوں کا ظلمتکدہ تھی۔ میونک میں اس کا صرف ایک مشغلہ رہ گیا تھا اس بے کیفی اور بے خودی کے عالم میں اپنی ناکام محبت کی داستان لوگوں کو سنایا کرتی تھی لیکن دنیا نے اُسے چھوڑ دیا اہالیان میونک یہ جان کر کہ اس کا مستقبل بالکل تاریک ہے اس سے بے اعتنائی برتنے لگے۔ چنانچہ میونک چھوڑ کر وہ انگورہ چلی آئی اس کے بعد اس کا کیا حشر ہوا ۱۹۲۳ء کا ایک کیونیک یوں لکھتا ہے "ایک عورت پاشا سے ملنا چاہتی تھی لیکن جب اسے ملاقات کی اجازت نہ مل سکی تو پاشا کے مکان کے قریب ہی گولی مار کر اپنی زندگی ختم کر لی وہ پاشا کی ایک عزیزہ تھی اس کا نام فخری خانم تھا"۔

شادی

لیکن لطیفی خانم "کاروبار دلداری" میں زیادہ کامیاب رہی وہ سمرنا کے ایک دولتمند تاجر کی لڑکی تھی اور خالدہ ادیب خانم سے اُسے شرف تلمذ حاصل تھا اپنی فاضل معلمہ و ادیبہ کی طرح اس کا یقین تھا کہ ملک کا مستقبل اس وقت تک تاریک و ناکام رہے گا جب تک عورتوں میں تعلیم عام نہ ہو جائے اور مجلسی زندگی میں وہ مردوں کے دوش بدوش نہ ہو جائیں وہ خود عرصہ تک پیرو تسالز پیرس میں رہ کر آزادانہ تعلیم حاصل کر چکی تھی۔ جرمن۔ فرنچ اور انگریزی زبان روانی سے بول لیتی تھی اور ترکی ادب کی زبردست عالمہ تھی ابھی فرانس میں وہ قانون پڑھ رہی تھی کہ یکبارگی وہ اسے سمرنا آنا پڑا۔ اس وقت سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ تھا لیکن قریب تھا کہ کمال فاتحانہ شہر میں داخل ہو۔ لیکن سمرنا میں اسے چین نہ حاصل ہو سکا یونانیوں نے اُسے کمال کی جاسوس سمجھ کر ستانا شروع کیا اس کی نقل و حرکت کی پوری دیکھ بھال کی جانے لگی۔ اس کی کوٹھی کے گرد افسر تعینات کر دئے گئے جو لطیفی کو اپنے کسی مہمان یا دوست سے ملنے نہیں دیتے تھے گرفتاری کی بھی دھمکی دی گئی بعض لوگوں نے سمرنا چھوڑ دینے کا مشورہ دیا لیکن وہ خوفزدہ نہ تھی اپنی وسیع اور عالیشان کوٹھی میں تنہا رہتی تھی ملازم البتہ کچھ موجود رہتے تھے۔ ان ساری سختیوں کے باوجود وہ علانیہ طور پر ترکی اور باشندگان ترکی سے اپنی شدید محبت و ہمدردی کا اظہار کرتی رہی تھی۔ کمال سے شیفتگی اُسے پہلے ہی سے تھی اب وہ بیچینی اور وارفتگی کے ساتھ سمرنا میں اُس کے فاتحانہ اقدام کا انتظار کرنے لگی۔ ارادہ کر چکی تھی کہ جب مصطفےٰ کمال شہر میں داخل ہوگا تو بطور مہمان اسے اپنے یہاں مدعو کرے گی طویل مسافتوں اور صبر آزما لڑائیوں کے بعد جب کمال شہر میں داخل ہوا تو لطیفی خانم پیرس کے ایک خوشنما گاؤن میں ملبوس جس کے اوپر ایک برقع پڑا ہوا تھا لیکن چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ مجسمہ نسوانیت اور پیکر نیاز بنی ہوئی اسے خوش آمدید کہہ رہی تھی اور میزبانی کی سعادت حاصل کرنا چاہتی تھی مصطفےٰ کمال نے اول اول لطیفی کی اس جرأت کو گستاخی سے تعبیر کیا لیکن جب سارے حالات سن لئے تو بخوشی اس کا مہمان بننے پر رضامند ہوگیا لطیفی خانم کی صحبت میں وہ بہت محظوظ ہوا اس نے اپنی آئندہ اسکیم اور پروگرام پر تفصیلی بحث کی، لطیفی کی رواں اور برجستہ گفتگو اور ذہانت و فطانت دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ ترکی میں وہ بہت کم ایسی عورتوں سے مل سکا تھا جو وسعت خیال اور وقت نظر کے اعتبار سے لطیفی کی ہم پایہ ہوں تعلیم نسواں کا وہ خود بھی زبردست حامی تھا اور چاہتا تھا کہ معاشرت کے ہر گوشہ میں عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کر دے۔ لطیفی نے آخر میں یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ مجھے اپنا سکریٹری بنالیں میں غیر زبانوں کے مکالمے اور مکتوبات آپ کے لئے ترجمہ کیا کروں گی۔ کمال نے منظور کر لیا اور چار روز تک برابر وقت کے مہمات مسائل پر جو فتح سمرنا کے بعد دفعتہً پیدا ہو گئے تھے دونوں تبادلۂ خیالات کرتے رہے لیکن بہت جلد ان کا موضوع گفتگو مہمات کے بجائے شخصیات اور ذاتیات ہوگیا اور آخر میں ان کی ساری دلچسپیوں اور گفتگو کا مرکز انھیں دونوں کی ذات رہ گئی کمال کی بڑھتی ہوئی شیفتگی اور التفات دیکھ کر لطیفی کچھ بدگمان ہو گئی اس نے نہایت صفائی اور جرأت سے کہدیا کہ میں خود کو آپ سے وابستہ نہیں کر سکتی تاآنکہ باقاعدہ ہمارا آپ کا عقد نہ ہو جائے۔ کمال ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ کچھ بددل ہو کر واپس چلا گیا اور چار مہینے تک نہ تو اس سے ملاقات کی اور نہ کوئی خط لکھا لطیفی خانم کو بھی یقین سا ہو گیا کہ یہ افسانہ ختم ہو چکا اور وہ پیرس جا کر قانون کا دوبارہ

مطالعہ کرنے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ لیکن کمال نکا یک اس کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں تم سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں مگر شرط یہ ہے کہ ابھی ہو جائے۔ شادی ہو گئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ معمولی واقعات جو معمولی آدمیوں کی ذات سے متعلق ہوتے ہیں اپنے اندر کوئی دلچسپی اور کشش نہیں رکھتے لیکن وہی واقعات جب بڑے آدمیوں کی ذات سے رونما ہوتے ہیں تو ان میں خاص اہمیت وزن اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک روایت ہے کہ اس گفتگو کے بعد دوسرے روز ہی مصطفےٰ اور لطیفی دونوں گھر سے باہر نکلے راستہ میں پہلا امام جو انھیں مل سکا روک لیا گیا اور اُس سے نکاح پڑھانے کی خواہش ظاہر کی گئی۔ غریب امام پہلے تو اس عجیب درخواست کا مطلب نہ سمجھ سکا لیکن کمال نے جب اپنی شخصیت کی وضاحت کی تو امام نے نکاح کے مخصوص فقرات کہے اور لطیفی خانم نے ان کے جواب میں "ہاں" کہا کیا تم بعوض اس قدر چاندی کے خود کو مصطفےٰ کمال کی زوجیت میں دیتی ہو؟" جواب اثبات میں تھا اور شادی ہو گئی۔ اور دوسری روایت یوں ہے کہ فتح سمرنا کے بعد لطیفی خانم کا باپ فتح کی خوشی میں ایک جشن کا اہتمام کر رہا تھا دوست احباب مدعو تھے کہ مصطفےٰ کمال بھی پہنچا اور لطیفی خانم سے شادی کا پیغام دیا چنانچہ یہ جشن فتح، جشن عروسی میں منتقل ہو گیا ایک مفتی صاحب بلائے گئے اور اُنھوں نے نکاح پڑھا دیا۔

شادی کا انجام

ترکوں میں ایک عجیب رسم یہ تھی کہ شادی کے موقعوں پر دولہا کے بجائے کسی اور شخص کو پیش کر دیا کرتے تھے لیکن یہ اپنی قسم کی پہلی مثال تھی جس میں دولہا اور دلہن دونوں موجود تھے۔ اس شادی سے ایک مثال اور بھی قائم ہو گئی۔ مصطفےٰ کمال نے اپنی طرف سے جب لوگوں کو مدعو کیا تو مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی دعوتی رقعات بھیجے گئے اور دعوت میں عورتیں بھی شریک ہوئیں مغرب کی نماز کے بعد لطیفی خانم نے اپنا معمول بنا لیا کہ حکومت کی جانب سے جو اجتماع بھی ہوگا مصطفےٰ کمال کے ساتھ اس میں وہ بھی شریک ہو گی یہاں تک کہ جب کمال فوجی معائنہ کے لئے نکلتا تو وہ بھی اس کے پہلو بہ پہلو سوار ہو کر جاتی اس شادی سے مصطفےٰ کمال کی سیرت میں بہت کچھ تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ اصلاح معاشرت کے سلسلے میں لطیفی خانم کے مشورے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوئے لیکن مثالانہ زندگی کی شادمانیاں عرصہ تک قائم نہ رہ سکیں ایک ہی سال کے بعد کمال کی سپاہیانہ فطرت اور لطیفی خانم کی نازک اور لطیف طبیعت کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگے اور ایک روز جب لطیفی خانم اپنے والدین سے ملنے جا رہی تھی تو حکومت کے تمام اراکین اُسے رخصت کرنے کے لئے گئے اور پھولوں کے تحائف پیش کئے لیکن کمال موجود نہ تھا چہ میگوئیاں ہونے لگیں لیکن دل کی بات زبان پر نہ آئی۔ یہ اچھا ہوا کہ کمال یا لطیفی کو حصول طلاق کی خاطر عدالتی چارہ جوئی نہیں کرنی پڑی۔ جمہوریہ ترکیہ کا صدر ہونے کی حیثیت سے طلاقوں کی منظوری نامنظوری اس کے اختیار میں تھی چنانچہ ایک طلاق اس نے اپنے حق میں منظور کیا لطیفی کی عمر اس وقت پچیس سال کی تھی۔ لوگوں نے بہت کوششیں کیں کہ اس علیحدگی کے اسباب وعلل دریافت کریں لیکن مصطفےٰ کمال اور لطیفی خانم دونوں میں سے کسی نے بھی اصل حالات پر روشنی نہیں ڈالی۔ قیاس آرائیاں بہت کچھ کی گئی ہیں لیکن حقیقت اور اصلیت کا پتہ ان میں سے کسی کو دینا نہایت ہی دشوار امر ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے یہ طلاق وقوع پذیر ہوئی۔ اس میں کا

کہ تمام مشرقی ممالک میں اولاد خصوصاً اولاد نرینہ کی آرزو بہت زیادہ پائی جاتی ہے لیکن یہ حقیقت کہ کمال نے پھر شادی نہیں کی اور یہ کہ آج تک اس نے صرف لڑکیوں کو متبنی کیا ہے اس خیال کے قطعاً منافی ہے۔ بعض اصحاب کی رائے واختراع کہنا زیادہ مناسب ہوگا ہے کہ لطیفہ خانم کا سیاسیات میں ضرورت سے زیادہ دخل دینا ان طلاق کا باعث ہوا۔ ایک فرنچ ویکلی میں لطیفہ خانم اور مسولینی کے ایک نمائندے کی گفتگو شائع ہوئی تھی۔ لطیفہ خانم نے نمائندہ مذکورہ سے دریافت کیا کہ آپ کے ملک میں عورتوں کی ترقی کی عام رفتار کیا ہے اس نے جواب دیا کہ اٹلی کی عورتیں ترقی یافتہ نہیں کہی جاسکتیں ان کا سب سے بڑا فرض اب بھی یہی ہے کہ وہ خانگی زندگی میں مردوں کی راحت و آسائش بہم پہنچائیں اور خوبصورت اور تندرست بچے پیدا کریں۔ یہ جواب سن کر لطیفہ خانم ترش ہو گئی اور کہا کہ اس مدت مدید کے بعد بھی ہر جگہ عورتوں کا وہی حال ہے ترکی سیاست سے ہاتھ اٹھا لینے کے بعد لطیفہ خانم نے چاہا کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں جا کر لکچر دے لیکن مصطفیٰ کمال نے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے لکچروں میں سیاست ترکی پر ناواجب کر یگی اسے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا البتہ اس کے ساتھ اتنی رعایت کی گئی کہ خاموشی اور سکون کے ساتھ جہاں چاہے سفر کر سکتی ہے اور جی چاہے تو قسطنطنیہ میں بھی رہ سکتی ہے کمال نے اس کے بعد خانم کو پانچ ہزار پونڈ عطا کئے غرض جس شادی سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں اس کا انجام یوں ہوا۔

مصطفیٰ کے معمولات زندگی

کمال جس مکان میں رہتا ہے وہ ایک سادہ اور خوشنما عمارت ہے جو ایک باغ کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ اس کی تمام دلچسپیوں کا مرکز اس کا ذاتی اصطبل ہے جس میں بہترین عربی اور انگریزی گھوڑے ہیں۔ نفسانیات زندگی سے وہ بے پرواہ ہے اچھی کتابیں تازہ ہوا اور کچھ موسیقی اس کی ضروریات زندگی ہیں۔ وہ بہت محنتی واقع ہوا ہے لیکن اپنے معمولات پر ہمیشہ سختی سے پابند نہیں رہتا ہمیشہ صبح کو دیر میں اٹھتا ہے کچھ لوگ اس پر عیش پرستی اور نفس پرستی کا الزام رکھتے ہیں لیکن آج تک اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت نہ مل سکا کہ وہ رات کو اپنے کلب سے بہت دیر میں لوٹتا ہے۔ اس نے ایسی چھ یتیم لڑکیوں کو متبنے کر رکھا ہے جن کے باپ مختلف لڑائیوں میں مارے گئے تھے یہ لڑکیاں باغ میں اکثر کھیل کود میں مشغول دکھائی دیتی ہیں ان میں سے ایک لڑکی کی شادی ایک نوجوان افسر سے کردی گئی ہے شادی کے موقع پر کمال بھی لڑکی کے ساتھ رقص میں شریک تھا اور ایک دلیر فوٹو گرافر نے اس بہانے کا ایک فوٹو بھی لے لیا۔ وہ پوکر کھیلنے کا بہت شوقین ہے اور یہ دلچسپی اکثر اسے راتوں کو دیر تک مشغول رکھتی ہے کھانے کے دوران میں موسیقی سے ضرور لطف اندوز ہوتا ہے اور کھانوں ہی کی طرح موسیقی میں بھی ایشائی اور یورپی دونوں نغمے ہوتے ہیں۔ ترکوں کی شخصی اور انفرادی آزادی کو اہمیت دینے کے لئے وہ رقص کی محفلوں میں بھی حصہ لیتا ہے۔

قدیم بابل کے راستے اثری تحقیقات کے سلسلہ میں (بنو خذ نصر) کے زمانہ کی ایک پختہ اینٹ ملی ہے جس پر یہ عبارت نقش ہے "وہ سڑکیں جو پختہ اینٹ سے تیار کی جاتی ہیں اور تارکول کے ذریعہ ہموار کی جاتی ہیں بہت مضبوط اور دیرپا ہوتی ہیں" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سڑکوں کے سلسلہ میں تارکول وغیرہ کا استعمال زمانہ قدیم میں بھی رائج تھا۔

باپ کا خون

(از جناب مولانا ماہر القادری صاحب)

ظفر نے بی۔اے کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہی، قیامت سر پر اٹھا لی ہر وقت ولایت کا تذکرہ، لندن کی تمنا، یورپ کے لئے اصرار۔ ظفر کے والد شیخ عطاء الحق ایک تو خالص مشرقی مسلمان تھے، اس لئے بیٹے کو اُس سرزمین میں بھیجتے ہوئے ڈرتے تھے جہاں نصرانیت "شجر خبیث" شاید گستر ہے۔ دوسرے ظفر اُن کا کلیجا تھا، ظفر کی ماں بیٹے کو تین مہینہ کا چھوڑ کر دنیا سے سدھار گئی تھیں، شیخ صاحب نے ظفر کی پرورش میں ماں اور باپ دونوں کے فرائض ایک ساتھ ادا کئے، لہٰذا ایسے محبوب بیٹے کی جدائی کا تصور اُن کو کپکپا دیتا تھا جسے برسوں انھوں نے چھاتی پر سلایا اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ بیٹے کے آرام کی خاطر شیخ جی پٹی کے سہارے سکڑے پڑے رہے۔ کوئی شک نہیں کہ ہر باپ کو اپنے بیٹے سے محبت ہوتی ہے، لیکن شیخ جی کو ظفر سے محبت نہیں "عشق" تھا، ظفر اُن کی کائنات تھا، اُن کا سرمایہ تھا اُن کی تمناؤں کا خلاصہ اور اُن کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھا۔

ظفر پر لندن جانے کا بھوت سوار تھا، اس عرصہ میں اُس کو دو تین اچھی نوکریوں کے مواقع بھی ملے، مگر اُس نے اُن سب کو ٹھکرا دیا، یورپ کی سیر و تفریح کا تصور اُس کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا، وہ یورپ کے اخبار پڑھتا اور ایک ایک خبر اور ایک ایک پارٹی کی تفصیل پر "آہ" "اور کاش" کہتا۔ ظفر کے باپ اپنے چچا زاد بھائی اور ظفر کے چھوٹے ماموں سے ہر کام میں مشورہ لیتے تھے اور ان دونوں کی مرضی کے بغیر تنکا بھی نہ توڑتے تھے، ظفر نے ان دونوں کو شیشہ میں اتار لیا۔ ظفر کے چچا اور ماموں نے شیخ جی کو جیسے تیسے راضی کر لیا۔ شیخ جی کو بتایا گیا کہ ظفر کو ہندوستان آتے ہی کوئی بڑی نوکری مل جائے گی۔ حکومت میں اُس کی قدر ہوگی دو سال میں ایک مرتبہ ظفر وطن آیا کرے گا۔ شیخ جی نے بیٹے کے ولایت بھیجنے کی "ہامی" تو بھری، مگر اُن کا محبت بھرا دل جدائی کے تصور سے نڈھال ہوا جا رہا تھا اور جب ظفر کا جہاز ساحل بمبئی سے روانہ ہوا ہے تو شیخ جی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سچ مچ کوئی اُن کے سینے کو چیر کر دل نکال لے گیا، اُن کی سپید اور نورانی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی، انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:-

"ظفر! فی امان اللہ! خدا کے لئے جلد آنا"

ظفر پر بھی باپ کی جدائی کا اثر ہوا، اور اُس کی پلکیں بھی باپ کی حالت دیکھ کر نم آلود ہو گئیں مگر اُس کی پلکوں کی نمناکی دیرپا نہ تھی، لنچ کے وقت جب وہ حسین چھوکریوں کے جھرمٹ میں کھانا کھا رہا تھا تو اُس کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما رہا تھا اور پیشانی خوشی سے چمک رہی تھی۔ جہاز کی دلچسپیوں نے ظفر کو "نیم مغرب زدہ"، ساحلِ فرنگ پر قدم رکھنے سے قبل ہی بنا دیا۔ ظفر جب لندن پہنچا ہے تو وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی خوش قسمتی اُسے جنت میں لے آئی۔

ہندوستانی طلباء کے لئے سب سے آسان بیرسٹری کا امتحان ہے، ظفر نے بھی اسی امتحان کے لئے تیاری شروع کر دی۔

لندن کی دلچسپیوں سے شروع شروع میں تو وہ بچتا رہا اور زیادہ وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا رہا لیکن فرنگی احباب نے اُسے رفتہ رفتہ اُن دلچسپیوں میں حصہ لینے کے لئے اُبھارا، جو انگریزی معاشرت کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ شیخ صاحب کی تربیت اور شفقانہ نگرانی نے ظفر کے کردار کو چاندی سے زیادہ اُجالا اور گلاب کی پتی سے زیادہ معصوم بنا دیا تھا، مگر ظفر کے پہلو میں حساس دل تھا کوئی شیشہ کا ٹکڑا نہ تھا اُس کے خون میں جوانی کی گرمی تھی، اُس کے جذبات آتش فشاں مادہ سے زیادہ گرم اور ہیجان انگیز تھے اور اُس کے دلوں کا آفتاب، بام شباب سے تیزی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔ لندن کے حسین نظارے، خدا کی پناہ! زاہد صد سالہ کے دامن ارتقا کی دھجیاں ہو جائیں۔ ظفر تو بھولا بھالا نوجوان تھا، اُس کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

ظفر کو پہلی مرتبہ ایک عظیم الشان عمارت میں لیجایا گیا، جس کا اندرونی حصہ تمام کا تمام شیشہ کا بنا ہوا تھا، دیواریں، چھت، فرش، حوض، فوارے، گلدان، کرسیاں، میزیں، سب کے سب شیشہ کے! ظفر اور اُس کی پارٹی حوض کے قریب پہنچی ہی تھی کہ چھت کو جنبش سی ہوئی اور چند خوبصورت نیم برہنہ لڑکیاں حوض میں "چھم" سے کود پڑیں، لڑکیوں کے پانی میں کودتے ہی حوض کا پانی سُرخ ہو گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد گہرا سبز! اسی طرح بہت سے رنگ بدلتے رہے، ظفر نے کئی مرتبہ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملا اور حیرت و مسرت کے ساتھ اس طلسمی نظارہ کو دیکھتا رہا۔ لڑکیوں نے چہلیں شروع کیں، ایک دوسرے پر پانی اُچھالا، بلوریں پنڈلیوں اور عُریاں سینوں کا مظاہرہ کیا، اُس کے بعد تماشائیوں کو چھیڑا! ظفر پر اس منظر کا بیحد اثر ہوا، اور وہ جب اس طلسمی قصر سے واپس ہوا ہے تو اُس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ تو ایک رنگینی کی اجمالی تفصیل ہے، لندن کی سرزمین تو ایسے مناظر کو پیش کرتی ہے جن کو دیکھ کر جذبۂ غیرت کو پسینہ آجاتا ہے اور انسانیت کی نگاہ شرم سے جھک جاتی ہے۔ تھیٹر، سینما ہال، مدرسے، دفاتر، عبادت گاہیں، عورتوں سے بھری ہوئیں، اور کیسی عورتیں، شوخ، چنچل، پارے سے زیادہ بیقرار اور تتلی سے زیادہ آوارہ تھیں۔ قدم قدم پر رنگینیوں کے جھرمٹ اور ہر موڑ پر دلچسپیوں کی نامحدود دنیا۔ ایک دو منظر ہوں تو آدمی احتیاط برت سکتا ہے وہاں تو ہر ذرہ معصیت کی دعوت دیتا ہے اور ہر پھول کی پتی رنگینیوں میں ڈوب جانے کے لئے اشارہ کرتی ہے۔ ظفر نے ابتدا میں ان نظاروں سے بچنے کی کوشش کی اور اپنے احباب سے صاف صاف کہہ دیا کہ ایسی شوخ اور بیہودہ باتیں اُسے پسند نہیں ہیں اور ایسی ناروا حرکات کو وہ غیرت و خودداری کے خلاف سمجھتا ہے۔ مگر احباب نے اُس کو گمراہ کرنے کے لئے مہینوں تک اس بات کی تبلیغ کی، کہ "یہ تمام باتیں تہذیب میں داخل ہو چکی ہیں، اور تمدن ان کو قبول کر چکا ہے، گناہ وہ ہے، جسے سوسائٹی ناپسند کرتی ہے، جس چیز کو سوسائٹی قبول کر لیتی ہے اُس پر گناہ کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ خوش فعلی اور تفریح انسان کا فطری حق ہے، کوئی قانون انسان سے اس حق کو نہیں چھین سکتا، دنیا صرف عیش و عشرت کا نام ہے، کھاؤ، پیو، مزے اُڑاؤ اور چلے جاؤ۔ ہندوستان ایک نیم وحشی ملک ہے، اوہام و قدامت میں اُس کا بند بند جکڑا ہوا ہے، وہاں کی تہذیب نامکمل اور تمدن اُس ان گھڑ پتھر کی طرح ہے، جسے بُت تراش کے تیشے نے چھوا بھی نہ ہو"، ظفر کے کانوں میں جب یہ باتیں پہلی مرتبہ پڑیں، تو اُس کی پیشانی کی لکیریں بے ترتیب سی ہو گئیں، اور وہ بڑی اُلجھن محسوس کرنے لگا، لیکن رفتہ رفتہ ہر بات گوارا ہوتی گئی

مغربی تہذیب کا جادو اثر کرتا چلا گیا۔ باپ کی تربیت کا اثر تھا کہ ظفر نے ان رنگینیوں اور دلکشیوں میں بھی اپنے کردار کی بہت کچھ حفاظت کی لیکن شبنم سے بھری ہوئی ننھی پتلی کے رنگین پروں کو کسی نہ کسی حد تک غم آلود ہونا ہی پڑتا ہے، اور کاجل کی کوٹھری سے جب کوئی محتاط سے محتاط شخص نکلتا ہے تو اُس کے لباس پر دھوئیں کے ہلکے سے نقوش نمایاں ہو ہی جاتے ہیں۔

باپ کے خط پر خط آ رہے تھے، مگر ظفر لندن سے ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد بھی وہ لندن میں ٹھہرا رہا۔ بات یہ تھی کہ اُس کی قسمت میں چکر تھا اور کاتب تقدیر کے لکھے کو بہرحال پورا ہونا تھا۔ ہندوستان کی واپسی سے دو ماہ قبل، ایک لڑکی سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس لڑکی کی عمر پچیس سال سے کچھ اوپر ہو گی، ناک نقشہ معمولی تھا، البتہ شوخیوں میں وہ کٹ پتلی سے زیادہ چنچل تھی، اور لباس اور آرائش حسن کے رکھ رکھاؤ میں غیر معمولی دلچسپی لیتی تھی۔ اس لڑکی کا باپ دھوبی کا پیشہ کرتا تھا۔ اور اُس کا بھائی دن بھر جلی ہوئی سگریٹیں اُٹھاتا پھرتا تھا۔ لڑکی نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا، اُس نے خوشنما گلکدے میں ظفر کے بالوں کو اپنی صبیح انگلیوں سے سُلجھاتے ہوئے کہا۔

"ظفر! تم کتنے حسین ہو"

اس جملے نے ظفر پر جادو کا کام کیا، اُس کی آنکھوں کے ڈورے فرطِ مسرت سے سُرخ ہو گئے، اور بال سلجھانے والی انگلیوں کو بے تاب ہو کر چوم لیا۔ محبت کی پینگ بڑھتی رہی، اور آخر کار دونوں مناکحت کے لئے رضامند ہو گئے، اگر ہندوستان کے کسی دھوبی یا رنگریز کی لڑکی سے ظفر کا رشتہ قرار پاتا، تو ظفر شاید خودکشی پر آمادہ ہو جاتا، اور اس رشتہ کو قبول نہ کرتا۔ مگر یہ لندن کے دھوبی کی لڑکی تھی، اور پھر اُسے یقین دلایا گیا تھا کہ "انٹونیا" پاک دامن شریف اور باوفا ہے۔ ظفر کی سادگی دیکھئے کہ اُس نے یقین بھی کر لیا حالانکہ لندن میں وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ لندن میں عصمت کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اور یہ شیشہ کتنی آسانی اور بے پروائی کے ساتھ چور چور ہو جایا کرتا ہے؛ مگر جھوٹی محبت نے اُس کی آنکھوں پر غفلت کے پردے ڈال دئے، وہ شادی کر کے اُس آتشکدہ میں کود گیا جہاں انگاروں پر پھولوں کا دھوکا ہوتا ہے جہاں کائی کی ہلکی سی تہ کے نیچے تباہیوں کا سمندر چھپا ہوتا ہے

شادی ہوئی اور "بین الاقوامی" شادی ہوئی، مہذب شادی، متمدن نکاح! ایسی شادی جو شوہر اور بیوی کے مذہب پر کوئی اثر نہ ڈالتی ہو، دو ہزار پاؤنڈ کا مہر قرار پایا۔ کچھ دن شہر سے باہر "شب ہائے عسل" گذریں، اُس کے بعد ظفر اپنی چہیتی بیوی کو لے کر ہندوستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ سفر بہت لطف سے کٹا، ظفر سمجھ رہا تھا کہ وہ بیش بہا خزانہ لے کر ہندوستان جا رہا ہے، وہ شدید فریب میں مبتلا تھا، کیونکہ اس خزانہ کا ہر سکہ کھوٹا تھا اور جس چیز کو وہ خالص سونا سمجھ رہا تھا اُس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا، جسے چند دن میں اُتر جانا چاہئے تھا۔

ساحلِ ہند پہ بیٹے کے استقبال کے لئے شیخ صاحب عزیزوں کی ایک جماعت کو لے کر موجود تھے۔ جہاز ساحل پر آ کر رکا۔ ظفر اپنی بیوی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے اُترا، باپ نے بیٹے کی پیشانی کو بوسہ دیا؛ شفقت پدری آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکی بیٹے نے بھی سر جھکا دیا۔ عزیزوں نے پھولوں کے ہار پہنائے۔ یہ سب کچھ چند منٹ میں ہو گیا، مگر ایک انگریز عورت کو ظفر کے

دیکھ کر سب لوگ کانا پھوسی کرنے لگے۔ ظفر کے چھوٹے ماموں ظفر سے بے تکلف تھے، انہوں نے ظفر سے عورت کے متعلق استفسار
کیا، ظفر نے مسکرا کر جواب دیا:۔

"یہ میری بیوی ہے!"

اس جواب کو سن کر تمام عزیز مبہوت ہو کر رہ گئے۔ شیخ صاحب پر تو اتنا اثر ہوا کہ وہ بیٹے اور بہو کو چھوڑ کر موٹر میں سوار ہوئے
اور مکان چل دیئے۔ گھر جا کر انہوں نے عورتوں کو یہ خبر سنائی۔ جس کو سن کر گھر میں اک کہرام سا مچ گیا۔ ظفر تھوڑی دیر بعد بیوی کو لئے
ہوئے مکان پہونچا۔ اس نے احتیاطاً بیوی کو موٹر میں چھوڑ دیا۔ گھر میں سب عورتوں نے اس کی بلائیں لیں۔ ظفر کی بڑی بہن
بھائی کا ہاتھ تھام کر بولی:۔

"ظفر! ابا جان نے ایک بری خبر سنائی تھی۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ظفر نے جھنجھلا کر کہا:۔

ہاں میں نے شادی کر لی ہے، کیا شادی کرنا گناہ ہے! لندن میں دوستوں نے سچ کہا تھا کہ ہندوستان وحشیوں
کا ملک ہے:"

ظفر کے جواب نے عورتوں کو خاموش کر دیا۔ ظفر نے ماما کو بیگم صاحبہ کے بلانے کے لئے اشارہ کیا، اس پر ظفر کی خالہ نے ماما کو روکا
اور کہا کہ خبردار اس کرشانی کو بلا کر نہ لانا۔ ہم اسے اپنے گھر میں قدم بھی نہ رکھنے دیں گے، ہمارے یہاں بھائی بہو بیٹیاں ہیں، اس
حرافہ کی تو پرچھائیں سے ان کو بچانا چاہئے۔

خالہ کی باتیں سن کر ظفر کا چہرہ غصہ سے لال بھبوکا بن گیا، اس نے چھڑی کو زور سے ہلا کر کہا:۔

"خالہ جان! میں تمہارا ادب کرتا ہوں، مگر تمہاری باتیں مجھے مجبور کر رہی ہیں کہ ادب کو بالائے طاق رکھ دوں
تم میری شریف بیوی کی توہین کرتی ہو۔ میں اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ تو میری خواہش ہے کہ تم لوگوں
کی اس سے ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ وہ خود وحشی عورتوں سے ملنا پسند نہیں کرتی"

یہ کہہ کر ظفر زنانی ڈیوڑھی سے باہر چلا گیا۔ گھر میں ہلچل پڑ گئی، ادھر ظفر کے باپ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ فرنگن کو
گھر میں قدم نہ رکھنے دوں گا۔ صورتِ حال کو دیکھ کر عزیزوں نے شیخ جی کو سمجھا بجھا کر راضی کیا کہ جو ہونا ہے ہو گیا ضد کرنے سے
کیا فائدہ؟ ظفر نوجوان ہے نہ معلوم غصہ میں آ کر کیا کر بیٹھے؟ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ایک آدھ ہفتے اسے اور اس کی بیوی
کو بالاخانہ پر رکھا جائے، اس عرصہ میں وہ اپنا کاروبار شروع کرے گا، اور شہر میں کوئی بنگلہ کرایہ پر لیلیا جائے گا۔

شیخ صاحب جب راضی ہو گئے، تو عورتیں بھی ظفر کی بیوی کے اندر آنے پر رضامند ہو گئیں۔ لوگوں نے کہہ سن کر ظفر
کے غصہ کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ ظفر کی بیوی جب پہلی مرتبہ زنانہ مکان میں آئی ہے۔ تو عورتیں اس کے مردانہ لباس کو دیکھ کر
چھپنے لگیں اور کئی عورتوں نے تو ڈھلکے ہوئے دوپٹے سے اچھی طرح سر کو چھپا لیا۔ ظفر نے عورتوں سے بیوی کا تعارف کرا دیا

ظفر کی بیوی نے مسکرا مسکرا کر سب سے مصافحہ کیا۔ تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ظفر ترجمانی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ عورتوں نے جو ظفر کی بیوی پر بعد میں تنقیدی فقرے کسے، وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں :۔

"بڑی خالہ! اس کے دیدوں کا تو پانی مر گیا شوہر کے سامنے اور کھلا ہوا سینہ! توبہ توبہ! مجھے تو پسینہ آگیا۔"

"چٹاخ پٹاخ باتیں! ہمارے یہاں کی تو کسبنیں بھی کچھ شرم کرتی ہیں۔"

"یہ بار بار ہونٹوں پر لال رنگ کی کیا چیز لگاتی تھی اور اس کی پنڈلیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔"

"ظفر کی بے شرمی تو دیکھئے بیوی کی ایک ایک ادا پر جان دیئے دیتا تھا۔"

"ہاں! ہمارے تو خاندان کو بٹہ لگ گیا۔"

دو ہفتہ تک بالا خانہ پر ظفر اور اس کی بیوی کا قیام رہا۔ اس عرصہ میں جو اس عورت کی بدولت گھر کی حالت رہی ہے، وہ ظفر کے خاندان میں برسوں تک کہانیوں میں بیان کی جاتی رہی۔ ایک دفعہ اس نے ظفر کی دیکھا دیکھی قورمہ میں ڈبل روٹی کا ٹکڑا ڈبو کر کھالیا۔ اب جو مرچیں لگیں، تو دیوانی کتیا کی طرح کمرے میں دوڑنے لگی، بہت سی مٹھائیاں کھائیں تو کہیں جاکر مرچوں کا اثر زائل ہوا۔ ایک بات ہو تو بیان کی جائے، اس عورت نے شیخ صاحب کی حویلی کو تماشہ گھر بنا دیا۔

دو ہفتہ کے بعد ظفر نے ایک بنگلہ کرایہ پر لے لیا اور وہاں منتقل ہونے کے بعد وکالت شروع کر دی۔ بنگلہ کا کرایہ، موٹر کا خرچ اور تین سو روپیہ ماہوار شیخ صاحب کو دینا پڑے۔ عزیزوں نے طے کر دیا کہ جب تک وکالت اچھی طرح نہ چل جائے شیخ صاحب ماہ بماہ مقررہ ماہوار دیتے رہیں۔ ظفر ذہین بھی تھا اور تقریر کی تو اسے بلا کی مشق تھی۔ ذہانت اور طلاقت لسانی کی بدولت چند ہی دن میں اس کی شہرت ہوگئی اور کام چل نکلا۔ فوجداری مقدمات اس کے پاس کثرت کے ساتھ آنے لگے۔ گاؤں والوں میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ :۔

"ظفر بیرسٹر صاحب ملزم کو پھانسی کے تختہ سے چھڑا سکتے ہیں۔"

چند دن تک تو ظفر کی بیوی، جسے ہم آئندہ "انٹونیا" کہیں گے، خاموش رہی اور ظفر کو اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ مگر ظفر کی وکالت کے چمکتے ہی اس نے پر پرزے نکالے۔ روزانہ ایک نہ ایک چیز کی فرمائش، نئے نئے لباسوں کی دھن، مکان کے سجانے کا خبط! ظفر کو انٹونیا سے محبت تھی، اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کی ہر فرمائش پوری کی، حالانکہ ہر مہینہ اسے کافی مقروض ہو جانا پڑتا۔

ایک سال میں ظفر بہت کچھ مقروض ہو گیا، اور ایک مرتبہ اس کی موٹر پر قرقی بھی آگئی، مگر انٹونیا کو نہ شوہر کی عزت کا پاس تھا اور نہ غریب کے بننے بگڑنے کا خیال! اسے تو نرم و نازک لباس، قیمتی انگوٹھیاں، اور بہترین آرائش چاہئے تھی۔ ظفر نے ان تمام باتوں کو برداشت کیا، لیکن انٹونیا کی بے عنوانیوں میں اضافہ ہوتا رہا! اب اس نے دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہفتہ میں کم سے کم ایک دن دوستوں کی دعوت ہوتی، پیانو بجتا، برج کھیلا جاتا، مزیدار گفتگو ہوتی، ظفر نے اس کو بھی برداشت

مگر انٹونیا انگلستان کی عورت تھی، جو عیش و تفریح کے تنوع کی پرستار تھی، اُس نے اب شہر کے بعض نوجوان عہدیداروں سے میل جول بڑھانا شروع کیا۔ اپنے یہاں اُن کو دعوت دیتی اور خود بھی اُن کے یہاں جاتی۔ ابتدا میں تو وہ ظفر کے ساتھ دعوتوں میں شرکت کرتی تھی، لیکن کچھ دن کے بعد اُس کو یہ شرکت و معیت بھی گوارا نہ ہوئی، اُس نے اب تنہا جانا شروع کردیا۔ اور پھر کہیں جانے کی کچھ حد ہوتی ہے، وہ شام کو جاتی اور دوسرے دن صبح کو اُس وقت واپس ہوتی، جب ظفر کچہری جانے کے لئے تیار ہوتا۔ ظفر نے ایک دن دبی زبان سے انٹونیا کو ٹوکا، تو اس پر وہ شیرنی کی طرح گرج کر بولی۔

"تم میری آزادی میں خلل نہیں ہوسکتے، میں تمہاری بیوی ہوں، کنیز نہیں ہوں"

انٹونیا آزادی کے ساتھ شہر کے حکام اور دولتمند نوجوانوں سے ملنے لگی، اسی عرصہ میں سوء اتفاق سے اسقاط حمل کا حادثہ پیش آگیا، ظفر نے انٹونیا کے علاج پر پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ ایک مہینہ میں اُسے افاقہ ہوگیا اور کچھ دن کے بعد انٹونیا بالکل اچھی ہوگئی، لیکن صحت پاتے ہی اُس نے ولایت جانے کا تقاضا کیا۔ ظفر نے بہت کہا سنا کہ میرا تو بال بال قرضہ میں بندھا ہوا ہے، علاج میں اور زیادہ قرضہ ہوگیا، اس لئے ایسی حالت میں ولایت کا سفر کسی طرح مناسب نہیں۔ مگر انٹونیا کہیں ماننے والی تھی، ہندوستان کی تفریحات سے اُس کا جی اکتا چکا تھا، لندن کی رنگین زندگی اُسے جلد سے جلد ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کررہی تھی۔ ظفر نے بہت کچھ سمجھایا اور ایک دن تو انٹونیا کی اس لجاجت کے ساتھ خوشامد کی کہ غریب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، لیکن اُس سنگدل عورت پر مطلق اثر نہ ہوا، اُس کے اصرار کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی۔ مجبور ہو کر ظفر نے سُودی قرضہ لیا، اور انٹونیا ولایت روانہ ہوگئی۔ انٹونیا کے جانے کے کچھ دن بعد، شہر کے ایک اینگلو انڈین عہدیدار بھی لندن روانہ ہوگیا، اس عہدیدار سے انٹونیا کا بہت زیادہ میل جول تھا اس عہدیدار کا کیرکٹر عام طور پر مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ انٹونیا کے بعد اس کی روانگی کو سب نے محسوس کیا، اور ظفر پر تو اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ وہ جلسوں اور پارٹیوں میں جانے سے کترانے لگا۔ انٹونیا نے چھ ماہ تک لندن میں قیام کیا، ظفر کے ہندوستانی دوستوں کے ایسے خطوط آئے، جن کو پڑھ کر ظفر کو بیحد صدمہ ہوا۔ انٹونیا نے لندن سے روانہ ہوتے وقت، ایک خط ہوائی ڈاک سے ظفر کے نام بھیجا۔

"پیارے ظفر! تمہاری جدائی میں یہ دن بہت بے کیفی کے ساتھ گذرے، والدین کی محبت نے مجھے مجبور کردیا، ورنہ میں اتنے دن تک تم سے کبھی جُدا نہ رہتی ہر جگہ تم یاد آئے، یقین جانو کہ تمہارے بغیر ہر دلچسپی بے کیف تھی، بہرحال اب میں آرہی ہوں، اور وصال کی ساعتیں بہت ہی قریب ہیں۔

ظفر! جب تم مجھے لے کر ہندوستان روانہ ہوئے تھے، تو بحری سفر بڑے لطف سے گذرا تھا، ہائے! اس دفعہ میں تنہا ہوں، سمندر کی موجوں پر جب چاندنی رقص کرتی ہوگی، تو میرا آغوش کس قدر بے چین ہوگا۔ ڈانس کے وقت تم مجھ کو بہت زیادہ یاد آؤگے، اور میری باہیں تمہاری حسین گردن کو تلاش کرتی ہوں گی۔

آرہی ہوں، صرف تمہارے لئے، تمہارے لئے! تمہاری۔۔ "انٹونیا"

ظفر کا دل انٹونیا کی طرف سے بہت کچھ مکدر ہو چکا تھا، لیکن اس خط کے پڑھتے ہی اُس کے دل کا کچھ اور ہی رنگ ہو گیا، اُس سے انٹونیا کی تصویر کئی مرتبہ چوما۔ خط نہ تھا جادو تھا، جس نے ظفر کے شکوک وشبہات کو مجنوط اور خوابیدہ بنا دیا۔ اُس نے انٹونیا کا بو فور مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔ اور اُس کی آمد کے اعزاز میں بڑے دھوم کی دعوت دی۔ کئی دن تک دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا، اور ظفر کی اُمیدوں کا مرجھایا ہوا باغ پھر لہلہا اُٹھا۔۔

اگر انٹونیا اب بھی اپنے اخلاق و عادات کو درست رکھتی، تو ظفر اس کا غلام بن کر رہتا، کیونکہ پچھلی باتوں کو اُس نے بالکل بھلا دیا تھا، مگر انٹونیا کہاں ماننے والی تھی، اُس نے اپنی گذشتہ۔ کات کی تجدید کی۔ اینگلو انڈین عہدیدار بھی کچھ دن کے بعد واپس آگیا، اور یورپ کی عطا کی ہوئی آزادی اپنا کام کرنے لگی۔ ایک دن انٹونیا اسی عہدیدار کے ساتھ نکلا۔ کھیلنے کے لئے چلی گئی، اور ایک ہفتہ میں واپس ہوئی۔ ظفر کو بیوی کی یہ حرکت بہت زیادہ ناگوار گذری، اُس نے انٹونیا کو بہت کچھ سخت سست کہا، انٹونیا نے ظفر کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ دوسرے دن اُس نے ضلع کے کلکٹر سے ظفر کی شکایت کر دی۔ ظفر کو کلکٹر نے بلایا۔ اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا:۔

"بیرسٹر صاحب! میرے پاس شکایت آئی ہے کہ تم اپنی بیوی کو بہت ستاتے ہو اور اُس کو ہندوستانی عورت کی طرح مقید اور پابند بنانا چاہتے ہو، میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرو، ورنہ مجھے مجبوراً مداخلت کرنی پڑے گی، دیکھئے! یہ میرا پہلا اور آخری حکم ہے"۔

ظفر نے اپنی صفائی میں بہت کچھ دلیلیں پیش کیں، لیکن انگریز کلکٹر، ہندوستانی شوہر کی بات کو انگریز بیوی کے مقابلہ میں کس طرح درست اور صحیح سمجھ سکتا تھا۔ ظفر غم و غصہ کی بھڑکی ہوئی آگ سینہ میں لے کر مکان واپس ہوا۔ اور چند دن تک خاموش رہا، وہ سخت مصیبت میں تھا اور انٹونیا کے مسئلہ نے اُس کی زندگی کو عذاب بنا دیا تھا۔

انٹونیا کسی دوست کے یہاں گئی ہوئی تھی، تعطیل کا دن تھا، ظفر برآمدے میں بیٹھا ہوا، قانونی کتب کا مطالعہ کر رہا تھا، کہ اتنے میں چٹھی رساں نے دوپہر کی ڈاک لا کر دی، ایک خط انٹونیا کے نام کا تھا جو لندن سے کسی شخص نے ہوائی ڈاک کے ذریعہ بھیجا تھا۔ انگریزی تہذیب میں بیوی کے خطوط کو شوہر اُس کی اجازت کے بغیر نہ کھول سکتا ہے اور نہ پڑھ سکتا ہے، ظفر نے بھی اب تک اسی اصول پر عمل کیا، مگر آج اُس نے اس اصول کی خلاف ورزی کر کے، خط کو چاک کر دیا، ظفر خط پڑھتا جاتا تھا، اور اُس کے چہرے کی رنگت بدلتی جاتی تھی، ایک ایک لفظ اُس کے لئے تیر و نشتر تھا۔

"پیاری انٹونیا!۔
"جب سے تم گئی ہو، میری زندگی بے کیف ہے تم نے تو جلد آنے کا وعدہ کیا تھا، مگر آج چار ماہ ہو گئے، تم نے بس ایک خط بھیج کر ہی سلسلہ مراسلت بند کر دیا"
انٹونیا! تم کتنی حسین اور مہربان ہو، تمہاری باہیں کتنی گداز، اور تمہارے لب کس قدر شیریں ہیں۔"

وہ کیف انگیز راتیں یاد آتی ہیں، تو دل بے چین ہو جاتا ہے جب میں اور تم ساتھ ساتھ تھے۔ کیا وہ راتیں واپس آسکیں گی ؟

یقین ہے کہ میری بھیجی ہوئی دوا نے ضرور اثر کیا ہوگا، اور تم اُس خطرے سے نکل چکی ہوگی، جو تمہارے اور تمہارے شوہر کے تعلقات میں ناخوشگواری کا باعث ہوتا۔ خدا کے لئے جلد جواب دو!

ظفر خط کو پڑھ کر دیوانہ کی طرح برآمدے میں دوڑنے لگا، اُس کا دماغ اُس مجرم کے دماغ کی طرح پریشان ہوگیا تھا جس نے پہلی مرتبہ خون کیا ہو۔ اسی حالت میں اُس کے ایک دوست آگئے، دوست نے ظفر کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا، اور آخر یہ طے پایا کہ کلکٹر سے جا کر تمام واقعات بیان کر دئے جائیں۔ ظفر شام کو کلکٹر کے یہاں پہونچا۔ اور تمام واقعات بیان کر دئے کلکٹر نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

بیرسٹر صاحب! آپ نے بیوی کی اجازت کے بغیر اُس کا خط کھول کر، خود ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ بہرحال اگر تم بیوی کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتے، اور اُس کو طلاق ہی دینا چاہتے ہو، تو اُس کا مہر ادا کردو بیرسٹر صاحب! میں تم کو پریشان دیکھنا نہیں چاہتا، تم ایک شریف اور نامور باپ کے بیٹے ہو، عدالتی کارروائی اور مقدمہ بازی میں تمہارا روپیہ بھی صرف ہوگا، بدنامی بھی ہوگی۔ اور تمہارے پیشہ پر بھی اثر پڑے گا۔ میں تمہاری مالی حالت سے بھی واقف ہوں، اس لئے پورا مہر تو تم ادا نہیں کر سکتے، اسلئے میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ بارہ ہزار روپیہ نقد دے دیا جائے، مجھے یقین ہے کہ میری تجویز کو تم قبول کروگے !!

ظفر نے بہت کچھ کہا کہ مہر کا سوال ہی بیکار ہے، عورت نے بد چلنی کا ارتکاب کر کے اپنے حق کو زائل کر دیا مگر کلکٹر صاحب کی منطق کے آگے غریب کی کچھ نہ چل سکی۔

ظفر پر تو پہلے ہی سے قرضہ کا بہت کچھ بار تھا، بارہ ہزار کی رقم کہاں سے مل سکتی تھی، دو چار ساہوکاروں سے بات چیت کی، اُنھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اب تنگ آکر احباب نے ظفر کے باپ سے درخواست کی، شیخ صاحب تمام حالات سے قریب قریب بے خبر تھے کیونکہ اب وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے، اور زمینداری کا کاروبار چھوٹے بھائی کے سپرد تھا، ان حالات کو سن کر شیخ جی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اُن کے چہرے پر زردی چھا گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے ان کے بدن سے لہو چوس لیا۔ روپیہ تو اُنھوں نے دیدیا، لیکن ان شرمناک حالات کا اُن پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اُن کا دل بیٹھتا ہی گیا اور جس دن انٹونیا مہر کا روپیہ لیکر شہر سے روانہ ہوئی ہے اُس دن شیخ جی پر سکرات کا عالم طاری تھا۔ شیخ جی نے مرتے وقت ظفر کو پلنگ کے قریب بلا کر کہا۔ ظفر میرا خون تیری گردن پر ہے، مگر میں تجھ کو معاف کرتا ہوں "

ظفر باپ سے لپٹ کر رونے لگا، باپ کی آخری ہچکی، بیٹے کی سسکیوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

بے رحم شکاری

جنگ عظیم میں ایک جرمنی غواصہ کا حیرت انگیز کارنامہ

الہلال عربی بابت ماہ دسمبر میں جرمنی غواصہ یو ۔ ۵۵ کے کپتان ہربرٹ سادر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جسمیں انہوں نے جنگ عظیم کا ایک کامیاب "بحری معرکہ" کا حال نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ناظرین فاران کی دلچسپی کے لئے ذیل میں اس کی تلخیص درج کی جاتی ہے

ایک روز ہم شکار کی تلاش میں نکلے۔ ہماری اصطلاح میں شکار سے مراد حلفاء کے جنگی جہاز تھے جنہیں ہم چپ چپ کر برباد کیا کرتے تھے۔ ہم بڑھتے بڑھتے خلیج جاسکونیا میں جیرونڈ کے دہانہ کے قریب پہونچ گئے ہمیں پوری توقع تھی کہ وہاں رات کی تاریکی میں بوردو سے آنے یا جانے والا کوئی جہاز ضرور مل جائے گا جسے ہم آسانی سے شکار کر لیں گے۔ رات نہایت تیرہ و تاریک تھی۔ اس قدر کہ تیز دوربین کے ذریعہ بھی ایک میل کے فاصلے سے جانے والا کوئی جہاز نہیں دیکھا جا سکتا تھا سمندر بالکل خاموش تھا۔ اس کی سطح ہموار اور چمکدار نظر آرہی تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں اس حالت میں کس پوشیدہ جذبہ نے ہمیں اس مقام تک پہونچا دیا تھا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ جذبہ تھا نہایت قوی اور اسے کسی طرح مغلوب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غالباً یہ خیال ہمیں یہاں تک کھینچ لایا کہ یہ ایک مناسب شکارگاہ ہے اس لئے یہاں ضرور قسمت آزمائی کرنی چاہئے

رات کی تاریکی میں ہم بڑھتے بڑھتے بندرگاہ تک پہونچ گئے۔ وہاں ہمیں ایک عجیب چیز نظر آئی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک جہاز اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتا ہوا ہمارے سامنے سے گذر رہا ہے ہم ابتدا معلوم نہ کر سکے کہ یہ کس قسم کا جہاز ہے اور اس وقت کہاں جا رہا ہے۔ لیکن چند ہی منٹ بعد جہاز کے ایک کنارہ پر کچھ روشنی ہوئی اور مستول بھی سرخ روشنیوں سے جگمگانے لگا۔ اس وقت ہم نے جانا کہ ہمارے سامنے جہازوں کی بندرگاہ تک رہنمائی کرنے والا (Pilote) ایک جہاز ہے۔

اتنے میں وسلکی کے افسر نے ہمیں مطلع کیا کہ کچھ مبہم آوازیں سنائی دے رہی ہیں جو ضرور بندرگاہ تک آنے والے کسی جہاز کی طرف سے آرہی ہیں اور غالباً اسی کے استقبال کے لئے یہ جہاز جا رہا ہے۔ ہم فوراً اپنی دوربین ٹھیک کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگے لیکن تاریکی اتنی تھی کہ اس میں کسی چیز کا دیکھنا قطعاً محال تھا۔

اب میرے آدمی اپنے اپنے کام پر مستعد اور ہر قسم کے پیش آنے والے حادثہ کے استقبال کے لئے تیار ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم اسی غنیمت والے شکار کو لیکر شکارگاہ سے واپس چلے جائیں یا اس سے موٹے اور فربہ شکار کا انتظار کریں۔ اس چھو—

کھولنے کو سمندر کی تہ میں پہونچانے کے لئے صرف دو تین بم کافی تھے لیکن میں نے خیال کیا کہ اس کے بعد دشمن ہر طرف سے ہم پر ٹوٹ
پڑیں گے اور ہمارا یہاں ایک لمحہ کے لئے ٹھہرنا ناممکن ہو جائے گا پس جب اپنے کو خطرہ میں ڈالنا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں نہیں کسی
بڑے مال پر ہاتھ مارا جائے ۔

میں نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا تو ان کے منہ میں اسی لاغر و نحیف شکار کو دیکھ کر پانی آ چکا تھا اور وہ اسی چھوٹے سے
شکار پر حملہ کرنے کے لئے بے قابو ہو رہے تھے ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا ۔ اسے چھوڑ دو یہ تو نہایت
حقیر لقمہ ہے اس سے بہتر کا انتظار کرو ۔

ہم اور آگے بڑھ کر زیادہ قریب سے جہاز کو دیکھنے لگے ۔ اتنے میں ہم نے چراغ کی روشنی میں جسے جہاز کا ایک شخص لئے ہوئے تھا
دیکھا کہ ایک چھوٹی سی ڈونگی جہاز سے نیچے اتاری گئی ۔ دو تین شخص اس پر سوار ہو کر اسے جلدی جلدی کھینے لگے ۔ یہ کیسی ڈونگی ہے!
اور کہاں جا رہی ہے؟ یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی مگر اس سوال کا جواب اپنے دل سے پوچھنے کے بجائے ہم نے ڈونگی والوں ہی
سے پوچھنا زیادہ مناسب خیال کیا ۔ ہم نے غواصہ کو حرکت دی اور چند منٹ بعد ڈونگی کے سامنے تھے ۔ میں اور میرے دو ساتھی
کود کر ڈونگی میں پہونچ گئے اور ان کے سامنے کھڑے ہو گئے ہمیں یوں بے سان و گمان دیکھ کر شاید انھوں نے ہمیں دریائی
بھوت یا جنات خیال کیا ہو ان بیچاروں پر اس وقت جو گھبراہٹ طاری ہوئی زندگی بھر میں وہ منظر بھلا نہیں سکتا ہماری ان
سے نہایت مختصر گفتگو ہوئی ہمیں معلوم ہوا کہ کوئی بہت بڑا فرانسیسی جہاز دو میل کے فاصلہ پر کھڑا ہے اور ساحل تک پہونچنے کیلئے رہنما کشتی کا منتظر ہے
یہ معلوم ہونے کے بعد ان تینوں شخصوں کو غواصہ میں بٹھا دیا گیا اور ان کی بجائے ہم پانچ آدمی کشتی میں سوار ہو گئے میرے ساتھیوں
میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک بم تھا ۔ غواصہ کے دوسرے ساتھی پستول تان کر ان تینوں فرانسیسیوں کے مقابل میں جم گئے
تاکہ اگر ذرا ان کے منہ سے آواز نکلے تو فوراً ان کا خاتمہ کر دیں ۔ میں نے اپنے ان ساتھیوں سے کہا کہ وہ غواصہ لیکر ہمارے پیچھے پیچھے
چلے آئیں اور فرانسیسی جہاز سے کچھ فاصلہ پر رک کر ہمارا انتظار کریں ۔ اگر ان کے کانوں میں پستول چلنے کی آواز آئے تو بغیر کسی تاخیر کے جہاز پر
بم برسانا شروع کر دیں اور اس کا مطلق خیال نہ کریں کہ اس سے مجھے یا میرے ساتھیوں کو کچھ نقصان پہونچے گا ۔ یہ ہدایت دے کر میں
اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا کچھ دیر ہم یونہی ادھر ادھر بھٹکتے رہے لیکن پھر ایک طرف سرخ روشنی دکھائی پڑی جس نے ہماری رہنمائی
کی ہم سمجھ گئے کہ اس روشنی سے جہاز رہنما کشتی کو اپنی طرف بلانا چاہتا ہے ۔ روشنی جس سمت سے آ رہی تھی ہم اس طرف روانہ ہو گئے
ابھی ہم جہاز سے کچھ فاصلہ ہی پر تھے کہ تین بار مسلسل جہاز نے سیٹی دی جس سے تھوڑی دیر کے لئے رات کا سکون درہم برہم ہو گیا اب
ہم نے اپنے کو ایک نہایت عظیم الشان جہاز نہیں بلکہ ایک خوفناک بحری دیو کے سامنے پایا جس کا وزن بیس ہزار ٹن سے یقیناً کم نہ ہوگا
یہ دیو آہستہ آہستہ ساحل کی طرف آ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پہاڑ سطح سمندر پر تیر رہا ہے ۔ یقیناً یہ ایک نہایت خطرناک چیز تھی
کہ انجام کی پروا کئے بغیر ہم آگے قدم بڑھاتے جا رہے تھے ۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اسی قسم کی جرأت و اقدام میں ہماری خوشی، مسرت
اور کامیابی کا راز ہے ۔ اگر اس قسم کے خطرناک اقدامات ہماری زندگی میں نہ ہوں تو زندگی بے لطف ہو جائے ۔

مسافی دو پہرے دس قدم کے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ پہلے اس کی نچلی سطح پر روشنی ہوئی اور پھر ایک زینہ لٹکایا گیا تاکہ "رہنما" جہاز کا
کپتان اس کے ذریعہ اوپر چڑھ سکے۔ میں اور میرے ساتھی چند منٹ میں بندروں کی طرح پھاند کر عرشہ جہاز پر پہونچ گئے
ایک شخص لالٹین لئے ہمیں روشنی دکھا رہا تھا وہ ہمیں اس طرح دیکھ رہا تھا گویا ہم اس کے ہم وطن یا گھر کے دوست ہیں جب وہ مجھے
اپنے ساتھ کپتان کے کمرے میں لے گیا جو میرا انتظار کر رہا تھا میرا منتظر کپتان مجھے دیکھ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھا تاریکی میں میرا چہرہ اچھی طرح
دکھائی نہیں پڑتا تھا اس نے انتہائی اطمینان و مسرت کے ساتھ کہا "دیکھیے ہم صحیح و سالم یہاں پہونچ آئے۔ اور ان وحشیوں
سے جو خطرہ تھا پیش نہیں آیا"۔ یہ فقرہ سن کر باوجود ایک خطرناک مقام پر ہونے کے مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور میں قہقہہ لگا کر
ہنس پڑا۔ میں نے اور زیادہ قریب جا کر آہستہ سے کہا

"جناب من! اب کل سات منٹ آپ کو موقع ہے۔ میرے ساتھیوں نے آپ کے جہاز کے ہر گوشہ میں بم رکھ دئے ہیں
جو سات منٹ بعد خود بخود پھٹ جائیں گے۔ یہ بھی سن لیجیے کہ میرا جہاز آپ کے جہاز سے چند قدم کے فاصلہ پر کھڑا ہے اگر آپ نے
یا خود میں نے دیر کر دیا تو اس کی توپیں گرج کر میرے ساتھی آپ کے جہاز کو چند لمحے میں غرق کر دیں گے اس لئے اب وقت
آپ اپنے اور اپنے آدمیوں کے بچانے میں صرف کیجئے ورنہ آپ ان کو اور خود اپنے نفس پر ظلم کریں گے"۔

میں ابھی اس گفتگو سے جونہی فارغ ہوا میرے ساتھیوں نے سیٹی کے ذریعہ اپنے کام سے فارغ ہو جانے کی اطلاع دی کپتان پر
کچھ اس قدر سراسیمگی طاری تھی کہ اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں پستول کے قبضہ پر تھا۔ میں اسی حال میں چلا کہ کپتان
میں وہاں سے اس حال میں چلا کہ لالٹین دکھانے والا اور دو اور شخص
میرے چلے آنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا زینہ کے پاس مجھے اپنے ساتھی مل گئے اور ہم اپنی کشتی میں سوار ہوگئے
ہمیں اچنبھے سے دیکھ رہے تھے لیکن انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ ہم کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئے تھے۔ جہاز سے اتر کر ہم اپنی کشتی میں سوار ہوگئے
اور پوری قوت سے کہ جلد جلد خواصہ تک پہونچے وہاں پہونچ کر ہم نے تینوں فرانسیسیوں کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور انہیں کشتی
میں سوار کرکے چھوڑ دیا۔ اب ہم میدان سے ذرا ہٹ کر انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں چند منٹ میں کیا ہونے والا ہے۔ ہمارے آنے کے
بعد ہی جہاز میں ایک قیامت برپا ہوگئی جہاں تک تمام لالٹینیں روشن ہو گئیں جہاز روشنی سے اس طرح جگمگا اٹھا جیسے وہاں کوئی محفل منعقد
ہو رہی ہو۔ لوگوں نے شور اور واویلا کرنا شروع کر دیا۔ تختے اور لکڑیاں سمندر میں پھینکی جانے لگیں اور لوگ کود کود کر ان پر سوار ہونے لگے
ایک یا دو منٹ بعد جہاز کے کناروں پر بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی پھر یکے بعد دیگرے سخت دھماکے کے ہوئے ایک ساتھ دو بموں کے
پھٹنے سے بجلی کی سی کڑک پیدا ہوئی اور ساری فضا تھرا اٹھی۔ جہاز کثیف دھوؤں کی چادر میں چھپ گیا بعض بعض حصوں سے
آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ بموں کے پھٹنے سے سمندر میں ایک سخت تلاطم برپا ہو گیا اور اس کی موجیں جہاز کے کناروں سے ٹکرانے
لگیں رفتہ رفتہ دھوئیں کا بادل چھٹنے لگا اور آگ کی روشنی میں جہاز جو بھی نظر آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجروح جہاز ایک طرف کو جھک پڑا
اور پھر آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا یہاں تک کہ ہماری نظروں سے بالکل غائب ہو گیا۔ اب جہاز ساحل کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ کچھ چاند ڈوبنے والوں کی مدد
کے لئے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ہماری طرف آ رہی تھی میں نے خواصہ کو سمندر کی سمت روانہ ہونے کا حکم دیا اور پھر پانی کی تاریکی میں گم ہو کر
کیا کچھ ہمارا پیچھا کرنے کے لئے

ادبیات

تجلیات اختر

(از جناب اختر جمال صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

مجھے فریب نہ دے حلقۂ فسانوں سے — دل خراب نہ بہلے گا اِن بہانوں سے

یہ نکتہ ہائے محبت ہیں دیکھ لے واعظ — حقیقتیں ہیں نمایاں انھیں فسانوں سے

بہار وادیِ غربت کی بُو نہ دیکھ سکے — اُلجھ کے رہ گئیں نظریں جو آشیانوں سے

یہ کہکشاں یہ ثریا یہ خوشۂ پروین — کسی نے پھینکے ہیں اپنے طلسم خانوں سے

خود اپنی ذات پہ بھی جن کو اعتماد نہیں — خدا بچائے ہمیں ایسے بدگمانوں سے

کسی نے چھیڑا تھا روزِ ازل جو سازِ الست — فضائیں گونج رہی ہیں انھیں ترانوں سے

کسی کی اور شکایت بتا کیا کیجے — ہمیں تو شکوہ ہے اپنے ہی مہربانوں سے

حیات شور

(از جناب منظور حسین صاحب شور ایم اے (علیگ)

شوق رسوائے التجا نہ ہوا — ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

دل نے سو طرح کر دیں ہدفیں — ناوکِ غم کبھی خطا نہ ہوا

کھائے ایسے فریبِ راہ حیات — آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا

زخم دل نے وہ خونچکانی کی — کوئی غنچہ چمن میں وا نہ ہوا

ہر مسرت حرام ہے اس پر — جو ترے غم میں مبتلا نہ ہوا

درد سے لیکے تیرے داماں تک — کوئی ناخن گرہ کشا نہ ہوا

ہجر میں غم بھی کھا کے دیکھ لیا — دل سے کم دردِ لا دوا نہ ہوا

اک مسرت کی بھیک مانگی تھی — مجھ سے راضی مرا خدا نہ ہوا

شور کس کا گلہ کرے کوئی — آشنا بھی تو آشنا نہ ہوا

"ملت بیضا"

(موجودہ ماحول کے پیش نظر)

(از جناب سلیمان صاحب سالک کانپوری)

نوید فصل گل لے کر صبا مستانہ وار آئی ۔ لٹاتی موتیوں کو، لہلہاتی سبزہ زار آئی
وہ چھیڑا قمریوں نے طوطیوں نے نغمۂ شیریں ۔ کہ اک اجڑے ہوئے گلشن میں پھر تازہ بہار آئی
ہویدا ہے غضب کی دلربائی ذرہ ذرہ پر ۔ چمن میں ہو گئی ہے پھر کسی ذوق لیلائی
ارے! تو یہ پڑی ہے چشم نظارہ تحیر میں ۔ سمندر سے فزوں ہے قطرۂ شبنم کی پہنائی
کرشمہ خیزی، رفتار باد صبح کیا کہنا ۔ کھل اٹھے غنچے، پژمردہ گلوں نے تازگی پائی

سحر کے وقت کانوں میں مرے آواز آتی ہے
کوئی کہتا ہو جیسے کہ "بہار آئی بہار آئی"

چمک اٹھا ہے نور کیفیت سے گنبد خضرا ۔ کہ پھر اسلامیوں میں ہو رہی ہے زندگی پیدا
ہوئی پھر ملت اسلامیہ کو فکر مستقبل ۔ ہوئی پھر الفت مذہب کی جانب قوم کو پروا
خدا رکھے کہ اب پھر نوجواں اٹھے ہیں صورت ۔ نگاہیں لامکاں رس ہیں تخیل ہے فلک پیما
گذاری ہیں بہت شبہائے ماضی اس تفکر میں ۔ خداوندا ہماری قوم کا انجام کیا ہو گا؟
اثر ہونا ہے شاعر کی دعائے صبحگاہی میں ۔ تعالی اللہ کہ شعلے رنگ ہے ملت بیضا
مبارک ایشیا! پھر تیرے ایام سعید آئے ۔ ترے صحرا نے پھر پیدا کئے ہیں نرگس و لالہ

فضائے عرش سے دیکھا ہے میں نے خاک مشرق پر
نچھاور کر رہا ہے دست قدرت لولوء و لالہ

الا! اے ظلمت مغرب کہ ہنگام سحر آیا ۔ افق سے شرق کے خورشید اپنا پھر ابھر آیا
پیام موت ہے مقراض دو لگا تیری زلفوں کو ۔ جسے دیکھا ترے اس دام میں الجھا نظر آیا
وہ منزل سامنے ہے کوشش پیہم بھی جاری ہے ۔ ہمارا کارواں پر خار راہوں سے گذر آیا
نوازشہائے پیہم کر رہا ہے پھر کوئی ہم پر ۔ فغانوں میں تپش آئی دعاؤں میں اثر آیا
ابھی سے سوچ لے یورپ مآل اپنی جسارت کا ۔ ہماری راہ میں سنگ گراں بن کر اگر آیا
خراج زندگی دنیا کے ہر گوشے سے ہم لیں گے ۔ زمانہ کی روش تبدیل کر لیں گے تو دم لیں گے

سوال و جواب

(۲)

(از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

[illegible] دو ہی راہیں ہیں یا تو فریق اول کے خیالات کی تائید کریں یا فریق ثانی کے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ فریق ثانی نے جواز
کذب پر عقلی و نقلی دلائل پیش کئے ہیں ان میں بے چون و چرا تسلیم کرکے حضرت خلیل اللہ کی جانب انتساب کذب جائز سمجھ لیا جائے
لیکن افسوس ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے دل اس پر آمادہ نہ ہوسکا۔ رہا فریق اول سو اگرچہ انہوں نے تحقیق کی راہ اختیار کی ہے
لیکن ان کی رائے سے بھی ہم پوری طرح متفق نہیں ہیں پہلے ہم ان وجوہ کو بیان کریں گے جو ہمیں فریق ثانی اور بالخصوص فریق
اول کے ہم خیال ہونے سے روکتے ہیں۔

فریقین کی دلیلوں سے اختلاف کے وجوہ

فریق ثانی یعنی وہ لوگ جو بل فعلہ کبیرہم ہذا اور انی سقیم کو جھوٹ سمجھنے پر مصر ہیں اپنے اس خیال پر نقلی اور عقلی دونوں قسم کی
دلائل پیش کرتے ہیں نقلی دلائل میں انہوں نے ما کذب ابراہیم الا ثلث کذبات اور دوران اہل موقف اذا سألوا ابراہیم الشفاعۃ قال
انی کذبت ثلاث کذبات کو پیش کیا ہے لیکن یہ دونوں روایتیں متعدد وجوہ سے میزان صحت پر پوری نہیں اترتیں، اس لئے
ان سے خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر کی جانب جھوٹ جیسی قبیح چیز کا انتساب کبھی جائز ہو ہی نہیں سکتا خواہ کذب حسنہ ہو یا غیر حسنہ
اب ہم وہ وجوہ جن کی بنا پر ان روایتوں کو صحت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، ترتیب وار بیان کرتے ہیں۔

(۱) قرآن کے خلاف ہیں اس لئے کہ قرآن میں ان کے متعلق حسب ذیل تصریحات ہیں۔

واذکر فی الکتاب ابراہیم انہ کان صدیقا نبیا (مریم) اور مذکور کرو کتاب میں ابراہیم کو ۔۔ بیشک وہ نہایت سچے نبی تھے۔

دوسری جگہ ان کی صداقت کی داد ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

قد صدقت الرؤیا انا کذالک نجزی المحسنین (والصافات) تم نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم محسن لوگوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

اسی آیت کے بموجب جس سے عام طور پر لوگ حضرت خلیل اللہ کی جانب جھوٹ کی نسبت کرتے ہیں ان کا یہ پرجلال قول بھی ہے
کیا کسی خوف زدہ کا قول ہو سکتا ہے ملاحظہ ہو۔

قال افتعبدون من دون اللہ ما لا ینفعکم شیئا ولا یضرکم اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ افلا تعقلون (۶۶-۶۷ انبیاء)

کہا کیا تم رب خدا کے مقابل میں ان چیزوں (اصنام) کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارا کچھ بنا سکتی ہیں اور نہ بگاڑ سکتی ہیں تف ہے تم پر اور تمہارے معبودان باطل پر کیا تمہیں سمجھ بوجھ نہیں۔

(۲) اصول تحقیق پر پوری نہیں اترتیں، اس لئے کہ اصول میں یہ مسلم ہے کہ قرآن مجید اصل ہے یہی احادیث و روایات

سکے پانچے کا فیصلہ ہے۔ قرآن جس بات کی تصدیق کرے وہ صحیح اور جو اس کے مخالف ہو وہ مردود اور ناقابل التفات ہے خواہ اسکی سند کتنی ہی مسلسل و مربوط کیوں نہ ہو، چنانچہ ابن القاسمؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے امام مالکؒ سے اس شخص کی بابت دریافت کیا جو حدیث ان اللہ خلق آدم علی صورتہ اور ان اللہ یکشف عن ساقہ یوم القیمۃ اور ان اللہ یدخل یدہ فی النار حتی یخرج من اراد، بیان کرتا ہے تو انھوں نے ان کا بڑی سختی سے انکار کیا۔

امام صاحب کے انکار کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے ان روایتوں کو قرآن کے خلاف پایا اس لئے انھیں بیان کرنے پر اظہار نفرت کی تاکہ غلط سلط روایتیں لوگوں میں عام نہ ہوں واللہ اعلم۔

(۳) اصول درایت کے معارض ہیں،، علمائے محققین کے نزدیک حدیثوں کی صحت و ضعف معلوم کرنے کا ایک بڑا اصول درایت ہے یعنی اگر کوئی روایت ایسی ہو کہ اس کا مضمون بداہۃً عقل کے خلاف ہو تو گو وہ مختلف طرق سے مروی ہو نا معتبر قرار پائے گی۔

(۴) خلق انبیا کے سراسر منافی ہیں" نبی مجسمہ اخلاق ہوتا ہے اور سب کو زیور اخلاق سے مرصع کرنا چاہتا ہے لیکن اگر خدانخواستہ نبی ہی کسی قسم کی کمزوری دکھائے تو کیا اس کے مخاطبین بھی اس کی باتوں پر اطمینان کریں گے اور کیا اس سے اس کی عصمت پر حرف نہیں آئیگا اسی اصول کی بنا پر امام رازی علیہ الرحمہ نے اس روایت کا ضعیف ہونا بدیہی قرار دیا ہے۔

(۵) ان کے صحیح تسلیم کرنے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ شریعت تماشا بن کر رہ جائے گی معاذاللہ تمام محرمات جو انکے حکم میں اور سارے کے سارے طیبات حرمت کے تحت میں آسکتے ہیں۔

میرے خیال میں اس قسم کی روایتوں کی اشاعت کی وجہ یہ ہے کہ جب حکایات پسند مفسرین کو آیات بل فعلہ کبیرہم ہذا اور انی سقیم کی تاویل میں زحمت لاحق ہوئی تو انھوں نے ان دونوں آیات اور تورات کے باب پیدائش کو سامنے رکھ کر ایک نہایت ہی موزوں قصہ تراش لیا حالانکہ ان آیات کی تاویل ان قصوں کے بغیر ممکن تھی اور شائبہ کذب تک نہ ہوتا۔

رہا ان کا فریق ثانی، عقلی استدلال کہ جھوٹ فی نفسہٖ کوئی مردود چیز نہیں، یہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نور و ظلمت میں کوئی فرق ہی نہیں، ہمارے نزدیک غلاظت غلاظت ہی رہے گی، یہ نہیں ہو سکتا کہ شیشے کے نہایت صاف و شفاف ظرف میں رکھنے سے اس کی اصلیت بدل جائے گی۔

رہے محققین حضرات (فریق اول) جنھوں نے رفع کذب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے ان سے ہمیں بل فعلہ کبیرہم ہذا کے بارے میں تو اتفاق ہے لیکن انی سقیم کے تحت میں جو تاویلیں انھوں نے اختیار کی ہیں ان سے ہمیں اختلاف ہے ہمارے نزدیک اس کی جو صحیح تاویل ہے اس کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

آیت بل فعلہ کبیرہم کی صحیح تاویل

اس آیت پر جب سیاق و سباق کی روشنی میں ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول جھوٹ

نہیں ہے بلکہ استہزا پوشیدہ ہے۔ اپنی بت پرست قوم پر اس قول کے ذریعہ ایک زبردست حجت قائم کی ہے۔

(۱) اگر یہ قول (بل فعلہ کبیرہم ہذا فاسئلوہم الخ) ان کی بت پرستی پر ایک ضرب کاری ... نہیں ہے تو پھر اسے سن کر ان کے ندامت و شرمندگی سے جھلانے کے کیا معنی ؟ بالفاظ دیگر ان کے عقائد باطلہ میں تزلزل کیوں ہوا ؟ فرجعوا الی انفسہم فقالوا انکم انتم الظالمون"

(۲) اگر اس قول سے ان کے کفر و شرک پر تضحیک نہ ہوتی تو وہ یوں جواب نہ دیتے۔

لقد علمت ما ہولاء ینطقون — تم کو معلوم ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے۔

(۳) اگر یہ ڈر کر کہا ہوتا تو پھر یہ پرجلال قول جس نے پوری قوم میں یک بیک آگ لگا دی آپ کی زبان مبارک سے نہ نکلا ہوتا۔

قال افتعبدون من دون اللہ ما لا ینفعکم ولا یضرکم — کیا ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو نہ تو تمہارا کچھ بنا سکیں اور نہ کچھ بگاڑ سکیں

اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ افلا تعقلون" — تف ہے تم پر اور تمہارے معبودوں پر جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو۔ کیا تمہیں سمجھ نہیں

کیا یہ کسی خوفزدہ کا قول ہو سکتا ہے ؟

(۴) اگر ایسے موقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت ہوتی تو خدا کو قلنا یا نار کونی بردا و سلاما علی ابراہیم کہنے کی نوبت نہ آتی"

یہ حقیقت اس وقت اور روشن ہو جائے گی جب آپ طریقہ دعوت ابراہیمی پر غور کریں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریق دعوت

حضرت ابراہیم کو خدا نے جو قاہرہ عطا فرمائی تھی وہ اپنی قوم کو نہایت لطیف طریقہ سے دعوت دیتے تھے مثال کے طور پر سورہ انعام کی آیات ۷۵ - ۷۹ تک سامنے رکھئے دیکھئے کتنے لطیف پیرایہ میں لوگوں کو توحید کی تعلیم دی ہے۔

جب وہ نبی کو ایک بت پرست قوم کو وحدانیت کی تعلیم دیتے ہیں تو پہلے ہی قدم پر انکے عقائد قدیمہ پر نشتر نہیں چلاتے بلکہ انہیں جن چیزوں میں جلال الٰہی کا عکس نظر آتا ہے یا جن کی ظاہری تابانی میں وہ قدرت کاملہ محسوس کرتے ہیں وہ بھی ان کی عظمت و کبریائی کا بظاہر دل و زبان سے اعتراف کرتے ہیں۔ تاکہ انہیں متوجہ کر کے ان پر ان کے معبودوں باطل کی حقیقت واضح کریں۔

جب انھوں نے ستارہ دیکھا تو (سنانے کیلئے) کہا یہ میرا رب ہے لیکن جب ڈوب گیا تو کہا میں ڈوبنے والوں کو اپنا رب بنانے کا نہیں پھر جب چاند کو دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے جب وہ بھی ڈوب گیا تو وحشت اور پریشانی کا اظہار کیا، پھر جب آفتاب کو دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے یہ بڑا ہے۔ جب یہ بھی ڈوب جاتا ہے تو فرماتے ہیں اے قوم جن چیزوں کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بری ہوں (انعام)

حضرت ابراہیم کا یہ طریقہ دعوت حقیقت میں محاجہ کا بہترین طریقہ تھا جس میں ان کے معبودان باطل کو اس طرح عرش الوہیت پر بٹھا کر معزول کر دیا ہے کہ گویا وہ کچھ تھے ہی نہیں اسی طرح یہاں بھی (بل فعلہ کبیرہم ہذا) آپ نے ان کے قلعہ شرک پر مختلف طریقوں سے گولہ باری کی ہے تاکہ وہ سب سے کٹ کر خدائے واحد کے سامنے جھک پڑیں اسکے لئے کبھی تو آپ کی زبان میں جنبش ہوئی ہے اور کبھی ہاتھ پاؤں میں، یعنی پہلے تو آپ نے ان کے معبودوں باطل کی بےبسی قولاً ظاہر کی ہے پھر عملاً بھی دکھلا دیا کہ لیجئے انہیں تم پوج رہے ہو یہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس طریق دعوت نے انہیں بے بس کر دیا چنانچہ وہ غیظ و غضب سے چلا اٹھے۔

قالوا حرقوہ وانصروا آلہتکم ان کنتم فاعلین۔ ان لوگوں نے کہا ابراہیم کو آگ میں جھونک دو اور اپنے بتوں کی حمایت کرو اگر تمہیں [illegible]

دلچسپ معلومات

جانوروں کا خون

علمائے روس آج کل بعض حیوانات کے خون کو انسان کے جسم میں داخل کرنے کا خاص تجربہ کر رہے ہیں۔ ابھی تک تو یہ ہوتا ہی رہا ہے کہ جب چوٹ یا زخم سے کسی کے جسم کا خون کافی مقدار میں خارج ہو جاتا ہے یا کسی اندرونی مرض کی وجہ سے اس میں کمی آجاتی ہے تو بعض حیوانات کے خون سے اس کی تلافی کر دی جاتی ہے جس کے بعد جسم اپنی اصلی حالت پر لوٹ آتا ہے لیکن علمائے روس کا خیال ہے کہ انسان کے جسم میں بعض حیوانات کا خون داخل کرنا بہت سے امراض مثلاً معدہ کے زخم اور خون کی خرابی وغیرہ کے لئے بھی بہت زیادہ مفید ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس سے جسم کے اندر امراض کے مقابلہ و مدافعہ کی زبردست طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

کائنات کی عمر

کائنات کی عمر کیا ہے؟ اس سوال کو بہت سے علماء نے حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ ہر ایک کی تحقیق کے طریقے الگ الگ ہیں اس لئے ان کے نتائج تحقیق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں سر جیمس جینز مشہور ماہر فلکیات کی تحقیق کے مطابق کائنات کی عمر . . . . ملیون سال ہے اور ڈاکٹر بوک کے نزدیک کائنات کی عمر . . ۲۰ ملیون سے زیادہ نہیں۔ ڈاکٹر بوک کے اس اندازہ کی بنیاد جن چیزوں پر ہے انہیں بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ یہ ایک علمی بحث ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ تفصیل کی طالب ہے۔

ولادت کی تکالیف کا ازالہ

ولادت کے وقت عورتوں کو جو سخت تکلیف لاحق ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لئے اب تک بہت سی دوائیں ایجاد ہو چکی ہیں لیکن تجربہ کرنے کے بعد دیکھا گیا ہے ان کے استعمال کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ آج کل ایک نئی دوا کی ایجاد کا حال معلوم ہوا ہے خیال ہے کہ یہ بے ضرر اور پیش نظر مقصد کے لئے بہت زیادہ مفید ہونے کی بنا پر بہت زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی اس کے موجد امریکہ کے دو بڑے عالم ڈاکٹر روث اور ڈاکٹر کین ہیں جو جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ یہ ایک خواب آور دوا ہے جسے عمل ولادت سے کچھ پہلے استعمال کرکے میٹھی نیند سو جاتی ہے۔ خواب ہی کے اثنا میں بغیر کسی تکلیف کے وضع حمل ہو جاتا ہے پانچ سو سے زائد عورتوں پر اس کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے لیکن علمائے نفس اور بہت سے ڈاکٹر وضع حمل میں سہولت پیدا کرنے کے لئے کسی قسم کی دوا استعمال کرنے کے . . . . خلاف ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے عورت کی نظر میں ولادت کی کوئی قیمت باقی نہ رہے گی ماؤں کو اپنے بچوں کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ اسی شفقت کا اثر ہے جو انہیں ولادت کے وقت لاحق ہوتی ہے اگر وضع حمل کے وقت انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ لاحق ہو تو ممکن ہے کہ اولاد کے ساتھ انہیں زیادہ محبت نہ ہو

کتابوں کی چوری زمانہ قدیم میں

کتابوں کی چوری کچھ زمانہ حال کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ پچھلے زمانہ میں بھی شائقین علم آج کل ہی کی طرح کتابیں چرایا کرتے تھے ایتھنز میں حال ہی میں ایک سنگ مرمر کی ایک تختی ملی ہے جو میلاد کی پہلی صدی کی یادگار معلوم ہوتی ہے۔ اس پر یہ عبارت درج ہے "یہاں سے کوئی کتاب نکالنا ممنوع ہے پبلک کیلئے کتب خانہ ۱ بجے سے ۶ بجے تک کھلا رہتا ہے"

یہ تختی جس جگہ ملی ہے وہاں پہلی صدی عیسوی میں ایک بہت بڑا کتب خانہ "ترا جانوس" قائم تھا۔

دنیا کا سب سے بڑا پل

ڈنمارک کی پارلیمنٹ آجکل ایک زبردست تعمیری پروگرام پر غور کر رہی ہے حکومت ڈنمارک کا ارادہ ہے کہ ایک ۱۲ میل لمبے پل کے ذریعہ اپنے ملک کو سویڈن سے ملا دے۔ اس پل کی تعمیر پر تقریباً ۱۲ ملیون گنیاں صرف ہوں گی۔ دس سال میں پل تیار ہوگا، اور ۱۲ ہزار مزدور مسلسل کام کریں گے تین بڑی بڑی کمپنیوں نے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی پارلیمنٹ سے اجازت طلب کی ہے۔

دنیا کی تیز رفتار چیزیں

دنیا کی جو چیزیں اپنی سرعت کے اعتبار سے مشہور ہیں ان کی فہرست ذیل میں ترتیب سرعت کے لحاظ سے درج کی جاتی ہے۔

روشنی	فی گھنٹہ	۶۶۹۶۰۰۰۰۰	میل
دم دار ستارے	"	۲۰۵۲۰	"
کرۂ ارض	"	۱۱۱۰	"
آواز	"	۷۲۰	"
انتہائی تیز رفتار ہوائی جہاز	"	۴۲۴	"
" " موٹر	"	۳۰۰	"
" " دخانی جہاز	"	۴۸	"

کتوں کی عبادت

چین میں ایک قبیلہ ہے جو کتوں کی عبادت کرتا ہے غالباً کتوں کی عبادت کرنے والے تمام عالم میں صرف اس قبیلہ کے لوگ ہونگے۔ گذشتہ زمانہ میں بعض قومیں سانپ اور بعض دوسرے حیوانات کی پرستش کرتی تھیں لیکن کتوں کی پرستش کا رواج نہ پہلے تھا اور نہ چین کو چھوڑ کر دنیا کے کسی اور گوشہ میں پایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں ایک مرتبہ جب دشمنوں نے اس قبیلہ پر شبخون مارا تھا تو اس موقع پر کتوں ہی نے بھونک بھونک کر لوگوں کو جگا یا تھا۔ چونکہ کتوں ہی کی بدولت ان کا شہر محفوظ رہ گیا اس لئے لوگوں نے اس کے بعد احسان مندی کے طور پر کتوں کی پرستش شروع کر دی۔

کوائف عالم اسلامی

ترکی

حکومت ترکیہ کا نیا قانون

جمہوریہ ترکیہ نے ایک نیا قانون بنایا ہے جس کی رو سے تمام سرکاری عہدیداروں افسروں قونصلوں، نیز سول سروس بحری فوج اور ہوائی فوج کے عہدیداروں اور ایسے اشخاص کو جو سرکاری ملازمت میں کسی نہ کسی طرح سے بھی ہوں، کسی غیر ملکی عورت سے شادی کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

ٹرکی میں جبری فوجی بھرتی کا حکم

حال ہی میں حکومت ٹرکی کی وزارت تعلیم نے تمام ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اسکاوٹ بننے کا حکم دیدیا ہے اور ان کی جبری بھرتی کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے جبری فوجی بھرتی کے لئے بھی ایک قانون پاس کیا ہے۔ جو لڑکے اور لڑکیاں بھرتی کئے جا رہے ہیں ان کی عمریں ۱۲ سال سے ۱۸ سال تک کی ہوں گی۔ ہر ہفتہ ڈھائی روز انہیں خاص ٹریننگ حاصل کرنا ہوگی اور یہی تربیت یافتہ لڑکے ضرورت کے وقت فوجی سپاہیوں کی جگہ بھی کام کریں گے۔

ٹرکی وزیر خارجہ کا اہم سفر

انگورہ کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ ڈاکٹر رشدی وزیر خارجہ ترکیہ ۱۰ مارچ کو بذریعہ طیارہ بغداد روانہ ہو جائیں گے۔ بغداد سے طہران جائیں گے اور ترکی عراق ایران اور افغانستان کے ایشیائی میثاق پر دستخط کرنے کے بعد یکم اپریل تک انگورہ پہونچ جائینگے۔

عراق

وزیر اعظم عراق کے عزم انگورہ کی غرض وغایت

سیاسیات مشرق قریب کا ایک مسرت بخش پہلو یہ ہے کہ اسکندرونہ کے جھگڑے کے باوجود، عراق اور ترکی کے باہمی حسن تعلقات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ جب سے سید حکمت سلیمان وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے ہیں ان دونوں ملکوں کے دوستانہ رجحانات میں ترقی ہو رہی ہے۔ طہران میں چار سلطنتوں کے میثاق پر دستخط ہو جانے کے بعد وزیر اعظم بہت جلد انگورہ جائیں گے اس سیاحت سے غرض نہ صرف ترکی و ایران کی باہمی مودت میں استحکام پیدا کرنا ہے بلکہ وزیر اعظم ترکی کی ترقیات کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عراق اصلاحات کے سلسلے میں ترکی کی کہاں تک تقلید کر سکتا ہے۔

فلسطین

نابلس میں عربوں اور یہودیوں میں خوفناک تصادم ہوگیا پولیس نے فسادیوں پر آتش باری کی جس کے جواب میں فسادیوں نے پولیس پر بم پھینکے جس کی وجہ سے بے شمار پولیس والے زخمی ہوئے فوج نے فسادیوں پر مشین گنوں سے فیر کئے مقتولین اور مجروحین کی تعداد سیکڑوں بیان کی جاتی ہے۔

فلسطینی عربوں کا عزم لندن

معلوم ہوا ہے کہ فلسطینی عربوں اور عیسائیوں کا ایک وفد مفتی اعظم ابن الحسینی کی قیادت میں مارچ کے وسط میں لندن جائیگا

فلسطین کی قسمت کا فیصلہ

معلوم ہوا ہے کہ فلسطین کے شاہی کمیشن کی سفارشات کے متعلق اپریل میں حکومت کی جانب سے اولاً ایک اعلامیہ شائع ہوگا جس میں وہ اپنی سیاست کی تشریح کرے گی۔

حجاز

میثاق دول اسلامی سے سلطان ابن سعود کا اتفاق

جلالۃ الملک شاہ غازی نے اپنی کابینہ کی سفارش پر حال ہی میں سعودی حکومت کے ولیعہد امیر فیصل کو عراق کی سیاحت کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ وہ غالباً اسی ماہ میں عراق تشریف لیجائیں گے اور ان تمام معاملات کے متعلق جو عرب اور عراق سے تعلق رکھتے ہیں گفتگو کرینگے اور چار سلطنتوں کے معاہدہ کے متعلق بھی گفتگو کرینگے جسکی پابندی کا وعدہ سلطان عبدالعزیز کرچکے ہیں۔

مصر

نوجوانوں کی تنظیم

مصر نے نوجوانوں کی تنظیم کے سلسلہ میں جو سب سے بڑا قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ وہاں سے چند ممتاز سیاستداں اٹھے اور انھوں نے ایک وسیع نظام کے ماتحت جمعیۃ شبان المسلمین کی بنیاد رکھدی۔ آج مصر میں اس انجمن کا نظام تمام نوجوانوں پر حاوی ہے یہاں کے نوجوانوں نے جو مجاہدانہ عزم کیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے باہمی تفریق کو پیدا نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے نوجوانوں کی انجمن میں جامعہ مصر کے طلبہ سے لیکر جامع ازہر اور قدیم مدارس کے طلبہ مشترک مقاصد کے لئے جمع ہیں اور ان کی متحدہ رائے یہ ہے کہ وہ مذہبی اخوت کی بنیاد پر طرابلس مراکش، فلسطین، عراق، الجزائر، جاوا اور مشرق بعید کے نوجوانوں کی رہنمائی کریں۔ مصر کے نوجوانوں میں مذہب کا جذبہ پوری طرح پیدا ہوگیا ہے چنانچہ انھوں نے اپنے ایک اجتماع میں یہ مطالبہ کیا کہ مصری سلطنت کے اساسی امور کو شریعت اسلام سے مطابقت دینے کے لئے باضابطہ قدم اٹھایا جائے اور مصر کو ایک اسلامی سلطنت کی حیثیت سے مذہبی سیاسیات میں حصہ لینا چاہئے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

تفسیر سورہ لہب از علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ اردو از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدیر رسالہ الاصلاح ضخامت ۲۴ صفحات تقطیع چھوٹی، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۲؎ ملنے کا پتہ:۔ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

علامہ حمید الدین فراہیؒ کو اللہ تعالیٰ نے فہم قرآن کا جو زبردست ملکہ عطا فرمایا تھا، اہل علم کے لئے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں جن لوگوں کو ان کی بلند پایہ تصنیفات کے مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ علامہ ابن قیمؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے بعد اس رتبہ کا کوئی دوسرا مفسر قرآن اور حامل علوم و معارف پیدا نہیں ہوا۔ مولانا موصوف قرآنی مشکلات کی جس طرح گرہ کشائی کرتے ہیں اور کتاب الٰہی کے اسرار و رموز جس خوبی سے بے نقاب کرتے ہیں وہ آپ اپنی نظیر ہے، مولانا کی تصنیفات میں متعدد ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو انھیں عام مفسرین سے ممتاز کردیتی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت ان سب کی طرف سرسری اشارہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نظم قرآن مولانا کا خاص موضوع ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کی نہ صرف آیتیں بلکہ سورتیں بھی باہم مربوط اور منظم ہیں، آپ اپنے اس دعویٰ کو اپنی کتابوں میں جس خوبی سے ثابت کرتے ہیں اور اس کی بنا پر جو نادر نکتے پیدا کرتے ہیں وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی تصنیفات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآنی آیات سے کرتے ہیں۔ بوقت ضرورت کلام عرب سے بھی استشہاد فرماتے ہیں۔ عربی زبان اور ادب میں آپ کو جو مرتبہ تبحر حاصل تھا اس کا ثبوت آپ کی تصنیفات میں بکثرت ملتا ہے۔ اپنے دعاوی پر قرآنی دلائل کے ساتھ ساتھ کلام عرب سے اس طرح استشہاد فرماتے ہیں کہ ان کے سامنے چار و ناچار سر تسلیم جھکانا ہی پڑتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کا یہ جلیل القدر امام اپنے علوم و معارف کا خزانہ اپنے ساتھ لیتا گیا اور چالیس سال کے مسلسل غور و فکر کے ... نتائج و تحقیقات ... کا بہت کم حصہ صفحۂ قرطاس پر آسکا۔ پھر بھی مولانا نے اپنی وفات کے بعد اپنی تحقیقات کا کافی حصہ مسودات کی شکل میں چھوڑا ہے جو تمامتر قرآنی علوم و معارف سے متعلق ہے۔ اگر یہ مسودات اشاعت پذیر ہوکر منظر عام پر آجائیں تو امید ہے کہ فہم قرآن کی راہ سے بہت سی مشکلات دور ہو جائینگی۔ مولانا مرحوم کی وفات سے علم و فن کو جو صدمۂ عظیم پہنچا ہے اس کی تلافی کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ ان کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی طبع و اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے بہت جلد اس کا سامان فراہم کردیا۔ مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں کی توجہ اور شاگردوں کی مساعی سے آپ کی کوششوں کی آخری یادگار، مدرسۃ الاصلاح میں ایک انجمن "دائرہ حمیدیہ" کے نام سے قائم ہوگئی ہے جس کا مقصد خاص یہی ہے کہ مولانا مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ مولانا فراہی کے خیالات و تحقیقات کی نشر عام کے لیے اس ادارہ کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ الاصلاح بھی شائع ہو رہا ہے جس کی ادارت کے فرائض علامہ فراہی کے لائق شاگرد مولانا امین احسن

اصلاحی نے انجام دیے ہیں۔ یہ رسالہ قرآنی علوم و معارف کے لئے مخصوص ہے اور اپنے رنگ کا واحد رسالہ ہے۔

مولانا فراہی کی تصنیفات زیادہ تر عربی زبان میں تھیں اس لئے اُردو داں طبقہ ان سے کسی طرح مستفید نہیں ہو سکتا تھا بنابریں دائرہ کی طرف سے علامہ فراہی کے غیر مطبوعہ مسودات کی طبع و اشاعت کے ساتھ ساتھ ان کے مطبوعہ اجزاءِ تفسیر کے اردو ترجمہ شائع کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ تفسیر سورہ لہب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اس کتاب میں بھی علامہ فراہی کی تفسیری خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں، عام مفسرین تبت یدا کو بددعا قرار دیتے ہیں، علامہ فراہی نے نہایت محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ بددعا نہیں ہے بلکہ فتح مکہ اور دشمنان اسلام کی تباہی کی پیشگوئی ہے۔ اس سورہ میں ابولہب اور اس کی بیوی کے ذکر کے جو وجوہ بیان کئے ہیں اور ابولہب اور ابوجہل کی ذہنیتوں کا جو فرق واضح کیا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ تکلیف مالا یطاق اور اجتماع بین النقیضین کے اہم اعتراضات کو بھی نہایت خوبی سے رفع کیا ہے غرض یہ ہے کہ یہ تفسیر اپنے رنگ کی پہلی اور نرالی تفسیر ہے اور اہل علم کی قدر دانی کی مستحق۔

ترجمہ علامہ فراہی کے شاگرد رشید مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے کیا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ترجمہ پوری طرح ادا کر دیا ہے۔ مولانا فراہی کا طرز تحریر بالکل قدما کے رنگ کا ہے وہ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی ادا کرتے ہیں اس قسم کی تحریروں کا سلیس اور با محاورہ ترجمہ بہت دشوار ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ اس پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ امید ہے کہ ارباب علم اس رسالہ کی قدر کریں گے تاکہ علامہ فراہی کی تفسیر کے دوسرے اجزا بھی شائع ہوتے رہیں۔

انقلاب روس:- مترجمہ مسٹر نسیم صاحب چمن دہلوی ضخامت ۹۰ صفحات - قیمت ایک روپیہ (عہ)
ملنے کا پتہ:- انقلاب ٹریڈرز کمپنی دہلی۔

مشہور شیطان صفت راہب راسپوٹین کے قصے بہت مشہور ہو چکے ہیں، زیر نظر کتاب راسپوٹین کے واقعات کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اور بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ کتاب زار اور زارینہ کی نظر بندی کے بعد زارینہ کی ایک سہیلی اور محرم راز میڈم جینٹر کی طرف سے شائع ہوئی تھی اس میں زارینہ کے تمام پوشیدہ اور حیرت انگیز واقعات طشت از بام کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ زارینہ چونکہ جرمنی کی رہنے والی تھی اور قیصر جرمن کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی اس لئے وہ دیدہ و دانستہ روس کو تباہ اور اسے جرمنی کے حوالے کرنا چاہتی تھی زارینہ محل شاہی میں بیٹھ کر جو سازشیں کرتی تھی اس کتاب میں اس کو مرقع وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ بچپن کے حالات کے ساتھ زارینہ کا وہ آخری انجام بھی دکھایا گیا ہے جب وہ زمانہ انقلاب میں زار اور خاندان شاہی کے ساتھ سائبیریا میں جلا وطن کر دی گئی اور پھر ان سب کو قتل کر کے ان کی راکھ کانوں کی تہ میں بکھیر دی گئی۔ کتاب کے آخر میں راسپوٹین کی گمشدگی اور قتل کے مفصل حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں جو واقعات مذکور ہیں نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں تک صحیح ہیں۔ ممکن ہے مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہو لیکن اس

...ہیں کتاب بہت زیادہ دلچسپ ہے ۔ ترجمہ بھی بہت شستہ اور عام فہم ہے امید ہے یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

میثاق النبیین

مؤلفہ جناب مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی ۔ ضخامت ۲۰۵ صفحات ، کتابت طباعت و کاغذ عمدہ قیمت ۸/ ملنے کا پتہ :- منیجر دارالکتب اسلامیہ ، احمدیہ بلڈنگ لاہور۔

جس طرح آنحضور صلعم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے تمام انبیاء عالم کی تصدیق کی ہے اور ان پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لئے جزو ایمان ٹھہرایا ہے ، اسی طرح آپ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ تمام انبیاء عالم نے بھی آپ کی تصدیق کی ہے اور اپنی اپنی امتوں سے آپ پر ایمان لانے کا میثاق لیا ہے ۔ پیش نظر کتاب میں آنحضور صلعم کی اس دوسری شان کو دکھایا گیا ہے ژند اوستا ، وید اور صحف اولیٰ میں آنحضور صلعم کے متعلق جو پیشگوئیاں [illegible] کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے ان پیشگوئیوں کا ژندی ، سنسکرت اور عربی عبارتیں عکس دیا گیا ہے اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ ان کے [illegible] بھی درج کر دئے گئے ہیں ۔ اس موضوع پر غالباً یہ سب سے پہلی جامع کتاب ہے جس کے لئے جناب عبدالحق صاحب مصنف [illegible] مبارکباد ہیں۔

منادی کا سالنامہ ۱۹۳۷ء

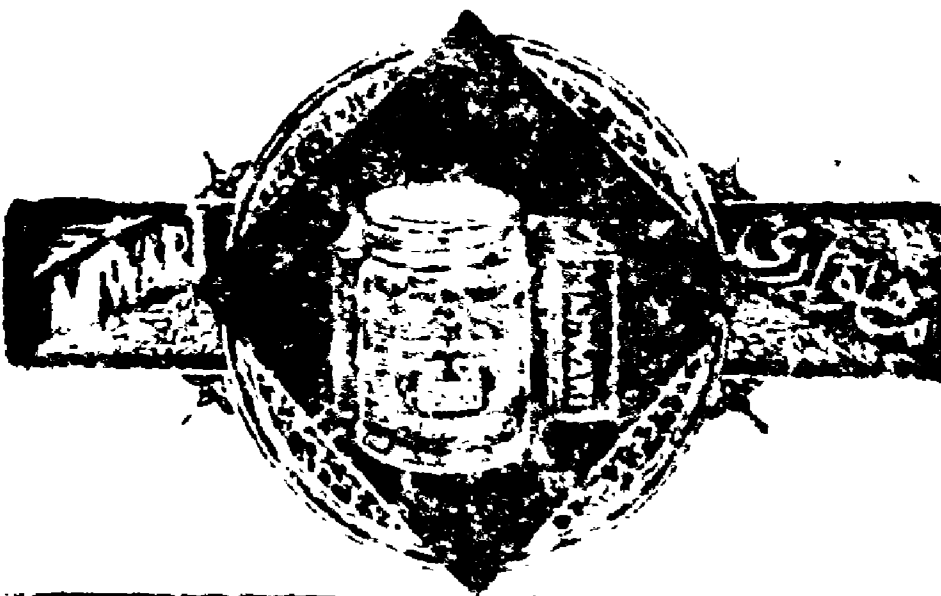
مرتبہ خواجہ حسن نظامی دہلوی ضخامت ۲۹۰ صفحات تقطیع چھوٹی قیمت آٹھ آنے (۸/)

خواجہ حسن نظامی اردو تحریر و انشا میں جس طرز خاص کے مالک ہیں اس کے قابل قدر نمونے اس میں ملتے ہیں ۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی ادارت میں منادی کے نام ڈوروپیہ ہفتہ وار شائع ہوتا ہے اس کا یہ سالنامہ ہے ۔ اگرچہ اس سالنامہ کا معتد بہ حصہ کتابوں اور دواؤں کے اشتہارات کی نذر ہو گیا ہے لیکن خواجہ صاحب نے بعض چیزیں اچھی جمع کر دی ہیں مثلاً ہندوستان کے اردو رسالوں اور اخباروں کے نام ، یا ہندوستان کے [illegible] افراد کے فوٹو جن کو خواجہ صاحب سے عقیدت ہے اور اسی طرح بعض اور کام کی باتیں بھی اس میں مل سکتی ہیں جو اس کی قیمت کے مقابلہ میں [illegible] زیادہ قیمتی کہی جا سکتی ہیں۔

نگار

ایک علمی ادبی رسالہ ہے جو ہر مہینہ کی ۵ تاریخ کو رامپور سے شائع ہوتا ہے ۔ سالانہ قیمت ۴ روپیہ ، دفتر منیجر نگار ، رامپور سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

اس کے مضامین نہایت پاکیزہ اور بلند معیار کے ہوتے ہیں اور ملک کے بعض ممتاز اہل قلم کے جواہر پارے بھی اس میں نظر آتے ہیں ۔ زبان ، انشا اور اسلوب تحریر کے اعتبار سے اسے ہندوستان کے بلند پایہ رسالوں کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے اور بحیثیت مجموعی اسے ارباب ذوق کے لئے ایک گرانمایہ تحفہ کہا جا سکتا ہے ۔ تحقیق و تصحیح الفاظ کے عنوان سے جناب مولانا عتیق الرحمن صاحب صدر مجلس اصلاح زبان رامپور کی طرف سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں بعض زبان زد غلط الفاظ کی تصحیح کی گئی ہے اور لغات اور شعراء کے کلام کو ثبوت میں پیش کیا گیا ہے ۔ مضمون نگار نے مختلف حوالہ جات سے یہ ثابت کیا ہے کہ اصطبل بفتح الف و با ابریشم بفتح شین اور ستر بالف مقصورہ بولنا غلط ہے ۔ ان کی تحقیق کے مطابق اصطبل بکسر الف و سکون با ، ابریشم بفتح شین اور ستر الف ممدودہ ہے ۔ اسی طرح چند اور الفاظ کے متعلق بھی اسی نوع کی تحقیقات پیش کی گئی ہیں ۔ امید ہے اصلاح زبان کا یہ باب قائم رکھا جائیگا اور ان محققین...









کلام مجید و حمائل شریف مترجم و محشّٰی

بلاکوں کے ذریعہ دو رنگ میں

اس قرآن پاک کا ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے بزمانۂ اسیری جزیرۂ مالٹا میں بہت تحقیق و تدقیق اور غور و فکر کے ساتھ بڑی مدت میں مکمل فرمایا تھا اور فوائد کی تحریر کا کام شروع فرمایا کہ ۱۹۲۰ء میں آپ کا وصال ہو گیا اور فوائد کے باقی چھبیس پارے آپ کے تلمیذ رشید شیخ المفسرین مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی نے ساڑھے تین سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل فرمائے۔ خدا کا شکر ہے کہ مروجہ تراجم کے مقابلہ میں اس ترجمہ کو زیادہ سہل، زیادہ آسان، تحت اللفظ اور مستند ہونے کی حیثیت سے تمام علمائے کرام اور فضلائے دور حاضرہ نے تسلیم فرمایا ہے اور ہزارہا اردو داں کو قرآن کریم سے مستفید ہونے کا موقعہ حاصل ہے۔ پہلا ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن بھی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے فوائد کے اضافہ کے ساتھ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا۔ یہ دونوں ایڈیشن ختم ہو چکے۔

اس ترجمہ قرآن شریف اور حمائل شریف کو بلاکوں کے ذریعہ سے خوش رنگ زمین پر چھاپا گیا۔ ذیل میں بالتفصیل دونوں کا ہدیہ درج ہے۔ قسم دوم میں صرف کاغذ کا معمولی سا فرق ہے۔ باقی خصوصیات مشترک ہیں۔ نمونہ مفت طلب فرما سکتے ہیں۔

قرآن شریف

قسم		ہدیہ
قسم اول	مجلد اعلیٰ ہدیہ [illegible] رعایتی جبکہ [illegible] اختتام طباعت [illegible]	
	غیر مجلد " [illegible]	[illegible]
قسم دوم	مجلد " [illegible]	[illegible]
	غیر مجلد " [illegible]	[illegible]

حمائل شریف

قسم		ہدیہ
قسم اول	مجلد اعلیٰ ہدیہ	[illegible]
	غیر مجلد "	[illegible]
قسم دوم	مجلد "	[illegible]
	غیر مجلد	[illegible]

محصول ڈاک، ریل اور خرچ پیکنگ ہدیہ کے علاوہ ہوگا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ڈاک کے ذریعہ ایک مجلد قرآن مجید معہ پیکنگ دو روپیہ اور غیر مجلد … اور حمائل شریف مجلد معہ پیکنگ … اور غیر مجلد کا … ہوگا۔ ریل کے ذریعہ ۵۰۰ میل تک ایک قرآن مجید معہ پیکنگ و لیس جسٹری … اور ایک حمائل شریف معہ پیکنگ … ریل کے ذریعہ بہت کفایت ہے۔

محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور (یو پی)

غنچہ کے مضمون نگاروں اور ناظرین سے التجا

۱۔ مضامین رسالہ عام فہم اور آسان زبان میں ہونا چاہئیں۔

۲۔ ادق مضامین جو بچوں کی سمجھ سے باہر ہوں درج نہ کئے جاسکیں گے۔

۳۔ صنعتی و حرفتی اور دیگر مضامین معہ تصاویر و اشکال ہوں تو بہتر ہے۔

۴۔ مضامین رسالہ جامع اور مختصر ہوں تاکہ دو صفحے سے نہ بڑھ سکیں۔

۵۔ بچوں کے سب سے بہتر مضمون پر انعام پیش کیا جائے گا۔

۶۔ ماہرین تعلیم اور مدرسین کے تعلیمی مضامین خاص طور سے ضروری ہیں

۷۔ غیر شائع شدہ مضامین واپس نہ کئے جائیں گے۔

۸۔ جملہ خط و کتابت میں چٹ نمبر کا حوالہ اور جواب طلب باتوں کے لئے جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۹۔ تاریخہائے اشاعت۔ ہر ماہ انگریزی کی یکم ۸۔ ۱۶۔ ۲۴۔ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

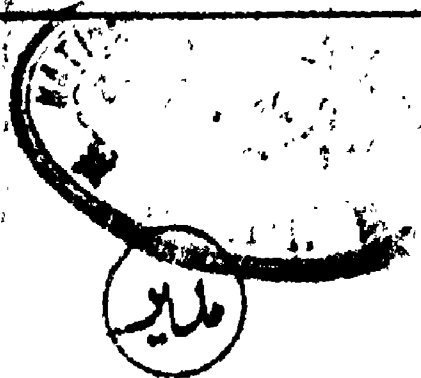
قیمت غنچہ:۔ سالانہ تین روپیہ (ے) ششماہی ایک روپیہ ۸ ر ممالک غیر سے سالانہ للعہ۔ فی پرچہ ایک آنہ

نرخنامہ اشتہارات رسالہ غنچہ

مقدار صفحہ	ایک بار	چار بار	تین ماہ	چھ ماہ	ایک سال	اجرت تقسیم ضمیمہ
پورا صفحہ	ۓ	عـــہ	صـــہ	۱ا صعـــہ	۱ا صللعہ	۸ر سیکڑہ
نصف صفحہ	۶ے	ســـہ	صـســہ	صـــہ	۱ا صعہ	
چوتھائی صفحہ	۶	معہ ر	عـــہ	صـســہ	صـــہ	

اشتہار بچوں کی ضرورت سے باہر نہ ہو زبان صاف اور سلیس ہو۔ مخرب اخلاق اشتہار درج نہ ہوں گے۔

جملہ خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ:۔ محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ و غنچہ بجنور۔ (یو پی)



فاران

مالک: محمد مجید حسن

مدیر: ابو اللیث ندوی اصلاحی

ہر ماہ انگریزی کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

جلد ۳ | بجوز ماہ اپریل ۱۹۳۷ء مطابق ماہ صفر ۱۳۵۶ ہجری | نمبر ۴

فہرست مضامین

شذرات

لکھنؤ میں مدح صحابہ کے متعلق سنیوں اور شیعوں کے درمیان جو قضیہ چل رہا تھا، اس کی تحقیقات کے لئے حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا اعلان کردیا ہے۔ کمیشن کے ارکان فریقین کے بیانات سننے کے بعد، حکومت کے سامنے اپنی سفارشیں پیش کرینگے جن پر غور کرنے کے بعد حکومت اپنا فیصلہ نافذ کرے گی۔

یہ خبر جلسہ جس قدر ہماری تکلیف اور کوفت کا باعث ہوئی ہو لیکن مسلمانوں کے موجودہ حالات کے لحاظ سے غیر متوقع نہیں کہی جاسکتی۔ اس وقت جبکہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی ضرورتیں روز بروز نہایت شدید ہوتی جارہی ہیں مسلمان ہیں کہ اب تک معمولی معمولی مسائل پر باہم دست و گریباں ہیں۔ گویا ان کی آنکھیں اپنے افتراق و غفلت کے ان نتائج کو دیکھ ہی نہیں رہی ہیں جو بہت جلد ان کے سامنے آنے والے ہیں۔

مدح صحابہ کا جھگڑا جب شروع ہوا تو ابتداءً . . . عام طور سے خیال کیا جاتا رہا کہ چند ارباب اغراض نے اپنے فوری فائدوں کے لئے ان دونوں فرقوں کے درمیان جنگ وجدال کی آگ مشتعل کردی ہے جو خود بخود چند دنوں کے بعد بجھ جائے گی۔ لیکن خلاف توقع اس قضیہ نامرضیہ نے بہت زیادہ طول کھینچا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ دونوں جماعتوں کے وفود انگریز گورنر کی خدمت میں ایک ایسے مسئلہ کے تصفیہ کے لئے حاضر ہوگئے جس سے اسے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس موقع پر ہردو فریق نے ایک نجی مسئلہ کو حسن تفاہم کے ذریعہ طے کرلینے کے بجائے حکومت کے سامنے پیش کرکے اسلامی شرف و وقار کو جو صدمہ پہونچایا تھا وہ دردمند اصحاب کے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا تھا لیکن توقع تھی کہ اس کے بعد ملک کی جدید صورت حال ان کے لئے تازیانۂ عبرت ہوگی، اور وہ بہت جلد اپنے افتراق کے انجام کو دیکھتے ہوئے باہمی مفاہمت کے ذریعہ خود اس مسئلہ کو طے کرلیں گے لیکن افسوس ہے کہ یہ توقع پوری نہ ہوسکی ہردو فریق اپنے اپنے مطالبات پر اس طرح جمے رہے کہ حکومت کو اپنے اعلان کے مطابق مجبوراً ایک تحقیقاتی کمیشن کا تقرر عمل میں لانا پڑا۔ اس سے صرف یہی نقصان نہیں ہوا کہ باہمی مفاہمت کے ذریعہ آپس کی رنجشوں اور کدورتوں کو ہمیشہ کیلئے دور کرلے کا ایک بہترین موقع ضائع ہوگیا بلکہ یہی اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ کمیشن کی سفارشات کہیں شیعہ سنی اختلاف کو زیادہ سخت اور مستقل نہ بنادیں۔

کاش مسلمان ملک کے موجودہ مسائل اور حالات پر نظر رکھتے اور تنگ دلی، تنگ نظری اور تعصب سے بالاتر ہوکر ملک و قوم کے مفاد کے لئے متحد ہوجاتے۔

بمبئی کے بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے :-

"معلوم ہوا ہے کہ چند اشخاص اس موضوع پر مولوی . . . اور مولوی . . . کے درمیان مناظرہ کا انتظام کر رہے ہیں کہ محمد (صلعم) بندے ہیں یا خدا، مولوی . . . صاحب اپنی تقریروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ محمد صلعم اور خدا تعالیٰ ایک ہی چیزیں ہیں اور مولوی . . . صاحب اپنی تقریروں میں حضور تاجدار مدینہ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ ثابت کرتے ہیں۔ اس بات کے فیصلہ کے لئے مناظرہ ہوگا"

قطع نظر اس سے کہ آنحضور صلعم کو خدا ثابت کرنا، کس قدر زبردست فتنہ ہے، سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے اب اسی قسم کے مباحث بحث و مناظرہ کے لئے باقی رہ گئے ہیں ؟

مارچ کے فاران میں، رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" پر ایک مفصل مضمون شائع کیا جا چکا ہے اسے پڑھ کر ناظرین کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس رسالہ کا تحقیق کے اعتبار سے کیا مرتبہ ہے اور اس کی تصنیف و اشاعت کا حقیقی مقصد کیا ہے۔ اس مضمون میں ضمناً اس بات کا بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ جن علماء کرام نے جناب مصنف کی "تحقیقات عالیہ" کی تائید و تصویب اور ان کے سب ولہجہ کی متانت و شائستگی کی تعریف و توصیف کی تھی، ان میں سے دو اہم شخصیتوں نے معذرت پیش فرمائی ہے کہ ان کی تحریریں کس طرح اس رسالہ میں شائع ہوئیں۔ تائید کرنے والوں کی فہرست میں حضرت مولانا محمد قطب الدین عبد الوالی فرنگی محلی کا اسم گرامی بھی اہمیت رکھتا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا نے بھی سید صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں اپنی تحریر پر اظہار افسوس فرمایا ہے۔ اس مکتوب کے چند فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ اس رسالہ کی تصنیف کا حقیقی مقصد لوگوں کی نظروں میں کس طرح بے نقاب ہوتا جا رہا ہے۔

". . . اگر میرا کل مطبوعہ مضمون جو . . . علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیوں کے نام سے مستقل طبع کیا گیا ہے دیکھتا جس میں نہایت توہین آمیز طریقہ اختیار کیا گیا ہے تو میں اس قدر بھی نہ لکھتا۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ بعض صاحبان آپ کی علمی و قومی و مذہبی خدمات کو مٹانے کے درپے ہیں اور غالباً ان کا مقصد اس سے یہ ہے کہ جو خدمت آپ کی ذات گرامی، اور دار المصنفین سے علم دین، قرآن و حدیث و فقہ کی ہو رہی ہے اس کو صدمہ پہونچائیں اور مسلمانوں کو دھوکا دے کر نفاق و شقاق کی خلیج کو وسیع تر کر دیں۔ ورنہ آپ کے ایسے مرنجان مرنج بزرگ کی جو نہایت متانت گر استقلال کے ساتھ خالص علمی خدمات میں منہمک ہے اتنی شدت سے مخالفت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں . . . . . میری دلی دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ آپ سے بہت زمانہ تک علم اور دین اور قوم وملک کی خدمات جیسی وہ چاہتا ہے لیتا رہے۔

پچھلے پرچے میں تفسیر سورۂ لہب مصنفہ علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے اردو ترجمہ پر تنقید کرتے ہوئے دائرۂ حمیدیہ کا جو علامہ موصوف کے قلمی مسودات کو زیور طبع سے آراستہ کرنے اور ان کے خیالات و تحقیقات کو ملک میں عام کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، سرسری ذکر آچکا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ دائرہ اپنے پیش نظر مقصد کو پورا کرنے کے لئے تیزی کے ساتھ قدم اٹھا رہا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ اس سال مولانا فراہیؒ کی بعض غیر مطبوعہ تصنیفات کی طبع کا اہتمام ہو رہا ہے اور متعدد مطبوعہ اجزاء تفسیر کے ترجمے شائع کئے جانے والے ہیں۔

تفسیر سورہ لہب کے بعد ہمارے پاس مولانا فراہی کی تفسیر سورۃ کوثر کا ترجمہ اور اسباق النحو حصہ اول، دو کتابیں تنقید کے لئے آئی ہیں۔ یہ دونوں الگ الگ مبسوط تبصرے کی محتاج ہیں۔

تفسیر سورہ کوثر۔ قرآن کی تمام سورتوں میں سب سے چھوٹی سورۃ ہے لیکن اس چھوٹی سی سورۃ میں بھی جو حقائق و معارف بند ہیں انھیں معلوم کر کے انسان کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل جاتے ہیں: ہٰذا قول البشر۔ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی اس تفسیر میں جن رموز و حقائق کو پہلی مرتبہ آشکارا کیا ہے، ناممکن ہے کہ کوئی شخص انھیں پڑھے اور مولانا کی تحقیق اور قوت اجتہاد سے مرعوب نہ ہو۔ اس سورۃ میں کوثر کی حقیقت مدلل طور پر واضح کی گئی ہے۔ نماز و قربانی کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت کتاب پر مفصل تنقید کرنے سے ہم معذور ہیں

اسباق النحو میں عربی زبان کے اصول و قواعد نہایت سہل اور آسان اردو میں اس طرح بیان کر دئے گئے ہیں کہ کم از کم مدت میں عربی زبان سیکھی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب اب سے بہت پہلے شائع ہوئی تھی اور متعدد مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی داخل ہو چکی ہے۔ اب مصنف مرحوم کی نظر ثانی، ترمیم اور اضافہ کے بعد شائع ہو رہی ہے۔ اس طبع جدید کے بعد کتاب نے ایک جدید صورت اختیار کر لی ہے۔ اور زبان عربی کے تمام ضروری مسائل پر پوری طرح حاوی ہو گئی ہے۔

اول الذکر کتاب کی قیمت ۱ر ہے اور موخر الذکر کی ۵ر۔ دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ کے پتہ سے مل سکتی ہیں۔

مصطفیٰ کمال پر جو مضمون فاران میں نکل رہا ہے اس کا سلسلہ اس پرچہ میں جناب عبدالحکیم صاحب کی غیر معمولی مشغولیت کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔ انشاء اللہ آئندہ پرچے سے وہ پھر جاری ہو جائے گا۔ ناظرین مطمئن رہیں۔

اس پرچہ میں ان کا ایک دلچسپ مضمون علامہ اقبال کی تازہ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" پر شائع ہو رہا ہے جو ان کے مضمون "مصطفیٰ کمال" کی تلافی کے لئے کافی ہے۔ علامہ اقبال کی اس تصنیف پر عبدالحکیم صاحب مفصل تبصرہ کا ارادہ رکھتے ہیں یہ پہلی قسط ہے امید ہے آئندہ نمبر میں اس مضمون کا بقیہ حصہ درج ہو سکیگا۔

توحید اور اس کے اثرات

(۶)

اس مضمون کے ۵ نمبر شائع ہو چکے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب تک اصل موضوع پر ایک حرف نہ لکھا جا سکا ہمارا مقصد اس مضمون کی تحریر سے عقیدۂ توحید کے اثرات واضح کرنا تھا لیکن موضوع کی اہمیت مقتضی ہوئی کہ پہلے اس کے متعلقات اور مبادی پر روشنی ڈالی جائے۔ اسی خیال کے مطابق اب تک یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ عقیدۂ توحید کس عقیدے کو کہتے ہیں، عقائد و آثار میں باہم کیا تعلق ہے اور انہیں قرآن میں کس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ابھی بعض اور مباحث باقی ہیں جن پر اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے روشنی ڈالنا ضروری ہے لیکن چونکہ مضمون بہت پھیلتا جا رہا ہے اس لئے اب انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اصل موضوع پر گفتگو شروع کر دی جاتی ہے۔

توحید کے اثرات ایک دو نہیں کہ انہیں چند سطروں یا چند صفحات میں بیان کر دیا جائے۔ جملہ شریعت اسی ایک عقیدہ کا ظہور ہے اس لئے انہیں بالتفصیل بیان کرنے کے لئے بہت زیادہ وقت اور گنجائش کی ضرورت ہوگی بنا بریں ہم چاہتے ہیں کہ اس کے خاص خاص اہم اثرات و نتائج آئندہ نمبروں میں بیان کر دیں۔

ممکن ہے مضمون کے طول و تسلسل سے بعض لوگ گھبرا جائیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اب تک حتی الوسع ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس مضمون کا ہر نمبر ما قبل سے علیحدہ اپنی جگہ مستقل ہو۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے ربط کلام کے لئے گذشتہ بحث کا خلاصہ بھی دے دیا گیا ہے آئندہ بھی ایسا ہی کیا جائیگا۔ یہی طریقہ ہم اپنے دوسرے مسلسل مضامین میں بھی اختیار کرتے ہیں۔ امید ہے اس سے مضامین کا تسلسل زیادہ ناگوار نہ ہوتا ہوگا۔

اس مضمون کے پڑھنے والوں کو اجمالی طور پر بتایا جا چکا ہے کہ دنیا کی ہر نیکی اور خوبی اسی عقیدہ کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔ انسان جب آنکھیں کھولتا ہے اور کائنات میں خدا کے وجود، رحمت، ربوبیت اور عدل وغیرہ کے بے شمار آثار کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس سے اس کے قلب میں لازماً خدا کی محبت، خشیت، شکر اور اطاعت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہی احساس تمام اعمال خیر کا سرچشمہ ہے، اسی سے تمام شریعت وجود میں آتی ہے یہی ہے جو ہر مسلم کے تقویٰ و صلاح کے زیور سے آراستہ کرتا ہے۔ یہی اس کے دل سے غیر اللہ کا خوف نکالتا ہے اور اسے ایک خاص جوش و خروش اور نئے جذبات و کیفیات سے معمور کر دیتا ہے۔ گو اس عقیدہ کے تسلیم و اعتراف کے بعد بھی اس کے ظاہری جسم و اعضاء وہی رہتے ہیں لیکن وہ اپنی اندرونی کیفیتوں کے لحاظ سے بالکل بدل جایا کرتا ہے۔ پہلے وہ مردہ تھا۔ اب

اس میں زندگی آگئی۔ پہلے اس کا سر کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے سامنے جھک جایا کرتا تھا۔ اب وہ خدا کے سوا کسی اور طاقت کے آگے سر جھکانا اپنے لئے ننگ خیال کرتا ہے پہلے اس کی ہمتیں سرد اور حوصلے پست تھے "فکر معاش اور ترس مرگ" کے سوا دنیا میں اس کا کوئی مشغلہ نہ تھا لیکن اب اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ

بحر و بر اندر طوفانش غرب ازنگاہ او پیام انقلاب

پہلے کیفیت یہ تھی کہ

ملت خاکستر او بے شرر صبح او از شام او تاریک تر

اور اب اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ

پیش او کوہ گران یک تودہ ریگ

!

ازنگاہش عالمے زیر و زبر

اس عقیدہ کے اثرات اس درجہ سکون بخش، کیف آور اور ولولہ انگیز ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنے اس انقلاب حال پر حیران ہو جاتا ہے اور مسرت و بے خودی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے۔

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب نہ زمیں نہ آسماں تم نے جہاں بدل دیا آکے میری نگاہ میں

اور کبھی ان الفاظ میں اس کے اثرات پر اپنی حیرت کا اظہار کرتا ہے۔

من نمی دانم چہ افسوں می کند روح را در تن دگرگوں می کند

دنیا بھی اس کے ان اعمال و کارناموں کو دیکھ کر جو اس نئی زندگی کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں، پکار اٹھتی ہے۔

تازہ از ہنگامہ او کائنات

اور اسے اس کے وجود کے مقابلہ میں ہر چیز "نمود" نظر آنے لگتی ہے۔

مرد مومن از کمالات وجود او وجود و غیر او ہر شے نمود

اسی عقیدہ کا کرشمہ تھا کہ وہ عرب جن کی "ہر طرح حالت بری تھی" اور جن کے متعلق علامہ حالی نے یہ فرمایا ہے۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

کہیں آگ پجتی تھی واں بے محابا کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا بتوں کا عمل سو بسو جابجا تھا

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی | نہ یونان کے علم وفن کی خبر تھی

یہ حال ہوگیا:۔

یہ نذیر از ضرب اولات ومنات | در جہات آزاد از بند جہات
ہر قبائے کہنہ چاک از دست او | قیصر وکسریٰ ہلاک از دست او
گاہ دشت از برق وبارانش بدرد | گاہ بحر از زور طوفانش بمدد
عالمے در آتش او مثل خس | اقبال این ہمہ ہنگامہ "لا" بود وبس

غرض لا الہ الا اللہ ایک چھوٹا اور سادہ سا جملہ ہے لیکن اس کی قوت وتاثیر ہمارے اندازے سے باہر ہے اس کا ایک معمولی کرشمہ یہ ہے۔

ہر کہ اندر دست او شمشیر لا ست | جملہ موجودات را فرمانبروا است

اس کی قوتیں اور تاثیرات محسوس کیجا سکتی ہیں لیکن ان کا اظہار بہت دشوار ہے ذیل میں اسی کلمہ "لا" کے خاص خاص اثرات ونتائج واضح کئے جائینگے۔

عقیدۂ توحید موجب طمانیت ہے

دنیا میں انسان کو مختلف قسم کے اضطراب اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ جہانتک تم سے ہو سکے ان سب کے اسباب کی جستجو کرو اور پھر دیکھو یہ عقیدہ کس طرح ان کا قلع قمع کرتا ہے قرآن میں مومنین کے وصف میں بار بار کہا گیا ہے،

لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون
نہ ان پر خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں

اکثر مفسرین اسے آخرت کے لئے خاص قرار دیتے ہیں لیکن اگر تم غور کرو تو مومن باللہ کی یہ کیفیت دنیا میں بھی ہوتی ہے۔ وہ ہر حال میں اقلیم طمانیت کا فرمانروا اور مملکت سکون کا تاجدار ہوتا ہے۔ کوئی پریشانی اسے لاحق نہیں ہوتی اور کسی قسم کا غم اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔

تم اپنے ارد گرد بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھتے ہوگے جو ہر قسم کے ظاہری اسباب وراحت کے باوجود بھی راحت وسکون سے محروم رہتے ہیں اور انتہائی کرب وبے چینی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی پریشانیوں کے اسباب کا اگر پتہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی جملہ پریشانیاں کفر وشرک یا خدا کی صحیح معرفت کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔

بے شمار ایسے لوگ ہیں جو خدا کو نظروں سے اوجھل کرکے اسرار ونظام کائنات کو حل کرنا چاہتے ہیں لیکن ہر لمحہ ان کی حیرانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کی ذہنی الجھنوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ یا تو ذہنی قلبی اور روحانی پریشانیوں میں مبتلا رہ کر ایک دن مر جاتے ہیں یا توحید کے ناخون سے کائنات کے تمام عقدوں کی گرہ کشائی کرکے سکون حاصل کرتے ہیں۔

اسی مضمون کے پچھلے نمبروں میں یورپ کے دو مشہور سائنسداں پروفیسر جارج رومانیز اور پروفیسر کنگ فورڈ کلیفورڈ کی تحر[illegible]

پیش کی جا چکی ہیں کہ وہ اپنے کفر و الحاد کی تکلیف کس بری طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کے علاوہ یورپ کے بیشمار حکما و فلاسفہ کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں جنھوں نے صراحتاً اعتراف کیا ہے کہ مذہب کو تسلیم کئے بغیر ذہنی پریشانیوں سے بچنا دشوار ہے

تم ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہونگے جو ایک لمحہ کے لئے کائنات کے اسرار کی طرف ملتفت نہیں ہوتے اور جن کے ارد گرد راحت کے جملہ سامان مہیا رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی ذہنی پریشانیاں حد سے بڑھی ہوتی ہیں۔ جب ایسیلاب آتا ہے تو ان کے دلوں میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ تیز ہوائیں چلتی ہیں تو ان کی حرکت قلب غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے آسمان پر دمدار ستارے نظر آتے ہیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بخار یا کسی اور مرض کا اگر معمولی حملہ ہوتا ہے تو ان کی پریشانیاں حد بیان سے باہر ہو جاتی ہیں۔ وہ ایسی چیزوں سے ڈرتے ہیں جن سے ڈرنا تمہارے نزدیک حماقت ہے اور اس قدر ڈرتے ہیں کہ ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان کی زندگی اس طرح اضطراب و پریشانی کے لئے وقف کیوں ہو جاتی ہے؟ اس لئے کہ وہ کائنات میں خدا کے سوا بہت سے متصرف مانتے ہیں، طلسم جادو، جنات و شیاطین اور دوسری ایسی قوتوں کے تصرف کے قائل ہیں جو ان کے خیال کے مطابق بغیر کسی سبب اور اصول و ضابطہ کے انسان کو ستاتی اور غم میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔ یہی اوہام و خرافات کا تسلط انھیں کسی لمحہ چین نہیں لینے دیتا۔ ہر اس چیز کو جس کا کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہیں آتا، مخفی طاقتوں کے تصرفات کا نتیجہ قرار دے لیتے ہیں اور ان سے غیر معمولی طور پر ڈرنے لگتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ کائنات میں تصرف صرف خدائے واحد کا ہے۔ کوئی ذرہ اس کے حکم اور مشیت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، اس کا ہر فعل حکمت پر مبنی اور اصول و نظام کے ماتحت ہے، ایسے شخص کو دنیا کی کوئی چیز خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ ہواؤں کا چلنا، بجلی کا چمکنا، بادل کا گرجنا، پانی کا برسنا، لوگوں کا بیماریوں میں مبتلا ہونا، یہ ساری چیزیں اس کے نزدیک اسباب و علل کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ہوا، پانی، بجلی، سمندر، سورج، ستاروں کو وہ بذات خود متصرف یا کائنات کی مخفی طاقتوں کا معمول بھی نہیں قرار دیتا اس لئے یہ چیزیں اسے خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ جن چیزوں کا کوئی ظاہری سبب اس کی سمجھ میں نہیں آتا، انھیں بھی وہ اسباب و علل ہی کا نتیجہ قرار دیتا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اسباب و علل کے ماتحت ہے۔ تمہیں اس قسم کے اعتقاد رکھنے والوں کے سکون و اطمینان اور اس کے برعکس اعتقاد رکھنے والوں کی پریشانیوں پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ طمانیت و سکون اور اضطراب و پریشانی دونوں کا منبع خیالات و افکار ہیں۔ انسان کا ذہن اگر فاسد خیالات اور غلط تصورات سے پاک ہو تو مصائب و مشکلات میں بھی اس کے سکون قلب میں فرق نہیں آتا اور اگر ذہن و دماغ پر ان کا تسلط ہو تو ہر قسم کے اسباب راحت کے باوجود سکون و طمانیت سے محروم رہتا ہے۔

حریت از عفت فکر است و بس

عقیدۂ توحید مشکل کشا ہے

اب تک جن دو اصناف کے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کفر و شرک کی بنا پر ہر قسم کے

سباب راحت کے باوجود، پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں اب ان لوگوں کا تصور کرو جو اسباب آسائش سے محروم یا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صنف کے لوگ پہلی دونوں صنفوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔ حکماء اور فلاسفہ تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی تعداد بھی اب پہلے زمانہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے، جن کے دل و دماغ پر خرافات کا استیلاء ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عہد حاضر کی نام علمی ترقیوں کے باوجود خرافات کا بالکلیہ استیصال نہیں ہوا اور خود یورپ میں اب تک اس کی حکومت بدستور قائم ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ازمنہ قدیمہ کے مقابلہ میں اب خرافات کا اثر بہت کم ہو گیا ہے اور بہت سے اعتقادات جو جہالت اور حماقت کا نتیجہ تھے، علم جدید کی روشنی میں بالکل زائل ہو گئے ہیں اس لئے اس زمانہ میں ایسے لوگوں کی تعداد جن کو پریشان کن خرافات کا نسخہ ہوتا ہے پہلے زمانہ کے مقابلہ میں کم ہے البتہ ان دونوں صنفوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اسباب راحت سے محروم اور معاشی مصائب کے شکار ہیں۔ اور اس زمانہ میں ترخصوصیت کے ساتھ بے روزگاری نے اس تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے ایسے لوگوں کے متعلق تو ظاہر ہے تم یہی رائے قائم کرو گے کہ اگر ان کی زندگی ہمہ وقت پریشانی کیلئے وقف ہو تو ایسا ہونا چاہئے بلاشبہ تمہارا یہ خیال ان لوگوں کے متعلق صحیح ہے جن کا دل توحید کے انوار سے روشن نہیں ہے لیکن جن دلوں میں اس عقیدہ نے گھر کر لیا ہے ان میں غم و حزن اور پریشانی کا راہ پانا ناممکن ہے۔ خدا کی ذات سے تعلق قائم ہو جانے کے بعد ہر بند غم خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔

زبند دو جہاں آزاد گردم (خسرو) اگر تو ہم نشیں بندہ باشی

خدا کی یاد ہر غم کو دور کرتی ہے۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد — من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

اسی لئے حافظ علیہ الرحمۃ معرفت کی اس مے گلگوں سے ہر وقت مست رہنا چاہتے ہیں۔

اے دل آن بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

اور اسے پلا کر دوسروں کو بھی مست بنا دینا چاہتے ہیں۔

اے کہ از روزگاری طلبی — فرح و عیش و خرمی و طرب

فکر مال و منال و حشمت و جاہ — ہمہ بگذار و ساغرے بطلب

اور یہ واقعہ ہے کہ مسرت و اطمینان کا سرچشمہ یاد الٰہی ہے نہ کہ مال و دولت کی فراوانی۔

عاقبت در جاں رنج دہ جاہ و مال

اس لئے جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں جاہ و مال اور دنیوی اعزاز و مناصب کو چھوڑ کر صرف اسی کو چاہتے ہیں ؎

وہ نہیں ملتا تو چاہیں اور کیا (فراق) اور جو ملتا ہے تو پھر کیا چاہئے

قرآن مجید اور مسئلہ رنج و غم

رنج و غم اور ان کے ازالہ کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ قرآنی تعلیمات کا خلاصہ ہے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اطمینان قلب کا سرچشمہ ذکر الٰہی کو قرار دیا گیا ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب | اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

اور مشکل سے مشکل مواقع پر بھی مایوسی کو کفر کا خاصہ بتایا گیا ہے۔

ولا تایئسوا من روح اللہ انہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون (ترجمہ: اور خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا کی رحمت سے کافر ہی ناامید ہوتے ہیں)

ایک مومن باللہ کا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیش آتا ہے، خدا کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر کے مطابق پیش آتا ہے اور یہ کہ اس کا ہر فعل کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہوتا ہے وہ مالی دقت، جسمانی اذیت، اعزا و اقربا کی مفارقت غرض کسی موقع پر بھی خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوتا قرآن نے اس اعتقاد کا یہ خاصہ خود بیان کیا ہے۔

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم الخ (حدید)	کوئی مصیبت نہیں آتی ملک اور نہ خود تم میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو اللہ سے اس پر اترایا نہ کرو۔

اور جزع و فزع کو صفات ایمان کے منافی قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ہے:۔

ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسہ الشر جزوعا واذا مسہ الخیر منوعا الا المصلین الذین ھم علی صلوتھم دائمون (المعارج)	انسان چھوٹے دل کا ہے۔ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچے گھبرانے لگتا ہے اور جب نعمت ملتی ہے بخیل بن جاتا ہے۔ مگر وہ جو نمازی ہیں اور اپنی نمازوں کو کبھی ناغہ نہیں کرتے۔

یہاں پر ذرا رک کر یہ سمجھ لو کہ اس آیت میں اگرچہ "جزع" "و منع" سے محفوظ رہنا "مصلین" (نمازیوں) کا خاصہ بیان کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایمان باللہ کا خاصہ ہے اس کو سمجھنے کے لئے پہلے نماز کی حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔

رکوع و سجدہ اور اعضاء کی حرکت کا نام نماز نہیں ہے بلکہ "ذکر الٰہی" نماز ہے اور یہی اس کی حقیقت ہے۔

اقم الصلوۃ لذکری	میرے ذکر کے لئے نماز پڑھو
وذکر اسم ربہ فصلی	اپنے رب کو یاد کیا پس نماز پڑھی

گویا نمازی مشکلات میں صبر کرتے ہیں اور نعمت پاکر بخل سے محفوظ رہتے ہیں، ان کا یہ خاصہ، اس "ذکر الٰہی" کا نتیجہ ہوتا ہے جسے ہر روز پانچ وقت تلاوت آیات اللہ کے ذریعہ قلب میں استوار کرتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ خدا کا تصور اور اس کا ذکر، ایک ایسا قلعہ ہے جس میں پناہ گزیں ہونے کے بعد، انسان غم و حزن

کے غموں سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے اسے خدا کا جس قدر زیادہ قرب حاصل ہوگا، اسی قدر اسے سکون خاطر محسوس ہوگا۔ اسی بنا پر ہمیں حکم ملا ہے کہ مصائب و مشکلات میں اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے مدد طلب کریں (استعینوا باللہ) آنحضور صلعم کو اللہ تعالیٰ کی معیت کا یقین نہایت محکم اور اس سے تعلق خاطر نہایت گہرا تھا اس لئے آپ اس موقع پر بھی نہ گھبرائے جبکہ غار ثور میں حضرت صدیق اکبر کے پائے ثبات میں بھی بمقتضائے بشریت لغزش آگئی اور یک بیک دشمنوں کو اپنے سر پر دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ اس موقع پر آپ نے ان کی ان الفاظ میں ڈھارس بندھائی:۔

لا تحزن ان اللہ معنا — غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

جب خدا کی معیت حاصل ہو تو پھر کونسی پریشانی قریب پھٹک سکتی ہے۔

نماز چونکہ بندے کو خدا سے قریب کرتی ہے (واسجد واقترب سجدہ کر اور قریب ہو جا) اور نماز کے عالم میں بندہ مقامات عرفان کی سیر کرتا (الصلوۃ معراج المومنین) اور خدا سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے (فان العبد یناجی ربہ) اس لئے مصائب میں نماز ہر چیز سے زیادہ سکون و طمانیت کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں استعانت بالصلوۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے اور اسی بنا پر مکی پرمصائب زندگی میں مسلمانوں کو بکثرت نمازیں پڑھنے کی تاکید کی جاتی تھی اور اسی وجہ سے آنحضور صلعم کا یہ حال تھا کہ

کان اذا حزبہ امر صلی — جب کوئی مشکل پیش آتی تو آپ نماز پڑھتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خدا کا تصور پریشانیوں کو دور کرتا ہے اور سکون و طمانیت کی دولت بخشتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسے پڑھ کر تمہارے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مذہب طمانیت و سکون کا موجب کیسے بن سکتا ہے جبکہ وہ انسان کو مختلف قسم کی بندشوں میں جکڑ دیتا ہے اور بہت سی ایسی باتوں سے روک دیتا ہے جن کو کرنے یا جنہیں حاصل کرنے کی وہ قدرت رکھتا ہے۔ کیا اس کی آزادی کے حق کو چھین لینا اس کے حزن کا موجب نہ ہوگا؟

اس شبہ کا مختصر جواب یہ ہے کہ مذہب جن لذتوں سے متمتع ہونے پر پابندیاں عائد کرتا ہے وہ وہی ہیں جن سے خود تمتع حاصل کرنے والے کی ذات کو یا اسکے ابنائے جنس میں سے انہیں تکلیف دیکر لذت حاصل کرنا ایک کے لئے دوسرے اعتبار سے مضر ہوتا یا کسی کو نقصان پہونچاتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کو حرام قرار دیا ہے انہیں حلال سمجھنے والے اگر ان نقصانات کا تصور کریں جو ان کی اس حرکت سے خود انہیں یا ملک و جماعت کو لاحق ہوتے ہیں اور ان کی فطرت مسخ نہ ہو تو وہ یہ کہتے ہوئے ان سے باز آ جائیں۔

لا خیر فی لذۃ من بعدھا کدر — وہ لذت بیکار ہے جس کے بعد بے لطفی ہو

پھر جو لوگ قیامت کا اعتقاد رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان محرمات کا ارتکاب روح کو ناپاک اور ناکارہ بنا دیتا ہے وہ بطیب خاطر انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ مذہب نے انہیں ممنوع قرار دیا ہے نہ کہ اسے اپنے حق آزادی کے منافی سمجھ کر غمگین ہوں۔ (باقی)

یادِ اندلس

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

(۵)

پچھلے پرچے میں اشبیلیہ کے آثار سے بحث کرتے ہوئے، وہاں کی عجیب و غریب عمارت مسجد کے منارہ کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ دوسری قابل ذکر عمارت، جیرالدا ہے۔ گو یہ عمارت بھی مختلف حوادث وانقلابات سے دوچار ہونے کی بنا پر اپنی اصلی شکل وہیئت میں باقی نہیں ہے لیکن پھر بھی عربی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ ان دونوں عمارتوں کے علاوہ اشبیلیہ میں اور بھی عربی آثار پائے جاتے ہیں لیکن زیادہ اہمیت انہی دونوں عمارتوں کو حاصل ہے۔ انہیں دیکھنے کے لئے دور دور سے سیاح آتے ہیں اور عربی انجینیروں کی مہارت فن اور عرب بادشاہوں کی بلند حوصلگی کے حیرت انگیز مظاہر دیکھ کر عش عش کرنے لگتے ہیں۔

اشبیلیہ عربوں کے عروج واقتدار کے زمانہ میں اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے پورے اندلس میں شہرت رکھتا تھا۔ وہاں کی چہل پہل، طرب وسرور، میلے ٹھیلے، زندگی اور زندہ دلی کے لوازم خاص طور پر مشہور تھے۔ ایک مرتبہ منصور ابن عبدالمومن کے دربار میں قرطبہ اور اشبیلیہ کی فضیلت کے بارے میں ابن رشد اور ابوبکر بن زہر کے درمیان مناظرہ ہوا ابن رشد نے ابوبکر کو مخاطب کرکے کہا:۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جب اشبیلیہ میں کوئی عالم شخص مرتا ہے اور اس کی کتابیں فروخت کرنی ہوتی ہیں تو قرطبہ لیجائی جاتی ہیں اور جب قرطبہ میں کوئی گویا مرتا ہے اور اس کا ترکہ بیچنا ہوتا ہے تو اشبیلیہ لایا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشبیلیہ اپنی تاریخ کے اکثر دور میں طرب و سرور کا شہر ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ مشہور رہا ہے۔

جب اندلس سے عربوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو ساتھ ہی اس شہر کی رونق وآبادی اور چہل پہل کا بھی خاتمہ ہوگیا پہلے کثرت آبادی کے لحاظ سے اس کا شمار اندلس کے بڑے شہروں میں تھا۔ لیکن عربوں کی جلاوطنی اور ہجرت کے بعد اس کی آبادی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی یہاں تک کہ اس وقت اس کی کل آبادی صرف ۱۴۸۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے۔ آبادی کے اس حیرت انگیز تنزل کا بڑا سبب عیسائیوں کا تعصب اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا وحشیانہ سلوک ہوا۔ عربی حکومت

کے زوال کے بعد جو بدبخت لیکن قابل رحم مسلمان دشمنوں کے ظلم و جور اور تشدد کے برداشت کی اپنے اندر تاب رکھتے تھے یا اسے برداشت کرنے پر مجبور تھے وہ تو چاروناچار وہاں پڑے رہے لیکن ان کی اکثریت اسے خیرباد کہہ کر جیان، بلنسیہ غرناطہ وغیرہ ان مقامات میں جاکر آباد ہوگئی جہاں اس وقت تک بنو احمر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

غرناطہ

غرناطہ، اندلس میں مسلمانوں کا آخری پایہ تخت اور ان کی جائے پناہ تھا۔ بلنسیہ، اشبیلیہ اور قرطبہ وغیرہ کی بربادی کے بعد مسلمانوں کی حکومت صرف غرناطہ اور اس کے حدود میں محدود ہوکر رہ گئی۔ اندلس کے اکثر حصوں پر دشمنوں کی حکومت و سیادت قائم ہو جانے کے بعد اگرچہ غرناطہ میں مسلمانوں کا قدم جمانا دشوار امر تھا لیکن قدرت کو منظور تھا کہ ابھی کچھ دنوں اور مسلمانوں کی حکومت وہاں قائم رہے۔ چنانچہ بنو احمر نے اپنی شجاعت ہمت اور حسن تدبیر کے بل بوتے پر دشمنوں کے علی الرغم ایک مدت مدید تک اپنی حکومت کا جھنڈا سرنگوں ہونے سے بچایا لیکن جب کسی عمارت کی بنیادیں ہی کھوکھلی ہوگئی ہوں تو اسے کب تک گرنے سے بچایا جا سکتا ہے چنانچہ بعد کے آنے والے خلفاء کی کمزوری غفلت اور ناعاقبت اندیشی کی بناپر وہ وقت جلد آگیا کہ ہسپینیوں نے ارغون، قشتالہ کے عیسائی بادشاہوں کی مدد سے ۸۹۷ھ میں ہمیشہ کے لئے انہیں اندلس سے نکال دیا۔

بلنسیہ، قرطبہ وغیرہ کی بربادی کے بعد غرناطہ مسلمانوں کا آخری ملجا و ماوی تھا۔ عیسائیوں کے جبر و تشدد سے گھبرا کر جو مسلمان ترک وطن پر مجبور ہوتے تھے وہ غرناطہ کا قصد کرتے تھے۔ مسلمانوں کی اس ہجرت اور ترک وطن کا نتیجہ ہوا کہ وہ تمام شہر جو کسی زمانہ میں خاص چہل پہل رکھتے تھے ویران نظر آنے لگے اور ان کی آبادی اور رونق غرناطہ میں منتقل ہوگئی۔ چونکہ اس زمانہ میں مسلمان ہی ہر قسم کے علمی ادبی تعمیری صنعتی اور تجارتی وغیرہ کمالات کے جامع تھے اور ہر قسم کے ہنر انہی کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے تھے اس لئے جب یہ اندلس کے ہر ہر گوشہ کو سمٹ کر غرناطہ میں آگئے تو ان کے ساتھ ہر قسم کے کمالات صنعتیں، دستکاریاں وغیرہ بھی سمٹ آئیں شاہان بنو احمر نے جس طرح ان مہاجر مسلمانوں کی پذیرائی کی، اسی طرح ان علوم و فنون اور صنائع کو بھی اپنے یہاں جگہ دی جو اندلس کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کے زوال کے بعد کس مپرسی کی حالت میں تھے اسلامی سلطنت کے اس آخری دور میں علوم فنون تجارت صنعت اور حرفت کو جو فروغ ہوا اس نے قرطبہ کا پہلا دور ترقی بھی ایک حد تک بھلا دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ عہد زیادہ دنوں تک قائم نہ رہا۔ جن اسباب نے اندلس کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کا تختہ حکومت الٹ دیا تھا، انہی اسباب نے یہاں سے بھی ان کی حکومت کا خاتمہ کردیا۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کی بربادی کے بعد ایک غرناطہ باقی تھا جہاں مسلمان ہجرت کرکے جا سکتے تھے لیکن جب غرناطہ کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا تو اس سرزمین اندلس میں جہاں ان کی آٹھ سو سال تک حکومت قائم تھی، ایک جگہ بھی ایسی باقی نہ رہی جو انہیں اپنی پناہ میں لے سکے مسلمانوں کو اپنے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا۔ بہت سے دشمنوں کی تلواروں کا لقمہ بن گئے، کچھ

زبردستی عیسائی بنائے گئے اور جو باقی رہ گئے وہ صحرا افریقہ میں سسک سسک کر مر گئے۔ اس ناسعود ساعت کے بعد سرزمین
اندلس مسلمانوں کے وجود سے بالکل خالی ہوگئی البتہ ان کے وہ آثار باقی رہ گئے جو عیسائیوں کے مٹانے سے بھی نہ مٹے
اب بھی آثار ہیں جو اس سرزمین پر عربی دور حکومت کی یادگار ہیں۔

اسلامی دور حکومت میں غرناطہ کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا تعلق رہا ہے اور آخری دور میں تو وہ ہر طرف سے سمٹ کر
یہیں آگئے تھے اس لئے یہاں ان کے ہر قسم کے آثار بکثرت پائے جاتے ہیں۔ عربوں کے آثار پر عمومی حیثیت سے بحث تو
آگے کہیں آئے گی اس وقت اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے مشہور عمارتوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہاں صرف قصر حمراء کا تذکرہ
کر دیا جاتا ہے۔

قصر حمراء

قصر حمراء غرناطہ کی ایک نہایت مشہور عمارت ہے۔ اس کا دوسرا نام قصبۃ الحمراء ہے۔ چونکہ اس کی دیواریں سُرخ ہیں
اس لئے وہ حمراء کے نام سے مشہور ہے یہ شہر غرناطہ سے بالکل متصل ایک پہاڑ کی بلندی پر قائم ہے اس کا حسن و جمال اور
وسعت حد بیان سے باہر ہے اس کے حدود میں جو عمارتیں داخل ہیں ان میں قلعہ اور تین اور خاص عمارتیں قابل ذکر
ہیں ان میں سے ہر ایک مختلف زمانوں میں تعمیر ہوئی ہیں۔ پہلی عمارت محمد ثالث کے زمانہ میں تعمیر ہوئی جو ابن خطیب
کے بیان کے مطابق اس کے دور حکومت کا نہایت عظیم الشان اور قابل فخر کارنامہ ہے۔ یہ عمارت اصل میں جامع مسجد
تھی لیکن عیسائیوں کے تسلط کے بعد کنیسہ میں تبدیل ہوگئی ہے۔

دوسری عمارت قصر آس کہلاتی ہے۔ یہاں بادشاہ کا دربار ہوتا تھا اور یہیں امراء اور اعیان سلطنت کو شرف
باریابی بخشا جاتا تھا۔

تیسری عمارت جو ان دونوں عمارتوں سے کسی قدر الگ واقع ہے بادشاہ کے رہنے کا خاص محل تھا اسی محل کے درمیانی
حصہ میں وہ عجیب و غریب حوض ہے جو سنگ مرمر کے بارہ شیروں پر قائم ہے اور جن کے منہ سے پانی جاری ہوتا ہے۔ صحن کے
بالائی حصہ سے فوارے چھوٹتے رہتے ہیں۔

سفراء سے ملاقات کرنے کا ہال نہایت خوشنما اور قسم قسم کے نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ دیواروں پر رنگ برنگ کی
دلکش تصویریں نہایت مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ ایک خاص عمارت "قاعۃ الاختین" کے نام سے
مشہور ہے۔ اس کے نقوش عربوں کی نقش نگاری کا نادر نمونہ ہیں۔ غالباً شاہی بیگمات یہاں جاڑوں کے ایام میں بیٹھا
کرتی تھیں۔ یہ عمارتیں اپنی خراب و خستہ حالت میں بھی عرب سلاطین کے جاہ و جلال اور سطوت و جبروت کے اثرات دل
پر نقش کر دیتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود بخود صفحۂ ارض پر قائم ہوگئیں ہیں اور صانع قدرت کے
سوا کسی معمار نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ قصر حمراء کے قریب ہی ایک شاندار اور وسیع باغ ہے جس میں ہر قسم کے

پھول اور درخت موجود ہیں۔ سرو کے درخت بکثرت ہیں۔ ان میں سے ایک کو "سلطانی سرو" کہتے ہیں یہ ۶۰۰ سال کا پرانا درخت بتایا جاتا ہے اس کے ساتھ بعض تاریخی واقعات وابستہ ہیں۔ اس باغ کا نام "عُریف" ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل تک غرناطہ میں "عریف" جیسے تقریباً سو باغ موجود تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت وہاں کے باشندوں کے مذاق اور تمدن کا درجہ کتنا بلند تھا۔

قصر حمرا یوں تو اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کے ابتدائی دور ہی میں تعمیر ہو چکا تھا لیکن اس کو حقیقی شہرت و عظمت اس وقت حاصل ہوئی جبکہ شاہان بنو احمر نے غرناطہ کو اپنا مستقل دارالسلطنت قرار دیا۔ غرناطہ کے پایہ تخت ہو جانے کے بعد اس کی شان و شوکت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ خود قصر حمرا کے حدود میں بعض شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں محمد ابن احمر نے اپنے دور حکومت میں قلعہ اور شہر پناہ کے قریب ایک شاندار شاہی محل تعمیر کیا جو حمرا کی قابل ذکر عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

قصر حمرا کی عمارتیں اپنے جمال اور دلکشی میں اس طرح بے مثال واقع ہوئی ہیں کہ کہا جاتا ہے فرڈینڈ اور ملکہ ازبیلا نے جب غرناطہ پر قبضہ کیا تو گو وہ اندلس کو نہ صرف عربوں کے وجود سے بلکہ ان کے ہر قسم کے آثار سے بھی پاک کرنے کے لئے بیتاب تھے لیکن ان کے دلوں کو ان عمارتوں نے اس طرح موہ لیا کہ انہیں یہ گوارا نہیں ہوا کہ ایسی حیرت انگیز عمارتیں بے دردی کے ساتھ تلف کر دی جائیں چنانچہ انہیں محفوظ رکھا اور ان کی اصلاح و ترمیم کے لئے باقاعدہ عربی انجینیر مقرر کئے۔

کہا جاتا ہے کہ شارلکان کو عربی آثار بالخصوص حمرا کی عمارتوں کی حفاظت کا بہت خیال تھا۔ مشہور ہے کہ جب پہلی مرتبہ اس کی نظر حمرا کے آثار پر پڑی تو بے ساختہ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے:۔
کتنے بدبخت تھے جنھوں نے ان عمارتوں کو برباد کیا۔

سرگذشت حمرا

حمرا کی عمارتیں اس وقت تک مختلف حوادث روزگار سے دوچار ہو چکی ہیں۔ حملوں کے موقعوں پر انہیں جو صدمے پہونچے ان کا تو ذکر ہی کیا متعدد بار وہ زمانہ کی دیگر آفات کا بھی ہدف بن چکی ہیں ۱۵۲۲ء میں ایک سخت زلزلے نے انھیں بہت نقصان پہونچایا۔ ۱۵۹۰ء میں بارود خانہ میں آگ لگ جانے کی وجہ سے اس کی عمارات کا بہت کچھ حصہ جل گیا ۱۸۱۲ء میں نپولین کی فوج نے اسے قلعہ سمجھ کر اس کا ایک حصہ بارود سے اڑا دیا۔

عربوں کی جلاوطنی کے بعد اسپین کے بادشاہوں نے حمرا کی عمارتوں کے ساتھ اگرچہ وہ برتاؤ نہیں کیا جس کی وہ مستحق تھیں لیکن یہی بہت غنیمت تھا کہ ان کے ساتھ کوئی برا برتاؤ نہیں کیا بلکہ اس کی ترمیم و اصلاح کے لئے عرب انجینیروں کی خدمات حاصل کیں جنھوں نے انتہائی کمال اور مہارت کے ساتھ ان عمارتوں کے خراب حصوں کی اس طرح اصلاح کی کہ وہ اصل سے مل گئے۔ لیکن سترھویں صدی کی ابتدا سے لیکر اٹھارویں صدی کے وسط تک ان کی طرف سے

بے پروائی بہت زیادہ بڑھ گئی اس کے کسی حصہ کو توپخانہ بنا دیا گیا کسی حصہ میں فوج رہنے لگی بعض بعض حصوں کو بیکار سمجھ کر فقیروں اور معمولی پیشہ وروں نے آباد کر لیا۔ اس زمانہ میں ان عمارتوں کی حالت بہت خراب و خستہ تھی، رہنے والوں کی بدسلیقگی اور بے پروائی کی بنا پر برا حال تھا، بارود میں آگ لگ جانے اور گولہ باری ۔ ۔ ۔ ۔ کی وجہ سے بارہا اس کو بہت شدید نقصان پہونچا۔ بعض دیواریں منہدم ہوگئیں، بہت سے نقوش مٹ مٹا گئے، ممکن ہے اسی دور غفلت میں عربوں کے شاندار تمدن و تہذیب کی یہ حیرت انگیز یادگاریں ہمیشہ کے لئے مٹ جاتیں لیکن حکومت نے پسند نہ کیا کہ ان عمارتوں کو شاید آنے والی نسلوں کے سخت مطاعن کا ہدف بنے۔ اس لئے ایک مدت دراز کی غفلت و بے پروائی کے بعد ان کی حفاظت و بقا کا اسے خیال آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ یہ عمارتیں بالکل تلف ہونے سے بچ گئیں اور کسی نہ کسی حال میں ان کی بقا کا سامان ہوگیا لیکن یہ التفات ہر دور میں یکساں باقی نہیں رہا بلکہ مختلف بادشاہوں کے زمانوں میں ان کے ذوق و رجحان اور عقل و فہم کے مطابق گھٹتا اور بڑھتا رہا۔

شارلکان کی عمارتیں

اسی قصر میں جسے شہر کہنا زیادہ موزوں ہے، عربوں کے آثار کے علاوہ وہ قدیم محل بھی موجود ہے جسے ۱۵۲۶ء میں شارلکان نے مسلمانوں کے مال جزیہ سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے دور کی بعض اور ناتمام عمارتیں بھی موجود ہیں جو غالباً سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اختتام کو نہ پہونچ سکیں۔

حمرا کی عمارتوں کے پہلو میں ان عمارتوں کی تعمیر سے شارلکان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے مقابل میں عربوں کے آثار کو بے حقیقت کر دکھائے اور لوگوں کی توجہ ان کی طرف سے پھیر کر اپنی عمارتوں کی طرف مائل کر دے لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی حمرا اب بھی ایک فقید المثال عمارت کی حیثیت سے موجود ہے اور دیکھنے والوں کے قلب و دماغ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک انگریزی مصنف نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "شارلکان نے اپنی عمارتیں اگر کہیں اور بنائی ہوتیں تو فن تعمیر کا نہایت عمدہ نمونہ ہوتیں لیکن حمرا کے مقابلہ میں ان کی حیثیت بالکل ہیچ نظر آتی ہے۔" عربوں کے زمانہ عروج میں قصر حمرا کی تزئین و آرائش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن قیمتی فرش فروش سے ہوتی تھی اور وہاں جو خوبصورت برتن وغیرہ استعمال ہوتے تھے ان کے نمونے اب باقی نہیں ہیں۔ البتہ اس عہد کا ایک مٹی کا گھڑا موجود ہے جو ایک میٹر سے زیادہ لمبا ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی چمک ہے۔ اس پر مختلف حیوانات کی تصویریں اور عربی نقوش ہیں۔ یہ گھڑا غرناطہ کے زمانہ قدیم کے صنعتی کارخانوں کی یادگار ہے۔

(باقی)

تفسیر سورہ بقرہ

(۳)

(از امام جلیل سید رشید رضا مرحوم)

والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ھم یوقنون

یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جو مذکورہ بالا چیزوں پر ایمان رکھنے کا اقرار کرے قرآن سے ہدایت یاب بھی ہوسکے کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں .... جو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا قطعیت کے ساتھ زبان سے اقرار کرتے ہیں لیکن ان کا دل مومن نہیں ہوتا جب ان کے اعمال واحوال کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔ قرآن غیبت، جھوٹ اور چغل خوری سے منع کرتا ہے لیکن وہ لوگوں کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ چغل خوری کرتے ہیں اور جھوٹ بولنے کو کوئی گناہ کا کام نہیں خیال کرتے۔ قرآن غور وفکر کا حکم دیتا ہے لیکن ان کا حال ان مکذبین کے مشابہ ہوتا ہے جن کے وصف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

بل ھم فی غمرۃ ساھون	بلکہ وہ غفلت میں ہیں بھولے ہوئے۔

نہ انہیں اخروی حیات کی کچھ فکر ہوتی، نہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے مستقبل کی پرواہ کرتے نہ حوادث وانقلابات سے عبرت پذیر ہوتے اور نہ آیات دنیا میں تدبر کرتے۔

آیت کریمہ میں جن مومنین کا ذکر ہوا ہے وہ وہ نہیں ہیں جو صرف زبان سے اپنے مومن ہونے کا اعلان کرتے ہیں بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے کو قرآن کی ہدایت کے مطابق سنوارتے ہیں۔ قرآن کو معیار قرار دے کر اپنے اعمال واخلاق کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا وہ اس پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ مثلاً قرآن نے نماز کے متعلق کہا ہے کہ وہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ (تنھی عن الفحشاء والمنکر) اور نمازیوں کے بارے میں بیان کیا ہے:۔

ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسہ الشر جزوعا واذا مسہ الخیر منوعا الا المصلین	انسان تھوڑے دل کا ہے جب اسکو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے گھبرانے لگتا ہے اور جب نعمت ملتی ہے بخل کرنے لگتا ہے مگر وہ جو نمازی ہیں اور جو اپنی نمازوں کو کبھی نہیں چھوڑتے

گویا نماز ان بری صفات کو بھی جن کے فطری ہونے کا گمان ہوتا ہے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ پس اگر کوئی نماز پڑھے پھر بھی بد خلقی، خوف، بخل اور طمع کا شکار رہتا ہے تو اسے کہنا چاہیے کہ وہ قرآن کی اصطلاح میں نمازی نہیں ہے اور نہ وہ ان انعامات واکرام کا مستحق ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے نمازیوں سے وعدہ فرمایا ہے

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایتیں اور انعامات بندوں کو ملتے ہیں انہیں قرآن میں لفظ انزال سے جس کے لغوی معنی کسی چیز کو بلندی سے نیچے لانے کے ہیں۔ تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی ذات باکمال رب اور خالق ہونے کی وجہ سے علو اور رفعت کی مالک ہے اور انسان عام مخلوقات کے مقابلہ میں اگرچہ بہت زیادہ سرفراز کیا گیا ہے لیکن بہر حال اس کا بندہ ہے۔ قرآن نے وحی کے علاوہ خدا کے دوسرے انعامات کو انزال سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً

وَاَنزَلنَا الحَدِیدَ فِیہِ بَاسٌ شَدِیدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔ ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں

پھر فرمایا وَبِالاٰخِرَۃِ ھُم یُوقِنُون اور آخرت کو وہ یقینی مانتے ہیں

آخرت کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے اس سے مراد آخرت کی زندگی یا دار آخرت ہے جہاں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ نصوص قطعیہ میں دوزخ، جنت وغیرہ کے جو احوال بیان کئے گئے ہیں ان سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

یقین اس اعتقاد کو کہتے ہیں جو واقع کے مطابق ہو اور شک اور زوال سے محفوظ ہو۔ گویا یقین دو اعتقاد کا نام ہے ایک یہ کہ فلاں چیز یوں ہے دوسرے یہ کہ دوسری طرح نہیں ہو سکتی ہے۔

یقین کی یہ تعریف استاذ امام نے اپنے درس میں فرمائی تھی۔ اور یہی تعریف مناطقہ اور متکلمین کے نزدیک مسلم ہے لیکن لغت میں عیر حسی اور غیر بدیہی چیزوں پر اعتقاد محکم رکھنے کو یقین کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی سچا شخص کوئی خبر سنائے اور اس پر اطمینان ہو جائے یا دلائل اور براہین کی روشنی میں کوئی اعتقاد قائم کر لیا جائے تو یقین کہلائے گا بشرطیکہ اس میں کوئی شک باقی نہ رہے۔ لسان العرب میں یقین کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ العلم و ازاحۃ الشک و تحقیق الامر وھو نقیض الشک والعلم نقیضہ الجھل۔ ایمان شرعی کے لئے صرف لغوی یقین کی شرط ہے یعنی ایسی تصدیق جس میں شک اور تردد نہ ہو اور اس پر ظن کی تعریف صادق نہ آئے لغوی یقین کے مقابلہ میں منطقی یقین زیادہ اکمل ہے۔ اسی منطقی یقین کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے استاذ امام نے یہ مبسوط تقریر ارشاد فرمائی :-

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان متقین کی وصف میں جو قرآن اور گذشتہ آسمانی صحیفوں پر ایمان لاتے ہیں ایمان بالآخرت کو ذکر فرمایا اس سے پہلے جس جماعت کا تذکرہ ہوا ہے اس کے وصف میں یہ صفت نہیں بیان کی گئی ہے کیونکہ وہ لوگ اگرچہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اپنی مخصوص نماز کے ذریعہ خدا کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے دئے ہوئے رزق سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں لیکن یہ سب کچھ قیامت اور جزا میں متحیر ہونے کے منافی نہیں۔ ان سب اعمال کے باوجود بھی وہ لوگ قرآن پر ایمان لانے سے پہلے روز قیامت اور جزا و سزا کے بارے میں متحیر تھے۔ قرآن نے ان کی اس طرح ہدایت کی کہ انہیں ان حیرانیوں کے سمندر سے نکال دیا۔

وہ ایمان جو یقین سے خالی ہو، شریعت میں معتبر نہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کے اعتقاد کے

؛ فرمایا ہے :-

ہ بہ من علم ان یتبعون الا الظن وان ان کو اس کی کچھ خبر نہیں، محض اٹکل پر چلتے ہیں اور اٹکل ٹھیک بات

لا یغنی من الحق شیئاً (۵۳ : ۲۸) میں کچھ کام نہیں آتا۔

ن یقین کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا اور ظنی اعتقاد معتبر نہیں قرار پاتا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کا درجہ ظن رکھنے والوں سے بھی نیچے ہے یعنی جو شک اور ریب میں مبتلا ہیں۔

اللہ اور یوم آخر پر یقین رکھنے کا حال اعمال کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ اپنے بھائی کا حق لینے کے لئے عدالت میں بالکل جھوٹے دعوے کرتے ہیں یا کسی کو نقصان پہنچانے یا کسی سے انتقام لینے کے لئے جھوٹی شہادتیں دیتے ہیں درآن حالیکہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے دعوے اور شہادت میں جھوٹے ہیں۔ اگر ان سے کہا جاتا ہے خدا سے ڈرو اور قیامت کی فکر کرو تو وہ نہایت صفائی سے اعتراف کرتے ہیں کہ بیشک قیامت کا آنا برحق ہے ایک نہ ایک دن قبر میں جانا ہے اور دنیاوی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس کے مقابلہ میں اس دنیا کی کوئی حیثیت نہیں لیکن ان سب اعترافات کے باوجود وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے جھوٹے دعوے یا جھوٹی شہادت کے صحیح ہونے پر قسمیں کھاتے ہیں۔ اور جب تحقیق کی جاتی ہے تو ان کا کذب واضح ہو جاتا ہے اور وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ایمان گویا ایک معمولی خیال ہے جو ان کے ذہن و دماغ میں اس وقت دوڑنے لگتا ہے جب کسی کا مال غصب کرنا ہوتا ہے یا نفس کو خوش کرنے کے لئے کسی کو فریب یا آزار میں مبتلا کرنا ہوتا ہے ان کے ایمان کا ان کے اعمال و افعال پر اتنا بھی اثر نہیں ہوتا جتنا بعض مردہ مشائخ پر اعتقاد رکھنے کا ہوتا ہے جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے۔ پس اس قسم کا ایمان اگرچہ لوگوں کے نزدیک ایمان کہلاتا ہے لیکن یہ وہ ایمان نہیں ہے جس کی بنیاد ایقان پر قائم ہوتی ہے اور جس کا اثر اعضا و جوارح سے نمایاں ہوتا ہے۔"

آثار یقین پر مفصل گفتگو کرنے کے بعد فرمایا :- کسی چیز پر یقین رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز تمہارے احساس پر بالکل چھا جائے اس کا علم اس درجہ قوی ہو جائے کہ وہ تمہارے نفس پر پوری طرح قابض و متصرف ہو جائے۔ لیکن ایمان کے اندر یہ خاصیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ حسب ذیل دو صورتوں سے حاصل ہو۔

(۱) جو باتیں فکر و نظر کی محتاج ہیں انہیں غور و فکر اور دلائل و براہین کی روشنی میں قبول کیا جائے۔ اللہ کا وجود اور رسول کی رسالت وغیرہ، ایمان کی باتوں کا علم ایسے صادق و معصوم کے ذریعہ حاصل ہو جس کی صداقت و عصمت تمہارے نزدیک دلائل سے ثابت ہو۔ کوئی خبر یقین کا باعث اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ تم نے خود آپ معصوم صلعم سے نہ سنا ہو یا کم از کم ہم تک ایسے طریق سے نہ پہونچی ہو جس میں شک کا کوئی گمان نہ ہو سکے۔ یہ بات صرف تواتر کے اندر پائی جاتی ہے ہمارے اور دور نبوت کے درمیان اتنا طویل زمانہ گذر گیا ہے کہ اب ہمارے یقین کا سرچشمہ صرف ایسی متواتر خبریں ہیں جن کے

وقت میں کسی کو اختلاف نہ ہو۔ پس غیب کی باتوں پر، آخرت اور اس کے احوال پر، ملاء اعلیٰ اور اس کے اوصاف پر اور اللہ تعالیٰ کی ان صفتوں پر جن کی طرف غور و فکر سے رہنمائی نہیں ہوتی[۱]۔ یقین کرنے کا ذریعہ صرف قرآن کریم ہے۔ اس لئے قرآن نے جن چیزوں کی ہمیں خبر دی ہے ہمیں وہیں تک رہنا چاہئے اور اپنی طرف سے ان میں غلط اضافہ اور قیاس آرائی نہیں کرنی چاہئے۔

ایقان بالآخرت کی اہمیت واضح کرنے اور یہ بیان کرنے کے لئے کہ آخرت پر یقین رکھنا صرف انہی لوگوں کا کام ہے جو قرآن پر ایمان رکھتے ہیں یہاں ضمیر فصل (ھم) (وبالآخرۃ ھم یوقنون) لائی گئی۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ آخرت کی جن باتوں پر ایمان لانا ہوتا ہے ان کا قطعی ہونا ضروری ہے۔ اس لئے وہ تمام باتیں جنہیں لوگوں نے خواہ مخواہ اخبار غیب میں داخل کر دیا ہے، ان سے متعلق جھوٹی حدیثیں گھڑ لی ہیں یا وہ اقوال جو اہل کتاب کے ہیں یا جو غلط طریقے سے سلف کی طرف منسوب ہیں یا بعض وہ جو اعتبار ہونا نہ دعویوں سے بیان کئے ہیں یہ سب قابل یقین باتوں میں داخل نہیں بلکہ ان میں اکثر باتیں ایسی ہیں جن سے ناواقف رہنا ہی بہتر ہے۔ اہل قرآن کا امتیازی وصف یقین ہے اور جب تک کوئی بات قطعی دلائل سے نہ پہونچے اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اہل قرآن کو ظنیات سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ظن[۲] ان لوگوں کے وصف میں داخل ہے جن کی قرآن نے شدت کے ساتھ مذمت کی ہے۔

اولئک علیٰ ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون — وہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہونچنے والے ہیں

اس آیت میں دو اشارے ہیں لیکن جمہور کے نزدیک دونوں کا مشار الیہ ایک ہی ہے۔ ان سے وہ مومنین اہل کتاب و مومنین غیر اہل کتاب مراد ہیں جن کا پچھلی دو آیتوں میں تذکرہ ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اسم اشارہ مکرر یہ ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ ہدایت پر ہونے اور مراد پر پہونچنے کیلئے دونوں وصفوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن یہ تکلف ہے یہی حال اس قول کا بھی ہے کہ یہاں ہدیٰ کی تنکیر تعظیم کے لئے ہے۔ ہمارے شیخ کا خیال ہے کہ اس آیت میں لف و نشر کے اسلوب پر ان دونوں اشاروں سے مومنین کی ان دو الگ الگ قسموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا ہے۔ استاذ امام فرماتے ہیں کہ پہلا اشارہ (اولئک علیٰ ھدی من ربھم) اپنی جماعت کے لئے ہے یعنی ان لوگوں کے لئے جو ایک حد تک لذت حق سے آشنا ہونے کی وجہ سے

---

[۱] خدا کی بہت سی صفتیں ایسی ہیں جو غور و استدلال کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہیں مثلاً علم، قدرت، مشیت، وحدت اور بعض ایسی ہیں جن کا علم وحی اور خبر معصوم پر موقوف ہوتا ہے اور یہ عموماً ایسی ہوتی ہیں جو تمثیل کے رنگ میں متشابہات میں داخل ہیں مثلاً غضب، ید، استواء وغیرہ۔ اس کا بیان آگے مناسب موقع پر آئیگا۔ متشابہات کی تفسیر سورہ آل عمران کی ابتدا میں ملے گی۔

[۲] ظن اور ظنیات کے ضمن کے معنی جو علم ہوتا ہے اسی پر تحری یقین کی تعریف صادق آتی ہے جیسا کہ گذر چکا۔

حق کے منتظر ہیں یہ جماعت حق وہدایت سے کسی قدر آشنا ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں ہدی کو نکرہ لایا گیا ہے جو نوع پر دلالت کرتا ہے۔ یہ جماعت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت کی منتظر رہتی ہے اسی لئے جونہی ان تک پہونچتی ہے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں ان کا دل بوجہ ایمان بالغیب اقامۃ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے اس کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔

لیکن دوسری جماعت (یعنی وہ لوگ جو آنحضور صلعم کی لائی ہوئی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں) گو یہ اور پہلی جماعت دونوں ہدایت میں شریک ہوتی ہیں لیکن اس دوسری جماعت کی ہدایت زیادہ کامل ہوتی ہے پہلی جماعت کے افراد جس بصیرت و ہدایت کے مالک ہوتے ہیں وہ اگرچہ فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں ہوتی لیکن انھیں تفصیلی ایمان کے ذریعہ اس کا اہل بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ چنانچہ جونہی ان کے کانوں میں حق کی دعوت پہونچتی ہے وہ فوراً اسے قبول کر لیتے ہیں۔

دوسرے فرقہ کی طرف واولئک ہم المفلحون سے اشارہ کیا گیا۔ اس فرقہ کے افراد کے فلاح وسعادت کی وجہ مطلق غیب کا اجمالی ایمان نہیں ہوتا بلکہ اس کا باعث قرآن، گذشتہ آسمانی صحیفوں اور قیامت کا کامل ایمان ہوتا ہے۔ اس آیت میں دونوں اشاروں کے دو الگ الگ مرجع ہونے کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ضمیر فصل صرف دوسرے میں لائی گئی ہے۔ اگر دونوں اشاروں کا مشارالیہ ایک ہی ہوتا تو پہلے میں بھی ضمیر فصل لائی جاتی۔ قرآن پر ایمان لانے والے ہی حقیقت میں صحیح اور کامل ہدایت پر ہوتے ہیں گویا صحیح اور کامل ہدایت صرف ان کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اگرچہ اس آیت میں اس کی تصریح نہیں کی گئی لیکن ان کے لئے فلاح کو مخصوص ثابت کرنے کا مقصود یہی واضح کرنا ہے۔

فلاح کا اطلاق مقصد میں کامیابی پر ہوتا ہے لیکن اگر کامیابی بغیر محنت و مشقت اور سعی وارادہ کے حاصل ہو جائے تو ایسے فلاح کے لفظ سے اور نہیں کریں گے۔ اس لفظ کے اطلاق کے لئے ضروری ہے کہ حصول مطلوب میں جدوجہد سے کام لیا گیا ہو۔ اس لئے اس آیت میں جن لوگوں کے لئے فلاح ثابت کی گئی ہے ان کی فلاح گذشتہ اور موجودہ صحیفوں پر ایمان لانے۔ اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب کرنے اور قیامت کے دن جزا و سزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ ہے کذب و بہتان کو چھوڑنا، نفس کو طمع خوف بخل اور تمام فواحش و منکرات اور صفات بد سے محفوظ رکھنا اور ان تمام فضائل سے آراستہ ہونا جنھیں خدا نے اعمال صالحہ میں گنایا ہے ایمان میں داخل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان بما انزل الی النبی میں شریعت کی تمام باتوں پر ایمان لانا داخل ہے۔ اس لئے شریعت کی وہ باتیں جو یقینی طور پر ثابت ہیں اور ان پر کوئی قابل لحاظ اختلاف نہیں ہے، ان کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ ان پر ایمان لانا ایمان ہے اور ان کا انکار کرنا کفر ہے۔ ایسی ہی چیزوں کو اسلامی وحدت اور ارتباط کا وسیلہ بنانا چاہئے۔ البتہ وہ چیزیں جن کے ثبوت اور علم کا درجہ اس سے فروتر ہو انھیں مجتہدا کے اجتہاد پر چھوڑ دینا چاہئے اور ایسی چیزوں کو دین میں اختلاف کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔

استاذ امام نے مجتہدین کے اجتہاد کے بعد اپنے قلم سے اتنی عبارت اور بڑھا دی :-

یا عاملین کے ذوق اور ناقلین روایت کے اعتماد پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ یہ لوگ چھان بین اور تحقیق کے بعد [illegible]

اعتماد سمجھیں تو ان پر عمل کریں۔ لیکن ان لوگوں کے لئے یہ زیبا نہیں کہ ان میں سے جو چیزیں ان کے نزدیک ثابت ہو جائیں دوسروں کے لئے انھیں لازم قرار دیں کیونکہ اگر ناقل کو منقول منہ پر اعتماد ہو جائے تو اس سے یہ کچھ ضروری نہیں ہو جاتا کہ دوسرے بھی اس پر اعتماد کرنے لگیں اس لئے کہ یہ اعتماد منقول منہ کے احوال و اخلاق اور اندرونی باتوں کے علم پر موقوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو بعض احادیث کی نادر صحت پر اطمینان ہو جائے اور وہ انھیں صحیح معلوم ہونے لگیں تو وہ ان کے لئے حجت ہو جائیں گی لیکن دوسروں کے لئے وہ حجت اور قابل عمل نہیں قرار دی جا سکتیں۔ اسی لئے صحابہ کرام جو حدیثیں سنتے تھے وہ ان کو نہیں لکھتے اور نہ ان کی طرف دعوت دیتے تھے۔ حالانکہ وہ قرآن کی اتباع اور عمل شیخین سنت اور احادیث پر عمل کرنے پر زور دیا کرتے تھے اور اسی بناء پر حضرت امام مالک نے خلیفہ منصور اور ہارون رشید کو اپنی کتاب موطا … یہاں تک کہ موطا پر بھی عمل کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کرنے کی اجازت نہیں دی۔ آحاد احادیث پر عمل کرنا صرف انہی لوگوں پر واجب ہے جو حدیث و دلالت میں صحیح سمجھتے ہوں۔ اگر کسی کو کسی کی روایت پر اعتماد ہو تو اسے اس کو اخذ کرنا چاہئے لیکن دوسروں کے لئے حجت نہیں بن سکتی … عاملین کا ذوق تو وہ بالاجماع کوئی شرعی حجت نہیں۔ البتہ شبہات میں قلب کی استفتا کیا جا سکتا ہے اور تعارض دلائل کے وقت وہ اطمینان پیدا کیا جا سکتا ہے۔

"چڑیوں کا گھونسلا"

رومیوں کا ایک وفد حضرت امیر معاویہ سے ملنے کے لئے دمشق آیا۔ وہ امیر معاویہ جو تمام رومی عظمت کے وارث تھے! جنھوں نے شام کو قیصر کی عظیم الشان رومی تمدن و حکومت سے چھین کر خلافت اسلامیہ کا دارالسلطنت اور اس نے دین کا مرکز بنایا تھا جس کی بے پناہ قوت نے قیصر و کسریٰ کی تمام سلطنت پارہ پارہ کر ڈالی تھی

وفد نے دمشق پہونچکر دارالخلافت کا پتہ پوچھا لوگوں نے پتہ بتایا۔ ارکان وفد کو نہایت تعجب ہوا انھوں نے کہا "یہ تو چڑیوں کا گھونسلا ہے" حضرت امیر معاویہ نے … مکان کو منہدم کرا دیا۔ اور ایک نئی عمارت کی داغ بیل ڈالی اور ایسی پرشکوہ عمارت بنوائی کہ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد … ایک یادگار چھوڑیں جو ایک ایک کرکے دست برد زمانہ کے نذر ہو گئیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ عبدالعزیز ابن مروان نے فسطاط میں عمرو بن العاص کی جامع مسجد کے متصل ایک محل بنوایا اور اس کی وسعت عظمت کی وجہ سے اس کا نام "مدینہ" رکھا اس کے تمام گنبدوں پر سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے۔

جب بنو امیہ کا آخری خلیفہ مروان ابن محمد عباسی فوجوں کے خوف سے بھاگ کر مصر آیا تو پہلے فسطاط میں اقامت گزیں ہوا لیکن خبر ملی کہ عباسی لشکر برابر اس کے تعاقب میں ہے وہ دریائے نیل عبور کرکے جیزہ چلا گیا اور فسطاط کو جلا دینے اور قصر مدینہ کو ڈھانے کا حکم دے دیا ایک امیر نے ملامت کی کہ آپ عبدالعزیز ابن مروان کے اس محل کو منہدم کرتے ہیں جس کی تیاری میں پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا ہے مروان نے کہا "اس کا غم نہ کرو اگر میں بچ گیا تو اس کو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے دوبارہ تعمیر کرادوں گا" (الاصلاح)

ہندوستان کی آخری ہچکی

(از مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی)

(بسلسلہ فاران ۱۵ نومبر ۱۹۳۰ء)

(۳)

اس مضمون کے دو نمبر فاران کے دو پچھلے پرچوں پر شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اس کی تیسری قسط ہے۔ اسے دسمبر کے فاران میں شائع ہونا چاہئے تھا لیکن افسوس ہے کہ اپریل میں شائع ہو رہی ہے۔ مولانا نجیب آبادی صاحب پچھلے دنوں اپنے بعض عزیزوں کی علالت اور ان کی تیمارداری کی نہایت پریشانیوں اور مصروفیت میں رہے اس لئے وہ مضمون کی تکمیل کی طرف توجہ نہ ہو سکے۔ اُمید ہے کہ اب اس کا بقیہ حصہ مسلسل شائع ہوتا رہے گا۔ مضمون کا پیش نظر حصہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت آموز بھی ہے اور یہی وہ زمانہ ہے کہ جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں موجودہ افتراق کے بجائے کامل اتحاد تھا اور جبکہ انگریز بھی ہماری ملکی زبان اُردو سیکھنے پر مجبور تھے اس مضمون میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر دہلی اور آگرہ سے ہے اس لئے اس علاقہ کے باشندوں کے لئے اس مضمون کا مطالعہ خصوصیت کے ساتھ دلچسپی کا موجب ہوگا۔ (فاران)

بھرت پور کا محاصرہ

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جس وقت راؤ ہلکر ڈیگ میں پہونچ گئے جنرل فریزر اور لارڈ لیک نے ہرناتھ چیلے کے شکست یاب ہونے کے بعد اس کی توپوں پر قبضہ پالیا تھا انہیں توپوں سے ڈیگ پر گولہ باری کی گئی۔ جسونت راؤ ہلکر کی فوج سے بعض سردار جدا ہو کر انگریزوں سے جا ملے۔ ہلکر کے وکیل بھاؤ بھاسکر نے بھرت پور پہونچکر بھرت پور کے راجہ رنجیت سنگھ کو جسونت راؤ ہلکر کا ہمدرد اور دوست بنا دیا تھا لہٰذا جسونت راؤ ہلکر ڈیگ سے چلکر بھرت پور آئے اپنا توپخانہ اور مع فوج کی جمعیت اور ریا بوسندھیا وغیرہ دس ہزار کی جمعیت کو فصیل شہر کے نیچے انار دروازہ کے متصل بجانب مغرب مقیم کیا اور خود متھرا دروازے سے اٹل بند دروازے تک بجانب شمال ومشرق مقیم ہوئے۔

انگریزی لشکر فتح ڈیگ کے بعد قریباً پچاس ہزار سوار و پیادہ اور عظیم الشان توپخانے کے بھرت پور کی طرف آیا اور بھرت پور سے دو کوس کے فاصلے پر خیمہ زن ہوا۔ بھرت پور کے راجہ رنجیت سنگھ نے لیک صاحب کے پاس خط بھیجا کہ میں ایک معمولی زمیندار ہوں آپ ہندوستان کے مالک ہیں مجھ سے لڑنا آپ کی شان کے شایاں نہیں میں معذور ہوں اور اقتضائے مروت امان خواہ کو امان دینے پر مجبور ہوں۔ اس خط کا لیک صاحب نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور حملہ کی دھمکی دی۔ اب

نواب امیر خاں کا حال سنئے وہ بھیلسے میں محاصرہ جمائے ہوئے پڑے تھے کہ ان کے پاس مہاراج جسونت راؤ کا خط پہونچا کہ مدد کو پہونچو انھوں نے جواب لکھا کہ میں اس وقت جبکہ بھیلسہ فتح ہونے والا ہے محاصرہ چھوڑ کر نہیں آسکتا بھیلسہ کے محاصرے کو دو مہینے ہوئے تھے اور اسی عرصہ میں نواب امیر خاں بیمار بھی ہوگئے تھے . . . . آخر امیر خاں نے صحت بھی پائی اور بھیلسہ بھی فتح ہوگیا۔ یوسف خاں عامل سرونج کو بھیلسہ سپرد کرکے بعد پورے ارادے سے کوچ کیا مقام گنج باسودہ پہونچے۔ یہاں فوج بھیلسہ چھوڑ آئے تھے کچھ یہاں چھوڑی اور تین سو سوار ان کے ساتھ دے کر جامر کی طرف جو بھیلسہ اور ساگر کے درمیان ہے [illegible] سے چالیس کوس کے فاصلے پر ہے کوچ کیا اور وہاں کے راجہ سے پچاس ہزار روپیہ معاملہ وصول کیا تین لاکھ روپیہ [illegible] نے [illegible] دیا راجہ گڈھ منڈلا سے بھی زر معاملہ وصول ہوا ان راجاؤں نے مشورہ دیا کہ ہم کو ساتھ [illegible] سے [illegible] پر حملہ کرو ادھر [illegible] صاحب نے جو نواب امیر خاں سے بہت ڈرتا تھا اور بندیلکھنڈ میں ان کی [illegible] دیکھ چکا تھا [illegible] صاحب [illegible] کو لکھا کہ نواب امیر خاں کو ہماری طرف سے پیام دو کہ اورنگ آباد میں [illegible] صاحب نے [illegible] ملک [illegible] دینے کا اقرار کیا تھا اب اس پر تیرہ لاکھ روپیہ کی آمدنی کا ملک اور اضافہ کرکے آپ کو سپرد کیا جاتا ہے بشرطیکہ آپ ہمارے [illegible] ترک [illegible] کردیں یہ پیام جب امیر خاں کے پاس پہونچا اور انھوں نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ [illegible] ملک [illegible] حکومت کرو ہم تم کو اس ملک سے نکال کر دم لیں گے اس عرصہ میں [illegible] کہ جس طرح ممکن ہو [illegible] چنانچہ نواب امیر خاں دیونی کور بھامر سے لوٹ کر [illegible] میں آئے وہاں سے اپنے متعلقین اور محمد شاہ خاں افسر توپخانہ اور دس بارہ ہزار پنڈاروں کے لشکر کو ہمراہ لیا اور [illegible] ہوتے ہوئے بیری کو [illegible] پہونچے یہاں [illegible] انگلیہ نے حاضر ہوکر اظہار عقیدت کیا اپنے متعلقین اور مختار الدولہ محمد شاہ خاں کو یہاں ایک مناسب جمعیت کے ساتھ چھوڑا اور خود [illegible] عبور کرکے گوالیار پہونچے وہاں چار ہزار انگریزی فوج مقیم تھی وہ خبر سنتے ہی [illegible] کی طرف روانہ ہوگئی نواب امیر خاں نے یہاں چار پانچ روز قیام کیا اس عرصہ میں انباجی انگلیہ کے پاس [illegible] صاحب کی چٹھی پہونچی اور دوسری طرف جنرل جون صاحب نے بڑودہ سے علاقہ مالوہ میں مع توپخانہ پہونچ کر لکھا کہ تم سرکار کمپنی کے دشمن کو پناہ دیتے ہو بہتر ہے کہ فوراً محمد شاہ خاں اور نواب امیر خاں کے اہل و عیال سے جدا ہو جاؤ ورنہ انگریزی لشکر کو اپنے سر پر پہونچا ہوا سمجھو انگلیہ نے ڈر کر مختار الدولہ محمد شاہ خاں کو جواب دے دیا وہ سخت متشوش ہوئے مگر راجہ [illegible] سال [illegible] نے [illegible] متعلقہ مالوہ میں محمد شاہ خاں اور اہل و عیال نواب امیر خاں کو جگہ دی [illegible] کوٹہ کے راجہ ظالم سنگھ نے اپنے [illegible] امیر محمد خاں نامی افغان کو مختار الدولہ کے پاس بھیجا اور پیام دیا کہ ہم اتنی استطاعت تو نہیں رکھتے کہ آپ کے توپخانہ اور تمام لشکر کے مصارف برداشت کرسکیں مگر [illegible] نواب امیر خاں کے متعلقین کے آرام سے رہنے کے لئے قلعہ شیرگڈھ خالی کردیا ہے آپ اس قلعہ کو کام میں لاسکتے ہیں مختار الدولہ نے اس کو بہت غنیمت سمجھا اور وہاں منتقل ہوگئے اور اس علاقہ کی تحصیل وصول شروع کردی اور فوج کی درستی میں مصروف ہوئے ادھر نواب امیر خاں نے گوالیار سے کوچ کرکے

چنبل کو عبور کیا اور دھولپور پہونچے۔ یہاں جنرل لیک صاحب کے فرستادے نواب کے پاس پہونچے اور پیغام دیا کہ آپ ہم سے
صلح کریں اور ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ روپیہ کی آمدنی کا ملک اور ایک کروڑ روپیہ نقد لے لیں نواب نے یہ جواب دے کر ایلچیوں کو رخصت
کیا کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے تم غیر ملکی لوگ ہوتے کون ہو جو ہم کو ملک و مال کا لالچ دیتے اور اپنے آپ کو ہندوستان کا مالک
سمجھتے ہو ہم تم کو ہندوستان سے خارج کر کے دم لیں گے اور اپنے ملک پر خود حکومت کریں گے۔ انگریزی ایلچیوں کے دھولپور
میں نواب کے پاس پہونچنے کا حال بھرت پور کے راجہ رنجیت سنگھ نے سنا تو مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر سے کہا کہ اگر نواب امیر خاں نے
انگریزوں سے صلح کر لی اور ہمیں تنہا چھوڑ دیا تو بڑی مشکل پیش آئے گی راجہ جسونت راؤ نے جواب دیا کہ "آپ بالکل مطمئن رہیں میں
امیر خاں کو خوب جانتا ہوں میرے اُسکے درمیان بھائی چارہ (مواخات) قائم ہے اُس کو اگر ہفت اقلیم کی بادشاہت بھی ملیگی
تب بھی وہ اپنے عہد کو نہیں توڑ سکتا میں اُس کے ساتھ دھوکا کر سکتا ہوں لیکن وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دیگا جسطرح میں نواب میاں کی
طرف سے مطمئن ہوں اسی طرح آپ بھی مطمئن رہیں جب نواب امیر خاں دھولپور سے کوچ کر کے بھرت پور سے بیس کوس کے فاصلہ پر
پہونچ گئے تو جنرل لیک صاحب نے یہ سمجھ کر کہ نواب کے بھرت پور پہونچ جانے کے بعد قلعہ کا فتح ہونا دشوار ہو جائے گا قلعہ پر سخت
حملہ کیا مگر رنجیت سنگھ راجہ بھرت پور کی بہادری ہوشیاری سے یہ حملہ ناکام ثابت ہوا اور بہت سے گورے اور تلنگے ہلاک و مجروح ہوئے

بھرت پور میں انگریزوں اور ہندوستانی سرداروں کا مقابلہ

نواب امیر خاں کے قریب پہونچنے کا حال سنکر مہاراج ہلکر نے غلامی خاں کو ایک لاکھ روپیہ کے ساتھ نواب کے استقبال
کو بھیجا اور لکھا کہ اسوقت میری تقصیر و تزویر پر کچھ خیال نہ فرمائیں آپ کا وکیل اور جرمانہ دونوں حاضر ہیں نواب نے وہ روپیہ فوج
کو تنخواہ میں تقسیم کر دیا اور کوچ کر کے فتحپور سیکری میں آئے تو یہاں مہاراج ہلکر خود استقبال کو موجود تھے۔ دونوں خوب گرمجوشی کے
ساتھ ملے اور مہاراج نے از سر نو پھر تجدید مواخات کی اور دونوں نے ملکر بھرت پور کی طرف کوچ کیا اور بھرت پور سے پانچ کوس کے
فاصلہ پر خیمہ زن ہوئے۔ اگلے روز مہاراج اپنے لشکرگاہ میں گئے اور نواب امیر خاں یہیں مقیم رہے۔ دوسرے روز قلعہ کے
آگے تین سو سواروں کی صف جا کر جھنڈا گاڑا اور حکم دیا کہ جس قدر لشکر آئے یہیں ٹھہرے اور خود بیس سواروں کے ساتھ مہاراج
کی ملاقات کے لئے اُن کی فرودگاہ پر جو وہاں سے دو کوس تھی گئے دونوں سرداروں نے ملکر کھانا کھایا اور محبت کی باتیں کیں
کر رہے تھے کہ نواب کے لشکرگاہ کی جانب سے غبار نمایاں ہوا اور دونوں متردد ہوکر دیکھنے لگے۔ اسی وقت ہرکارہ پہونچا اور
خبر لایا کہ انگریزی فوج کی بارہ رجمنٹ اور چار پلٹنوں نے امیر کے ڈیرے کی طرف حملہ کیا ہے نواب امیر خاں فوراً گھوڑے
پر سوار ہوکر پہونچے اور اسی تھوڑی سی فوج سے حریف پر حملہ کیا مگر انگریزی فوج نے قلعہ بندی کی پوزیشن اختیار کر کے توپخانہ
سے کام لیا اور نواب کے حملہ کو رد کر دیا نواب نے غیرت و غیظ میں آکر ہمراہیوں کو حکم دیا کہ منتشر ہو جاؤ اور چاروں طرف سے دشمن
کو گھیر لو چنانچہ جوانمردوں نے فوراً متفرق ہوکر ہر چہار سمت سے حملے کئے اور توپ و بندوق سے گزر کر تلوار و سنگین کی سخت و شدید
لڑائی ہوئی اور انگریزی فوج پسپا ہونی شروع ہوئی اسی حال میں جسونت راؤ ہلکر آ گئے اور اہل قلعہ نے فصیل قلعہ سے

بان وتفنگ سے شکست دے گئے جنرل لیک صاحب کا یہ حملہ بھی ناکام رہا اور میدان جنگ سے فرار کی عار گوارا کی دو دن کے
بعد نواب امیر خاں نے بھرت پور کے راجہ سے ملاقات کی۔ راجہ نے نواب کی بہادری وشجاعت کی بیحد تعریف کی اور دس لاکھ
روپیہ دیا اور نواب نے وہ روپیہ سپاہ میں تقسیم کیا جس سے لشکری فارغ البال و مطمئن ہوئے چند روز کے بعد راجہ رنجیت سنگھ
والی بھرت پور نے نواب سے کہا کہ متھرا کی طرف سے انگریزی لشکر کے لئے رسد آرہی ہے اگر ممکن ہو تو اسے روکو۔
نواب امیر خاں صرف دو سو سواروں کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوئے اور رسد کے محافظ دستہ پر قضائے مبرم کی طرح جا پڑے انگریزی
پلٹنوں کو درہم برہم کرکے سامان رسد لوٹنا چاہتے تھے کہ توپ کی آواز آئی پوچھنے پر خبر رساں نے بتلایا معلوم ہوا کہ انگریزی
پلٹن بھاگ کر ایک گاؤں میں پناہ گزیں ہوئی تھی بابو سندھیہ نے وہاں جا کر ان کا محاصرہ کر لیا ہے اور توپیں چلا رہا ہے نواب
نے کہا کہ بابو نے بہت حماقت کی ہے اس سے انگریزی فوج توپوں کی آواز سن کر رسد والوں کی مدد کو آجائے گی اور
بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ ابھی یہ گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ انگریزی فوج پہونچ گئی۔ نواب نے کہا کہ بابو سندھیہ سے کہو کہ اپنی
حماقت کا نتیجہ بھگتو۔ انگریز جو محصور تھے فوج پہونچ جانے سے قوی دل ہو کر مقابلہ کے لئے نکل آئے اور بابو سندھیہ ہزیمت
اٹھا کر بھاگا اور اس کی فوج دشمن کے مقابلہ میں نواب کے ہمراہیوں کے بھی قدم اکھڑ گئے تھوڑے سے سوار نواب کے ہمراہ رہ گئے نواب نے
بڑی مشکل سے اپنے دو سو سواروں کو سمیٹ کر انگریزی لشکر پر حملہ آور ہوئے آخر انگریزی لشکر کو ہٹایا اور ان کی زد کا
تک پہونچایا۔ اس معرکہ میں دشمنوں کے بہت سے آدمی مارے گئے لیکن سامان رسد قبضہ سے نکل گیا۔ رنجیت سنگھ فصیل شہر پر
یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا شام کو نواب سے ملاقات کے وقت کہا کہ بابو سندھیہ کی بیوقوفی سے نتیجہ حسب دلخواہ نہ نکلا لیکن میں نے
آپ کی بہادری و شجاعت کی جیسی تعریف سنی تھی ویسا ہی پایا۔ دو چار روز کے بعد راجہ نے پھر نواب کو بلایا اور متھرا سے دوسری
بڑی رسد کے آنے کا حال سنایا اور کہا کہ اس مہم کی کامیابی و ناکامی پر اصل فتح و شکست کا انحصار ہے اگر یہ رسد انگریزی لشکر
میں پہونچ گئی تو اس کو بڑی مدد مل جائے گی اور محاصرہ دیر تک استقلال کے ساتھ لڑنے کی استعداد اس میں پیدا ہو جائے
گی نواب امیر خاں نے اس مہم کے سر کرنے کا ذمہ لیا اور اپنے مقام سے کوچ کرکے بھرت پور سے تین کوس اور انگریزی لشکر
سے دو کوس کے فاصلہ پر متھرا کی سڑک پر خیمہ زن ہوئے چونکہ انگریزی فوج بہت قریب تھی لہذا ہر وقت مستعد اور ہوشیار رہتے تھے
آدھ آدھ کوس کے فاصلہ پر چاروں طرف نئی چوکیاں قائم کردیں کہ جنگ کرنے میں مصروف رہیں۔ جاسوس نے خبر پہونچائی
کہ متھرا سے رسد پانچ پلٹنوں اور چار ہزار سواروں کی حفاظت میں روانہ ہوئی ہے نواب نے یہ سنتے ہی اپنی فوج کو حکم دیا کہ
متھرا کی طرف بڑھو اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر راجہ کے پاس آئے اور کہا کہ جنرل لیک صاحب جب رسد کی جانب
میرے بڑھنے کا حال سنیں گے تو بڑے لشکر کے ساتھ رسد کی امداد کے لئے پہونچیں گے اور لشکرگاہ میں برائے نام معمولی لشکر
رہ جائے گا لہذا آپ ان لشکرگاہ کے بچے ہوئے سپاہیوں پر حملہ کریں اور اگر اس کام کو دشوار سمجھو تو خود رسد پر جاؤ مجھے
یہاں رہنے دو راجہ نے کہا کہ نہیں تم رسد پر جاؤ میں یہاں کا کام انجام دے لوں گا۔ چنانچہ نواب فوراً گھوڑا خبر کرکے اپنے

لشکر سے آملے اور تھوڑی دیر کے بعد رسد کے محافظ لشکر سے مقابلہ ہوگیا۔ انگریزی پلٹنوں نے نہایت قابلیت اور پھرتی کے ساتھ قلعہ باندھا اور انگریزی قواعد جنگ کے مطابق مقابلہ کرنے لگے زیادہ دیر اس معرکہ آرائی کو نہ گزری تھی کہ جرنیل لیک صاحب چار پلٹنیں۔ بارہ رجمنٹ۔ دو ہزار ہندوستانی سوار اور ایسی توپخانہ لے کر رسد والوں کی امداد کو پہونچ گئے۔ نواب امیر خاں ان سب سے مقابلہ کرنے کی مناسب تدابیر میں مصروف تھے کہ ایک طرف سے مہاراج ہلکر آگئے نواب نے مہاراج ہلکر کی اس حماقت پر سخت افسوس کیا اور کہا کہ اگر میری ملنے پر آپ عمل کرتے تو کامیابی یقینی تھی مہاراج کچھ عذر کرکے خاموش ہوگئے۔ آخر نواب نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا خود میمنہ میں کھڑے ہوئے اور میسرہ میں مہاراج کو کھڑا کیا اور چمنا بھاؤ کو مقدمۃ الجیش بنایا شام تک لڑائی ہوتی رہی چمنا بھاؤ اور مہاراج ہلکر دونوں پسپا ہوئے اور نواب مصروف جنگ رہ کر حریف کو دباتے رہے جب رات ہوگئی تو دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل اسی جگہ خیمہ زن ہوئے۔ صبح جرنیل لیک نے پلٹنوں کا قلعہ باندھ کر رسد کو بیچ میں لیا اور اسی حیثیت سے کوچ کیا نواب نے جنونیز حریف پر حملہ کرنا چاہا لیکن مہاراج جسونت راؤ ہلکر نے نواب کو نہایت سخت وشدید اصرار کے ساتھ روکا اور کہا کہ دشمن نے جنگ فرخ آباد میں میری فوج کو شکست دی ہے اور میرا رعب دشمن کے دل سے جاتا رہا ہے۔ اگر اس وقت آپ نے حملہ کیا تو اندیشہ ہے کہ آپ نے بندیل کھنڈ میں انگریزوں کو بار بار شکستیں دیکر جو ناموری حاصل کی ہے اور دشمن آپ سے بہت خائف ہے کہیں آپ کا رعب بھی نہ جاتا رہے لہذا اسوقت طرح دے جاؤ اور دشمن کو نکل جانے دو۔ اسوقت کا حملہ ہرگز کارآمد ثابت نہ ہوگا۔ چنانچہ انگریزی لشکر اپنی فرودگاہ پر معہ رسد پہونچ گیا اور مہاراج ہلکر نے نواب امیر خاں کو حملہ آوری سے باز رکھا۔ اس واقعہ کے کئی روز کے بعد راجہ بھرت پور نے مہاراج ہلکر اور نواب دونوں کو بلایا اور کہا کہ آپ دونوں سرداروں کا ایک جگہ رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ایک صاحب یہاں دشمن کے مقابلہ پر موجود رہیں اور ایک صاحب دشمن کے ملک پر تاخت وتاراج کے لئے نکل جائیں۔ مہاراج نے کہا کہ مجھ میں تاخت وتاراج کی ہمت اور میرے لشکر میں اتنی طاقت نہیں مگر نواب امیر خاں اس کام کو خوب کرسکتے ہیں اور انہیں کو اب ہمت سے کام لینا چاہئے چنانچہ نواب نے منظور کرلیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء سے تعلق رکھتا ہے۔ اور فروری مہینہ میں مذکورہ واقعات پیش آئے۔

روہیلکھنڈ میں امیر خاں کی تاخت وتاراج

نواب امیر خاں راجہ بھرت پور اور جسونت راؤ ہلکر دونوں کو بھرت پور چھوڑکر ان کے مشورے کے موافق جریدہ سوار کو ہمراہ لے کر ملک روہیلکھنڈ کے ارادے سے روانہ ہوئے مہابن گھاٹ سے گذر کر گوکل آئے اور یہاں سے زر معاملہ وصول کرتے ہوئے براہ جوارکوٹہ پہونچے وہاں چار انگریزی پلٹنیں وہاں کے قلعہ کو گھیرے اور وہاں کے زمیندار روندے خاں نامی کو محصور کئے پڑی تھیں نواب کے آنے کی خبر سنتے ہی قلعہ علیگڈھ کی طرف محاصرہ اٹھاکر فرار ہوگئیں نواب امیر خاں کوتے سو کوچ کرکے براہ سبی نگر دسرہی پور وجلال پور گنگا کے کنارے بوٹ گھاٹ پر پہونچے اور .. ..

.. .. گنگا کو کہیں پایاب نہ پایا چار وہاں سے چلکر براہ پریھت گڈھ قمرالدین نگر آئے اس

بھی تیس کوس چلے تھے گھر گھاٹی پایاب گھاٹ نہ ملا مایوس ہوکر لوٹنے کا ارادہ کیا کہ ہردوار گھاٹ سے جو بہت دور تھا گنگا کو عبور کریں
مگر ایک بوڑھے شخص نے پایاب راستے کا پتہ بتادیا گنگا کو عبور کرلیا گھوڑوں کے تنگ بھی نہ بھیگے اور لشکر کی بکریاں تک بھی
پار اتر گئیں۔ موضع دھنورہ میں قیام ہوا دوسرے دن امروہہ میں لشکر زدوکش ہوا۔ وہاں سے رات کو کوچ کرکے چار گھڑی
دن چڑھے مرادآباد پہونچے۔ وہاں انگریزی لشکر سے مقابلہ ہوا انگریزی لشکر بہت سا قتل ہوا بقیۃ السیف نے راہ فرار اختیار
کی۔ نواب نے مرادآباد کا جیل خانہ توڑ کر تمام قیدیوں کو خرچ سفر دے دے کر رخصت کردیا۔ مرادآباد کو اس لئے نہیں لوٹا کہ یہاں
کے باشندے کہیں ہمارے آنے سے گھبرا نہ جائیں۔ رام گنگا کو عبور کرکے رامپور کی جانب کسی گاؤں کے قریب قیام کیا۔
یہاں کسی مخبر نے خبر دی کہ رتن چند دیوان لکھنؤ کا خزانہ یہاں موجود ہے آپ اس کو کام میں لائیں چنانچہ محمد خاں و عبداللہ
خاں کو دفینہ نکالنے کے لئے بھیجا گیا۔ جس مقام کا پتا بتایا گیا تھا ان سرداروں نے اسے کھدوایا پہلے کمخواب دوشالے
وغیرہ قیمتی زیورات نکلے پھر روپے ہے۔ محمد خاں نے قیمتی کپڑے اور زیورات وغیرہ سب ہمراہیوں کو تقسیم کردیئے اور روپیہ بھی لوگوں
کو بانٹ دیئے صرف ۲۵ ہزار روپیہ بچا کر نواب کے پاس لے آئے مخبر نے ہرچند کہا کہ روپیوں کے نیچے اشرفیاں ہیں انہیں بھی
نکالئے مگر فیض اللہ خاں بنگش و احمد خاں وغیرہ نے کچھ التفات نہیں کیا اور کہا کہ یہاں اب کچھ نہیں ہے۔ ان سرداروں کا
منصوبہ یہ تھا کہ کہیں لشکری مالامال ہوکر اور روپیہ لے کر اپنے اپنے گھروں کو نہ چلدیں اور اس مہم میں خلل پڑے اس لئے کہ
نواب کی فوج میں ایک بڑا حصہ اُن لوگوں کا تھا جو اسی ملک روہیلکھنڈ کے رہنے والے تھے۔ دوسرے دن نواب نے انگریزی
کیمپ پر حملہ کیا جس میں کئی پلٹنیں تلنگوں کی تھیں یہاں چونکہ کیمپ کے اردگرد خندق بہت وسیع و عمیق تھی لہذا مورچہ جمانا
پڑا۔ آدھی رات کے وقت نواب کے ہرکارے جنرل اسمتھ صاحب کے ہرکاروں کو جو چٹھیاں لے جارہے تھے پکڑ لائے
اُن چٹھیوں کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ جنرل موصوف بڑی زبردست فوج کے ساتھ اسی دن دوپہر تک آنے والا ہے چونکہ
نواب امیر خاں کے اس طرح روہیلکھنڈ میں آنے کا مقصد انگریزوں سے جم کر مقابلہ کرنا اور لڑنا نہ تھا بلکہ انگریزوں کو پریشان کرنا
اور بھرت پور کے قلعہ کو فتح کرنے کے لئے جو طاقت انگریزوں نے فراہم کی تھی اُسے منتشر اور انگریزوں کی توجہ کو تقسیم کرنا تھا لہذا
اُنھوں نے وہاں قیام مناسب نہ سمجھ کر وہاں سے کوچ کیا اور ٹانڈے کے راستے کاشی پور پہونچ کر قیام کیا صبح کو جنرل
اسمتھ صاحب شکلف صاحب الگزنڈر صاحب اور مالی صاحب سرداران انگریزی کی معیت میں بہت سی سوار و پیادہ
فوج کے ساتھ مرادآباد پہونچے اور یہاں نواب امیر خاں کو نہ پایا۔ نواب امیر خاں نے کاشی پور سے کوچ کرکے دامن کوہ
متعلقہ کمایوں کے علاقوں کو لوٹتے ہوئے بھوج پور کو آکر لوٹا اور ایک ہفتہ وہاں قیام کیا۔ اور ایک حصہ فوج کو پیلی بھیت
کی طرف روانہ کیا اور اُسنے پیلی بھیت کے علاقے میں تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیا۔ اسمتھ صاحب نے مرادآباد سے
کوچ کیا اور رامپور آئے اور نواب نصر اللہ خاں رئیس رامپور سے جو نواب احمد علیخاں نواب رام پور کے اتالیق اور
مدارالمہام ریاست تھے ملے اور نواب امیر خاں کا حال دریافت کیا۔ یہاں نواب امیر خاں کے بھیجے ہوئے حصہ فوج نے

ریاست رامپور کے علاقہ بلاسپور چپیلی اور کیمری کو لوٹ کر خوب روپیہ حاصل کیا ریاست رامپور کے بعض پٹھان امیر خاں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ یہ سب حال معلوم کرنے کے بعد جنرل اسمتھ صاحب نواب امیر خاں کی طرف روانہ ہوا نواب نے بھوجپور سے کاشی پور کی جانب کوچ کیا کاشی پور سے شیر کوٹ پہونچے اور یہاں لوٹ مار کرکے دھام پور آئے۔ دھام پور سے نگینہ پہونچ نگینہ کے شرفا نے حاضر ہو کر ملاقات کی اور نگینہ کو لوٹ مار سے محفوظ رکھنے کی استدعا کی جو منظور ہوئی۔ نگینہ میں لشکر کو چھوڑ کر نواب نے کئی سو گھوڑوں کے نال الٹے جڑوائے اور تین چار ہزار سوار لے کر نجیب آباد آئے اس زمانہ میں نجیب آباد ویران پڑا تھا یہاں کوئی رئیس نہ تھا نواب معین الدین خاں عرف نواب بھمبو خاں حصار کے علاقے میں فرمانروائی کرتے تھے اور انگریز اس جدید ریاست کو نواب معین الدین خاں سے لینے کے لئے اپنی سازش مکمل کر رہے تھے جس کا دردانگیز حال کسی دوسرے موقع پر سنایا جائے گا۔ نواب امیر خاں نے نجیب آباد سے ایک روایت کی موافق دو کروڑ روپیہ وصول کیا نگینہ سے نجیب آباد تک جو فوج نواب کے ہمراہ آئی اس فوج کے پیچھے پیچھے وہ کئی سو گھوڑے آئے جن کے نال الٹے جڑوائے گئے تھے۔ اسی طرح نجیب آباد سے کرتپور گئے۔ کرتپور میں کوٹلہ میں اس وقت ایک عورت کوٹلہ کی رئیسہ تھیں انھوں نے نواب امیر خاں کے پہونچنے کی خبر سن کر ایک سونے کی نتھ اور ایک سوت کی اٹیا نواب امیر خاں کے پاس بطور نذر اپنے معتمدین کے ہاتھ بھجوائی نواب نے ان رئیسہ کو اپنی بہن قرار دے کر مناسب تحائف بھجوائے اور بستی کوٹلہ کو جو پٹھانوں کی بستیاں تھیں نیز کرتپور کو بالکل محفوظ و مامون رکھا اور فوراً وہاں سے اکبرآباد ہوتے ہوئے نگینہ اور نگینہ سے مرادآباد کا راستہ لیا۔ اسی عرصہ میں جنرل اسمتھ صاحب ایک زبردست فوج کے ساتھ آپہونچا۔ رات کا وقت تھا کہ نواب امیر خاں کی فوج سے جنرل اسمتھ صاحب کی فوج کا مقابلہ ہونا۔ ہ کے قریب ہوا نواب نے فوج کا ایک نہایت قلیل حصہ لیک صاحب کے مقابلے پر چھوڑا اور خود شیر کوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ چونکہ کرتپور سے بھی فوج کے پیچھے الٹے نال والے گھوڑے آئے تھے لہذا جب دن نکلا تو جنرل لیک صاحب نے گھوڑوں کے سُموں کے نشان دیکھ کر یہ سمجھا کہ نواب امیر خاں اکبرآباد کی طرف گئے ہیں اور ایک معمولی دستہ یہاں چھوڑ گئے تھے جسے ہمارا مقابلہ کیا چنانچہ وہ گھوڑوں کے الٹے نال سے دھوکا کھا گئے اور نہایت مستعدی کے ساتھ اکبرآباد اور اکبرآباد سے کرتپور اور کرتپور سے نجیب آباد پہونچے اور یہ سمجھتے رہے کہ نواب امیر خاں ہمارے آگے آگے جا رہے ہیں ان کو ہر جگہ گھوڑوں کے نقش قدم نے دھوکا دیا راستے میں اگر کسی نے کہا بھی کہ نواب کی فوج مخالف سمت کو گئی ہے تو جنرل صاحب کو یقین نہیں آیا نجیب آباد سے جنرل صاحب نگینہ آئے اور یہاں آکر ان کو معلوم ہوا کہ نواب نے ان کے ساتھ کیا مذاق کیا تھا نواب جنگی چالاکیوں میں ایک نہایت عجیب و غریب خدعہ حرب نواب امیر خاں نے استعمال کیا اور اس طرح جنرل لیک صاحب کو قریباً چالیس میل مع فوج بے نتیجہ سفر کرا کر اپنے لئے دو دن کی مہلت نکال لی۔ اور شیر کوٹ سے افضل گڈھ پہونچ کر منتشر شدہ فوج کی فراہمی کا بندوبست کیا۔

جنگ فتح گڑھ

فتح گڑھ میں فوج کے مختلف منتشر دستے آکر جمع ہوگئے لیکن سوئے اتفاق سے فوج کے بعض حصوں میں جو لوٹ مار
سے گرانبار بھی ہوگئے تھے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس حال میں جنرل لیک اور دوسرے انگریزی افسر بہت سی پلٹنیں اور بہت سی
توپخانے لئے ہوئے آپہونچے۔ نواب نے فوج کو بیدار کرکے نالائقوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور خود اپنے معتمد سپاہیوں کو لے کر
میمنہ و میسرہ و مقدمۃ الجیش وغیرہ کو ترتیب دے کر مقابلہ کے لئے مستعد ہوگئے۔ اس روز ذیقعدہ ۱۲۱۹ھ کی ۲۹ تاریخ تھی جو
حسب ارشاد نواب صاحب کے مطابق ... ہوا اور جمشید خاں محمد حسین خاں۔ عزت خاں۔ شجاعت خاں۔ باقی محمد خاں
وغیرہ سرداران لشکر نے اپنی اپنی جمعیت جنگ کے بہترین نمونے دکھلائے۔ فوج میں جو پنڈارے شامل تھے انھوں نے کچھ کام
نہیں کیا بلکہ پٹھانوں نے ... سرداران ... کے کاموں کو بے حقیقت بنا دیا۔ اس لڑائی میں انگریزی توپوں نے بڑا غضب ڈھایا
جس وقت میں جب لڑائی زور شور سے جاری تھی اور بندوقوں سے گذر کر تلواروں اور سنگینوں پر نوبت پہونچنے والی تھی
توپوں پر جا سے گولوں کے گراب کی تھیلیاں بھر بھر کر انگریزی توپچیوں نے فیر کرنے شروع کئے اس گراب کی بارش میں کلیت
کشتوں کے پشتے لگ گئے لیکن امیر خاں کی فوج کے پٹھانوں نے جو زندہ رہے بجائے اسکے کہ ہمت ہار کر اپنی جان بچانے کی
فکر کریں انتہائی طیش و غضب کے عالم میں انگریزی فوج کی صفوں میں گھس کر اس جانکاہی دبے جگری کے ساتھ شمشیر زنی
کی کہ چشم زدن میں انگریزی سپاہیوں سے اپنے جانوں کا پورا بدلہ لے لیا۔ پنڈاروں نے جو اس جنگ میں شریک
نہ ہوئے تھے موقع پاکر انگریزی لشکر کی فرودگاہ پر اس وقت چھاپا مارا جبکہ لڑائی خوب زور شور سے جاری تھی اور بہت
سے سامان رسد اور کئی ہاتھی اور ذخیرے نیچے لوٹ کر چلدیئے میدان جنگ میں نواب امیر خاں کے ہمراہ صرف پچاس سوار
رہ گئے تھے کہ وہ اپنے نشان کے ہاتھی کے پاس آئے جو ایک جھاڑی میں کھڑا تھا۔ وہاں نشان اور سواروں کو دیکھ کر
انگریزی لشکر کو جرأت نہ ہوئی کہ اس طرف حملہ آور ہوں نواب نے وہاں قریباً دو تین گھنٹہ قیام کیا اور شام ہونے پر وہاں سے
رہیٹر کی جانب کوچ کیا اور رہیٹر سے راستہ پر پہونچے راستے میں بکھرے ہوئے رفیق آآکر ملنے شروع ہوئے۔ راستے پر سے
مال غنیمت لے کر فرار ہو رہے۔ کاش یہ زندہ ہوتے ہوئے پھر مراد آباد آئے۔ مراد آباد میں رات بسر کرکے فیروزپور
جو سنبھل سے تین کوس ہے پہونچے یہاں فوج خیمہ زن ہوئی اور عصر کے وقت نواب امیر خاں سنبھل کے محلہ سرائے ترین
میں جہاں ان کا آبائی مکان تھا تین سو سواروں کے ساتھ پہونچے وہاں کے رئیسوں اور بزرگوں سے ملے ہر ایک کو خلعت
وانعام دیا اور رات کو وہیں مہمان رہے۔ رات ہی میں سرداران لشکر کے پاس حکم بھیجدیا کہ آدھی رات سے تمام لشکر چندوسی
کی جانب کوچ کرے خود صبح کی نماز سرائے ترین کی مسجد میں باجماعت پڑھ کر سوار ہوئے اور چندوسی میں فوج سے جا ملے
چندوسی میں دو تین دن قیام کرکے وہاں سے روپیہ وصول کیا اور وہیں سے بریلی کے مفتی صاحب کو جن سے دیرینہ تعلق
دوستی تھا لکھا کہ آپ منتظر رہیں میں بریلی آتا ہوں جرنیل انگریزی کو اس خط کا حال معلوم ہوگیا وہ فوراً مراد آباد سے روانہ ہوکر

بریلی اور چندوسی کے درمیان پہونچگیا۔ اسی حالت میں نواب امیر خاں کے جاسوس نے خبر دی کہ الگزنڈر صاحب دو ہزار سوار کے ساتھ سنبھل پہونچا ہے یہ سنتے ہی نواب نے بریلی کا ارادہ ملتوی کیا اور مقام علی پور جو سنبھل سے تین کوس ہے پہونچ گئے الگزنڈر صاحب نے گھبرا کر کاروان سرائے اور نتھے خاں کے باغ کی چار دیواری میں پناہ لی۔ نواب نے حملہ کرنا چاہا مگر فوراً الگزنڈر صاحب کا عریضہ پہونچا کہ میرے مارنے سے آپ کی فتح نہ ہوگی اس لئے کہ آپ ہی کے بھائی پٹھان جو میرے ساتھ ہیں مارے جائیں گے اُدھر الگزنڈر صاحب نے مولوی علاؤالدین صاحب کو بھی جو نواب کے قدیم آشنا تھے اپنا سفارشی بنا کر بھیجا لہذا نواب نے الگزنڈر صاحب کی جان بخشی کی اور وہاں سے کوچ کرکے امروہہ کے قریب پہونچ کر خیمہ زن ہوئے اس جگہ پنڈارے بھی جو مالی سین صاحب انگریز سپہ سالار کے تعاقب میں دوابہ کی طرف گئے تھے عاجز ہوکر واپس آئے اور شریک لشکر ہوگئے۔ ان کے پیچھے مالی سین بھی دو ہزار سواروں کے ساتھ آئے۔ نواب فوراً آمادہ جنگ ہوئے لیکن مالی سین صاحب تاب مقابلہ نہ لاکر ابراہیم پور کے احاطے میں محصور ہوئے۔ اسی حالت میں سنبھل کی طرف سے آنے والوں کی زبانی خبر پہونچی کہ ایک انگریزی لشکر مقابلے کے لئے آرہا ہے امیر کے لشکری یہ خبر سُن کر سراسیمہ ہوئے نواب نے مجبوراً وہاں سے کوچ کیا اور چاند پور پہونچکر مقیم ہوئے۔ صبح کو روز عید تھا (عید اضحی) وہاں کی عیدگاہ میں نماز عید پڑھی اس کے بعد نواب امیر خاں نے گڈھ مکتیسر کے گھاٹ گنگا کو عبور کیا وہاں سے کوتہ آئے اس ضلع کے زمینداروں دہقانان سے ملاقات ہوئی یہاں ہمراہیوں کی حاضری لی تو کل ایکہزار سوار تھے نواب نے کہا کہ میں انہیں ایکہزار سوار سے انگریزوں کا ناک میں دم کردوں گا اور ان کو ہرگز چین سے نہ بیٹھنے دوں گا لیکن ہمراہی سرداروں نے سخت مجبور کیا کہ اب بھرتپور چلو۔ غرض ۲۰ رذیحجہ ۱۲۱۹ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۰۵ء کو پورے ۴۳ دن کے بعد پھر مہاراج جسونت راؤ ہلکر سے جا ملے اس ۴۳ یوم کے عرصہ میں نواب امیر خاں نے قریباً ایکہزار میل کی مسافت طے کی اور انگریزوں کو سخت پریشان کیا بھرتپور میں اس مدت کے اندر کیا واقعات پیش آئے یہ بعد میں بیان ہوگا اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اُس زمانہ میں انگریز ہندوستانیوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اس قدر زیادہ طاقتور نہیں دیکھتے تھے جیسا کہ وہ آج ہیں اور نہ ہندوستانی اسقدر کمزور و بزدل اور نالائق تھے جیسے کہ وہ آج ہیں لہذا انگریزوں کو ہندوستانیوں کی زبان سیکھنے کی زحمت برداشت کرنی پڑتی تھی اور اُن کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہندوستانیوں کی معاشرت و اخلاق سے بھی کما حقہ واقف و آگاہ ہوں اور ہندوستانی مراسم بھی ادا کریں اوپر کئی جگہ جرنیل اسمتھ کا نام آچکا ہے میرے دوستوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اس فوجی اور جنگی انگریز کو اُردو زبان میں کافی دستگاہ حاصل تھی اور وہ اُردو زبان میں شعر بھی کہہ لیتا تھا میں اس وقت اسمتھ صاحب کی ایک غزل جو پانچ اشعار پر مشتمل ہے ذیل میں درج کرتا ہوں۔

نہ وہ ہمدم نہ وہ جلسہ رہا ہے — تپ دوری سے دل جل سا رہا ہے
جنوں کی فوج کی سُن آمد آمد — خرد کا پاؤں کچھ چل سا رہا ہے
کسی عاشق کا نعرہ چرخ زن ہے — جو خیمہ چرخ کا ہل سا رہا ہے

مجھے اس واسطے ہے تلملاہٹ — کہ غم سینہ میں دل مل سا رہا ہے
غنیمت چون اسمتھ آ گیا ہے — کہ دشمن اُس سے اب ٹل سا رہا ہے

یہ غزل اسمتھ صاحب کی شاگرد کلیان سنگھ صاحب آنریری مجسٹریٹ و رئیس چندوارا تحصیل بلاری ضلع مرادآباد نے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کو برادرم مولوی محمد عبدالمجیب خان صاحب نواب بی اے بیگ کو لکھوائی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسمتھ صاحب نے یہ غزل نواب احمد علی خاں صاحب والی رامپور کے عہد میں شاید انھیں کی فرمائش سے اُن کے مشاعرہ کے لئے لکھی تھی جبکہ اسمتھ صاحب کو جنرل سے کمشنری کا عہدہ سپرد کر دیا گیا تھا اور وہ روہیلکھنڈ کے کمشنر تھے۔ اس غزل کے تیسرے شعر کا قافیہ درست نہیں ہے لیکن چونکہ دیہات کے لوگ لفظ مصدر کی ہائے ہوز کو بجائے مکسور کے مفتوح بولتے ہیں اس لئے اسمتھ صاحب نے غلط تلفظ استعمال کیا اور ایک انگریز کے لئے قابل معافی ہے۔ دوسرے شعر جنون کی فوج تیسرے شعر میں خیمہ کا ہنا مقطع میں دشمن کا ٹلنا صاف اسمتھ صاحب کے جنگی مشاغل کا پتہ دیتا ہے کیا آج بھی ہندوستان میں ایسے انگریز پائے جاتے ہیں جن کو اس ملک کی وسیع ترین زبان اُردو کے سیکھنے کا شوق ہو اور جو جنرل اسمتھ کی برابر اُردو پر قدرت رکھتے ہوں۔ (باقی)

موسم اور غیر معمولی ذہانت کا باہمی تعلق

امریکہ کی نیشنل اکاڈیمی آف سائنسز کے سالانہ اجلاس میں جو نومبر ۱۹۳۶ء میں شکاگو یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا ڈاکٹر ولیم پیٹرسن نے ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا، وہ یہ کہ غیر معمولی ذہانت اور موسمی کیفیت کے درمیان کوئی قوی تعلق ہے موصوف نے امریکہ کے بیس ہزار ممتاز آدمیوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے نیز پاگلوں اور مجرموں کے حالاتِ زندگی پر بھی نظر رکھی ہے ان کے جمع کردہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن بچوں کا حمل سال کے نصف اوّل میں قرار پایا تھا، ان کی دماغی قوت بہ نسبت دوسرے بچوں کے عموماً زیادہ تھی، اور اُنہی کی تعداد میں وہ لوگ جو غیر معمولی طور پر ذہین تھے یا جن کا دماغی توازن درست نہ تھا زیادہ تر ہوئے تھے، اس قاعدہ کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اکتیس مصدروں پر منطبق کر کے ڈاکٹر موصوف نے دیکھا ان میں سے چھبیس کے حمل سال کے ابتدائی سات مہینوں میں قرار پائے تھے، اور صرف پانچ کے بقیہ پانچ مہینوں میں ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ ذہانت و ذکاوت کا تعلق نہ سیاروں کی چال سے ہے اور نہ دوسری مخفی اثرات سے بلکہ تمام تر موسم سے ہے، شمالی نصف کرہ میں سال کا نصف اوّل طوفانی زمانہ ہوتا ہے اور موسمی کیفیت کا اثر اُن بچوں پر بہت زیادہ پڑتا ہے جن کے حمل اس زمانہ میں قرار پاتے ہیں، برخلاف اس کے جن بچوں کا حمل سال کے نصف آخر میں قرار پاتا ہے، جو نسبتہً پرسکون اور غیر طوفانی زمانہ ہوتا ہے۔ وہ عموماً خاموش اور دماغی اور جسمانی دونوں قوتوں کے لحاظ سے اوسط درجہ کے ہوتے ہیں، — اقتباس

قدماء کا علم طب

(۳)

(از جناب مولانا نبی احمد صاحب اصلاحی)

قدیم چینیوں کا طب

سوائے شہروں کے جو غیر ملکی اثر سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے چینی ابھی تک طبابت کی اسی سطح پر ہیں جس پر کہ وہ
ہزاروں سال پیشتر تھے۔ چونکہ چین میں ہمیشہ سے پیشہ انتخاب کرنے کی غیر محدود آزادی ہے اس بنا پر پیشۂ طبابت کو تعداد اطباء
کے لحاظ سے ایک نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ زمانہ قدیم سے آجتک ہر ہر گاؤں میں متعدد طبیب موجود ہیں۔ غریب سے غریب
آدمی بھی بلا کسی باقاعدہ سند کے طبابت کر سکتا ہے اور طبیب کا لقب اختیار کر سکتا ہے۔ محض دربار کے اطباء بنا بر احتیاط
پیکن کے ایک کالج کا امتحان پاس کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ چونکہ قدیم چینی طب آج بھی دیہاتوں میں رائج ہے اس لئے
میں اسکی تمام کیفیتیں بیان کرنے میں صیغۂ حال استعمال کروں گا۔

چینی عطار کو اپنا روزگار شروع کرنے سے پہلے ایک امتحان پاس کرنا اور مجلس امتحان سے ڈپلوما حاصل کرنا ضروری
ہے۔ تیز دوائیوں مثلاً افیون، سنکھیا وغیرہ کو کسی مرکب دوا میں بلا طبیب کی تجویز کے ملانا انکے لئے ممنوع ہے۔
دوا خانوں میں تمام ضروری دوائیں کافی مقدار میں مہیا ہوتی ہیں اور بہت ہی ترتیب سے رکھی جاتی ہیں۔ چینی مفردات
میں ۵۰۰ مختلف قسم کی پتیاں ہوتی ہیں۔ علاوہ گولیوں کے جو بندوق کی گولیوں کے برابر بڑی ہوتی ہیں وہ موہنی عرق
بھی تیار کرتے ہیں۔ طبیب کے نسخوں کو عطار ہی پکاتا، گھونٹا، چھانتا ہے۔ وہ اس کام کے علاوہ پیشین گوئی کا پیشہ بھی کرتا ہے۔

چینی جراحی میں سوئی گودنے کا رواج عام ہے۔ لوگ اسکو تمام امراض کے لئے مفید سمجھتے ہیں اور اس کا مقصد
ان کے نزدیک روح نفسانی میں از سر نو تازگی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی ذی احساس عضو میں سوئی
چبھو کر اسے خوب اندر ڈالدیں یا محض گھمادیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس عمل سے ریاح خارج ہونے کا ایک اچھا راستہ پیدا
ہو جاتا ہے۔ مزید براں، ان کی جراحی میں افسنتین چینی کے روئیں Maxa کا استعمال، پچھنے لگانا، فصد لینا
ٹیکہ دینا (جسے انکے قول کے مطابق حکیم گونشن نے تقریباً ۱۰۰۰ء میں ایجاد کیا تھا) اور بذریعہ نلی آنکھوں میں سے مواد
نکالنا بھی متعارف ہیں۔ فصد جو بہت کم لی جاتی ہے، ایک چھوٹے نشتر کے ذریعہ سے انجام پاتی ہے جسکے بعد زخم پر چپا
اور تیل یا کسی پتی کے لگا دئے جاتے ہیں۔ جونک لگوانے کا رواج بالکل نہیں کیونکہ یہ چیز شریف چینی کی حیا داری کے لئے
تکلیف دہ ہے۔ معمولی صورتوں میں وہ پولٹس بھی لگاتے ہیں جس میں بلی کے جگر اور چڑیوں کی آنت کے استعمال کا

رواں ہے۔ ہڈی ٹوٹنے کے موقع پر ٹوٹا عضو خوب کھینچ کر کسی سیدھی چیز کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔
پھوڑوں کی اشں بھی ان کے یہاں ان کی روایت کے مطابق دو ہزار برس پیشتر سے چلی آتی ہے۔ ورنج صاحب کا خیال ہے
کہ یہ جاپانیوں سے اخذ کی گئی ہے۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اعضا کو سُن کرنے کی مشہور دوا اگر M ago
ہزاروں برس پیشتر انہی سے ایجاد کی تھی۔ چیچک کا معمولی ٹیکہ بھی ان کے یہاں رائج ہے۔ باایں ہمہ ان کے جراح بہت جاہل
ہوتے ہیں انھیں بہت ہی نیچے درجہ کا کام دیا جاتا ہے اور ان کی تنخواہیں بہت معمولی ہوتی ہیں۔
چینیوں کا علم الامراض بہت ناقص ہے تمام اور خاصکر باطنی بیماریاں روح، مزاج، سرد و گرم مزاج وغیرہ
کی طرف منسوب ہیں انسان کے بہت معتدل ہونے کے لحاظ سے ان کی علۃ العلل دو ہی عنصر قرار دئے جاتے ہیں
اول ین اچھا عنصر، دوئم ینگ برا عنصر) اس طرح معمولی بخار کا تعلق ینگ سے اور دق والے بخار کا ین سے بتایا جاتا
ہے دق علیہ الاخر۔ ان کے یہاں بخار کی دس ہزار قسمیں ہیں۔ ان کا عمل تشخیص زبان اور آنکھ کے معائنے اور نبض دیکھنے
پر مشتمل ہے۔ ان کے نزدیک حرکت نبض کا منبع بدن کے ایک خاص حصہ کی روح ہے جہاں سے وہ چلنا شروع ہوتی
ہے اور بیماریوں کے محل کا بھی صاف پتہ دیتی ہے۔ اس لحاظ سے نبض کی بدولت بیماری کا سبب اور محل دونوں معلوم ہو جاتے ہیں
ان کا فن نبض بہت ہی قدیم اور طولانی ہے۔ یہ ایک عجیب طریقے سے انجام پاتا ہے، چند انگلیاں ایک خاص
مقام پر رکھی جاتی ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے باری باری سے اٹھائی یا گرائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ پیانو بجانے میں کیا جاتا ہے
چینی بجائے نبض دیکھنے کے نبض بجاتے ہیں۔ اس عمل میں چند قواعد کے مطابق چاند اور سال کے موسموں کی تبدیلیوں
کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ اکثر نبض کے ملاحظہ میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ امراض دل میں بائیں نبض اور امراض جگر
میں داہنی نبض کی شناخت کی جاتی ہے۔ زبان کے ایک داغ اور قسم قسم کی بدرنگی سے چند مخصوص بیماریوں پر استدلال کیا جاتا ہے
چینی علم الادویہ بہت وسیع ہے۔ اس کی تقریباً تمام دوائیاں حیوانات اور نباتات سے اخذ کی ہوئی اشیا ہیں
ہر قسم کے بیج، سیکڑوں پودوں کی پتیوں (جو کہ روزانہ خوراک میں کھائی جاتی ہیں) بیشمار جانوروں کے پنجوں اور کان اور دل اور
جگر، ہرنی کے پت، خشک کردہ کیڑوں مکوڑوں، مینڈک، چھپکلی، سانپ، اژدہے کی ہڈی، حیوانات کے براز، روئی
ہاتھی دانت، مشک، ریوند چینی، کافور، جنتیانا Gentian اور دوسری بیشمار چیزوں پر مشتمل ہے۔ جنسن
کے پودے کی جڑ ([illegible] ڈالر فی اونس قیمتی ہوتی ہے) اور ابابیل کے گھونسلے تمام بیماریوں کے واسطے اکسیر خیال
کئے جاتے ہیں اور ان کی چینیوں کے یہاں بڑی قدر ہے۔
فن علاج میں بار بار نہانے کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ چینی طبیب مریض سے پرہیز کرانے میں بہت سخت
ہوتا ہے تشخیص کرنے کے بعد طبیب کا خاص کام یہ ہے کہ بیماری کے مادے کا جو ہاضمہ، رگوں، یا دوران خون کے اندر
واقع ہے، ازالہ کرے۔ بالعموم علاج بالضد کے اصول پر عمل ہوتا ہے مثلاً ضعف کی دوا شیر کے خون کا ست ہے۔ تقریباً

ام جانوروں کی کوئی نہ کوئی چیز اور خاصکران کا خون یا جگر کسی مرض کی مخصوص دوا ہے۔ اکثر اور بالخصوص امراءِ چین کے اطبا تمام
عطارخانوں کا اسوقت تک جائزہ لیا کرتے ہیں۔ جب تک کہ کوئی مناسب دوا نہ ملجائے۔ جب کوئی بیمار مرتا ہو تو چینی خیال یہ ہے کہ اسکو
بیماری سے شفا تو ہو سکتی تھی لیکن چونکہ طبیب کو اتنا وقت نہ ملا کہ اسے اپنی زہریلی دوا کے اثر سے نجات دیتا اسوجہ سے وہ مرگیا۔
گو بعض بہت پرانے اور نا تمام کتبے چینیوں کے تشریح اور فزیالوجی سے آشنا ہونے کے موید ہیں تاہم کہ طبی علوم میں ان
دونوں علموں کا مرتبہ سب سے نیچا ہے۔ مردوں کی تعظیم نے انسانی جسم کی تشریح کا دروازہ بالکل مسدود کردیا ہے۔ چینیوں کے نزدیک
چھ عضو رطوبت کے مرکز ہیں دل، جگر، دونوں گردے، طحال، پھیپھڑا، اور چھ دوسرے حرارت کے مرکز ہیں: بڑی اور چھوٹی
آنتیں، صفرا کا پتا، شکم اور خصیتیں ان کے شمار میں کل ۳۶۵ ہڈیاں ہیں۔ یونانیوں کے خاک و آتش کی جگہ پر چینی: دو عنصر لکڑی
اور دھات مانتے ہیں۔ رطوبت اور حرارت اصلی صفات ہیں جن کا اتحاد زندگی کا اور افتراق موت کا سبب ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک
دوران خون دن رات میں پانچ مرتبہ پھیپھڑے سے شروع ہوکر کلیجہ میں پہونچتا ہے اور وہاں ختم ہوجاتا ہے۔ پت جس طرح
اکسیر روح ہے اسیطرح وہ جرأت و بہادری کا مرکز ہے۔ پھیپھڑا آواز کا منبع ہے۔ طحال عقل کا اور دل تخیل کا مرکز ہے کلیجہ روح
کا رسدخانہ اور شکم دماغ کی جائے استراحت ہے۔

قدیم جاپانیوں کا طب

قدیم جاپانیوں نے اپنے علم الامراض میں اندرونی اور بیرونی بیماری میں امتیاز قائم کیا تھا۔ اسمیں رٹیرہ کی ایک بالکل
نرالی بیماری کا ذکر ہے جس کو جاپانی میں لکہ کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں بہت ہی عجیب و غریب چیزیں بطور علاج کے عمل میں
لائی جاتی تھیں مثلاً چیچک کی صورت میں وہ بیمار کے کمرے کو سرخ آویزاں کپڑوں سے سجاتے تھے چونکہ ان کا طب چینیوں سے
ماخوذ تھا، اسوجہ سے بحیثیت مجموعی اسمیں بھی اسی قسم کی دور از کار محال باتیں مذکور تھیں جنکو انجام دیکر طبیب طبیب نہیں
بلکہ ایک قسم کا جادوگر ہوجاتا ہے۔ باایں ہمہ ان دونوں قوموں کی طبابت خالص علمی شغلہ کہی جاسکتی ہے کیونکہ دوسری قوموں
کے طب کے برعکس اس پر مذہب یا مذہبی لوگوں کا اثر بالکل نہ پڑا۔

غیر متمدن یورپ کا طب یورپ کی وحشی قومیں سلٹ اور ٹیوٹن بھی اتنی ہی قدیم ہیں۔ ان کے یہاں طبی اساطیر کا چرچا
تھا۔ ایرا ایک دیوی ہے جسکی وہی عزت تھی جو یونانیوں کے یہاں ایسکولیپیس کی تھی۔ شادی میں لوگ فریگو دیوی سے اولاد
مانگتے۔ ہولا عورتوں کو بحالتِ زچگی سنبھالتی، ہیکل ہیلا بیماری سے مرنیوالوں کو اپنے مسکن نفلہیم میں جگہ دیتی۔ اس
مسکن کی ہر چیز بیماری یا اسکے متعلقات کے نام سے مشہور تھی مثلاً دالان کا نام آلڈمز (درد) خوابگاہ کا نام کرد (مرض)
اور کھانے کی میز کا نام ہنگر (بھوک) تھا۔ بعض نامکمل کتبے محفوظ ہیں جنمیں انکی حقیقی طب اور طبابت کیطرف اشارہ ہے۔ انسے پتہ چلتا
ہے کہ سویڈن اور ناروے کے اطبا استسقا میں مریض کو گرم سلاخ یا تیزاب سے داغتے تھے، دمہ میں فصد لیتے تھے، اور زخمیوں کو اٹھانے کیلئے نرم
دل والے آدمی تجویز کرتے۔ انکی تشریح میں ہڈیوں کی تعداد ۲۱۴ اور رگوں کی ۲۱۵ تھی۔ ان میں بعض باتیں ویدک خیالات سے ملتی جلتی ہیں

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق؟

(از جناب عبد الحکیم صاحب ایم اے مسلم یونیورسٹی)

"پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" علامہ اقبال کی تازہ مثنوی ہے۔ "جبریلِ مشرق" نے اس مختصر مثنوی میں بخوانندۂ کتاب، تمہید، خطاب بہ مہر عالمتاب، حکمت کلیمی، حکمت فرعونی، لا الٰہ الا اللہ، فقر، مرد حر، سیاستِ حاضرہ، وغیرہ عنوانات کے تحت موجودہ دور کے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ وہ چارہ راہ اور وہ اصول بتلائے ہیں جن پر کاربند ہو کر انسان انسانیت کی تمام سربلندیوں اور سرفرازیوں کو سمیٹ لے سکتا ہے۔ اقبال نے کوئی نیا پیغام نہیں دیا ہے کوئی جدید نظریہ نہیں پیش کیا ہے اور نہ کسی جدید مذہب کی بنیاد ڈالی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ صداقت و حقانیت کی کوئی بات دنیا کیلئے نئی اور انوکھی ہو ہی نہیں سکتی۔ تمام صداقتیں اور ساری سچائیاں [illegible] جدید مذہب اور جدید فلسفہ کی ضرورت نہیں اگر ضرورت ہے تو یہ کہ انہیں قدیم اور ابدی سچائیوں پر پھر سے عمل شروع ہو جائے [illegible] اگر ہمارا ذہن نظریۂ حسن و قبح، بہبودی اور بہتری ہے تو ہمیں سلف کی راہ سے پرکھنا چاہیے۔ اقبال نے اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے اور نہایت لطیف اور اس درجہ بلیغ اشارہ ہے کہ مثنوی کا ہر مصرع تاثر، دلنشینی اور دردمندی کی روح بن کر دلوں میں اتر جاتا ہے۔ واعظ بھی اپنے وعظ میں یہی پیغام دیتا ہے لوگوں کو سلف کی پیروی کی طرف متوجہ کرتا ہے مگر اس کی تقریر خشک، بے کیف اور تاثیر سے خالی ہوتی ہے یہ شاید اس لئے ہے کہ اس کی تمام نکوکاریوں اور نکوگفتاریوں کی تہ میں ذاتی اغراض و مقاصد کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے لیکن یہ مثنوی کوئی وعظ نہیں ہے، یہ حالات حاضرہ اور سیاست وقت پر تبصرہ اور ایک حکیم کی سچی اور بے لاگ تنقید ہے اور پھر مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی کے حقیقی وجوہ کا سراغ لگایا گیا ہے اور اس کے بعد جو نسخۂ کیمیا پیش کیا گیا ہے اس میں اخلاص، یقین اور ایمان کی تمام لذتیں پنہاں ہیں۔

اقبال کی پہلی تصانیف میں جوش، التہاب، بے چینی اور اضطراب، گرمی و تیز نوائی ہے ان کی مثال ایک بحرِ ناپیدا کنار کی سی ہے جس میں دیوپیکر موجیں اٹھ اٹھ کر پہاڑی چٹانوں سے مصروفِ پیکار رہتی ہیں جس میں ہر آن و ہر لحظہ ایک طوفانِ اضطراب بپا رہتا ہے لیکن ان کی تازہ تصنیفات کا یہ رنگ نہیں یہاں خروش اور شوریدگی کے بجائے سکون اور خموشی ہے، شیرینی اور جمال ہے۔ لطافت اور کیف ہے یوں سمجھنا چاہئے کہ بانگ درا کا اقبال ایک آتش بیان مقرر ہے جو اپنی جادو بیانی اور شعلہ مقالی سے دلوں کو گرما دیتا ہے لیکن اب اقبال کا حال اس عارفِ حق آگاہ کا سا ہے جس کا سینہ رموز و اسرار الٰہی کا گنجینہ ہے، جس کی آنکھوں میں ایک ملکوتی تبسم اور جس کے چہرے پر آسمانی نورانیت ہے جو زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن جس کی طرف دیکھ لیتا ہے معرفتِ حق میں اسے ڈبو دیتا ہے۔ اقبال پیرِ رومی سے بہت متاثر ہیں بتدریج تصوف کا رنگ ان کے

تصانیف میں اُبھر آگیا ہے لیکن ان کا تصوف خانقاہوں کا تصوف نہیں ہے جہاں صوفی تو بہت ہوتے ہیں لیکن سلطان کم ہی ہوتے ہیں، اقبال کا تصوف یہ ہے کہ خانقاہیں آباد کرنے سے پہلے اسکے ارد گرد جہاد کی صفیں آراستہ کرو تلوار اور قرآن کا ساتھ اسلام میں ہمیشہ سے رہا ہے تم دونوں میں جدائی کیوں پیدا کرتے ہو، یاد رکھو تلوار اور قرآن کی جدائی جسم اور جان کی جدائی ہے۔

خواندہ کتاب سے فرماتے ہیں:۔

بیا کہ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق	کہ درحرم خطرے از بغاوتِ خرداست
زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را	جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرداست
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم	طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرداست
گماں مبر کہ خرد را حساب و میزان نیست	نگاہِ بندہ مومن قیامتِ خرداست

عقل و خرد یعنی فطرت کے بہترین عطیہ سے آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں اپنی تباہی و ہلاکت کے سامان آپ پیدا کر رہی ہیں۔ ہلاکت بار مشینیں، زہریلی گیسیں اس لئے تیار کی جا رہی ہیں کہ دنیا سے انسانیت، تمدن اور کلچر کے تمام نقوش مٹا دئے جائیں اور ایک مرتبہ پھر وحشت، درندگی اور بربریت کا تسلط سارے عالم پر ہو جائے۔ کیا عقل اس سے زیادہ گمراہ ہو سکتی ہے؟ عقل و سائنس کی اسی گمراہی اور سیاست عالم کی اسی دیوانگی نے دنیا کے سب سے بڑے مصنف ایچ۔جی ویلز کی آنکھیں کھولدیں وہ اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہو گیا کہ دنیا کو اپنی نجات کے لئے سائنس کی ضرورت نہیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو عالمگیر اخوت و مساوات، رحم و کرم کا علم بردار ہو، جو انسانوں کو مختلف ٹولیوں اور مختلف جتھوں میں تقسیم کرنے کے بجائے کالے گورے لال پیلے ہر طرح کے لوگوں کو اس طرح گلے ملوا دے کہ دنیا کے بسنے والے تمام انسان ایک جماعت اور ایک برادری کے افراد بن جائیں، اور اخوت، محبت خلوص کی زنجیر دلوں میں رابطہ اتحاد پیدا کر دے۔ اقبال بھی رابطہ الفت و مودت پیدا کرنے کے لئے چاہتے ہیں کہ عقل کی بغاوت کو شیفتگی حق اور عشق الٰہی کی افواج سے دبا دیں سے

بیا کہ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق	کہ درحرم خطرے از بغاوتِ خرداست

تمہید کتاب میں پیر رومی شاعر کو مژدہ سنا رہے ہیں۔

گفت جاں با محرمِ اسرار شد	خاور از خوابِ گراں بیدار شد
جذبہ ہائے تازہ او را دادہ اند	بند ہائے کہنہ را بکشادہ اند

یہاں سے براہ راست شاعرِ مشرق سے خطاب ہے۔

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ	کس نکو ننشست در نارِ فرنگ

باش مانند خلیل اللہ مست | ہر کہن بتخانہ را باید شکست
امتاں را زندگی جذب درون | کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیر چرخ لاجورد | بے جنونِ ذو فنوں کارے نکرد
مومن از عزم و توکل قاہر است | گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

پیر رومی نے "جذب درون" کو اقوام عالم کی حیات سے تعبیر کیا ہے یہاں سمجھ لینا چاہیے کہ "جذب درون" کی حقیقت کیا ہے تاریخ عالم ..... وہ واقعہ اب تک حفظ ہے جب ایک خلیل اللہ نبی اور پروردگار کائنات کا برگزیدہ رسول اپنی صداقت پرستی اور حق گوئی کے جرم میں نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ ملائکہ اور عالم بالا کی دیگر مخلوقات نے اس ہولناک منظر کو دیکھا اور دیکھ کر کانپ اٹھے۔ ملائکہ نے عرض کی کہ اے خدا کے خلیل آپ کو خالق کائنات نے خلعت خاص کے شرف سے نوازا ہے آپ اس نازک وقت میں اس کی جناب میں عرض کیجیے کہ وہ آپ کو اس بلا اس ہولناک آزمائش سے بچا لے لیکن وہ پیکر صدق و صفا اور شیوۂ تسلیم و رضا اور وہ لذت چشیدۂ جفائے دوست جواب دیتا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے شاید کارفرمائے حقیقی کی مرضی سے ہو رہا ہے اور جب اسکی مرضی اور اس کی پسند یہی ہو تو میں اپنی طرف سے کیا کیوں کہوں ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست | تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

یہ جذب درون کی کارفرمائی تھی جس نے خلیل اللہ کو ابتلاء و محن کی اس امتحان گاہ میں ثابت قدم رکھا آپ نے اپنی پاک روح اور اپنے ارادہ و اختیار کو فرمان حق کا اس درجہ تابع بنا لیا تھا کہ آپ کی کوئی خواہش کوئی آرزو رضائے حق کے خلاف ہو ہی نہیں سکتی تھی یہی حال اقوام عالم کا ہے جس قوم نے اور جس جماعت نے اپنی طبیعت اور اپنی فطرت کو حق پرستی کے سانچے میں ڈھال لیا ہے ناممکن ہے کہ وہ اس دنیا میں ناکام و پسماندہ رہے پس مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ وہ دنیا میں غالب اور فاتح بن کر رہیں تو انہیں شیوۂ براہیمی کی سرمدی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور عزم و توکل کے بہترین انداز سیکھنے چاہئیں اور اگر مسلمان یہ نہیں کر سکتا تو وہ مومن نہیں ؎

مومن از عزم و توکل قاہر است | گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

شاعر اس کے بعد دین اور سیاست کے معنی پوچھتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

غم خورد نانِ غم افزایاں مخور (رومی) زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر
خرقہ خود بار است بر دوشِ فقیر | چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر
قلزمی؟ با دشت و دریا ہم ستیز:
شبنمی؟ خود را بہ گلبرگے بریز

سرِ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست — روحِ مومن ہیچ میدانی کہ چیست
قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود — عقدۂ خود را بدستِ خود کشود
از خودی اندر ضمیرِ خود نشست — رختِ خویش از خلوتِ افلاک بست
رخ سوئے دریائے بے پایاں نہ کرد — خویشتن را در صدف پنہاں نہ کرد
اندر آغوشِ سحر یک دم تپید — تا بکامِ غنچۂ نورس چکید

حکمت کلیمی اور حکمت فرعونی

حکمتِ کلیمی کے تحت اقبال نے ہمیں وہ پیغام یاد دلایا ہے جس کی تبلیغ کے لئے انبیاء کرام اس دنیا میں آئے تھے لیکن بدبختی سے ہم نے یکسر بھلا رکھا ہے۔ زبانِ رسالت نے ہمیں بتلایا تھا کہ کسی دنیوی سلطنت و قوت سے مرعوب نہ ہونا چاہئے ہمیشہ ہر حال میں صرف معبودِ حقیقی کی مرضی پیشِ نظر رکھو اور ڈرو تو اسی کی ذات سے ڈرو اور اسی کے سامنے جھکو۔ ایمانِ محکم اور عملِ نیک۔ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے یہ دولت اگر تمہیں میسر ہے تو دنیا کے صناعی علوم و فنون کو خاطر میں نہ لاؤ۔ زبانِ رسالت نے یہ پیام بھی دیا تھا کہ تم اپنے تمام خود ساختہ معبودوں کو ربی الاعلیٰ کی ضرب سے توڑ ڈالو اسلئے کہ جب تک ان معبودانِ باطل کا وجود باقی ہے حق پرستی کی راہ تم پر نہیں کھل سکتی۔ اور سن رکھو کہ ابدی راحت و آسائش سونے اور چاندی کے ڈھیروں اور کیکاؤس وکیخسرو کی عشرت گاہوں میں نہیں ہے جب تک تمہارے دل صدق۔ اخلاص، نیاز۔ سوز و درد سے خالی ہیں تم ابدی راحت و مسرت سے ہمکنار نہیں ہو سکتے فرماتے ہیں

از مقامِ خویش دور افتادۂ — کرگسی کم کن کہ شاہیں زادۂ
مرغک اندر شاخسارِ بوستاں — بر مرادِ خویش بندد آشیاں
تو کہ داری فکرتِ گردوں مسیر — خویش را از مرغکے کمتر مگیر
دیگر ایں نہ آسماں تعمیر کن — بر مرادِ خود جہاں تعمیر کن
در ظلامِ ایں جہانِ سنگ و خشت — چشمِ خود روشن کن از نورِ سرشت
مردِ مومن از کمالاتِ وجود — او وجود و غیرِ او ہر شے نمود

گر بگیرد سوز و تاب از لا الٰہ
جز بکامِ او نگردد مہر و مہ

اور حکمتِ فرعونی کا حال یہ ہے:۔

حکمتِ اربابِ کیں مکر است و فن — مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن
مکتب از تدبیرِ او گیرد نظام — تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام

شیخ ملت با حدیث دلنشیں — بر مراد او کند تجدید دیں
واے قومے کشتۂ تدبیر غیر — کار او تخریب خود تعمیر غیر

حکومت کے بانی کارکنوں کے جو نت نئے تجربے ہمیں دکھلاتے ہیں اس سے ہم سب خوب واقف ہیں۔ دستور جدید جس سے غریب ہندوستان کو نوازا گیا ہے ہمیں غالب کے حرف کی یاد دلاتا ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ملک کا نظام تعلیم عام ہی سہی۔ وہ انگریزی یا عربی دن رات ایسے رستے [illegible] برنسے؛ جانتا رہتا ہے جن کی ضرورت اس چوٹی بچّی رعیت میں نہیں ضرورت ہے ورنہ نہیں۔ [illegible] ہندوستان۔ حکمت فرعونی کو مظلوم شکار کے [illegible] والا [illegible] نہیں ہوجاتا۔ [illegible] یہ ہے کہ علمائے امت [illegible] علم و عمل بھی حکمت فرعونی کو دست و بازو بن انجام اسلام ہمیشہ [illegible] کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ بھی دین کی ایک خدمت ہے۔ کیا کیجئے حکام وقت کی ذہنیت ہی ایسی ہوتی ہے۔ شیخ ملت تو چاہتے ہی ہیں کہ خادم اسلام کو اپنے دنیوی آقا کی خاطر قربان کر دے۔

شیخ ملت با حدیث دلنشیں — بر مراد او کند تجدید دیں

مسلم قوم کے افراد کی ہمیشہ سے یہ بدقسمتی رہی ہے کہ جب کوئی جوہر قابل ان میں پیدا بھی ہوتا ہے تو پورے رشک و منافست کے ساتھ اس کی ہر ممکن مخالفت کی جاتی ہے وہ قوت اور مخالفت جو غیروں کے مقابلہ میں صرف ہونی چاہئے تھی اس کا نشانہ وہی لوگ بنائے جاتے ہیں جو ہر لحاظ سے قوم کے بہترین دل و دماغ کہے جا سکتے ہیں۔ ملک و ملت کے وہ مسائل اور وہ پیچیدہ گتھیاں جن کے سلجھنے پر پوری جماعت کی زندگی اور موت کا دارومدار ہوتا ہے نقطۂ نا قابل التفات قرار پاتی ہیں اور جماعت و مذہب کی خدمت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کے سب سے مخلص خادم کو اس کے سب سے عزیز و محبوب آقا کو الحاد و زندقہ کا مجرم بنایا جاتا ہے دنیا اپنے محسنوں کے ساتھ ہمیشہ سے یہی سلوک کرتی چلی آتی ہے لیکن آخر اس قوم کا کیا حشر ہونے والا ہے جو آپ اپنے پیروں میں یوں کلہاڑی مار رہی ہے؛ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (خدائے پاک اس سید والا شان کو تا دیر ملک و ملت کی خدمت کے لئے زندہ و سلامت رکھے) کے احسانات سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورا عالم اسلام گرانبار ہے جن کی تصانیف ہندوستان سے نکل کر ممالک غیر سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں جن کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ مکہ مکرمہ، ترکی، مصر، ایران اور افغانستان انھیں جلد از جلد اپنی زبانوں میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں لیکن علمائے ہند کا حال یہ ہے کہ ان تصنیفات و تالیفات کی کوئی وقعت ان کے نزدیک نہیں وہ سرے سے اسے کوئی خدمت ہی نہیں سمجھتے بلکہ بڑی تحقیق و کاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ سید صاحب درحقیقت اسلام کی کوئی خدمت ہی نہیں کرنا چاہتے تھے اصل منشا ان کا ایک خطرناک قسم کے الحاد کی تبلیغ کا تھا جس پر پوری رازداری کے ساتھ آج تک وہ کاربند رہے ہیں۔ یاللعجب

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

انہیں مدعیانِ علم و عمل کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

قوت فرمانروا معبود او — در زیانِ دین و ایمان سود او

از حدِ امروز خود بیروں نجست — روزگارش نقشِ یک فردا نبست

از نیاگاں دفترے اندر بغل — الاماں از گفتہ ہائے بے عمل

دینِ او عہد وفا بستن بغیر — یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

آہ قومے دل ز حق پرداختہ

مرد و مرگِ خویش را نشناختہ (باقی)

جاپانیوں میں قربانی کا جذبہ

روس و جاپان کی لڑائی کے زمانہ میں، جاپانی بیڑے کے سپہ سالار نے چاہا کہ پورٹ آرتھر ایک جنگی جہاز غرق کر کے اس کو بند کر دے چنانچہ اس نے ۷۷ نوجوان اس غرض سے طلب کئے کہ ایک جنگی جہاز بندرگاہ کے اندر جا کر ڈائنامیٹ سے اسکو اڑا دیں۔ کتنا کٹھن کام تھا! دنیا کا کوئی کام اس درجہ کٹھن نہیں ہوسکتا! دیدہ و دانستہ موت کے دہانہ میں اپنے کو ڈالنا تھا۔ لیکن جاپانی نوجوانوں نے سپہ سالار کی طلب کو مایوس نہیں کیا اس نے ۷۷ نوجوان طلب کئے تھے۔ لیکن تین ہزار نوجوان آگے بڑھے کہ بارود اور ڈائنامیٹ کی یہ بازی کھیلیں اور دنیائی تاریخ میں بہادری اور قربانی کی ایک بھی نہ فراموش ہونیوالی کہانی چھوڑ کر جائیں۔ سپہ سالار نے ۳ ہزار نوجوانوں میں سے مطلوبہ تعداد چھانٹ لی اور ان کے سامنے ایک پر اثر تقریر کی۔

جانبازو! میں محسوس کر رہا ہوں کہ اپنے بچوں کو موت کے منہ میں بھیج رہا ہوں اور یقین کرو کہ اگر میرے اپنے بچے ہوتے تو ان کو بھی اس مہم پر بھیجنے میں ایک لمحہ بھی درنگ نہ کرتا۔ اگر میرا ایک ہی لڑکا ہوتا تب بھی میں اس کو قربانی کے لئے پیش کر دینے سے دریغ نہ کرتا۔ پس سن رکھو!! جس کا ایک ہاتھ جاتا رہے وہ دوسرے ہاتھ سے اپنے کام کو جاری رکھے جس کے دونوں ہاتھ بیکار ہو جائیں وہ پاؤں کی مدد سے اپنے کام میں مشغول رہے پاؤں بھی بیکار ہو جائیں تو سر کو کام میں لائے!!!

اپنے افسروں کی اطاعت کرنا۔ ان کے حکموں کی تعمیل کرنا اور اپنی زندگی کے معاملہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہ کرنا!!!

میں تم کو موت کے منہ میں بھیج رہا ہوں۔ اور پوری طرح مطمئن ہوں کہ تم میں سے ہر ایک اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے بالکل آمادہ ہے۔ بس پورے سکون کے ساتھ اپنے کو آسمان کے حوالہ کر دو اور اپنی مہم پر روانہ ہو جاؤ!!!

قربانی اور فدویت کے یہ جذبات ہیں جن سے ہر جاپانی کا سینہ لبریز ہے۔ (الاصلاح)

ایک آیت کے مفہوم کی تحقیق

نومبر کے فاران میں "مواہب الرحمٰن" پر جو تنقید شائع ہوئی تھی اس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ حضرت مصنف نے اپنی اس کتاب میں قرآن کی بعض آیتوں کے جو معنی بیان فرمائے ہیں ان سے دو ایک جگہ ہمیں اختلاف ہے اور مثلاً آیت واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها کو پیش کیا گیا تھا چونکہ فاران میں مفصل تنقید شائع کرنے کی گنجائش نہ تھی اس لئے نہ اختلاف کے وجوہ دکھائے جا سکے اور نہ وہ تاویل پیش کی گئی جسے ہم صحیح سمجھتے ہیں۔ تنقید شائع ہونے کے بعد بعض لوگوں نے یہ خیالات کیا کہ آیت کی صحیح تاویل ہمارے نزدیک کیا ہے اور خود حضرت مصنف مدظلہ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں توجہ دلائی کہ اگر ہمیں آیت کے ترجمہ و تفسیر سے اختلاف تھا تو اسی تنقید کرتے وقت اپنا خیال واضح کر دینا ضروری تھا اگرچہ ہم فاران میں مفصل تنقید شائع کرنے اور اگر اس سلسلہ میں بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو اس سے حتی الوسع احتراز کرنے پر زیادہ طول دینے پر مجبور ہیں لیکن چونکہ آیت مذکورہ قرآن کی ایک نہایت اہم آیت ہے اور اس کی تفسیر میں عموماً دھوکا ہو جاتا ہے اس لئے ہم بھی چاہتے ہیں کہ باہمی مذاکرہ کے بعد آیت کی صحیح تاویل سامنے آ جائے۔ آیت کے متعلق بحث کی یہ تقریب اگر نہ بھی پیدا ہوتی جب بھی اس کی اہمیت مقتضی تھی کہ اس پر کبھی نہ کبھی روشنی ڈالی جائے۔ اس وقت طبیعت بحال بھی نہیں ہے اور فرصت بھی کم ہے اس لئے اس وقت اس بحث پر کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ البتہ اسی آیت سے متعلق میرا ایک مضمون ترجمان القرآن (حیدرآباد) نمبر ۳ جلد ۲ میں شائع ہوا تھا یہی مضمون (تمہید کا حصہ حذف کر دینے کے بعد) درج کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ آیت کے ترجمہ سے مجھے کیا اختلاف ہے اور وہ شبہات بھی انشاء اللہ دور ہو جائیں گے جو آیت کے متعلق عام طور سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوگی تو اس پر مزید گفتگو کی جائے گی۔

یہ مضمون ایک رسالہ کی خاص تحریک کے جواب میں شائع کیا گیا تھا اس لئے اسی کے مطابق آیت سے بحث کی گئی تھی اب اسے یہاں بہت کچھ حذف و اضافہ کے بعد شائع کرنا چاہئے تھا لیکن چونکہ اپنی موجودہ شکل میں بھی پیش نظر مقصد کے لئے مفید ہے اس لئے بغیر کسی ترمیم کے شائع کیا جاتا ہے ”فاران“

اس آیت میں دراصل دو باتیں قابل بحث ہیں سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں ”امرنا“ کے کیا معنی ہیں اور مامور بہ کیا چیز ہے؟ مفسرین نے اگرچہ ”امرنا“ کے بہت سے معنی لکھے ہیں لیکن میرے خیال میں وہ تمام تر تکلفات ہیں اس آیت میں بھی ”امر“ کا وہی مفہوم ہے جو عام طور سے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے یعنی حکم دینا۔ بغیر کسی وجہ خاص کے کسی لفظ کے غیر معروف معنی مراد لینا، میرے نزدیک اصولاً غلط ہے حتی الوسع قرآن کے الفاظ سے وہی معنی مراد لینے چاہئیں جو معروف اور متداول

اب رہا یہ سوال کہ مامور بہ کیا چیز ہے؟ تو اکثر محققین تو یہی فرماتے ہیں کہ اللہ کا حکم اطاعت اور نیکوکاری کا ہوگا نہ کہ فسق وفجور کا لیکن علامہ زمخشری نے نہایت شد ومد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ عربی اصول کے لحاظ سے یہاں فسق کو مامور بہ ماننا پڑیگا کیونکہ امرتہ فقام اگر کہا جائے تو فقام کے قرینہ سے امر بالقیام مراد ہوگا۔ اسی طرح اس آیت میں بھی ففسقوا کے قرینہ سے امر بالفسق مراد ہوگا۔ لیکن واضح رہے کہ علامہ زمخشری نے یہ جو کچھ کہا ہے اصل میں مذکورہ بالا قاعدہ کی بے جا حمایت میں کہا ہے ورنہ خدانخواستہ وہ اس بات کے قائل نہیں کہ اللہ فسق وفجور کا حکم دیتا ہے۔ ان کے نزدیک امر بالفسق گویا مجازاً کہا گیا ہے اور مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ ان پر راحت اور آسائش کے دروازے کھول دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ فسق وفجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں نہ یہ کہ واقعی ان کو فسق کا حکم دیتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ زمخشری کا یہ اصرار بالکل بیجا ہے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ" امرتہ فعصی" تو کیا کوئی عربی سے واقف یہاں "عصی" کے قرینہ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں امر بالعصیان مراد ہے؟ بعینہ یہی حال یہاں بھی ہے۔ علامہ زمخشری اس قسم کی مثالوں کا یہ جواب دیتے ہیں کہ چونکہ معصیت "امر" کے منافی ہے اس لئے اس مثال میں امر بالمعصیۃ مراد نہیں ہوسکتا لیکن بقول امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اگر ایسا ہے تو "امرتہ ففسق" میں بھی فسق کا مامور بہ ہونا مناسب نہیں کیونکہ فسق کے معنی "امر کی خلاف ورزی" کے ہیں جیسا قرآن کی بعض آیتوں سے ثابت ہے تو جس طرح معصیت، مامور بہا نہیں ہوسکتی اسی طرح فسق بھی مامور بہ نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس بارہ میں ان لوگوں کا خیال صحیح ہے جو "طاعت" کو مامور بہ قرار دیتے ہیں۔

دوسری بحث یہ ہے کہ بظاہر آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہلاکت کا ارادہ پہلے ہی کر دیتا ہے اور پھر محض اسی ارادہ کو جائز ثابت کرنے کے لئے ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے، وہ نہیں مانتے اس لئے ہلاک کر دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا جب کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کیا یہ ہلاکت ان کے گذشتہ اعمال کی پاداش میں ہونے والی ہوتی ہے یا ارادہ اہلاک کے بعد خدا جو کچھ ان کو حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی کے سلسلہ میں؟ اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے ہلاک کر دینے کا ارادہ ہی کر لیا تو پھر خواہ مخواہ کے لئے ایمان اور عمل صالح وغیرہ کا حکم دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر دوسری صورت اختیار کی جائے تو یہ اعتراض لاحق ہوتا ہے کہ خدا قبل نافرمانی قبل استحقاق عذاب ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بظاہر یہ سوال بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا کہ مدیر نگار کو اگرچہ اس آیت پر یہ شبہ لاحق ہوا۔ جس کا اظہار خود ہی انھوں نے اپنی تحریر میں کیا ہے۔ لیکن جواب دینے سے انھوں نے پہلو تہی کی مہمل بات کہہ کر جان چھڑالی کہ "فی الحقیقت یہ قرآن کا انداز بیان ہے کہ عربوں کے نمونہ خطابت میں بھی اس قسم کی بکثرت ملتی ہیں" انصاف سے فرمایئے کہ کیا اس جواب سے مذکورہ بالا شبہ رفع ہوگیا؟

اصل یہ ہے کہ یہ تمام شبہات، آیت کا صحیح مفہوم معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ اس آ

خدا کے ظلم و ستم کے ثبوت کے بجائے اس کی بے پایاں رحمت اور شفقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ غلط فہمیاں محض اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ اگلی اور بعد کی آیتوں کو پیش نظر رکھ کر غور نہیں کرتے ورنہ یہ شبہ ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اللہ ہلاک کا ارادہ نافرمانی سے پہلے کرتا ہے یا نافرمانی کے بعد۔

اب قبل و بعد کی آیتوں کو ایک ساتھ پڑھیے۔ خدا فرماتا ہے۔

لا تزر وازرة وزر اخرى وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا وكم اهلكنا من القرون من بعد نوح وكفى بربك بذنوب عباده خبيرا بصيرا۔ سب سے پہلے خدا یہ فرماتا ہے کہ رسول بھیجنے سے قبل ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے۔ اس کے بعد اس کی مزید توضیح و تفسیر کے لئے فرماتا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے اعمال خبیثہ کی بنا پر ہلاکت کی مستحق ہو جاتی ہے اس سے پہلے ہم ان کو باوجود استحقاق عذاب کے آخری موقع دے کر ڈرانے والوں کو بھیج کر ایمان اور عمل صالح کا حکم دیتے ہیں جب لوگ اس کے بعد بھی اپنی شرارتوں اور بداعمالیوں سے باز نہیں آتے تو پھر ہم ان کو ہلاک کر دیتے ہیں چنانچہ اس قانون کے مطابق حضرت نوح کے بعد معلوم نہیں کتنی قومیں برباد ہو گئیں اللہ تعالیٰ لوگوں کے گناہوں سے واقف ہے اس لئے جو لوگ اس کے قانون کے مطابق عذاب کے مستحق ہوتے ہیں وہ ان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نافرمانی سے قبل ہلاک کر دینے کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ دراصل ان کے بدترین اعمال اس کا سبب ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ ان کو فوراً ہلاک نہیں کرتا بلکہ ان کو آخری موقع دیتا ہے اور ان کی ہدایت کے لئے انبیاء کو بھیجتا ہے جب اس موقع سے بھی وہ فائدہ نہیں اٹھاتے تو پھر ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ قبل اور مابعد کی آیتوں کو ملا کر غور کرنے سے اس آیت کا یہی مفہوم متعین ہوتا ہے۔ اسی لئے اگرچہ مفسرین نے اس آیت کی بھی حسب عادت مختلف تاویلیں کی ہیں لیکن محققین نے بالعموم یہی تاویل پسند کی ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معتزلہ کے قول کے مطابق اسی تاویل کو ترجیح دی ہے شریف مرتضیٰ نے بھی گرچہ اس آیت کی متعدد تاویلیں نقل کی ہیں مگر ان کا رجحان بھی اسی تاویل کی طرف زیادہ ہے علمائے متاخرین میں استاذ امام علامہ حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی تاویل کی ہے۔ اور اس کی دوسرے دلائل سے توثیق کی ہے تفصیل کا موقع نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی اور دوسری آیتوں سے اس آیت کے یہی معنی متعین ہوتے ہیں اور بعینہ اس مفہوم کی بے شمار آیتیں قرآن میں ملتی ہیں کہ خدا انذار سے قبل کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا بلکہ راستہ دکھانے والوں کو بھیج کر ان کا آخری بار امتحان لیتا ہے مثلاً ایک آیت میں ہے۔

ذالك ان لم يكن ربك مهلك القرى بظلم واهلها غافلون

یعنی پیغمبروں کو بھیج بھیج کر حجت کا تمام کرنا اس سبب سے ہے کہ تمہارا پروردگار بستیوں کو ظلم سے ہلاک کرنے والا نہیں
۔ان کو ہلاک کر دے اور وہاں کے رہنے والے خدا کے منشا سے بے خبر ہوں۔

ایک دوسری آیت میں ہے:۔
ما کان ربك مهلك القرىٰ حتىٰ يبعث فى امها رسولاً يتلوا عليهم اٰياتنا
یعنی جب تک تمہارا پروردگار کسی قصبے میں پیغمبر نہ بھیجے اور وہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر نہ سنا دے اس کی شان
انصاف سے بعید ہے کہ اتمام حجت کے بغیر بستیوں کو ہلاک کر دیا کرے۔سورہ شعراء میں ہے:۔
وما اهلكنا من قرية الا ولها منذرون۔
ہم نے کسی گاؤں کو بے اس کے ہلاک نہیں کیا کہ آگاہ کرنے کو ان کے پاس پیغمبر آئے۔
استحقاق عذاب کے بعد انذار پر عذاب کیوں موقوف ہوتا ہے؟ اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ دیا ہے
مثلاً سورہ قصص میں ہے۔ ولولا ان تصيبهم مصيبة بما قدمت ايديهم فيقولوا ربنا لولا ارسلت
الينا رسولا فنتبع اٰياتك ونكون من المؤمنين
ایک دوسری جگہ ہے۔ لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل ان تقولوا ما جاءنا من بشير و
لا نذير۔ لولا ارسلت الينا رسولا فنتبع اٰياتك
اسی قسم کی بہت سی آیتیں قرآن میں ہیں اس وقت اس کی چند مثالیں پیش کر دی گئی ہیں استقصاء مقصود نہیں
ان تمام آیتوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ آیت اذا اردنا الخ میں روئے سخن خواہ یہود کی طرف ہو یا مشرکین عرب
کی طرف، یہ بات واضح کی گئی ہے کہ کوئی قوم انذار سے قبل ہلاک نہیں کی جاتی لیکن انذار کے بعد پھر وہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی
اس لئے اللہ کا تم پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تم کو تمہاری بدکاریوں کی وجہ سے ہلاک نہیں کر دیا بلکہ تمہاری ہدایت
کے لئے رسول بھیجا۔ اب بھی اگر تم اپنی بدکاریوں سے باز آ گئے تو یاد رکھو کہ اللہ تمہارے کردار سے واقف ہے۔ وہ
ضرور تم کو ہلاک کر دیگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مفہوم کی توضیح کے بعد آیت میں کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہتا۔ ہاں ایک سوال یہ
باقی رہ جاتا ہے کہ آیت میں مترفین (خوشحال لوگوں) کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں
کی وجہ سے ہلاکت کی مستحق ہو گئی تو اگر اللہ کو خیرخواہی مقصود ہے تو مترفین کے ساتھ پوری قوم کو اطاعت اور نیکوکاری
کا حکم دیا جاتا اور پوری قوم کے لئے انذار ہوتا صرف مترفین کی تخصیص کیوں کی جاتی ہے؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ
آیت کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ یہ حکم مترفین کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ حکم تمام اہل قریہ کے لئے ہوتا ہے
لیکن چونکہ عوام ان کے تابع ہوتے ہیں۔ اور یہی دراصل ان کی شقاوت یا سعادت کا باعث ہوتے ہیں۔ نیز یہاں روئے سخن
"مترفین" ہی کی طرف ہے اس لئے ذکر میں ان کی تخصیص کر دی گئی۔ ورنہ یہ چیز اپنی جگہ پر عام ہے۔

محبت یا ہوسناکی؟

(از جناب ... محمد صدیق صاحب متعلم دار العلوم ندوہ)

جب صلاح الدین حج کی غرض سے روانہ ہوا تو اس نے اپنی جائداد کے ساتھ اپنی دونوں لڑکیوں کو بھی اپنے چچا زاد بھائی سعد کے سپرد کر دیا۔ چھوٹی لڑکی کا نام سعاد و بڑی کا نام سودہ تھا لیکن صلاح الدین کو حج کر کے واپس آنا نصیب نہ ہوا اور راستہ ہی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اب اس کی دونوں لڑکیاں یتیم تھیں۔ ان کی پرورش کرنے والا صرف ان کا چچا سعد تھا۔ جو ان یتیم بچیوں کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کرتا تھا۔

ان دونوں لڑکیوں میں سعاد زیادہ خوبصورت تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ ذہین نہ تھی۔ لیکن سودہ کا حال اس کے برعکس تھا یعنی وہ صورت کے اعتبار سے تو کوئی خاص جذب و کشش اپنے اندر نہ رکھتی تھی لیکن فہم و فراست میں اپنی چھوٹی بہن سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہ دونوں اپنے چچا کی سرپرستی میں بہت خوش و خرم رہتی تھیں۔ اور زیادہ وقت اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ کھیل کود میں صرف کیا کرتی تھیں۔ دن رات گذرتے گئے۔ یہاں تک یہ دونوں شباب کی منزلیں طے کرنے لگیں اور رفتہ رفتہ گذر کر جوانی کے مرتبہ پر پہنچ گئیں۔ چونکہ سعاد حسن و جمال کی دیوی معلوم ہوتی تھی اسلئے گو وہ عقل و ذہانت میں اپنی بڑی بہن سودہ سے بہت پیچھے تھی لیکن دلدادہ نوجوانوں کی نظر میں جو حسن صورت کو ہمیشہ حسن سیرت پر ترجیح دیا کرتے ہیں سودہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قابل ترجیح تھی۔

سعد کے دونوں لڑکے جو اپنی چچا زاد بہنوں کے ساتھ کھیل کود کر اب نوجوان ہو چکے تھے، چھوٹی لڑکی یعنی سعاد کے ساتھ اندر ہی اندر انس محسوس کر رہے تھے، اور گو اب ان کے اور ان کی بہنوں کے درمیان سن شعور و جوانی نے ایک رسمی پردہ حائل کر دیا تھا جس کی بنا پر انہیں سعاد سے بات چیت کرنے اور میل ملاپ رکھنے کا پہلے جیسا موقع نہیں ملتا تھا۔ وہ موقعہ جو بچپن جیسے پرسکون اور معصوم زمانہ ہی میں حاصل ہو سکتا ہے تاہم وہ اس سے ملنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے اور جب کبھی موقع مل جاتا، اس سے باتیں کرتے لیکن اب یہ ایک دوسرے کی موجودگی میں سعاد سے باتیں کرنے میں ذرا جھجکتے تھے اور دونوں کے دل میں یہی خواہش ہوتی کہ وہ چلا جائے تاکہ میں سعاد سے تنہا باتیں کر سکوں۔

ایک دن سعید (بڑا لڑکا) موقع پا کر سعاد کے پاس گیا، اور اس سے کہا "کاش تم اپنے بھائی کی اس مصیبت کو جان سکتیں جس نے اسے تباہ کر رکھا ہے" اس کے بعد وہ زیادہ تکلف و تصنع کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی آواز پھول گئی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس نے آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ سعاد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے ساختہ کہنا شروع کیا "سعاد یاد کرو، جو کچھ میں کہتا ہوں اسے یاد رکھو۔ سعاد میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا دلدادہ ہوں، میرا دل صرف

تمہاری محبت سے لبریز ہے، میرے دل میں تمہارے عشق نے گھر کر لیا ہے، جس چیز کو تم بُرا سمجھتی ہو، اس کو میں بھی بُرا سمجھتا ہوں، اور جس چیز کو تم اچھا سمجھتی ہو، میں بھی اسے اچھا سمجھتا ہوں، سعاد میں تمہارا ہوں اور تم میری"

سعاد نے اس کی گفتگو کو غور سے سنا، مسکرائی اور چپ ہو رہی۔ سعید نے یہ دیکھا، خاموشی سے اپنے آنسو پونچھے اور چلا گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اس کا چھوٹا بھائی طلحہ آ پہنچا، یہ بے حد حسین، خوش فکر و خوش بیان نوجوان تھا، اس کی خوبصورت و چمکیلی آنکھوں سے دانشمندی کے آثار نمایاں تھے، یہ جب کبھی کسی مجلس میں بیٹھ جاتا، تو لوگ اس کی خوش بیانی کو سن کر تعجب کیا کرتے تھے، یہ چپکے سے سعاد کے قریب جا کر بیٹھ گیا، اور کہا:۔

سُعاد! اگر میں تم سے یہ کہوں، کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تو تمہارے لئے کوئی نئی بات نہ ہوگی، اس لئے کہ جو شخص بھی تمہیں دیکھے گا، یہ جملہ کہے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں، کہ اگر کوئی شخص تمہیں دیکھ لے، تو تمہارا دلفریب حُسن اسے تمہاری تعریف کرنے پر مجبور کر دے گا، اور وہ اپنی محبت تمہارے سامنے ظاہر کئے بغیر نہ رہے گا، جب وہ تمہاری ان خوشنما آنکھوں اور پیچ در پیچ زلفوں پر نظر کرے گا، تو اس کے دل میں ایک ایسی اُمید پیدا ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی، جو اس کی زبان کی گرہ کو کھول کر اسے اظہار محبت پر جری نہ کر دے، حُسن عاشق کی زبان بند کر دیتا ہے، اسکے سینہ میں حکایات کا ایک دفتر ہوتا ہے۔ لیکن انہیں بیان نہیں کر سکتا، میں جب کبھی تمہارے سامنے اپنے دلی خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں تو خیال ہوتا ہے، کہ انہیں ہمت و شجاعت کے ساتھ پیش کر دوں، لیکن جب تمہارے پاس آتا ہوں، تو تمہارے حُسن کو دیکھتے ہی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں، اور دل کے تمام خیالات دل ہی میں رہ جاتے ہیں، . . . . میں نے سنا ہے۔ کہ سعید تم سے بہت اختلاف رکھتا ہے، مگر تعجب ہے۔ کہ وہ پھر کس منہ سے تمہارے عشق و محبت کا دم بھرتا ہے، میں اپنے بھائی کے راز سے اچھی طرح واقف ہوں، کیونکہ ہم دونوں بچپن سے ساتھ کھیلتے۔ تربیت پاتے، اور تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں، اگر میں اس کے عادات و اخلاق سے واقف نہ ہوں گا، تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں، کہ تمہاری سنجیدگی نے اس کو تمہارے ساتھ گفتگو کرنے اور میل ملاپ رکھنے پر آمادہ کیا، ورنہ حقیقت یہ ہے، کہ اگر سعید آئینہ اُٹھا کر اپنی صورت دیکھے، تو اسے معلوم ہو جائے، کہ وہ تم جیسی شاداب کلی کے کس طرح لائق نہیں؟ سعید اگرچہ میرا بڑا بھائی ہے، مگر میں اس کی مذمت کے لئے نہیں، بلکہ اظہار واقعہ کے لئے یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں، کہ وہ بدمزاج، درشت خو اور غصہ ور شخص ہے، میرا خیال ہے، کہ تم نے بھی اس کے اخلاق کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہوگا، اور میری ہم خیال ہوگی"

طلحہ نے اپنے بھائی کی عیب جوئی کی، اور اس کی طرف سے سعاد کے خیالات کو مسموم کرنا شروع کیا، اس نے بہت جلد اپنی ہمزبانی سے مسحور کر لیا، کیونکہ ایک حسینہ کے لئے اس کے حسن کی تعریف سے زیادہ دلچسپ اور مسرور کن چیز اور کیا ہو سکتی، ایک حسین عورت کسی شخص سے اتنا دھوکہ نہیں کھا سکتی، جتنا کہ وہ اپنے حُسن کی تعریف کرنے والے نوجوان سے، حقیقۃً یہ ہے، کہ دنیا کی ہر عورت کو اپنے حُسن پر ناز ہوا کرتا ہے، اگرچہ وہ حقیقت کے لحاظ سے اس کے برعکس ہی کیوں نہ

یہ جانیکہ ایک خوبصورت اور نازک اندام حسینہ وہ تو اپنی ذات کو مدح و ثنا سے کہیں زیادہ بالاتر سمجھتی ہے، خصوصاً جبکہ اس کی تعریف کرنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہو۔

جب سعادت نے دیکھا کہ دونوں بھائی اس کی محبت سے بے تاب ہو رہے ہیں، تو اس سے بڑھ کر اور کون چیز اسے مسرور کر سکتی تھی؟ رفتہ رفتہ یہ خبر تمام خاندان میں پھیل گئی، اور جب اس بات کا علم ان کے والد سعد کو ہوا، تو وہ اس کے برے نتیجے سے بہت زیادہ پریشان ہوا اور اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے اکثر سوچ بچار میں رہنے لگا، وہ ان خیالات پراگندہ ہو کر کہتا تھا کہ محبت انسان کو ایسے اعمال کے ارتکاب پر مجبور بنا دیتی ہے، جن کے متعلق اس کی طرف سے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ محبت کی چنگاری پورے خاندان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔"

آخر سعد کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ سعید کو بلا کر کہے چنانچہ اس نے ایک روز سعید کو اپنے پاس بلا کر کہا بیٹا! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرا بھائی سلمان کتنی بڑی جائداد اور مال و دولت اپنی بڑی لڑکی سودہ کے لئے چھوڑ گیا ہے، اور وہ یتیم ہو گئی ہے باوصف اس کے کہ وہ کم حسین ہے، اس کے باپ کو پہلے ہی سے خطرہ تھا، کہ شاید اس بیکسی کی وجہ سے اس کی شادی میں دقت پیش آئے، لہذا اس نے یہ بھی شرط لگا دی ہے کہ اس ساری جائداد کا مالک محض وہ شخص ہو گا جو سودہ کو بیاہ کر اپنے گھر لے جائے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ کوئی غیر شخص میرے بھائی کی دولت سے فائدہ اٹھائے۔ رہا سعادت کا معاملہ، تو وہ چونکہ خوبصورت اور صاحب جمال ہے، اس لئے اس کے نکاح میں چنداں دشواری نہیں، اور میں نے سنا ہے کہ تم سعادت سے شادی کرنے کی خواہش رکھتے ہو، اگر ایسا ہے، تو تمہیں اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا چاہئے۔"

اس گفتگو کے بعد سعد نے اپنے چھوٹے لڑکے طلحہ کو بلایا، اور اس سے بھی یہی باتیں کہیں، اور اسے سوچنے کے لئے ایک دن کی مہلت دی، دوسرے دن باپ نے سعید کو بلا کر جواب طلب کیا۔ سعید نے جواب دیا:-

ابا جان! مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا چھوٹا بھائی طلحہ بھی سعادت سے محبت کرتا ہے، اس لئے میرا فرض ہے، کہ میں اپنے چھوٹے بھائی پر شفقت کروں۔ اس سے بڑھ کر میری شفقت کا مستحق اور کوئی نہیں ہو سکتا، اور یوں بھی ان سب باتوں کے باوجود میں اسے سعادت کا زیادہ مستحق سمجھتا ہوں، کیونکہ سعادت سودہ سے چھوٹی ہے لہذا میں سودہ کا مستحق ہوں اور وہ سعادت کا، بڑی لڑکی بڑے کے لئے اور چھوٹی چھوٹے کے لئے ہے اگرچہ میں سعادت سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتا تھا، مگر اب میں نے اپنے ارادہ کو بالکل بدل دیا ہے۔

سعد نے اس کا جواب سن کر اسے رخصت کیا، اور اپنے دوسرے چھوٹے لڑکے طلحہ کو بلایا۔ طلحہ نے حاضر ہو کر باپ کی خدمت میں سلام عرض کیا، باپ نے نہایت ہی شفقت آمیز لہجہ میں جواب دیا، اور اس سے گذشتہ سوال کا جواب طلب کیا، طلحہ نے جواب دیا:-

"ابا جان: میرا بڑا بھائی سعاد سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے، اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کی شادی سعاد سے کردیں، اور میں سودہ سے شادی کروں گا، اگرچہ سودہ اتنی خوبصورت نہیں، مگر اس کے اخلاق ظاہری حسن سے کہیں اچھے ہیں"
سعاد اس گفتگو کو پردے میں بیٹھی اپنے کانوں سے سن رہی تھی، جب طلحہ یہ کہہ کر چلا گیا تو وہ اپنے چچا کے پاس آئی اور رو کر کہنے لگی "چچا جان! مجھے ان دونوں سے علٰحدہ رکھئے دونوں سے ہاں دونوں سے: دونوں سے علٰحدہ رکھئے!
سعد نے جواب دیا: "بیٹی! گھبراؤ نہیں تم تو خوش قسمت ہو، کیونکہ دنیا تمہیں اپنے خوش نما اور دلفریب دامن میں لینے سے پہلے اپنے دامن کی حقیقت تمہارے او پر واضح کئے دے رہی ہے، اور میں نہیں سمجھ سکتا، کہ اس نے اپنی قدیم عادت کے خلاف ایسا کیوں کیا۔ اب یہ تمہارا فرض ہے، کہ تم بجائے گھبرانے کے اسے سمجھو، اور بجائے رونے کے اس پر ہنسو"

سلف صالحین

(از مولانا ظفر علی خاں مدظلہٗ)

وہ مسلماں کہاں اگلے زمانے والے — گردنیں قیصر و کسریٰ کی جھکانے والے
امتیاز ابیض و اسود کا مٹانے والے — سبق انساں کو اخوت کا پڑھانے والے
بات کیا تھی کہ نہ روما سے نہ ایراں سے دبے — چند بے تربیت اونٹوں کے چرانے والے
بھید وہ کیا تھا جو آپس میں ملے تھے نہ کبھی — ہو گئے مشرق و مغرب کے ملانے والے
جن کو کافور پہ ہوتا تھا نمک کا دھوکا — بن گئے خاک کو اکسیر بنانے والے
پیشوائی کو نکل آئی خدائی ساری — گھر سے نکلے جو محمد کے گھرانے والے
وہی نیساں ہے گہر ریز ابھی تک لیکن — نظر آتے نہیں گوہر کے لٹانے والے
کیا سکھاتے ہیں تمدن کی حقیقت ہم کو — آج قرآں کی دولت کو چرانے والے
فیض کس کا ہے یہ اس پر بھی کبھی غور کریں — اپنی تہذیب کا افسانہ سنانے والے
بادشاہی میں فقیری کا چلن رکھتے ہیں — دوش پر بار امانت کا اٹھانے والے
نہ دبے ہیں کبھی باطل سے نہ دب سکتے ہیں — گردن اللہ کے رستے میں کٹانے والے

آشنا ذوق اسیری سے ہو میری مانند
شعر کہنے ہوں اگر وجد میں لانے والے

(بہارستان)

علم اور مذہب

وجود باری کے متعلق ماہرین علم جدید کی رائیں

(از جناب ا۔ د صاحب اثلی)

رسالہ الہلال (عربی) نے مصر کے تین مشہور فاضل، ڈاکٹر علی توفیق شوشہ بک، ڈاکٹر محمد ولی اللہ، ڈاکٹر احمد زکی بک سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خدا کی ذات کے متعلق اپنی رایوں کا اظہار کریں۔ اس درخواست کو قبول کرتے ہوئے ان علماء نے خدا کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی قدرت کاملہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا خلاصہ ناظرین فاران کے لیے یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔ مصر میں ان حضرات کا شمار جدید علوم و فنون کے زبردست ماہرین میں ہوتا ہے۔ مذہب کے متعلق ان کے خیالات پڑھ کر اپنا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے کہ علم اور مذہب ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں اور جدید علوم کی تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں۔

ڈاکٹر احمد زکی نے اپنی رائے کا اظہار بہت بسط کے ساتھ کیا ہے اس لئے وہ الگ آئندہ صحبت میں پیش کی جائے گی۔

ڈاکٹر علی توفیق فرماتے ہیں۔ دنیا میں جن لوگوں کو خدا کی معرفت، اس کی عظمت کے ادراک اور اس کی قدرت و وحدانیت کے اعتراف کا زیادہ حق پہنچتا ہے وہ علماء ہیں۔ یہ اس لئے کہ عام لوگوں کے مقابلہ میں ان کا تعلق کائنات کے اسرار و غوامض سے زیادہ گہرا اور قریبی ہوتا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کائنات خدا کا ایک مظہر، کہنا چاہئے کہ اس کا ایک ایسا سربستہ راز ہے جس کی حقیقت کا سمجھنا انسانی دسترس سے باہر ہے۔

ایک ماہر فزیالوجی (علم وظائف الاعضاء)، جو اپنے معمل میں ہر روز یہ دیکھتا ہے کہ قلب کس طرح حرکت کرتا ہے، حرکت میں کیا خاص نظم ہوتا ہے، اعصاب اس پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، حوادث اور خارجی حالات کے پیدا کردہ انفعالات کیونکر اس کی حرکات میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں یا وہ دیکھتا ہے کہ جسم کے اعضاء کے درمیان باہم کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ کس نظام کے ماتحت اپنی جگہ اپنا ضروری کام انجام دیتے ہیں تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات میں کوئی ایسی قوت ضرور موجود ہے جو اس نظام کو اس حکمت، عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ چلا رہی ہے اور ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن کے ایک جزء کا پیدا کرنا بھی مخلوق کی مقدرت سے باہر ہے۔

علماء حیات جب "امیبا" یعنی اس حیوان کو دیکھتے ہیں جس کی ترکیب صرف ایک خلیہ سے ہوتی ہے تو وہ حیران

ہو جاتے ہیں کہ وہ کیونکر اپنی غذا فراہم کرتا ہے کیونکر اسے ہضم کرتا ہے اور کس طرح فضلات کو خارج کرتا ہے میرا خیال ہے جو لوگ قدرت کے یہ محیر العقول کرشمے دیکھتے ہیں ان کا دل خدا کی معرفت اور اس کی عظمت کے احساس سے زیادہ لبریز ہونا چاہیے

اس وقت فن کیمسٹری نے ترقی کے بہت سے مدارج طے کر لئے ہیں۔ اب اس فن کے علماء کے لئے یہ بہت آسان ہو گیا ہے کہ "مواد حیات" کو تحلیل کر کے ان کے عناصر اولیہ الگ الگ کر لیں یا ان عناصر کو ترکیب دے کر ان سے ایسے مرکبات تیار کر لیں جو صورت و تکوین میں "مواد حیات" کے مشابہ ہوں لیکن وہ چیز جو ان مرکبات اور مواد حیات کے درمیان فرق پیدا کرتی ہے اور جس پر انسان کو نہ قدرت حاصل ہے اور نہ حاصل ہو سکتی ہے، حیات ہے۔ علماء اپنے معملوں میں جن مواد کو ترکیب دیتے ہیں ان میں حیات پیدا کرنے سے علم اب تک قاصر رہا ہے اور ہمیشہ قاصر رہے گا کیونکہ وہ مادہ جسے پروٹو پلازم کہتے ہیں اس کی ایجاد و تخلیق انسان کے بس کی بات نہیں اس کا خالق صرف خداوند تعالیٰ ہے اور وہ اس کی تخلیق میں منفرد ہے یہی بات اس کی بے پایاں عظمت و قدرت کی دلیل ہے۔

جب میں دوربین کے پاس بیٹھتا ہوں یا اپنے معمل میں اپنے تجربات میں مشغول ہوتا ہوں تو میرا سر خدا کی بے انتہا قدرت کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت اس کے خلاق عظیم ہونے کا ایمان بہت زیادہ قوی ہو جاتا ہے

ڈاکٹر محمد ولی فرماتے ہیں کہ:۔

علوم و فنون کا جو سرمایہ ہمیں آباؤ اجداد سے وراثت میں ملا تھا وہ ترقی کے اس درجہ کو پہونچ گیا ہے جو پہلے زمانہ کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ انسانی بحث و استقراء نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ جو علوم و فنون زمانہ قدیم میں موجود تھے اس وقت ان میں سے ہر ایک متعدد اہم اور مستقل فنون میں منقسم ہو گیا ہے تقسیم و تجزیہ کے بعد جو جو یہ علوم پیدا ہوئے ہیں ان سے بھی عنقریب دوسری مستقل علوم کی شاخیں نکلنے والی ہیں، یہ علوم و فنون کا دائرہ اس قدر وسیع اس کے لئے ہوتا جا رہا ہے کہ کائنات اسرار و غوامض کا ایک مجموعہ ہے۔ آج اگر ایک بند کھلتا ہے تو دوسری بہت سی گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ انسان کائنات کے اسرار معلوم کرنے کے لئے اپنی ہر ممکن کوشش صرف کرتا ہے لیکن جتنا اس کے بحث و استقراء کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے غوامض کی فہرست بھی لمبی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز معمہ ہے اور ہر قسم کی کوششوں کے بعد جو کچھ وہ معلوم کرتا ہے وہ معرفت کے بحر ناپیدا کنار کے ایک نہایت حقیر قطرہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مفکرین نے ہر زمانہ میں کائنات کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی، بڑے بڑے نظریے قائم کئے گئے لیکن چند روز کی مقبولیت اور شہرت کے بعد خود بخود باطل ہو گئے۔ اس زمانہ میں علوم و فنون نے بہت ترقی کر لی ہے انسانی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے لیکن انسان جن حیرانیوں میں پہلے مبتلا تھا اب بھی مبتلا ہے اور جہالت کے جو بادل اسے ہر طرف سے پہلے گھیرے ہوئے تھے

اب بھی گھیرے ہوئے ہیں اس وقت ایک ایسا شخص جو غیر جانبدار اور ماحول کے ہر قسم کے اثرات سے آزاد ہو کر غور کرتا ہے یہ محسوس کرتا ہے کہ کائنات میں کوئی ایسی قدرت ضرور کارفرما ہے جس کی کارفرمائی اور صفات ہمارے دائرہ ادراک سے باہر ہیں انسان جب کائنات کے اسرار کھولنے سے اپنے کو عاجز پاتا ہے اور اپنے قلبی وجدان کے ذریعہ یہ محسوس کر لیتا ہے کہ کوئی ایسی طاقت ضرور موجود ہے جس کے ہاتھ میں ہر راز کا آخری سرا ہے تو وہ انتہائی حیرت اور سخت وجدانی اضطراب کے عالم میں اپنے کو اسی قدرت قاہرہ کی گود میں ڈال دیتا ہے اور اس وقت ایک ناقابل بیان سکون و طمانیت محسوس کرتا ہے۔ اس کی مثال اس بچے کی سی ہوتی ہے جو کسی چیز سے ڈر کر اس سے بچنے کے لئے اپنے کو ماں کی گود میں ڈال دیتا ہے اسی قدرت کا نام اللہ ہے جو مادیات سے مجرد اور مالوفات حواس سے بالکل منزہ ہے انسان اپنی عقل و ادراک کے ذریعہ خدا تک نہیں پہونچ سکتا۔ جو چیز اس تک اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اس کا یقین دل میں پیدا کرتی ہے اس کا پاک و صاف وجدان ہے۔

یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ انسان کے اندر دو زبردست طاقتیں ہیں ایک کا نام قوت مفکرہ ہے اور دوسرے کا قوت وجدانیہ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ اور اپنی جگہ مستقل ہیں۔ پہلی قوت کا نتیجہ ہر قسم کے علوم ہیں اور اس کی تگ و تاز حسی مشاہدات تک محدود ہے۔ وجدان کا دائرہ عمل اس سے الگ یعنی وہ مسائل ہیں جن کا حسی تجربات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

دلیری

حجاج بن یوسف کوفہ و عراق کا ایک نہایت ظالم گورنر ہوا ہے۔ اس نے ہزاروں بندگان خدا کو بے جرم تہ تیغ کیا ہے۔ ایک مرتبہ حجاج نے دربار عام کیا اور اس میں خلیفہ کی تعریف کے ساتھ ساتھ اپنی بہادری اور جرات کی بھی تعریف کی ایک عراقی عالم سعد بھی اس دربار میں موجود تھے۔ آپ نے حجاج کی تقریر کے بعد جوابی تقریر کرتے ہوئے کہا۔

واقعی حکومت بلاشبہ بہت وسیع ہے اور وہ اس کا گورنر حجاج یقینی طور پر جری ہے لیکن ایسا جری ہے جس کی جرات حق کے لئے صرف نہیں ہوتی بلکہ دنیا کے لئے حجاج بہادری کا دعویدار ہے کیا بہادری اسی کا نام ہے کہ تو نے کوفہ میں قتل و خون کے دریا بہائے کیا بہادری اسی کو کہتے ہیں کہ تو نے خانہ کعبہ پر پتھر برسائے؟ تجھکو اپنی گورنری پر ناز ہے اور ہم تجھے قہر الٰہی سمجھتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ہم میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ ہم تجھ جیسے ظالموں سے نجات حاصل کر سکیں۔

سعد کی تقریر نے مجمع میں اس درجہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ حجاج کو جان کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ لیکن حجاج ضبط کئے ہوئے بیٹھا رہا۔

تجلیات اختر

دریا کے کنارے

(از جناب اختر جمال صاحب مسلم یونیورسٹی)

وہ چاندنی راتوں میں اکثر دریا کے کنارے ہوتے ہیں
ڈوبے ہوئے اُنکے جلووں میں ساحل کی نظارے ہوتے ہیں

آنکھوں میں اشکِ گہر افشاں اور چرخ پہ تارے ہوتے ہیں
معصوم نگاہوں میں اُنکی معصوم نظارے ہوتے ہیں

کچھ شرم سے اُنکے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہوتا ہے
کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے بیتاب اشارے ہوتے ہیں

سرمست فضائیں ہوتی ہیں سرشار ہوائیں چلتی ہیں
موجوں کے ترنم میں پنہاں فطرت کے اشارے ہوتے ہیں

وہ محوِ ترنم ہوتے ہیں نغمات کی بارش ہوتی ہے
خوابیدہ محبت کے جذبے۔ اللہ اللہ کے شرارے ہوتے ہیں

ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ پُرکیف مناظر کی دنیا
کیا کہئے۔ نگاہوں میں کیا کیا پُرکیف نظارے ہوتے ہیں

پیڑوں کی گھنی شاخوں سے پرے وہ ابر کے ٹکڑے نور افشاں
جس طرح اندھیری راتوں میں پُرنور غبارے ہوتے ہیں

ہیں شیشہ بدست و نغمہ بلب۔ وہ مینا بدوش و جام بکف
اِس عالمِ کیف و مستی میں وہ کتنے پیارے ہوتے ہیں

اک ہوک جگر میں اُٹھتی ہے۔ کچھ درد سا دل میں ہوتا ہے
بیتاب نگاہوں میں پنہاں بیتاب اشارے ہوتے ہیں

آنکھوں سے محبت کے آنسو۔ موتی بن بن کے ٹپکتے ہیں
بجلی سی چمکتی رہتی ہے۔ جذبات شرارے ہوتے ہیں

لہریں سی اُٹھتی رہتی ہیں۔ آنکھیں رہ رہ کے جھپکتی ہیں
تاروں سے چمک ہوتی ہے۔ موجوں سے اشارے ہوتے ہیں

مدہوش سا کچھ ہو جاتا ہوں۔ کچھ دل کی تڑپ بڑھ جاتی ہے
وہ کھوئے ہوئے سے جب میرے شانے کے سہارے ہوتے ہیں

چھا جاتے ہیں سارے عالم پر۔ جذباتِ محبت اُٹھ اُٹھ کر
آنکھوں سے جو آنسو گرتے ہیں وہ چاند ستارے ہوتے ہیں

اِس عالمِ کیف و مستی میں۔ یوں میری طرف وہ بڑھتے ہیں
بول اُٹھتی ہیں خود آنکھیں اُنکی۔ اب ہم بھی تمہارے ہوتے ہیں

غزل

(از جناب اسرار الحق صاحب مجازؔ سابق ایڈیٹر آواز دہلی)

یہ غزل مشاعرہ یوپی نمائش لکھنؤ میں پڑھی گئی

وہ نقاب آپ سے اٹھ جائے تو کچھ دور نہیں ۔۔۔ ورنہ میری نگہِ شوق بھی مجبور نہیں

آنکھ سے چھپتے ہو اور قلب سے مستور نہیں ۔۔۔ تم عجب چیز ہو نزدیک نہیں دور نہیں

وہ بھی رو دیں مرے رونے پہ یہ منظور نہیں ۔۔۔ ورنہ جذبِ غمِ پنہاں سے یہ کچھ دور نہیں

خاطرِ اہلِ نظر حسن کو منظور نہیں ۔۔۔ اس میں کچھ تیری خطا دیدۂ مہجور نہیں

ہائے وہ وقت کہ جب بے پیے مدہوشی تھی ۔۔۔ ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں

تم کو یہ زعم کہ دنیا ہے تمہیں سے روشن ۔۔۔ مجھکو شکوہ مری دنیا میں کہیں نور نہیں

جراتِ عرض پہ وہ کچھ نہیں کہتے لیکن ۔۔۔ ہر ادا سے یہ ٹپکتا ہے کہ منظور نہیں

کبھی جلووں کا وہ طوفاں کہ الٰہی توبہ ۔۔۔ اور کبھی وہم کہ خود آنکھ میں بھی نور نہیں

دل دھڑک اٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پر ۔۔۔ اب قدم منزلِ جاناں سے بہت دور نہیں

حسن ہی حسن ہے جس سمت نظر اٹھتی ہے ۔۔۔ اب کہیں طور نہیں، برقِ سرِ طور نہیں

یاں چھپٹے پڑتے ہیں انوار ہر اک ذرے پر ۔۔۔ محفلِ عشق ہے یہ جلوہ گہِ طور نہیں

حسن مختار سہی، مختار رہے گا لیکن ۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود عشق بھی مجبور نہیں

میرے نزدیک وہ پیری ہے جوانی کیا ہے ۔۔۔ ایک اک سانس اگر نعرۂ منصور نہیں

دیکھ سکتا ہوں تو آنکھوں سے وہ کافی ہے مجاز ۔۔۔ اہلِ عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

سوال وجواب

آیت انی سقیم کی صحیح تاویل

(۳)

(از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

تفصیل بالا سے آیت "بل فعلہ کبیرہم ہذا"، کی تاویل ذہن نشین ہوگئی ہوگی اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت "انی سقیم" کی کیا تاویل ہے ؟ عام طور پر اس سے بھی لوگوں نے حضرت خلیل اللہ کی جانب جھوٹ کی نسبت کی ہے اور اس کی تائید میں روایت "اکذب ابراہیم الا ثلث کذبات" الخ پیش کی ہے لیکن محققین علماء اس روایت کی صحت ہی تسلیم نہیں کرتے اس پر بحث گذر چکی ہے جو لوگ اس ... کو مفصل دیکھنا چاہیں وہ تفسیر کبیر جلد ، کی طرف رجوع کریں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ علماء محققین اس آیت کی کیا تاویل کرتے ہیں؟

علماء محققین کی تاویل کا خلاصہ محققین کی تاویل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کسی مقام پر جشن منانے جارہی تھی حضرت ابراہیمؑ سے بھی کچھ لوگوں نے جشن میں شرکت کے لئے کہا آپ نے تبلیغ کے دوسرے طریقے اختیار کرنے کے بعد ایک مرتبہ کھلم کھلا ان کے معبودان باطل کی بے بسی ظاہر کر دینے کا یہ موقع بہت غنیمت خیال کیا، کیونکہ اس میلہ میں تقریباً تمام قوم شرکت کرتی تھی اور ان کا بتخانہ بالکل خالی ہو جاتا تھا چنانچہ آپ نے جشن کی شرکت سے معذوری ظاہر کرنے کے لئے یہ کیا کہ فوراً تاروں پر نظر دوڑائی اور کہا میں بیمار ہوں چونکہ آپ کی قوم کو تاروں سے خاص عقیدت تھی اس لئے جب آپ نے تاروں سے اپنے لئے بری فال لی تو آپ کی قوم نے جشن میں شرکت کے لئے اصرار نہ کیا اور آپ کو بتخانہ ہی میں چھوڑ کر چلی گئی۔

آیت کی اس تاویل سے ہمیں مختلف وجوہ کی بناء پر اتفاق نہیں ہے۔

(۱) علماء کی اس تاویل کی بناء پر مقام جشن اور بتخانہ دو جگہ ماننا پڑے گا حالانکہ مقام جشن بتخانہ ہی کو ہونا چاہئے کیونکہ مذاہب جشن کے لئے بت خانہ ہی موزوں ہوتا ہے۔

(۲) "فنظر نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم" کے ماقبل خواہ مخواہ سوال مقدر ماننا پڑے گا حالانکہ بغیر سوال مقدر مانے ہوئے بھی اس سے کہیں اچھی تاویل ہو سکتی ہے اور کسی طرح کے اعتراض وارد ہونے کا بھی اندیشہ نہیں۔

(۳) نجوم سے (فال لینا) ماننا پڑے گا حالانکہ پہلے تو اس کا جواز ہی مشتبہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت خلیل اللہ جیسے جلیل القدر نبی کی شان سے تو یہ بہت ہی فروتر ہے۔

(۴) اگر اسے (فنظر نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم) حیلہ تسلیم کریں تو پھر یہ سوال ہوگا کہ انبیاء کے لئے حیلہ کرنا کیسا ہے
الغرض اس تاویل کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو چند در چند زحمتیں پیش آتی ہیں جن میں سے دو زحمتیں تو ایسی ہیں جنھیں محققین نے بھی محسوس کیا ہے۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں سے فال بد لیا حالانکہ اسکے جواز میں شبہ ہے دوسرے یہ کہ آپ نے بیماری کا عذر کیا حالانکہ آپ بیمار نہ تھے محققین علماء نے ان دونوں سوالوں کے مختلف جواب دیئے ہیں لیکن ان سے ہماری تشفی نہیں ہوئی۔

ہمارے نزدیک واقعہ کی نوعیت وہ نہیں جو مفسرین نے بیان کی ہے بلکہ اصل واقعہ یوں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم جشن منانے کے لئے جمع ہوئی تھی اور آپ بھی بغرض ارشاد و تبلیغ وہاں تشریف لے گئے تھے اور عموماً یہ تمام انبیاء کی سنت رہی ہے کہ وہ ہر اجتماع پر تبلیغ و ارشاد کے لئے پہنچ جایا کرتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول "اذ قال لابیہ وقومہ ماذا تعبدون ائفکاً آلہۃ دون اللہ تریدون فما ظنکم برب العالمین" اجتماع ہی کے موقع کا ہے لیکن جب اس قسم کی باتوں سے آپ کی قوم ٹس سے مس نہ ہوئی تو آپ نے ان کے معبودان باطل کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لئے آخری حربہ استعمال کیا یعنی زبانی دعوت و تبلیغ کے بجائے ان کے قلعۂ شرک کے ڈھانے کے لئے ہاتھ پاؤں کو جنبش دینا چاہا اور اسکی یوں تدبیر کی کہ جب آپ کی قوم نے تمام رسوم وغیرہ منا کر اپنے گھروں کو جانے کا ارادہ کیا تو چونکہ آپ کو چلنے پھرنے سے تکان لاحق ہوگئی تھی اس لئے آپ نے سنانے کے لئے کہا میں تو بالکل ماندہ ہوگیا ہوں یہ آپ نے کسی کے جواب میں نہیں فرمایا تھا بلکہ یوں ہی معذرت کے ترے تاکہ وہ ساتھ چلنے کے لئے اصرار نہ کریں اور تاروں کی طرف اظہار عقیدت کے لئے نظر نہیں دوڑائی تھی بلکہ محض رات کا اندازہ کرنے کے لئے اور مخاطب کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ سقیم اس معنی میں آتا بھی ہے یا نہیں؟ کلام عرب سے ہمارے دعوی کی تصدیق ہوتی ہے۔

کلام عرب میں سقیم کا استعمال متعدد معانی کے لئے ہوا ہے مریض عشق کو بھی سقیم کہا گیا ہے، اسی طرح اس کلام پر بھی سقیم کا اطلاق ہوتا ہے جو اصول بلاغت پر پورا نہ اترے۔ ایسے ہی اس آدمی کو بھی کہتے ہیں جو کسی عارضی سبب سے مضمحل ہوگیا ہو حالانکہ عرف عام کے اعتبار سے اسے بیمار نہیں کہہ سکتے۔۔

سورہ صافات میں حضرت یونسؑ کی بابت کہا گیا ہے۔

فنبذناہ بالعراء وھو سقیم — ہم نے اسے کھلے میدان میں ڈالدیا حال یہ تھا کہ وہ نڈھال تھے۔

دیکھئے مذکورہ بالا آیت میں حضرت یونسؑ کو سقیم کہا گیا ہے حالانکہ آپ معنی عام کے اعتبار سے بیمار نہ تھے بلکہ یہ کیفیت عارضی سبب کی بنا پر ہوگئی تھی۔۔۔ اب اگر لغت اور شواہد قرآن کی روشنی میں یہ کہا جائے کہ حضرت خلیل اللہ کا قول انی سقیم اظہار کیفیت ہے تو کیا اختراع علیہ تو بیجا نہ ہوگا۔ مفسرین نے حضرت ابراہیم کے قول انی سقیم کو جشن میں شرکت سے پہلے کا قرار دیا ہو لیکن کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے خواہ مخواہ اسے پہلے ہی کا ماننا پڑے درانحالیکہ اس صورت میں چند در چند زحمتیں ہیں تو کیوں نہ اسے بعد کا ہی قول قرار دیا جائے جبکہ اس صورت میں ہر قسم کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔

دلچسپ معلومات

خوف اور اس کے ثمرات

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ خوف کا جذبہ انسانی جدوشرف کے خلاف ہے اس لئے ہر ممکن ذریعہ سے اسکے استیصال کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن علم جدید کا فیصلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کے نزدیک یہ جذبہ، انسان کے اندر ایک نہایت ضروری اور مفید عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ ایک فطری شعور ہے جو انسان کو نفس اور زندگی کی حفاظت اور مدافعت پر آمادہ کرتا ہے، یہ نفس کے سرور و ابتہاج کا بھی موجب ہوتا ہے۔ اس سے جسم میں چستی آتی ہے۔ عقل میں ہوشیاری اور انتباہ پیدا ہوتا ہے اور جب تک یہ طاری رہتا ہے جسم کے اندرونی غدود و اعضا اپنا کام زیادہ انہماک اور مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

عموماً انسان اپنے کو خطرات میں ڈال کر لذت محسوس کرتا ہے۔ بہت سے لوگ خونخوار درندوں کے شکار کے لئے افریقہ کے جنگلوں کا قصد کرتے ہیں، بہت سے لوگ ہوائی جہاز کے ذریعہ، فضا میں بلند ہوکر کود پڑتے ہیں اور پھر چھتریوں کے سہارے زمین پر اترتے ہیں۔ بعض لوگ خطرناک جنگلوں اور بیابانوں میں گھس جاتے ہیں۔ اس قسم کے بے شمار ایسے کام ہیں جن کو کرنے میں جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے لیکن انسان اس کی پروا نہ کرتے ہوئے ان میں پھاند پڑتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے خطرات سے دوچار ہونے میں کوئی خاص لذت محسوس ہوتی ہے یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگ عادتاً خطرات سے بچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، لیکن انہی میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو آرام یا تفریح کے لئے شکار، سیاحت اور اسی قسم کے دوسرے ایسے کام پسند کرتے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ خطرہ ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انسان بالطبع خطرے میں لذت محسوس کرتا ہے، اس لئے ہمیشہ اس کا طلبگار رہتا ہے۔

انسان کے اندر خوف کا جذبہ، منجملہ ان عوامل کے ہے جن کے بغیر انسان کا زندہ رہنا دشوار ہے۔ یہی جذبہ اسے حرص، حذر اور احتیاط پر آمادہ کرتا ہے۔ عورت کو اگر بڑھاپے کا خوف نہ ہو تو وہ اپنے جسم اور بشرہ کی حفاظت کی طرف زیادہ توجہ نہ کرے۔ ہمیں اگر اپنے غیر معمولی موٹاپے کا اندیشہ نہ ہو تو کھانے پینے میں بہت زیادہ بے پروا ہو جائیں۔ امراض کا اگر خوف نہ ہو تو ہم مطلق کسی قسم کی احتیاط یا پرہیز نہ کریں۔ غرض یہ ہے کہ جذبات انسانی میں خوف ایک نہایت ضروری اور جذبہ ہے یہ نہ ہو تو انسان کا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہی جذبہ ہے جو دین، اخلاق اور آداب کی اساس ہے اسکے بغیر انسان، عدل و استقامت اور صلاح و تقویٰ کی راہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی گامز

نہیں ہو سکتا اسی جذبہ نے انسان کو خدا پرستی کا راستہ دکھایا۔ ابتدا جب انسان اول نے قدرت کے خوفناک مظاہر، تیز و تند ہوائیں بارش، بجلی، زلزلے، اور درندے وغیرہ دیکھے تو اس کے دل میں غیر معمولی خوف پیدا ہوا۔ اسی خوف نے اسے ایک مخفی اور بلند و بالا تر قوت کے اعتقاد پر آمادہ کیا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہے کہ شجاعت خوف ہی کا نتیجہ ہے۔ ایک سپاہی میدان جنگ میں بے جگری کے ساتھ اس لئے لڑتا ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو دشمن اسے میدان سے زندہ واپس جانے دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوف قدرت کی طرف سے ہماری جان کا پاسبان ہے جو ہمیں ہلاکت سے محفوظ رکھتا ہے لیکن جب اس کا ہم پر بہت زیادہ اور غیر مناسب طور پر تسلط ہو جاتا ہے تو یہی "محافظ جان" ہماری ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔

ہماری موجودہ تمام ترقیاں، اس خوف ہی کا نتیجہ ہیں۔ تنہائی، بھوک، بیکاری اور ذلت وغیرہ کا خوف ہی ہے جو انسان کو شادی، محنت اور کوشش پر آمادہ کرتا ہے۔ اس قسم کے خوف اگر انسان کو لاحق نہ ہوتے تو موجودہ ترقیاں ظہور پذیر نہ ہوتیں۔

زہر کے طبی فوائد

سانپ کا زہر عام طور سے قاتل کہا جاتا ہے لیکن جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا استعمال بہت سی ایسی بیماریوں میں مفید ہوتا ہے جن میں کوئی دوا کارگر ثابت نہیں ہوتی اب تک مختلف نوع کے سانپوں کے زہر کی تین قسمیں معلوم ہوئی ہیں۔

(۱) وہ زہر جو اعضاء کو بے حس و حرکت بنا دیتے ہیں۔

(۲) وہ جن میں تحلیل و تعفینت کی خاصیت ہوتی ہے۔

(۳) وہ جو خون کو سخت اور منجمد کر دیتے ہیں۔

زہر کی یہ تینوں قسمیں بظاہر نہایت خطرناک اور قاتل ہیں لیکن اس کے باوجود علم کی جدید ترقیوں کی بدولت ان تینوں قسم کے زہروں سے نہایت مفید کام لیا جاتا ہے۔ پہلی قسم کے زہر کا پہلے ان حیوانات پر تجربہ کیا گیا جو تکلیف دہ امراض میں مبتلا تھے۔ اس سے ان کی تکلیف فوراً رفع ہوگئی۔ اس تجربہ کے بعد اسے ان لوگوں کو استعمال کرایا گیا جو ایسی امراض کے قاتل امراض میں مبتلا تھے اور ہر قسم کی دوائیں استعمال کر کے مایوس ہو چکے تھے۔ اس کے استعمال سے انہیں راحت و سکون نصیب ہوا اور نیند بھی آنے لگی۔ بعض حالات میں یہ زہر "مرگی" کے لئے بھی تریاق کا کام دیتا ہے دوسری قسم کا زہر ان حالات میں دیا جاتا ہے جبکہ خون کسی سبب سے منجمد ہو جاتے بسا اوقات چوٹ لگ جانے کے بعد ہوا اور بے ہوشی کے اثرات سے خون میں انجماد پیدا ہو جاتا ہے۔ قلب، دماغ اور آنتوں کی بعض بیماریاں بھی ایسی ہیں جن میں خون منجمد ہو کر موت کا باعث بن جاتا ہے۔ ان حالات میں دوسری قسم کا زہر دواؤں میں ملا کر دیا جاتا ہے۔

جس سے انکا خون رفع ہو جاتا ہے اور مریض ہلاک ہونے سے بچ جاتا ہے۔

بعض امراض ایسے ہیں جن کی بنا پر ناک سے یا بعض اندرونی حصہ جسم میں خون بہنے لگتا ہے ایسی حالت میں خون کے جریان کو روکنے والی، تیسری قسم کے زہر کے سوا کوئی دوا نہیں ہے۔ سانپوں کے زہر کے متعلق ابھی تحقیقات جاری ہے ممکن ہے اس کا استعمال دوسرے بہت سے امراض میں مفید ثابت ہو۔ جوں جوں اس کی افادی حیثیت نمایاں ہوتی جارہی ہے سانپ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے امریکہ میں لوگ اب خاص اہتمام سے سانپ پالنے اور ان کی تربیت کرنے لگے ہیں۔

روس اور جاپان کی علمی ترقیاں

جاپان نے علمی حیثیت سے جو ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس وقت وہاں ۵۴ علمی معہد قائم ہیں جن میں تقریباً ۲۵۰۰ علماء و محققین، شب و روز علمی تحقیقات میں مشغول رہتے ہیں۔ روس میں علمی تحقیقات کا کام اور زیادہ بڑے پیمانہ پر جاری ہے، وہاں ۸۴۰ علمی معاہد ہیں جن میں تقریباً ۴۸ ہزار علماء مصروف تحقیقات ہیں۔ حکومت علمی تحقیقات کا کام جاری رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔

دماغ کی غذا

ابھی چند سال پہلے تک عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ مچھلی یا وہ چیزیں جن میں اسفورس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے دماغ کی غذا کے لئے زیادہ مفید ہیں لیکن جدید تجربوں نے اس خیال کی لغویت ثابت کردی ہے۔ اب یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ دماغی صحت زیادہ تر جسم کی مجموعی صحت پر موقوف ہے۔

خربوزے کی نئی قسم

بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ امریکہ کے بعض حصوں میں ایسے خربوزے تیار ہوتے ہیں جن میں بیج نام کو بھی نہیں ہوتے۔

کم وزن کی اڑنے والی کشتی

امریکہ کے ایک موجد نے حال ہی میں ایک عجیب و غریب اڑنے والی کشتی اختراع کی ہے۔ اس میں ایک جگہ دو تختے جڑے ہیں۔ اوپر کا تختہ جہاز ملاحوں وغیرہ کے استعمال میں آتا ہے اور نیچے کے تختہ کو مسافر استعمال کرتے ہیں۔ اس کشتی میں سوا مسافروں کے لئے سونے کا بندوبست ہے۔ وزن میں یہ کشتی صرف سترہ ٹن ہے اور اس میں ایندھن کا کافی ذخیرہ ہروقت موجود رہے گا جس کی مدد سے یہ دن رات مصروف پرواز رہے گی۔

مہلک ترین مشین گن

امریکہ کے ایک ماہر اسلحہ جات نے ایک جدید مشین گن بنائی ہے جو وزن میں صرف ڈھائی ہزار پونڈ ہے مگر اسلحہ جات

تک بار کر لی ہے۔ اتنے ہی وزن کی گن سے اس کی مار گنی ہے اس طرح سے اسلحہ جات میں ایک اور ہلاکت خیز سلاح جنگ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

مشینی ڈاکخانہ

جرمن میں ایک عجیب و غریب قسم کی مشین ڈاکخانوں میں لگائی گئی ہے اس مشین میں پیسے آنے، روپیے وغیرہ کے لئے سوراخ بنے ہوئے ہوتے ہیں اگر ایک پیسہ ڈالا جائے تو ایک پیسہ والا ٹکٹ باہر آ جائے گا۔ دو پیسے ڈالے جائیں تو اسی قیمت کا ٹکٹ نمودار ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک مشین ایسی ہے جس میں کاغذ اور لفافے ہوتے ہیں اور پیسے روپیے ڈالنے سے اتنی ہی قیمت کے لفافے نکل آتے ہیں۔

مصنوعی اون

ایک اطالوی سائنسداں نے دودھ کے ایک جزو سے ایسا اون تیار کیا ہے جو صورت شکل میں بالکل اصلی اون جیسا ہے۔ اور اتنی ہی گرمی بھی رکھتا ہے۔ یہ اون ہوابازوں اور فوج کے سپاہیوں کی وردیوں میں استعمال ہونا شروع ہو گیا ہے۔

عجیب ترین کتاب

دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب وہ ہے جسے ابھی حال ہی میں نیوینگ کے ایک بوڑھے فوجی نے تصنیف کیا ہے اس کا طول معمولی ڈاک کے ٹکٹ کا نصف اور حجم تقریباً ½ سنٹی میٹر ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ۹۹ صفحات اور ۱۰۹۸۹ کلمات ہیں۔

پانی کے ذرات

ایک پیالہ پانی کے اندر جو ذرات ہوتے ہیں انہیں اگر تمام دنیا کے مرد اور عورتیں اور بچے جمع ہو کر شمار کریں اور ان میں سے ہر ایک ایک منٹ میں ۱۰ ذرہ شمار کرے تو یہ کام ... اسال تک جاری رہ سکتا ہے۔

سونے کی مقدار

چند سال پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ سونے کی پیداوار اب اپنے انتہائی درجہ کو پہونچ کر رک گئی ہے اور چند سال بعد اس میں کمی ہونا شروع ہو جائیگی۔ لیکن امریکہ کے ایک ماہر طبقات الارض نے اپنی ایک تقریر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اب بھی زمین کی تہ میں سونا بہت زیادہ مقدار میں موجود ہے اور اگر اسے نکالنے کے عمدہ وسائل اختیار کئے جائیں تو سالہا سال تک دو سو ملین گنی سالانہ کا سونا نکالا جا سکتا ہے۔

ایک عجیب تحقیق!

جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے غالباً کسی نے یہ سوال حل کرنے کی کوشش نہ کی ہوگی کہ کتا دن بھر میں کتنی مرتبہ دم ہلاتا ہے لیکن اس مسئلہ کی تحقیق کا شرف ایک انگریز فوجی افسر کو حاصل ہوا ہے جنکی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ کتا ایک منٹ میں ۴۰ مرتبہ یعنی ایک گھنٹہ میں ۲۴۰۰ بار دم ہلاتا ہے

کوائف عالم اسلامی

ایران

ایران کا تجارتی وفد یورپ میں

طہران کی اطلاع ہے کہ حکومت ایران نے ایران تجارت کے عہدیداروں کے ایک وفد کو یورپ روانہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ وفد یورپ اور متحدہ امریکہ اور غالباً جاپان اور جنوبی امریکہ جائے گا۔ وفد کے اس سفر کا مقصد یہ ہے کہ دیگر ملک میں ایرانی تجارت اور مصنوعات کو فروغ دے اور مختلف حکومتوں سے تجارتی معاملات پر گفت و شنید کرے۔

ایرانی کارخانوں کی ترقی

جرمن انجینیروں کی ایک جماعت ڈاکٹر لیبری کی قیادت میں ایران پہونچی ہے۔ یہ انجینیر ایران کے ترقی پذیر کارخانوں میں نئی جرمنی مشینوں کو نصب کریں گے اور نئی مشینوں کے متعلق حکومت کے سامنے اپنے مشورے پیش کریں گے۔

جرمنی اور ایرانی اشیاء کا تبادلہ

معلوم ہوا ہے کہ حکومت ایران نے جرمن سے عظیم مقدار میں جو سامان خریدا ہے اس کی قیمت سامان کی صورت میں پیش کیجائے گی۔ ایران جرمن کے لئے اسی قیمت کی روئی مہیا کرے گا۔

مصر

شام اور مصر کے طلبہ کے روابط

مصر کے طلبہ کی انجمن کے فیصلہ کے مطابق ایک جماعت شام گئی ہوئی ہے۔ اس جماعت کے ارکان شام کے ترقی پذیر تعلیمی رجحانات کی تحقیق کر رہے ہیں۔ شام کی وزارت تعلیم کی ہدایت کے ماتحت سیاح طلبہ کی راحت اور آسائش کے لئے جملہ انتظامات عمل میں لائے گئے ہیں اور ہر جگہ ان طلبہ کا استقبال کیا جا رہا ہے۔

مصر کی شمولیت کیلئے جمعیت اقوام کا خاص اجلاس

برطانیہ نے جمعیت اقوام کے جنرل سکرٹری سے ایک اسپیشل اجلاس منعقد کرنے کی درخواست کی ہے تاکہ مصر کو جمعیت میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا جائے اور مشورہ دیا ہے کہ اسمبلی کا اجلاس مئی کے آخر میں جب اجلاس ہو منعقد کر لیا جائے۔

فلسطین

فلسطین سے شاہی کمیشن کی روانگی کے بعد پھر اضطراب پیدا ہو رہا ہے جیسا کہ اس سے قبل اندازہ کیا گیا تھا۔

شاہی کمیشن کے ارکان محض سیاست کے ماتحت اپنی رپورٹ پیش کرنے میں غیر معمولی تاخیر سے کام لے رہے ہیں۔ غالب خیال یہی ہے کہ کمیشن یہودیوں کے اثر و اقتدار اور موافقت و مخالفت کا اندازہ کر رہا ہے۔ عرب کے انتہا پسند سیاسی حلقے یقین رکھتے ہیں کہ شاہی کمیشن کے ارکان اس قسم کی صورتیں اختیار کر رہے ہیں جس سے دائمی طور پر دستگاری حاصل ہو سکے۔

وفد فلسطین کا عزم لندن

ایک معتبر پیغام مظہر ہے کہ عربوں نے ایک آخری تبلیغی چارہ کار کے طور پر فیصلہ کیا ہے کہ انگلستان کی فضا کو متاثر کرنے کے لئے معتمد نمائندوں کا ایک وفد لندن بھیجا جائے۔ اگر وفد ناکام رہا اور شاہی کمیشن نے جرات کے ساتھ فلسطین کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنی سفارشات پیش کیں اور حکومت نے مناسب طریقہ اختیار نہ کیا تو اس کے بعد فلسطین اپنی جگہ آزاد ہوگا اور مردانہ وار قدم اٹھا سکیگا۔

زعماء کے افکار

فلسطین کے زعماء کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاہی کمیشن سے مایوس ہیں اور اب سنجیدہ دماغ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ملک کے تمام مسائل کا حل اجتماعی جد و جہد سے وابستہ ہے۔

حجاز

مدینہ منورہ میں ہوابازی کا مرکز

حکومت حجاز نے ہوائی طاقت کو مزید استحکام عطا کرنے کے لئے مدینہ منورہ میں بھی ہوابازی کا مرکز قائم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مجلس پرواز بھی قائم ہو چکی ہے جس کا پہلا اجلاس قائم مقام گورنر مدینہ کی صدارت میں ہوا ہے جمعیت کے ارکان نے پرواز کو ترقی دینے کے لئے ایک فنڈ کا بھی اعلان کیا ہے جس کیلئے حاجیوں سے بھی بطور خاص شرکت کی درخواست کی جا رہی ہے۔

جدہ سے مدینہ تک فضائی لائن کا اجراء

حکومت حجاز نے ایک مصری کمپنی کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ جدہ سے مدینہ منورہ تک فضائی لائن کا اجراء کرے تاکہ حرم مدینہ کی زیارت کرنے والے افراد کم سے کم وقت میں اپنا سفر پورا کر سکیں۔

حجاز میں اعلیٰ تعلیم

معلوم ہوا ہے کہ حکومت حجاز نے دولت مصر کے مشورہ سے مدینہ منورہ میں علوم عالی کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے حکومت مصر اپنے خرچ پر مصری پروفیسروں کو مدینہ منورہ بھیجے گی۔ ایک پروفیسر صاحب حجاز پہونچ گئے ہیں جنہیں وزارت تعلیم مصر ۴۰ پونڈ ماہوار تنخواہ دے گی۔

تقریظ و تبصرہ

"ائمہ تلبیس یا غارتگران ایمان"

یہ ایک نہایت اہم اور مفید کتاب ہے جو دارالتصنیف لاہور سے شائع ہوئی ہے عہد رسالت سے لیکر آج تک جن دجالوں نے الوہیت، نبوت، مسیحیت اور مہدیت وغیرہ کے جھوٹے دعوے کئے تھے، ان کے سوانح حیات اس میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں رخنہ اندازی کے لئے اب تک کیا کیا تحریکیں شروع ہوئیں اور پھر کس طرح صداقت و حقانیت سے خالی ہونے کی بنا پر خود بخود ختم ہوگئیں۔

عہد خاتم النبیین کے بعد ہر ملک اور ہر زمانہ میں نبوت، مسیحیت وغیرہ کے جو جھوٹے مدعی پیدا ہوئے، اگرچہ ان کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر گئی ہے لیکن ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنہیں جنون، مالی دشواریوں اور خوش آیند زندگی بسر کرنے کی توقع نے، نبی یا مسیح وغیرہ بننے پر آمادہ کر دیا تھا اس لئے جب یہ عارضی اسباب رفع ہوگئے یا توقع کے خلاف انہیں دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا تو وہ خود بخود نبوت و مہدیت کا جامہ اتار کر عام مسلمانوں کی صف میں داخل ہوگئے تاریخ میں بہت سے ایسے "انبیاء" کے نام اور حالات درج ہیں جنھوں نے ہارون رشید اور دوسرے خلفاء کے زمانہ میں مذکورہ بالا اسباب کے ماتحت دعوئی نبوت کیا تھا لیکن خلفاء کی معمولی تنبیہ اور چشم نمائی نے ان کے حوصلے سرد کر دئے اور وہ اپنے دعووں سے تائب ہو کر قسمت پر صبر کر کے بیٹھ رہے۔ لیکن انہی دجالوں اور مفتریوں میں بعض ایسے بھی تھے جن کے پیش نظر مال و دولت اور عزت و جاہ کے حصول سے زیادہ، سیاسی اغراض تھے ان لوگوں نے نئے نئے ناموں سے ایسی مذہبی تحریکیں شروع کیں جن کی بنیاد بظاہر قرآن و احادیث پر تھی لیکن جن کا اصل مقصد اسلام کو نقصان پہونچانا تھا۔ اس قسم کی تحریکوں میں ان قوموں کے ہاتھ کام کر رہے تھے جن کی تلواریں اسلام کی طاقت کے مقابلہ میں کند ثابت ہو چکی تھیں اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ مختلف قسم کی خفیہ سیاسی اور مذہبی سازشوں کے ذریعہ اسلام کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ یہی سازشیں تھیں جو آج سے بہت پہلے ابن سبا کی شکل میں ظاہر ہو کر مسلمانوں کی تفریق اور خانہ جنگی کی باعث ہوئیں اور پھر اس کے بعد مختلف زمانوں میں قرامطہ باطنیہ اور متعدد جھوٹے مدعیان نبوت و مسیحیت کے بھیس میں نمودار ہو کر اسلامی تعلیمات کو مسخ کرتی رہیں۔ اسلام نے اپنے دشمنوں کو اگرچہ میدان جنگ میں ہر مرتبہ شکستیں دیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دشمنوں نے اپنی مخفی سازشوں سے اسے بہت کچھ نقصان پہونچایا۔ اس قسم کی بعض مخفی تحریکیں اب بھی زندہ ہیں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں بعض

نئی نئی مذہبی اور اسلامی تحریکیں اسی غرض و مقصد کے لئے جاری کی گئی ہیں جو گو بظاہر مذہبی ہیں اور زیادہ خطرناک بھی نہیں معلوم ہوتیں لیکن حقیقت میں وہ خالص سیاسی تحریکیں ہیں اور ان کا مقصد صرف اسلام کو نقصان پہونچانا ہے۔ آج ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک میں متعدد ایسی مذہبی تحریکیں جاری ہیں جن کی حقیقت اگر تلاش کی جائے تو ان کی تہ میں انہی دشمنان اسلام کے ہاتھ نظر آئیں گے۔

ضرورت ہے کہ مسلمان اس قسم کی تحریکوں سے واقفیت حاصل کریں اور دشمنوں کے دام تزویر میں مبتلا ہونے سے بچیں۔ زیر نظر کتاب میں جن دجالوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں انہی میں بہت سے ایسے ہیں جو اس قسم کی تحریکوں کے بانی تھے۔ اگرچہ ان اشخاص کے فتنوں اور تحریکات سے جیسا کہ سرسری مطالعہ سے معلوم ہوا اس حیثیت سے بحث نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے جو حالات جمع کر دئے گئے ہیں ان سے اس پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب میں تقریباً سو مدعیان نبوت کے حالات بیان کئے گئے ہیں جو غالباً مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں ان کا مطالعہ صرف اس لحاظ سے اہم نہیں ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اب تک مسلمانوں کو دام فریب میں مبتلا کرنے کی کیا کیا کوششیں ہوئیں بلکہ اس سے ایک ایسی خاص بصیرت بھی پیدا ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کو آئندہ کسی دشمن اسلام یا مدعی نبوت کے فریب میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

ابن صیاد کے حالات سے کتاب کی ابتدا کی گئی ہے جس نے آنحضور صلعم کی حیات ہی میں دعوائے نبوت کیا تھا اور پھر ہر دور کے ... قابل ذکر مدعیان نبوت و کیفیت وغیرہ کے حالات بیان کر کے عہد حاضر کے مدعیوں کے تذکرہ پر کتاب ختم کر دی گئی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے حالات پر بھی بسط و تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے دعووں کی حقیقت کھول کر بیان کی گئی ہے۔

حجم ۳۳[illegible] صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر دار التصنیف نمبر ۱ ڈیفنگ روڈ لاہور۔

کلام مجید و حمائل شریف مترجم و محشیٰ

بلاکوں کے ذریعہ دو رنگ میں

اِس قرآنِ پاک کا ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے بزمانۂ اسیری جزیرۂ مالٹا میں بہت تحقیق و تدقیق اور غور و فکر کے ساتھ بڑی مدت میں مکمل فرمایا تھا اور فوائد کی تحریر کا کام شروع تھا کہ ۱۹۲۰ء میں آپ کا وصال ہوگیا اور فوائد کے باقی چھبیس پارے آپ کے تلمیذ رشید شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی نے ساڑھے تین سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل فرمائے۔ خدا کا شکر ہے کہ مروجہ تراجم کے مقابلہ میں اس ترجمہ کو زیادہ سہل، زیادہ آسان، تحت اللفظ اور مستند ہونے کی حیثیت سے تمام علمائے کرام اور فضلائے دور حاضر نے تسلیم فرمالیا ہے اور ہر اردو داں کو قرآن کریم سے مستفید ہونے کا موقعہ حاصل ہے پہلا ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن بھی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے فوائد کے اضافہ کے ساتھ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا۔ یہ دونوں ایڈیشن ختم ہوچکے۔

اس مرتبہ قرآن شریف اور حمائل شریف کو بلاکوں کے ذریعہ سے خوش رنگ زمین پر چھاپا گیا۔ ذیل میں بالتفصیل دونوں کا ہدیہ درج ہے۔ قسم دوم میں صرف کاغذ کا معمولی سا فرق ہے۔ باقی خصوصیات مشترک ہیں۔ نمونہ مفت طلب فرماسکتے ہیں

قرآن شریف

قسم		ہدیہ
قسم اول	مجلد اعلیٰ ہدیہ ... سنہری جلد ہدیہ اقسام ...	[illegible]
	غیر مجلد: "	[illegible]
قسم دوم	مجلد: "	[illegible]
	غیر مجلد: "	[illegible]

حمائل شریف

قسم		ہدیہ
قسم اول	مجلد: اعلیٰ ہدیہ	[illegible]
	غیر مجلد: "	[illegible]
قسم دوم	مجلد: "	[illegible]
	غیر مجلد	[illegible]

محصول ڈاک و ریل اور خرچ پیکنگ ہدیہ کے علاوہ ہوگا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ڈاک کے ذریعہ ایک مجلد قرآن مجید مع پیکنگ دو روپیہ اور غیر مجلد [illegible] اور حمائل شریف مجلد مع پیکنگ [illegible] اور غیر مجلد کا [illegible] ہوگا۔ ریل کے ذریعہ ۵۰۰ میل تک ایک قرآن مجید پیکنگ و ملیں جسٹری [illegible] اور ایک حمائل شریف مع پیکنگ [illegible]۔ ریل کے ذریعہ بہت کفایت ہے۔

محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور (یوپی)

غنچہ کے مضمون نگاروں اور ناظرین سے التجا

۱۔ مضامین مسلسلہ عام فہم اور آسان زبان میں ہونا چاہئیں۔

۲۔ اخلاقی مضامین بچوں کی سمجھ سے باہر ہوں درج نہ کئے جا سکیں گے۔

۳۔ تعلیمی و اخلاقی ... مضامین ... ہوں تو بہتر ہے۔

۴۔ مضامین مسلسل نہ ہوں مختصر ہوں تاکہ دو صفحے سے نہ بڑھ سکیں

۵۔ بچوں کے سب سے بہتر مضمون پر انعام ... دیا جائے گا

۶۔ ... تعلیم ... مدرسین کے تعلیمی مضامین خاص طور سے ضروری ہیں

۷۔ غیر شائع شدہ مضامین واپس نہ کئے جائیں گے۔

۸۔ جملہ خط و کتابت میں ... نمبر کا حوالہ ... جواب طلب باتوں کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۹۔ تاریخ اشاعت ہر ماہ انگریزی کی ۸، ۱۶، ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

قیمت غنچہ سالانہ تین روپیہ ششماہی ایک روپیہ ... غیر ممالک سے سالانہ ... فی پرچہ ایک آنہ

نرخنامہ اشتہارات رسالۂ غنچہ

تعداد صفحہ	ایک بار	چار بار	تین ماہ	چھ ماہ	ایک سال	اجرت تیاری ضمیمہ
پورا صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نصف صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	
چوتھائی صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	

اشتہارات بچوں کی ضرورت سے باہر ہوں یا ... خلاف اخلاق اشتہار درج نہ ہوں گے۔

جملہ خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ:۔ محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ و غنچہ بجنور (یو پی)

فاران

مالک: محمد مجید حسن

ہر ماہ انگریزی کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

مدیر: ابو اللیث ندوی اصلاحی

نمبر ۵ — بجنور، ماہ مئی ۱۹۳۷ء مطابق ماہ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ — جلد ۳

فہرست مضامین

بحث و نظر

ہنگامۂ فلسطین کی تحقیقات کے لئے جو شاہی کمیشن مقرر کیا گیا تھا، اس کے متعلق ہم اپنی رائے کا اظہار فاران کے کسی پچھلے پرچے میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں گو اب تک کمیشن نے اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش نہیں کی ہے اور توقع ہے کہ جشن شاہی کے اختتام پذیر ہونے سے پہلے پیش کرے گا لیکن بعض انگریزی اخبارات نے ان اسکیموں کا خلاصہ اپنے معتبر ذرائع سے معلوم کر کے شائع کر دیا ہے جو ارکان کمیشن کے پیش نظر ہیں۔ ان سے کمیشن کے متعلق ہماری اس بدگمانی کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے جس کا اظہار بہت پہلے ہم کر چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہی کمیشن، ملک معظم کی حکومت کے سامنے یہ سفارش کرے گا کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ عربوں کے لئے ہو اور دوسرا یہودیوں کے لئے اور دونوں کو زیر سایہ حکومت برطانیہ یا تو خود مختاری دیدی جائے یا سوئٹزرلینڈ کے نمونہ پر موجودہ انتدابی نظم و نسق باقی رکھتے ہوئے دونوں صوبوں کو الگ الگ داخلی خود مختاری عطا کی جائے۔

یہ اطلاع ہمارے لئے اس لحاظ سے کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں کہ ہمیں شاہی کمیشن سے کوئی بہتر اور مناسب حل پیش کرنے کی پہلے ہی سے توقع نہ تھی لیکن پھر بھی تقسیم فلسطین کی خبر پڑھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ خیال ہوتا تھا کہ عربوں نے کمزور اور نہتے ہونے کے باوجود جس ثبات و استقلال اور جرأت و عزیمت کے ساتھ ایک منظم اور طاقتور حکومت کا کئی مہینوں تک کامیاب مقابلہ کیا ہے، اس کے پیش نظر ارکان کمیشن نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ عربوں کے جذبۂ حصول آزادی کو کسی طرح دبایا نہیں جا سکتا اور جب تک ان کے جائز مطالبات بہ تمام و کمال پورے نہیں کئے جائیں گے، فلسطین میں امن و امان کا قائم ہونا محال ہے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ارکان کمیشن نے یا تو عربوں اور ہنگامۂ فلسطین کے اصل اسباب و محرکات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی یا ان کی استعمار پرستی اور ان کے مصالح قومی نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہر چیز کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ راہ اختیار کریں جسے وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے قومی مفاد کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اسکیم کے متعلق حکومت کا رویہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ اپنی فوجی طاقت و قوت کے بھروسہ پر اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے لیکن اسے ابھی سے یہ سوچ لینا چاہئے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو شاید اس کے نتائج اس کے حق میں کسی حال میں بھی مفید نہیں ثابت ہوں گے۔ عرب فلسطین کو اپنا وطن سمجھتے ہیں، حکومت کی یہود نواز پالیسی کے باوجود اب بھی ان کو وہاں اکثریت حاصل ہے اور وہ دوسرے عربی ممالک کی طرح آزادی کی فضا میں سانس لینا اپنا فطری حق سمجھتے

حصول آزادی کا جذبہ ان کے اندر اس قوت و شدت کے ساتھ پیدا ہو چکا ہے کہ حکومت کی تمام طاقتیں اور اس کی تمام تدبیریں اس کو فنا کرنے میں ناکام ثابت ہو چکی ہیں۔ ایسی صورت میں اسے کیسے ممکن کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ملک کا ایک حصہ ان لوگوں کو دینا گوارا کر لیں گے جنہیں ان کے خیال کے مطابق ان کی اجازت کے بغیر وہاں قدم رکھنے کا بھی حق نہیں ہے۔ ابھی تقسیم فلسطین کی اسکیم باقاعدہ پیش نہیں ہوئی ہے لیکن عربوں نے ابھی سے یہ اعلان کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ اسے کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتے۔ عرب ہائی کمیٹی نے اس کے متعلق ایک مفصل بیان شائع کیا ہے جس میں اس تقسیم کی سخت مخالفت کی گئی ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ جب تک اس کے وہ مطالبات منظور نہیں کئے جائیں گے جو اس نے کمیشن کے سامنے پیش کئے ہیں، وہ کسی چیز پر راضی نہیں ہو سکتی۔ اس کو اپنے مطالبات کی تکمیل پر اصرار ہے اور آخر تک رہے گا۔

ایک طرف یہ عزیمت اور حوصلے ہیں دوسری طرف فوج اور مشین گنیں ہیں، دیکھئے دونوں کے تصادم سے کیا صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اگر کمیشن نے واقعی یہی اسکیم پیش کی اور حکومت نے اس پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تو یقیناً فلسطین کے حالات بہت نازک صورت اختیار کریں گے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انجام کیا ہوگا۔

مدح صحابہ کے متعلق شیعہ و سنی اختلافات کے تصفیے کے لئے جو کمیٹی حکومت کی جانب سے مقرر کی گئی تھی، اس نے اپنا کام کئی ہفتے ہوئے سرعت کے ساتھ شروع کر دیا۔ فریقین کی طرف سے بڑے بڑے لوگ شہادت کیلئے پیش ہوئے اور اپنی جماعت کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے مسلک اور مطالبات کے دلائل و وجوہ بیان کئے۔ شہادتوں کے گذرنے کے بعد فریقین کے وکلاء نے بحثیں کیں اور اپنے اپنے دعاوی پر قانونی و مذہبی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہوئے انہیں محکم ثابت کرنے کی ممکن کوشش کی۔ اب اس سلسلہ میں صرف یہ کام باقی رہ گیا ہے کہ کمیٹی فریقین کے بیانات کی روشنی میں اس قضیہ کا کوئی حل تلاش کرے اور اپنی سفارشات حکومت کے سامنے پیش کر دے۔

اس مقدمہ کے سلسلہ میں ہر دو جماعت شیعوں اور سنیوں کی طرف سے جو شہادتیں گذریں اور کمیٹی کے روبرو بیانات پیش ہوئے انہیں ہم نے خود اہتمام سے پڑھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو اسلامی جماعتوں کے اتحاد و وفاق کا دل سے متمنی ہے انہیں پڑھ کر بہت زیادہ ملول اور رنجیدہ ہوا ہوگا۔ یہ ماں کسقدر دردناک اور المناک تھا کہ ایک ہی خدا، ایک ہی رسول ایک ہی کتاب کے ماننے والے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں اور ہر فریق، مخالف کو اپنا اشد ترین دشمن سمجھتے ہوئے اسکے ساتھ وہ سلوک روا رکھنا ہے جو بحیثیت ایک ہی جسم کے اعضا ہونے کے ایک دوسرے کے ساتھ کسی حال میں روا نہیں رکھنا چاہئے ہمیں اس موقع پر یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں ہمارے شیعہ صاحبان کی جانب سے اور بالخصوص خلفاء ثلاثہ کے متعلق انکی طرف سے جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ حد درجہ قابل افسوس ہے۔ علاوہ ازیں اس نازک دور میں جبکہ ملکی سیاست نہایت نازک دور سے گذر رہی ہے مسلمان اپنے مستقبل کی فکر سے بے پروا ہو کر ایک دوسرے کی تخریب میں مشغول ہیں۔ کاش اس قوم کو ہوش آئے!

توحید اور اس کے اثرات

(۷)

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون

پچھلے پرچے میں بتایا جا چکا ہے کہ عقیدۂ توحید انسان کے دل کو ہر قسم کے غم و حزن سے پاک کر کے اطمینان و سکون کی دولت سے معمور کر دیتا ہے۔ آج یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کا اہم خاصہ ما سوی اللہ کے خوف کو دور کر دینا ہے انسان جیسا کہ قرآن میں آیا ہے، دل کا بہت کچا ہے (ان الانسان خلق ھلوعا) چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرا جاتا (اذا مسہ الشر جزوعا) اور معمولی معمولی مصیبتوں میں مایوس ہو جاتا ہے (واذا مسہ الشر کان یؤسا)

جب وہ ذکر الٰہی سے غفلت اختیار کر لیتا ہے تو شیطان اس پر قابو پا لیتا ہے

ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین۔ — اور جو کوئی آنکھیں چرائے رحمان کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہ رہے اس کا ساتھی

اور جب کبھی شیطان کا کسی پر غلبہ ہوتا ہے تو وہ نفس کو ہر وقت مختلف قسم کی پریشانیوں اور خوف و ہراس میں مبتلا رکھتا ہے

الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء — شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم دیتا ہے بے حیائی کا

ذالکم الشیطان یخوف اولیائہ — یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے ان للشیطان لمۃ بابن آدم وللملک لمۃ فاما لمۃ الشیطان فایعاد بالشر و تکذیب بالحق

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اسے کفر و شرک میں مبتلا کر دیتا ہے جس کا خلاصہ خوف، بزدلی، پریشانی اور حزن و غم ہی سمجھنا چاہیئے

سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب بما اشرکوا باللہ ما لم ینزل بہ سلطانا — ہم ڈالیں گے کافروں کے دلوں میں ہیبت اس واسطے کہ انھوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کا جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری۔

ایک دوسری جگہ انکا حال ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

یحسبون کل صیحۃ علیھم۔ — جو کوئی چیخے جانیں ہم ہی پر بلا آئی

برخلاف اس کے جن کے قلوب، کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہوتے ہیں وہ ہر قسم کے خوف و حزن سے محفوظ رہتے ہیں۔ مصائب کا اگر پہاڑ ٹوٹ پڑے جب بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی اور آسمان و زمین بلکہ ساری کائنات اگر مخالفت پر آمادہ ہو جائے جب بھی ان کے سکون و طمانیت میں فرق نہیں آتا۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون — جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیاءکم فی الحیاۃ الدنیا وفی الآخرۃ۔ — جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور خوشخبری سنو اس بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے ہم تمہارے رفیق ہیں دنیا میں اور آخرت میں۔

بڑی سے بڑی مصیبت آئے، خدا کا تصور اور آخرت کا یقین اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون — جب ان پر مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

زبردست قوت کے مالک اور صاحب اختیار دشمن کے قتل و ایذا کی دھمکی کو اپنے لئے نوید جانفزا سمجھنا اور اس پر مضطرب اور پریشان ہونے کے بجائے خوش ہونا بڑی ہی جرأت، عزیمت اور بہادری کا کام ہے لیکن صاحب ایمان اس امتحان میں بھی کامیاب رہتا ہے فرعون مومنین کی ایک جماعت کو جو اس کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ صداقت دیکھ کر ایمان لاتی ہے ان الفاظ میں دھمکی دیتا ہے۔

لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاصلبنکم اجمعین — میں ضرور تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔

وہ اس کے جواب میں نہایت اطمینان سے کہتے ہیں۔

لاضیر انا الی ربنا منقلبون — کچھ ڈر نہیں ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے۔

جنگ کا موقع ہے، دشمن نہایت سروسامان اور تیاریوں کے ساتھ مقابلہ میں آئے ہیں اور ان کی تعداد مومنین کے مقابلہ میں کئی گنی زائد ہے لیکن ان پر کوئی ہراس طاری نہیں ہوتا اور دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت کی پروا کئے بغیر یہ کہتے ہوئے میدان میں کود پڑتے ہیں۔

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ — بارہا تھوڑی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب ہوئی۔

اگر انہیں یہ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ

ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم — دشمنوں نے تمہارے مقابلہ کے لئے سامان جمع کر لیا ہے اس لئے ان سے ڈرو

تو بجائے خوفزدہ ہونے کے خوش ہوتے ہیں اور

حسبنا اللہ ونعم الوکیل — کافی ہے ہم کو اللہ اور کیا خوب کارساز ہے۔

کہ کر سکون قلب کے ساتھ ہر خطرے کے استقبال کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔
میدان کارزار گرم ہے، ہر طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے تلواریں چمک رہی ہیں۔ موت سامنے کھڑی ہنس رہی ہے لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی اور یہ کہتے ہوئے۔

لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلی اللہ فلیتوکل المومنون (توبہ)	ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

اپنے کو زبردستی موت کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ عقیدہ توحید مومن کے دل میں ہمت، جرأت، عزیمت، شجاعت اور بے خوفی کا نہایت حیرت انگیز مادہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جو انسان پر اپنی ہیبت ڈالے بغیر نہیں رہتیں جب ان کا مقابلہ مومنین سے ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ایسی بات ہی نہ تھی جو کسی اہتمام و توجہ کی مستحق ہو

خشیت الٰہی اور ماسوی اللہ کے خوف کا استیصال

جو لوگ خدا کے علاوہ دنیا میں بہت سی قادر و متصرف ہستیوں کے قائل ہیں، سلسلہ اسباب وعلل کی ہر نمایاں اور قوی اثر چیز کو اپنا خدا سمجھتے ہیں، کائنات میں خدا کے سوا غیبی اسباب وعلل سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد رکھتے ہیں، وہ ہر وقت ان کے خوف سے لرزہ براندام رہتے ہیں، لیکن وہ لوگ جن کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں تصرف و قدرت کی مالک صرف خدا کی ہستی ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک وہ تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے، ان کا دنیا کی کسی چیز سے خوفزدہ ہونا بالکل محال ہے۔ خدا کے تصرف و قدرت کا عقیدہ رکھنے والوں اور اس کی عظمت و کبریائی کا احساس کرنے والوں کے دل اس کی ہے ؛ ان عظمتوں کے تصور سے اس طرح بھرپور ہو جاتے ہیں کہ ان میں اس کے سوا کسی کی عظمت و بڑائی کا خیال نہیں سما سکتا۔ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز اسے ہیچ نظر آتی ہے اور عظیم الشان طاقتیں اسے بالکل بے وقعت دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی پر مصائب اور حوصلہ شکن دور میں بار بار مسلمانوں کو خشیت الٰہی کی تلقین کی جاتی تھی کیونکہ خوف خدا کے بعد، دنیا کی کسی طاقت کا خوف، دل میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے۔

فلا تخشوھم واخشون	پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو

آل عمران میں ہے۔

فلا تخافوھم وخافون	پس ان سے مت ڈرو مجھ سے ڈرو

اور اس میں شبہ نہیں کہ یہی تعلیم قرن اول کے مسلمانوں کی ناقابل شکست عزیمت اور بے نظیر بہادری کا راز ہے۔

اسلام کا ایک زبردست احسان

اسلام سے پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اسلام نے دنیا کو مختلف قسم کے خوفوں سے نجات دے کر اس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے متعلق واضح تعلیمات پیش کر کے لوگوں کو شجر و حجر، چاند سورج، ستارے، کاہن، جادوگر جنات، شیاطین غرض بے شمار ایسی چیزوں کے خوف سے آزاد کیا جن سے وہ ہر وقت لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کے غیظ و غضب سے محفوظ رہنے کے لئے ان کی دہائی پکارتے تھے، نذرانے چڑھاتے تھے اور قربانی کرتے تھے۔ اسلام سے پہلے دینی پیشوا اور دنیاوی حکمران دونوں طرح طرح سے لوگوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ احبار و رہبان اپنی قدوسیت اور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان وساطت کے دعوے کے خود ارباباً من دون اللہ بنے بیٹھے تھے اور دنیاوی سلاطین و حکام ظل اللہ فی الارض بن کر اپنے ہی جیسے انسانوں سے اپنی پوجا کراتے تھے۔ ان کے متعلق یہ گمان کرتے تھے کہ ان کا وجود خدا کا جلوہ ہے یا ان کا عزل ونصب فرشتوں اور دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہے اس لئے وہ انسانوں سے کہیں زیادہ قوت کے مالک ہیں اور ان کی بے چون و چرا اطاعت ہر حال میں واجب ہے۔ لیکن جب اسلام دنیا میں آیا تو اس نے انسان کو شجر و حجر، احبار و رہبان امراء و سلاطین ہر ایک کی غلامی سے آزاد کیا۔ یہ بتا کر کہ سورج چاند ستارے، سمندر تالاب آسمان سے لے کر زمین تک کی ساری چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں اور ان کی پرستش انسانی شرف و وقار کی توہین ہے، ان کے دلوں سے ان کا خوف زائل کیا۔ یہ واضح کر کے کہ احبار و رہبان خدا نہیں بلکہ اس کے بندے ہیں اور اس تک پہنچنے کے لئے ان کی وساطت کی کوئی ضرورت نہیں ان کی حد سے بڑھی ہوئی عظمت و سطوت کا قلعہ مسمار کر دیا۔ اور یہ ظاہر کر کے کہ سلاطین و امرا تمہاری طرح انسان ہیں اور ان کا عزل ونصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ تمہارے ہاتھوں میں ہے ان کے جلال و جبروت کا طلسم توڑ دیا۔

غرض اسلام نے اپنی پاک اور روشن تعلیمات کے ذریعہ انسان کو اس کے حقیقی مرتبہ تک پہونچایا اور غیر اللہ کا خوف دلوں سے نکال کر پھینک دیا۔

ان تعلیمات کا اثر عربوں کی زندگی پر کیا پڑا

عرب کے باشندے اسلام سے پہلے بتوں کی پوجا کرتے تھے گو انہیں اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے لیکن ان کا خوف ان کے دلوں میں اس طرح سمایا ہوا تھا کہ ان کے نام سے ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا لیکن جب اسلام نے بتوں کی حقیقت واضح کی اور خدا کی صحیح معرفت سے ان کے سینوں کو منور کر دیا تو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے لات و منات کو توڑ ڈالا۔

عرب میں کہانت اور جادوگری وغیرہ کا رواج تھا اور لوگوں کے دلوں پر کاہنوں اور جادوگروں کا بہت زیادہ خوف و ہراس بیٹھا ہوا تھا لیکن جب اسلام نے کہانت اور جادوگری کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا تو ان کی ساری

سطوت خاک میں مل گئی اور وہ بالآخر فنا ہو کر رہے۔

عربوں کا اسلام سے پہلے جو حال تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ وحشی اور نکمی قوم کبھی عروج حاصل کرے گی اور انکی سطوت و ہیبت سے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں تھرا اٹھیں گی پر جب آفتاب اسلام طلوع ہوا اور اس کی گرم گرم شعاعیں ان کے دلوں پر پڑیں تو دفعۃً ان میں اتنی حرارت پیدا ہو گئی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بے سروسامانی کے باوجود اپنے گمنام جزیرے سے نکل پڑے اور مشرق و مغرب میں اپنی حکومت کا جھنڈا نصب کر دیا۔

اسلام سے پہلے عربوں کی وقعت دوسری قوموں کے نزدیک اتنی تھی کہ جب مسلمانوں نے فارس پر حملہ کیا اور اسلامی سفراء یزدگرد کے دربار میں پہنچے اور اپنے آنے کی غرض و غایت بیان کی تو یزدگرد نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا کہ تم کو یاد نہیں کہ تمام دنیا میں تم سے زیادہ ذلیل اور بدبخت کوئی قوم نہ تھی تم جب کبھی ہم سے سرکشی کرتے تھے تو سرحد کے زمینداروں کو حکم بھیج دیا جاتا تھا اور وہ تمہارا بل نکال دیتے تھے، لیکن وہی قوم جسے یزدگرد نے اسقدر ذلیل سمجھا تھا، اسلام کے بعد اتنی طاقتور ہو گئی کہ خود اس کی اس عظیم الشان سلطنت کا تختہ الٹ دیا جس کو اس پر اتنا غرہ تھا اور ان کی شجاعت و جرأت اس حد تک پہونچ گئی کہ بڑی سے بڑی طاقت انہیں ہیچ نظر آنے لگی۔

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جنگ قادسیہ شروع ہونے سے پہلے ایک موقع پر حضرت مغیرہ رستم کے دربار میں سفیر بنکر گئے۔ ایرانیوں نے چاہا کہ اپنی ظاہری شان و شوکت سے انہیں مرعوب کریں چنانچہ بہت سروسامان سے دربار سجایا گیا پر تکلف فرش و قالین بچھائے گئے۔ امراء و افسر اور خاص زرق برق کپڑے پہن کر رنگا رنگ کرسیوں پر بیٹھے اور خدام اور منصب دار قرینے سے دو رویہ بہت جا کر کھڑے ہو گئے لیکن حضرت مغیرہ کو اس شان و شکوہ نے بالکل متاثر نہیں کیا وہ گھوڑے سے اترے اور بے پروائی سے ہر چیز پر نظر ڈالتے ہوئے صدر کی طرف بڑھے اور رستم کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے

اس وقت تک اسلامی تعلیمات نے دوسری قوموں میں بہت زیادہ اثر و نفوذ نہیں پیدا کیا تھا اور وہ اپنے سلاطین و حکام کو انسان کے بجائے دیوتا یا اس کے گماشتہ سمجھتی تھیں اور انکے عقیدہ کے مطابق کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا تھا کہ بادشاہ یا حاکم کی برابری کا خیال دل میں آنے دے چہ جائیکہ کوئی ان کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ جائے۔ چنانچہ حضرت مغیرہ کے اس طرح بیٹھنے پر تمام دربار برہم ہو گیا یہاں تک کہ چوبداروں نے ان کا بازو پکڑ کر تخت سے اتار دیا۔

ایک ایسا شخص جس کو دل میں عظمت صرف خدا کی ہو اور جو بادشاہوں کو بھی اپنے ہی جیسا انسان سمجھتا ہو ان کی اس حرکت پر کیسے خاموش رہ سکتا تھا چنانچہ حضرت مغیرہ نے افسران بالا کو مخاطب کر کے کہا کہ میں یہاں خود نہیں آیا تھا بلکہ تم نے مجھے بلایا تھا۔ اس لئے بحیثیت مہمان ہونے کے تمہیں میرے ساتھ یہ سلوک زیبا نہ تھا تمہاری طرح ہم لوگوں میں یہ دستور نہیں کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور تمام لوگ اس کے آگے بندہ ہو کر گردن جھکائیں۔ حضرت مغیرہ کی اس جرأت آموز تقریر نے تمام دربار کو متاثر کیا یہاں تک کہ بعض بعض بول اٹھے کہ جس قوم کے افراد اسقدر جری اور ایسے بہترین جذبات و خیالات کے مالک ہوں انہیں ذلیل سمجھنا بہت بڑی غلطی

یاد اندلس

(۶)

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

علمی کارنامے

پچھلے نمبروں میں مسلمانوں کے صنعتی، تجارتی اور تعمیری کارناموں سے بحث کی جا چکی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علمی کارناموں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

اندلس کے مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں جو کارنامے انجام دئے، ان میں علمی کارنامے اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کا یورپ پر خاص اثر پڑا اور وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے ظہور پذیر ہونے کے باعث ہوئے اس اعتبار سے چاہئے تو یہ تھا کہ ان کے کارناموں میں سب سے پہلے علمی کارناموں سے بحث کی جاتی لیکن چونکہ انکی علمی ترقیاں، صنعت و حرفت اور تجارت کے فروغ ہی کی رہینِ منت تھیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ پہلے ان کے تجارتی و صنعتی کارناموں پر روشنی ڈالی جائے اور علمی کارناموں کا تذکرہ موخر کر دیا جائے

تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے حملے سے پہلے اندلس، صنعت و تجارت اور تعمیرات وغیرہ کے لحاظ سے کس درجہ فروتر تھا۔ اسی پر علم کو بھی قیاس کرو۔ مسلمانوں سے پہلے اندلس پر جہالت کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور اس کے کسی گوشہ میں بھی علم کا کوئی چرچا نہ تھا۔ بعض بعض مقامات میں سحر و طلسم وغیرہ کا رواج تھا جو غالباً رومیوں کے دورِ حکومت سے چلا آتا تھا بس ان کی کل علمی کائنات "یہی" تھی۔

جب بنو امیہ کی حکومت وہاں مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی اور ملکی نظم و نسق سے یک گونہ اطمینان نصیب ہوا تو اس وقت علوم و فنون کی طرف توجہ کی نوبت آئی۔

سلاطین اندلس اور علم کی قدردانی

علم و فن کی ترقی جن اسباب و وسائل پر منحصر ہے، ان میں امراء و سلاطین کی قدردانی بہت زیادہ اہم ہے۔ خوش قسمتی سے اندلس کے خلفاء چند کو چھوڑ کر سب کے سب ایسے تھے جنہیں خود علم کا شوق تھا اور جو اہلِ علم اور فضلاء کی قدردانی اپنا

وطن نہیں سمجھتے تھے۔

پچھلے صفحات میں کہیں گذر چکا ہے کہ عبدالرحمن ناصر نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا جو اس زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ تھا۔ اس کے بیٹے حکم بن عبدالرحمن کو بھی کتابوں کا بے انتہا شوق تھا۔ وہ بڑی بڑی قیمتیں دے کر بغداد و مصر وغیرہ سے کتابیں منگوایا کرتا تھا۔ اس نے اطراف واکناف ملک میں اپنے آدمی پھیلا دیئے تھے . . . . . جو اس کے لئے کتابیں نقل کرکے بھیجتے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے زمانہ خلافت میں اتنی کتابیں جمع کرلی تھیں جتنی خلفاء بنی عباس اپنے پورے دورِ خلافت میں بھی نہ کرسکے۔

بہت سے امراء و سلاطین ایسے گذرے ہیں جو خود صاحب تصانیف تھے مثلاً مظفر بن افطس جو بطلیوس کا حکمراں تھا، ادب میں کامل مہارت رکھتا تھا اور اس نے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی جو پچاس جلدوں میں تھی۔ خلیفہ یوسف بن عبدالمومن ایک بلند پایہ عالم اور علماء و شعراء کا بہت زیادہ قدرداں تھا۔ اس نے اہل نظر علماء کو ملک کے گوشہ گوشہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلایا تھا اور انہیں اپنے دربار میں جگہ دی تھی۔ انہی میں مشہور مسلمان فلسفی ابوبکر محمد بن طفیل تھا جو اس کے دربار میں بہت زیادہ عزت حاصل تھی۔ اسی کے مشورہ سے ابن رشد نے خلیفہ کے لئے ارسطو کی کتابوں کی تلخیص کی تھی۔

علی بن تاشفین اہل علم کی عزت افزائی میں غیر معمولی شہرت رکھتا تھا وہ جب تک اہل علم سے مشورہ نہ کر لیتا ملک میں کوئی حکم نافذ نہ کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو بھی اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر چھوٹے بڑے کام میں فقہاء اور اہل علم سے مشورہ لیا جائے۔ اس کی اسی قدردانی کا نتیجہ تھا کہ اہل کمال دور دور سے کھنچ آئے اور ان کا اس کے دربار میں اس طرح جمگھٹا رہنے لگا کہ بنو عباس کا ابتدائی زمانہ خلافت کا نقشہ لوگوں کے سامنے آگیا۔

مجاہد عامری اہل علم کے لئے بے دریغ روپیہ صرف کرتا اور ان کی اس درجہ عزت و تکریم کرتا کہ اس کی شہرت سن کر اہل کمال دور دور سے سفر کرکے آتے اور اس کے ہاں مقیم ہوتے

اشاعت علم کیلئے جدوجہد

تشویق علم اور مدارس کا اجراء | اس زمانہ میں عام طور سے مساجد سے مدارس کا کام لیا جاتا تھا اور ہر قسم کے علوم و فنون کی ان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن جب ضروریات وسیع ہوئیں اور تمدن نے بال و پر نکالے تو تعلیم کے لئے ہر شہر و قریہ میں خاص درسگاہیں تعمیر ہونے لگیں۔ چنانچہ ترقی کے ابتدائی زمانہ ہی میں صرف قرطبہ کے اندر ۸۰ مدرسے قائم تھے جن کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں لوگوں کی مفت تعلیم کا انتظام کیا جاتا اور جو تنگ دست بچے ہوتے انہیں وظیفے ملتے۔ عموماً سلاطین کا دستور تھا کہ وہ لوگوں کی ترغیب کے لئے بعض بعض کتابوں کے حفظ پر انعام مقرر کیا کرتے تھے جن کو حاصل کرنے کے لئے لوگ انہیں حفظ کرتے تھے اور اس طرح ان میں تعلیم کی اشاعت ہوتی تھی۔

کتب خانے

اندلس کے تمام بڑے بڑے شہروں میں، عام و خاص بڑے بڑے کتب خانے قائم کئے جہاں لوگ اپنی تشنگی علم بجھانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اندلس کے شہروں میں قرطبہ کتب خانوں کی کثرت کے اعتبار سے خاص شہرت رکھتا تھا اور یہاں کے لوگ کتابوں کے اس درجہ شائق تھے کہ مشکل سے کوئی ایسا گھر رہا ہوگا جس میں چھوٹا یا بڑا کوئی کتب خانہ نہ ہو۔

حکم ثانی نے پبلک کے لئے ایک زبردست کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اس کے لئے وہ دور دور سے کتابیں منگواتا تھا۔ انتظام تھا کہ ملک میں جس قدر کتابیں تصنیف ہوں اس کا ایک نسخہ اس کتب خانہ میں ضرور پہونچے۔ کتابوں کی تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی فہرست ۴۴ جلدوں میں تھی۔

علمی انجمنیں

اندلس میں علماء، مورخین اور شعراء و ادباء کی مختلف علمی و ادبی انجمنیں تھیں جہاں ان کا اجتماع ہوتا اور بحث و تحقیق کا بازار گرم ہوتا۔ ان انجمنوں سے جو اس زمانہ کی اکاڈمیوں سے بہت کچھ مشابہ تھیں، علم اور تمدن کو بہت زیادہ فائدہ پہونچا۔ خود خلفاء اپنے دربار میں مجلسیں منعقد کرتے اور علماء کو بحث و مباحثہ کی دعوت دیتے۔ خلیفہ مظفر، ابو عبد اللہ اور ابو الحزم وغیرہ جیسے فضلاء کو اپنے یہاں بلاتا اور ان کے ساتھ مذاکرہ کرتا۔ ابو عامر امیر اندلس، ہفتہ میں ایک بار علمی مجلس منعقد کرتا جس میں اہل علم جمع ہو کر مختلف مسائل پر مباحثہ کرتے۔ احمد بن سعید نصری نے طلیطلہ میں ایک اکاڈمی قائم کی تھی جہاں تقریباً ۴۰ جلیل القدر علماء سال کے تین مہینے نومبر و دسمبر اور جنوری میں جمع ہوتے اور مختلف موضوع پر مذاکرہ کرتے تھے۔

تعلیم نسواں

علوم و فنون کا یہ چرچا صرف مردوں ہی میں مخصوص نہ تھا بلکہ اس زمانہ میں عورتوں کے اندر بھی علم کا رواج عام تھا۔ تاریخ میں اندلس کی بہت سی فاضلہ عورتوں کے حالات مذکور ہیں۔ بہت سی عورتیں ایسی گذری ہیں جو ادب اور شعر و شاعری میں کافی ملکہ رکھتی تھیں اور برجستہ اشعار کہا کرتی تھیں جن عورتوں نے خصوصیت کے ساتھ ادب میں مہارت حاصل کی تھی۔ ان کی ...... مختصر فہرست کتاب عابرات اندلس و ماعرہا کے صفحہ ۶ پر درج ہے حمدہ بن زقاد اور اسکی بہن زینب کے متعلق ابن سعید کا قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ دونوں ادب اور شعر و شاعری میں بہت شہرت رکھتی تھیں اور کمال عفت و نزاہت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہل علم سے ملتی تھیں۔

غرض یہ ہے کہ عربوں کے زمانہ حکومت میں اندلس علوم و معارف کا مرکز تھا اور وہاں تعلیم اس درجہ عام تھی کہ عورتیں بھی فاضل ہوتی تھیں ایک فرانسیسی مورخ نے نہایت حسرت کے ساتھ لکھا ہے کہ "اسپین کے باشندے ایک مختصر جماعت کو چھوڑ کر سب کے سب لکھنا پڑھنا جانتے تھے درانحالیکہ یورپ کے اونچے طبقہ کے لوگ بھی جاہل اور ناخواندہ تھے"۔

اسپین کی اس تعلیمی ترقی پر متعلق تعجب نہیں ہونا چاہئے جبکہ وہاں کے مسلمان بادشاہ، دل و جان سے تعلیم کو عام کرنے پر آمادہ تھے، اور انتہائی فراخ دلی و حوصلے سے کام لیتے ہوئے بے دریغ روپیہ علوم و فنون کی اشاعت و ترویج پر صرف کرتے تھے

مسلمانوں نے ابتداً کن علوم کی طرف توجہ کی

اوپر کی تفصیلات سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اندلس کے امراء و سلاطین اور وہاں کے مسلمان باشندے علوم و فنون کے کس درجہ دلدادہ تھے۔ اب تصریح طلب بات یہ ہے کہ ان کی چشم التفات کن علوم کی طرف زیادہ مائل رہی۔

اندلس پر جس وقت مسلمانوں کا قبضہ ہوا، ان پر مذہبی اثر بہت غالب تھا۔ اس لئے جب انہیں علوم و فنون کی طرف توجہ کا موقع ملا تو مذہبی علوم زیادہ تر ان کی عنایت کا مرکز بنے، اور ایک زمانہ تک ان کا انہماک علمی، مذہبی علوم ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ اس زمانہ میں فلسفہ وغیرہ کا پڑھنا، کفر و زندقہ خیال کیا جاتا تھا۔ مذہبی اشخاص جن کا عوام پر تسلط تھا فلسفہ وغیرہ کو مذہب کے حق میں سم قاتل سمجھتے، اس لئے ان کی برائیاں کرتے اور ان کے پڑھنے پڑھانے والوں کو برا بھلا کہتے۔ اس وقت فلسفہ اور علم نجوم وغیرہ کے خلاف عوام کے جذبات اس درجہ برانگیختہ تھے کہ بہت سے خلفاء انہیں خوش کرنے اور ان میں ہردلعزیز بننے کے لئے ان علوم کی مخالفت کرتے، انہیں پڑھنے والوں کو سزائیں دیتے، اور ان فنون سے متعلق کتابوں کو جلوا ڈالتے۔

مشہور ہے کہ منصور ابن ابی عامر نے اپنے ابتدائی زمانۂ خلافت میں بعض لوگوں کی تسخیر قلوب کے لئے فلسفہ وغیرہ کی بیشمار کتابیں جلوا ڈالیں درانحالیکہ وہ خود اندرونی طور پر ان علوم کے ساتھ بہت زیادہ شغف رکھتا تھا۔ ابن رشد جو اندلس کا مشہور فلسفی گذرا ہے، اسے منصور ابن عبدالمومن نے اس جرم میں قیدخانہ بھیجا کہ اس کا فلسفہ کی طرف رجحان ہے۔ اشبیلیہ میں طارق نامی ایک شخص علم نجوم میں بہت مہارت رکھتا تھا اس کے شہر کے لوگ اسے اس لئے زندیق کہکر پکارتے تھے کہ اسے اس علم میں انہماک تھا۔

غرض یہ ہے کہ ایک زمانہ تک اندلس میں مسلمانوں کی توجہ و عنایت صرف مذہبی علوم کی طرف رہی اور دنیاوی علوم و فنون کا پڑھنا معیوب بلکہ کفر و زندقہ خیال کیا جاتا رہا۔

لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ خواص اہل علم تو ابتداء ہی سے ان علوم کو پڑھتے پڑھاتے رہے البتہ عوام اور ان کی خوشنودی حاصل کرنیوالے خلفاء کے ڈر سے اس کا عام طور پر اظہار نہیں ہونے دیا جاتا لیکن کچھ دنوں کے بعد اس چھپانے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی کیونکہ لوگوں کا ان علوم کیطرف میلان اس طرح بڑھتا رہا کہ انکو روکنا مذہبی رہنماؤں اور بادشاہوں کے دسترس سے باہر ہو گیا۔ اب ان علوم کو پڑھنا کوئی قابل اعتراض بات نہ رہی لیکن حقیقی معنوں میں انہیں پڑھنے کی صحیح آزادی پانچویں صدی ہجری کے ابتداء میں نصیب ہوئی۔ جبکہ اندلس میں طوائف الملوکی پھیلی اور بادشاہوں کی توجہ ہر کام کو چھوڑ کر اسے دور کرنے کی طرف منعطف ہو گئی قرطبہ کے شاہی محل میں جو کتابیں گذشتہ بادشاہوں کے زمانہ سے محفوظ چلی آتی تھیں وہ سب کی سب محل کی دوسری چیزوں کی طرح اس فتنہ کی نذر ہو گئیں اور بازاروں میں [illegible] کوڑیوں کے مول بیچ ڈالی گئیں۔ ان کتابوں کا اندلس میں پھیلنے سے وہ شوق جو بادشاہوں کے ڈر سے دب گیا تھا، ابھر آیا۔ ان علوم میں لوگوں نے اس قدر ترقی کی کہ آج کل کی ترقی یافتہ قوموں کو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑا۔ (باقی)

اصول تاویل قرآن

(از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

جس طرح دنیا کے جملہ فنون کے لئے کچھ نہ کچھ اصول وکلیات ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر ان میں قدم نہیں رکھا جا سکتا اسی طرح کلام سمجھنے کے بھی اصول وقواعد ہیں جن کی معرفت کے بغیر کسی کلام کا صحیح مدعا سامنے نہیں آسکتا۔ جملہ اصناف کلام کے اصولوں سے بحث کرنا میرے موضوع بحث سے باہر ہے آج کی صحبت میں میں صرف قرآن کی تاویل وتفسیر کے چند موٹے موٹے اصول بیان کرنا چاہتا ہوں جن کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے قرآن سمجھنے میں عجیب عجیب غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اگر تاویل قرآن کے وقت انہی چند اصول کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو امید ہے۔ آیات قرآن کے حقیقی منشا سمجھنے میں سہولت ہوگی اور قرآن کی غلط تاویل کی بنا پر جو گمراہیاں پھیلتی جا رہی ہیں ان کا قلع قمع ہو جائے گا۔

تاویل قرآن کے چند اہم اصول

ذیل میں ہم ان اصول کو نمبروار درج کرتے ہیں۔

(۱) ہر کتاب کا کوئی نہ کوئی خاص موضوع ہوتا ہے اور اس کے تمام مضامین کسی نہ کسی جہت سے موضوع سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً آپ جب کسی کے حالات لکھتے ہیں اور ضمناً اور لوگوں کی سیرتوں سے بھی تعرض کرتے ہیں تو یہ نہیں ہو کہ اوروں کے حالات یوں ہی معرض بحث میں آگئے ہیں بلکہ ان سب کے حالات کسی نہ کسی نہج سے اس خاص شخص کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں جس سے بحث کرنا آپ کا مقصود ہے اسی طرح قرآن کی ہر سورہ کا کوئی نہ کوئی عنوان ہوتا ہے اور تمام آیات اس سے کسی نہ کسی نہج سے متعلق ہوتی ہیں عربی میں موضوع سورہ کو عمود سے تعبیر کرتے ہیں عمود ستون کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جس طرح عمارت ستون پر کھڑی ہوتی ہے اس طرح قرآن کی ہر سورہ کے مطالب کسی خاص بنیاد پر قائم ہیں جب تک اس کا پتہ نہ لگایا جائے ان کی گرہیں نہیں کھل سکتیں قرآن کے طالب کو سب سے پہلے اس کی جستجو ہونی چاہئے تب ہی صحیح طور پر کسی سورہ کا مفہوم متعین کر سکتا

(۲) اصول قرآن میں سے ایک نہایت اہم بالشان اصول نظم قرآن کا ہے گو ایک بڑی جماعت اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر اس کی منکر ہے لیکن اگر نظم قرآن کا اصول نہ مانا جائے تو بے شمار آیتوں کی تفسیر میں ایسی فحش غلطیاں ہوں گی کہ جن کا نظم قرآن کے منکر اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان غلطیوں میں سے ایک عظیم الشان غلطی کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا سورہ بقرہ کی آیت ۶۲ (ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ الخ) سے بہت سے حضرات ایمان بالرسالت کی عدم ضرورت کا فتویٰ لے رہے ہیں اور بعض لوگ اس کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ اگر دیگر مذاہب والے اپنی اپنی کتابوں پر بغیر ایمان بالقرآ

سے حل کریں تو ان کی نجات کامل تو نہیں مگر ناقص کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ خیال کس قدر غلط ہے؟ اور قرآن کی بے شمار آیتوں بالخصوص سورۂ نساء کی آیت (۱۵۰) کے کس درجہ مخالف ہے، اس پر بحث کی گنجائش نہیں ہے میں تو صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ جو شخص قرآن پر لحاظ نظم غور نہیں کرتا، وہ کن کن غاروں میں گر سکتا ہے؟ اس قسم کی بے شمار فروگذاشتیں لوگوں سے ہوتی ہیں اگر آپ ان کے اسباب کی جستجو کریں گے تو ہر ایک کی مشترک علت نظم قرآن سے بے اعتنائی ہی کو پائیں گے۔

(۳) یہ ضرور ہے کہ ذخیرۂ حدیث قرآن مجید کی شرح و تفسیر ہے مگر اس کے تسلیم کرنے میں بھی کسی کو عذر نہ ہونا چاہئے کہ بہت سی منگھڑت حدیثیں بھی ہیں جو مختلف اسباب سے صحیح حدیثوں کے سرمایہ میں داخل ہو گئی ہیں۔ تو جس طرح صحیح حدیثیں قرآن سمجھنے میں بہت زیادہ معین ثابت ہوتی ہیں اسی طرح غلط حدیثیں غلط راستہ پر ڈال دیتی ہیں۔ اسی بنا پر قرآن کی حدیثوں کے ذریعہ تاویل و تفسیر میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ سلف صالحین اس بارے میں بہت زیادہ محتاط تھے اور جن حدیثوں کو وہ غلط سمجھتے تھے انہیں بالکل نظر انداز کر دیتے تھے۔ خصوصاً ان روایتوں کو وہ قطعاً قابل اعتناء نہیں سمجھتے تھے جو ان کے خیال کے مطابق قرآن کے خلاف ہوتی تھیں میں یہاں چند روایتیں بطور مثال پیش کرتا ہوں ان سے واضح ہو جائے گا کہ سلف کا اس قسم کی روایات کے بارے میں کیا طرز عمل تھا۔

(۱) سورہ صافات کی آیت "انی سقیم" سے عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت خلیل اللہ (نعوذ باللہ) جھوٹ بولے اور اپنے اس دعویٰ کی سند میں "ما کذب ابراھیم الا ثلث کذبات" کی روایت پیش کرتے ہیں گو یہ روایت صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہے مگر امام رازی جیسی جماعت مفسرین کا گل سرسبد بے پاروح روان اس کی صحت سے انکاری ہیں، وہ آیت انی سقیم کے تحت میں فرماتے ہیں۔

قال بعضهم ذالك القول رانی سقیم عن ابراهیم کذبة وردوا فیه حدیثا عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال ما کذب ابراهیم الا ثلث کذبات. قلت لبعضهم هذا الحدیث لا ینبغی ان یقبل لان نسبة الکذب الی ابراهیم لا تجوز فقال ذالك الرجل فکیف یحکم بکذب الرواة العدول فقلت لما وقع التعارض بین نسبة الکذب الی الراوی وبین نسبته الی الخلیل کان من المعلوم بالضرورة ان نسبته الی الراوی اولی۔ (تفسیر کبیر)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کا صریح جھوٹ ہے اور اس کی تائید میں "ما کذب ابراہیم" کی روایت پیش کرتے ہیں امام صاحب فرماتے ہیں میں نے ایک بزرگ سے کہا یہ حدیث قابل قبول نہیں اس لئے کہ حضرت ابراہیم کی جانب اس صریح جھوٹ کا انتساب کبھی جائز ہو ہی نہیں سکتا تو انھوں نے فرمایا آخر ثقہ و عادل لوگوں کی روایت کیسے موضوع ٹھہرائی جا سکتی ہے تو امام صاحب نے فرمایا جب جرح کے انتساب میں کوئی راوی خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو ابراہیم خلیل اللہ سے متعارض ہو جائے تو ایسی شکل میں راوی ہی کی طرف کذب کا انتساب اولیٰ ہے"

امام رازی نے یہ اصول مدنظر رکھ کر نہ صرف حضرت ابراہیمؑ کو کذب سے پاک ثابت کیا بلکہ اسی اصول پر ہم وہ تمام فسانے و قصص جو انبیاء کی طرف منسوب ہیں اور جنہیں پڑھ کر (نعوذ باللہ) انبیاء کی عصمت پر شبہ ہونے لگتا ہے بے حقیقت ثابت کر سکتے ہیں۔

(۲) اسی طرح ابن القاسمؒ چند حدیثیں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ جب حضرت امام مالک سے ان کی حقیقت دریافت کی تو انہوں نے سخت ناگواری کا اظہار فرمایا اور اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے کی نہایت شدت سے ممانعت کی میں نے یہ مثالیں محض اس غرض سے پیش کی ہیں کہ قرآن کا طالب آنکھ بند کر کے احادیث و روایات کو قرآن کی تاویل نہ کرے ورنہ قرآن کی قطعیت کو بہت سخت دھچکا لگے گا۔ دوسرا یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو حدیثیں قرآن کے خلاف ہوں وہ یقیناً مردود ہوں گی خواہ اعتبار سند ان کا درجہ کتنا ہی بلند ہو۔ یہ کوئی انوکھا اصول نہیں بلکہ اس پر علماء نے ہمیشہ عمل کیا ہے۔ البتہ متاخرین نے اس اصول سے بہت کم کام لیا اور اسی کی بنا پر ان کے درمیان اس قدر مناقشات و مجادلات کی گرم بازاری ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا۔

ان الاحادیث ستکثر .... عنی بعدی کما کثرت من الانبیاء من قبلی فما جاءکم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ فما وافق کتاب اللہ فھو عنی فلتہ اولم اقل،

کہ میرے بعد احادیث کی کثرت .... اسی طرح ہوگی جس طرح اور انبیاء کے بعد ہوئی پس جو کوئی حدیث تم تک پہونچے اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو اگر کتاب اللہ کے مخالف نہ ہو تو وہ میرا قول ہے خواہ میں نے بیان کیا ہو یا نہ بیان کیا ہو۔

(۳) اصول قرآن میں سے ایک مہتم بالشان اصول تعیین خطاب کا بھی ہے واقعہ یہی ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی کلام کے مخاطب سے واقف نہ ہوگا کبھی اسے صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ مثال کے طور پر یا ایہا الذین آمنوا کے خطاب کو پیش نظر رکھئے تو آپ پر یہ عقیدہ اچھی طرح واضح ہو جائیگا کہ کہیں تو اس سے مراد مومنین کاملین ہیں اور بعض جگہ منافقین، اگر قرآن کا طالب اس سے واقف نہیں ہے تو نہ معلوم وہ کتنے مومنین کاملین کو منافقین کے زمرہ میں اور کتنے منافقین و اشرار کو فقہا و صلحاء کی جماعت میں داخل کر دے گا اکثر مفسرین نے اس اصول کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے شدید قسم کی غلطی کی ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیت (۱۰۴) یا ایہا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا الخ سے بہت سے لوگ مومنین سے خطاب مانتے ہیں حالانکہ مومنین کاملین سے یہ حرکت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ حماقت اہل کتاب کی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اہل کتاب کو مومنین کے سا کیوں مخاطب کیا اس کے متعدد بے شمار مصالح ہیں جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں البتہ ایک حکمت تو اس کی بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک خاص انداز سے مومنین کو تنبیہ کر دیا گیا ہے کہ ان شریروں کے کے احمقانہ اور بیہودہ سوال نہ کرنا ورنہ تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو ان کا ہوا و نیز اس میں در پردہ اہل کتاب کو سرزنش کی گئی ہے اس قسم کے بے شما

خطابات مدنی سورتوں میں ہیں جن سے کہیں تو مومنین مراد ہیں اور کہیں منافقین وضعفا قلوب ابتدا یہ سوال کرنا خود تعیین خطاب کی کیا صورت ہے اس کے لئے قرآن پر دو پہلوؤں سے غور کرنا چاہئے۔

(۱) سیاق و سباق کے لحاظ سے

(۲) سورتوں کے زمانۂ نزول پر غور کرنا چاہئے۔

(۵) لغت عرب پر بڑا تدبر ہونا چاہئے اس لئے کہ قرآن عربوں ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ سلف کا اس اصول پر نہایت شدت سے عمل رہا ہے ان کے سامنے جب کوئی اشکال درپیش ہوتا، بلا توقف لغت عرب کی طرف رجوع کرتے حضرت ابن عباسؓ سے جب یوم یکشف عن ساق کی تاویل دریافت کی گئی تو قبل اس کے وہ اس کی تاویل بیان کریں یہ اصول زریں لوگوں کو بتلایا۔

اذا خفی علیکم شیٔ من القرآن فابتغوہ فی الشعر فانہ دیوان العرب (درمنثور)

جب تمہارے سامنے کوئی قرآنی مشکل آپڑے تو اس کا حل اشعار عرب سے چاہو اس لئے کہ دیوان عرب یہی ہے۔

مہتم بالشان اصول بیان کرنے کے بعد مفسر اعظم نے سوال عنہا آیت کی تاویل اشعار عرب سے کی۔

اسی طرح جب حضرت عکرمہ سے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر دریافت کی گئی تو انھوں نے محاورہ عرب سے استشہاد کرکے تفسیر بیان فرمائی:۔

قال ان العرب کانوا اذا اشتد القتال فیھم والحرب وعظم الامر فیھم قالوا لشدۃ ذالک قد کشفت الحرب عن ساق (درمنثور)

اہل عرب حرب و قتال کی شدت کے موقع پر اس محاورہ (کشفت الحرب) عن ساق کو استعمال کرتے تھے۔

(باقی)

برقی ٹائپ رائٹر

حال میں ایک جدید قسم کا برقی ٹائپ رائٹر ایجاد کیا گیا ہے، جس میں وقت اور زحمت کو بچانے کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کاغذ اور کاربن کے اوراق ایک کشتی میں رکھ کر اس ٹائپ رائٹر کے سامنے رکھدیئے جاتے ہیں اور یہ خود بخود ان کو کھینچ کر مشین میں لگا لیتا ہے، ٹائپ کرنے والے کو یہ زحمت نہیں کرنی پڑتی ایک ورق کے ختم ہونے کے بعد دوسرا خود بخود مشین میں لگ جاتا ہے۔

تفسیر سورۃ بقرہ

(۴)

(از امام جلیل سید رشید رضا مصری مرحوم)

(۶) ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون

(۷) ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ و لھم عذاب عظیم

(ترجمہ) بیشک جو لوگ کافر ہو چکے، برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اللہ نے مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اب تک ان دو قسموں کے لوگوں کا تذکرہ تھا جن کو قرآن روشنی بخشتا ہے اور جن کے قلوب میں اسے قبول کرنے کا میلان ہوتا ہے۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جن تک پہلی بار ہدایت پہونچی ہے لیکن وہ جیسا کہ گذر چکا ہے پہلے سے خدا کا وجود تسلیم کرتے ہیں، اس کا خوف دل میں محسوس کرتے ہیں اور اصولی طور پر ادراک غیر محسوسات کے وجود کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور دوسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو "ما انزل الی النبی" اور "ما انزل من قبلہ" پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ آخری قسم کبھی پہلی قسم کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ لوگ جو دعوت ایمان سننے سے پہلے سے "اتقاء" اور "ایمان بالغیب" کے اوصاف سے متصف تھے اور پھر آنحضور صلعم اور آپ کی لائی ہوئی چیزوں پر ایمان لائے۔ اس قسم کے لوگ بیک وقت دونوں قسموں میں داخل ہیں اور کبھی یہ دونوں قسمیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جن تک تا حال ہدایت نہیں پہونچی تاہم وہ پہلی جماعت کے اوصاف رکھتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے اور سن بلوغ کو پہونچکر عقل و فہم کی روشنی میں اپنے ایمان کی تصدیق کر لی۔ ان میں سے اول الذکر پہلی قسم میں داخل ہیں اور آخر الذکر دوسری قسم میں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

ان دونوں قسموں کا حال بیان کرنے کے بعد اب آیات (۶) و (۷) میں لوگوں کی ایک تیسری قسم یعنی کافروں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد آیۃ "ومن الناس من یقول" الخ میں ایک اور جماعت کا حال بیان ہوا جو کافر ہونے کے باوجود بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان سے الگ ہے۔ اس سے مراد منافقین ہیں۔ ان لوگوں کی باتوں اور بعض افعال سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں لیکن حقیقت میں وہ کافروں سے بھی بدتر ہیں۔

گویا یہاں چار قسم کے لوگوں کا بیان ہے اور یہی چار قسمیں ہیں جن میں لوگ دعوت قرآن پہونچنے کے بعد تقسیم ہو جایا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلعم کی تسلی کے لئے بیان فرمایا کہ اگر کچھ بدبخت قرآن سننے کے بعد اس پر ایمان نہیں لاتے

تو یہ قصور ان کا ہے نہ کہ قرآن کا۔ قرآن بھی عقل سمع وبصر وغیرہ کی طرح خدا کا ایک زبردست عطیہ ہے پس جس طرح اگر کوئی شخص عقل کو بالائے طاق رکھ دے اور اپنے وہم اور نفسانی خواہشات کا تابع بن کر ایسے کام کرے جن کا نتیجہ اچھا نہ ہو یا کوئی شخص آنکھ بند کرکے نامعلوم راستہ پر چلنا شروع کر دے اور کسی گڑھے میں گر کر ہلاک ہو جائے تو اس کی بنا پر عقل اور آنکھ کے غیر معمولی عطیہ الٰہی ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن سننے کے بعد اس پر ایمان نہ لائے تو اس سے کچھ قرآن کا عیب ظاہر نہیں ہوتا۔

غرض یہ ہے کہ یہاں اہل حق اور بالخصوص آنحضور صلعم کو تسلی دی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا "اب یہاں دوسری قسم کی پہلی جماعت کا بیان شروع ہوا۔ اس جماعت کے احوال پہلی قسم سے بالکل متغائر ہوتے ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا اتصال نہیں ہوتا اسی لئے اسے ماقبل سے منقطع کرکے یعنی بغیر عطف وغیرہ کے بیان کیا۔

کفر کے لغوی معنی چھپانے اور ڈھکنے کے ہیں اسی لئے رات اور دریا کے وصف میں بھی یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے قول ؎

کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ

میں کاشتکاروں کو کافر کہا گیا ہے کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتے ہیں۔ مجازاً اس لفظ کا اطلاق، نعمت کی ناشکری، خدا کے انکار اور خصوصیت کے ساتھ شرک پر ہوتا ہے کیونکہ ان سب صورتوں میں بعض معنوی امور پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔

اس آیت میں الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے متعلق خدا کو معلوم ہو چکا ہے کہ بوجہ کفر کے استحکام اور رسوخ کے قبول ایمان کی تمام صلاحیتیں ان سے رخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے شیخ کا ارشاد یہ ہے کہ یہاں پر کفر سے قرآن کا یا قرآن لانے والے کا یا ان چیزوں کا انکار مراد ہے جو صراحۃً دین میں داخل ہیں۔ اگر کوئی شخص عناداً یا تساہلاً یا استہزاءً ان چیزوں کا انکار کرے تو اس کے کافر ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ اس کے پاس پیغام حق صحیح طور پر پہنچ گیا ہو اور اس کی صحت پر غور کرنے کا اسے موقع مل گیا ہو اس کے علاوہ اور کسی صورت میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے صحابہ کسی کی تکفیر نہیں کرتے تھے۔ جو باتیں دین کی طرف منسوب ہیں لیکن قطعی طور پر ان کا دین سے ہونا ثابت نہیں ہے ان کا منکر کافر نہیں قرار دیا جا سکتا الا اینکہ اس کے انکار کا مقصد آنحضور صلعم کی تکذیب ہو۔

بعض متاخرین نے انتہائی جرأت سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو بھی کافر کہہ دیا جو بعض ظنیات کی تاویل کرتے ہیں یا کسی اختلافی مسئلہ کا انکار کرتے ہیں یا کسی گذشتہ اجتہاد کی کسی درجہ میں مخالفت کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگ ایک دوسرے کی تکفیر پر بہت دلیر ہو گئے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی بعض ایسی چیزوں کا انکار کرے جنہیں مسلمانوں نے عادتاً اختیار کر لیا ہے اور جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہ ہو، تو بھی اسے کافر کہے بغیر نہیں چھوڑتے خواہ خود ان کے

مثلاً فرائض اخلاق منافقانہ اور اعمال مشرکانہ ہوں۔

کافروں کی چند قسمیں ہیں (۱) بعض کو معرفت حق حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتے بلکہ عناداً اس کا انکار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے اور بہت جلد نیست و نابود ہو جاتے ہیں آنحضور صلعم کے زمانہ میں مشرکین اور یہودیوں کی ایک جماعت اس قسم کے کافروں کی تھی لیکن زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ ان کا خاتمہ ہوگیا۔

یہاں پر استاذ امام کا ایک مقولہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے۔

"علم کے بعد حق کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے علم سے[1] یقین کا پیدا ہونا یعنی یہ دونوں چیزیں بہت کم پائی جاتی ہیں"

(۲) بعض کافر ایسے ہوتے ہیں جو نہ حق کو جانتے ہیں اور نہ جاننا چاہتے ہیں انھیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون ولو علم اللہ فیھم خیرا لاسمعھم ولو اسمعھم لتولوا وھم معرضون	بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا اور اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر۔

ان لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ داعی حق کی پکار جب ان کے کانوں میں پہونچتی ہے تو اس پر لبیک کہنے کے بجائے اعراض کرتے ہیں اور استکبار اختیار کرتے ہیں۔ ان کے دل میں حق کا شعور ہوتا ہے لیکن ہر وقت ڈانوا ڈول ہوتا رہتا ہے جب حق کی چمک پیدا ہوتی ہے تو اپنے ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ ڈرتے ہیں کہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ممکن ہے بعض وہ چیزیں جنھیں وہ اچھی سمجھتے ہیں یا وہ عقائد جو آباء و اجداد سے وراثت میں ملے ہیں حق کے خلاف نظر آنے لگیں۔

(۳) تیسری قسم میں وہ کافر داخل ہیں جن کا قلب و وجدان مریض ہوتا ہے ایسے لوگ حق میں کوئی لذت محسوس نہیں کرتے اور نہ ان کے دل میں اسے قبول کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی توجہ حق سے ہٹ کر دوسری چیزوں کو اپنا مرکز بنا لیتی ہے اور وہی چیزیں ان کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں۔ تم سمجھتے ہوگے کہ آجکل اکثر لوگوں پر مال و دولت جمع کرنے اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا بھوت پوری شدت سے سوار ہے اور اس کے لئے عقل و ادراک اور ہر قسم کی قوتیں صرف کیجاتی ہیں، ایسے لوگوں کے سامنے جب حق پیش کیا جاتا ہے یا اسے قبول کرنے کی دعوت دیجاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں اور قبول کرنے کے بجائے وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ مذکورہ بالا قسم کے لوگوں کی طرح . . . . . . ہر زمانہ اور ہر جگہ بکثرت ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد خصوصیت کے ساتھ ان قوموں میں زیادہ ہوتی ہے جن میں جہالت عام ہوتی ہے، جن کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ جن کے فضائل کا سرچشمہ خشک ہو جاتا اور جن کے لئے چوپایوں کی طرح کھانے پینے کے سوا اور کوئی کام باقی نہیں رہ جاتا۔

---

[1] یہاں پر یقین سے مراد منطقی یقین ہے جس طرح ہاتھ سکہ ... تک پہونچ جاتا ہے ... ایمان شرعی کیلئے یہ یقین اگر شرط قرار دیا جائے تو ہر زمانہ میں مومنین کی تعداد بہت

ابھی مذکورہ جماعتوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:-

سواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم لا یؤمنون برابر ہے تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

انذار کے معنی ہیں کسی چیز کی اس طرح خبر دینا کہ اس کے نتائج و عواقب سے خوف پیدا ہو جائے۔ سواء اسم مصدر ہے اس کے معنی برابر ہونے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو لوگ استحکام کفر کی وجہ سے ایمان کی استعداد رکھنے والوں کی جماعت میں داخل نہیں ہو سکتے، ان کے لئے واقع کے لحاظ سے انذار اور عدم انذار برابر ہے۔ اگر کوئی شخص روشنی دیکھ کر آنکھیں بند کر لے کہ اسے روشنی پسند نہیں یا اس سے اسے نقصان پہونچتا ہے یا جو شخص اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس سے اسے عداوت ہے تو اسے روشنی سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے اور اس کے اس اعراض سے اس روشنی میں کیا برائی پیدا ہو سکتی ہے، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ نور کیا ہے اور نہ اسے جاننا چاہتا ہے کیونکہ اس کی طبیعت اور تربیت کی خرابی نے اس سے اسے دور کر دیا ہے یا جہل نے اس کے وجدان کو خراب کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ نور و ظلمت اور نفع و نقصان میں تمیز نہیں کر سکتا، ایسے شخص کو اس سے مطلق فائدہ نہیں پہونچ سکتا خواہ اس کی چمک کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو۔

لا یؤمنون اس جملہ سے ماقبل کی تفسیر ہوتی ہے یعنی مشرکین کے حق میں انذار اور عدم انذار برابر ہے یعنی وہ بہر حال ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ کے لئے یا آپ کے تابعین کیلئے یہ دونوں برابر ہیں کیونکہ دعاۃ حق ہر کافر کو دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کی تمیز نہیں کرتے کہ کون ایمان لانے کے لئے مستعد ہے اور کون مستعد نہیں ہے کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس کا علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان فرمایا کہ یہ کفار ایمان کی استعداد بالکل کھو چکے ہیں اور کفر ان کے دلوں میں اس طرح جاگزیں ہو گیا ہے کہ کسی اور بات کا گھسنا محال ہے۔ فرمایا:-

ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی ابصارہم غشاوۃ | اللہ نے انکے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور انکی آنکھوں پر پردہ ہے

امام راغب نے ختم اور طبع کے لغوی و مجازی معنی بیان کرتے ہوئے ختم اللہ علی قلوبہم کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس عادت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب انسان اعتقاد کی انتہائی گمراہیوں میں مبتلا اور ممنوعات کے ارتکاب میں بہت زیادہ منہمک ہو جاتا ہے اور اس کے حق کی طرف بالکل توجہ باقی نہیں رہتی تو اس سے نفس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ معاصی کا ارتکاب مستحسن نظر آنے لگتا ہے گویا قلب پر مہر لگ جاتی ہے''

غرض یہ ہے کہ یہ تعبیر ان لوگوں کی تمثیل ہے جن کے دلوں میں کفر نے گھر کر لیا ہے اور وہ ایمان کے دلائل و محاسن پر غور کرنے کے دواعی و اسباب کھو چکے ہیں اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اس لئے آیات اللہ کو تامل و تفقہ کی نیت سے نہیں سن سکتے۔

جملہ "علی ابصارہم غشاوۃ" کا عطف ختم اللہ پر ہے۔ غشاوۃ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز ڈھک دی جائے

مطلب یہ ہے کہ ان کی آنکھیں خدا کی ان روشن نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتیں جو ایمان کی طرف رہبری کرتی ہیں۔

یہاں پر ختم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کیونکہ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لئے اللہ کی یہی سنت جاری ہے۔ اور پھر اسے ماضی کے صیغہ کے ساتھ ادا کیا ہے یہ اشارہ ہے کہ گویا یہ کام ہو چکا۔ اس سے مشرکین کو جبری کفر پر استدلال نہیں ہو سکتا اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زبردستی انہیں ہدایت سے روک دیا کیونکہ یہاں تو تمثیلاً یہ بیان کیا گیا ہے کہ کفر اور کفریہ اعمال نے ان کے دلوں کو مردہ کر دیا ہے اور کفر ان پر اس طرح چھا گیا ہے کہ ایمان وغیرہ کے لئے کوئی استعداد ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی توضیح سورۃ منافقین کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

ذالک بانھم آمنوا ثم کفروا فطبع علیٰ قلوبھم فھم لا یفقھون (۶۳-۳)

یہ اس لئے کہ وہ ایمان لائے پھر منکر ہوگئے پھر مہر لگ گئی ان کے دل پر سو اب وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

یہودیوں کے متعلق سورۃ نساء میں فرمایا ہے۔

فبما نقضھم میثاقھم وکفرھم بآیات اللہ وقتلھم الانبیاء بغیر حق وقولھم قلوبنا غلف بل طبع اللہ علیھا بکفرھم فلا یومنون الا قلیلا (۴-۱۵۵)

ان کو جو سزا ملی ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں کے اور قتل کرنے پر پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر کہ ہمارے دل پر غلاف ہے سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے مہر کر دی انکے دل پر کفر کے سبب سو ایمان نہیں لاتے مگر کم

تصریح کر دی گئی ہے کہ طبع ان کے کفر اور معاصی کا نتیجہ ہے۔

سورہ جاثیہ میں ہے۔

افرءیت من اتخذ الٰھہ ھواہ واضلہ اللہ علیٰ علم وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشوۃ فمن یھدیہ من بعد اللہ افلا تذکرون (۴۵-۲۲)

بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرا لیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بھلا دیا اس کو اللہ نے باوجودیکہ تھا جانتا بوجھتا۔ اور مہر لگا دی اس کے کان پر اور دل پر اور ڈالدی اسکی آنکھ پر اندھیری پھر کون راہ پر لائے اسکو سوائے اللہ کے سو کیا تم غور نہیں کرتے۔

اس آیت میں شخص مذکور کی تعریف میں یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا لیا ہے۔ جس کا حال یہ ہو اسے کوئی چیز فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔ اس آیت میں تصریح کر دی گئی ہے کہ پردہ اس کی آنکھوں پر ڈال دیا گیا ہے جس نے ہوا و ہوس کو اپنا معبود بنا لیا لیکن سورہ بقرہ کی زیر بحث آیت میں یہ تصریح نہیں ہے، حالانکہ مطلب دونوں آیتوں کا ایک ہی ہے

(باقی)



علم طب اور عرب

(از جناب مولانا نجم محمد صاحب اصلاحی)

مولانا نجم محمد صاحب اصلاحی نے "قدماء اور عرب" کے عنوان سے ڈاکٹر مفیور ڈورایلن کے ایک مبسوط مقالہ کا ترجمہ کیا تھا جو فاران کی پچھلی اشاعتوں میں درج ہو چکا ہے۔ ایڈیٹر فاران کی خواہش پر موصوف نے "عربوں کا علم طب" "تہذیب (؟) کا علم طب" پر دو نہایت تحقیقی مضمون اپنے طور پر لکھے ہیں جن میں تاریخی حیثیت سے عرب اور ہند کے علم طب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آج کی اشاعت میں "عربوں کا علم طب" کا ایک حصہ درج کیا جاتا ہے۔ امید ہے ناظرین فاران ان دونوں علمی و تاریخی مقالات کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔ "فاران"

تمہید

طب بعنوان فنون کے ہے جو انسان کے لئے لابدی ہیں۔ ہر قوم میں خواہ وہ کتنی ہی وحشی اور غیر متمدن ہو قدرتی طور پر کچھ نہ کچھ طب اور طبابت کا رواج پایا جانا ایک بدیہی امر ہے۔ اس لئے کہ کون ایسا متنفس ہے جس کو بیماریاں لاحق نہوتی ہوں اور جو بیماریوں کو دفع کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ قدیم زمانہ میں جس طرح متمدن قوموں نے بیماریوں کو علمی اصول پر دفع کرنے کی جد و جہد کی، اسی طرح وحشی اور جنگلی قوموں نے اپنے معمولی غلط و صحیح طریقوں سے ستانے والے امراض سے چھٹکارا پانے کی کوششیں کیں . . . . اس نظریہ کے صدق کو تسلیم کرنے کے بعد ہر شخص تاریخ کی ورق گردانی کے بغیر بھی یہی کہدے گا کہ عربوں میں ابتدا سے کچھ نہ کچھ موٹے موٹے طبی مسائل اور تجربات موجود تھے جن کے ذریعہ سے وہ ہر قسم کی بیماریوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

عربوں کی تاریخ دو زمانوں میں منقسم ہے جاہلیت اور اسلام۔ آنحضرت کی بعثت کے پیشتر کا زمانہ زمانۂ جاہلیت اور اسکے بعد کا زمانہ اسلام کے نام سے متعارف ہے۔ عربستان کے طب کے متعلق گفتگو کرتے وقت ہمیں ان دونوں زمانوں کی کیفیت الگ الگ بیان کرنی چاہئے کیونکہ معمولی جاہلی طب کو اسلامی زمانہ کے ترقی یافتہ طب سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اسلام نے جس طرح عربوں کا اخلاق سنوارا، اسی طرح ان کے ٹوٹے پھوٹے علوم میں ایسی روح پھونکدی جس کی بدولت انھوں نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔

۱۔ دور جاہلیت

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا طب تین قسم کے امور پر مشتمل تھا۔

(۱) وہ طبی مسائل جانتے جو انھوں نے دوسری قوموں سے حاصل کئے تھے۔

(۵) وطبی تجربات جو انھوں نے خود اپنے ہم قوم اور اپنے اہل و عیال کا علاج کر کے حاصل کئے تھے۔
(۶) ٹوٹکے، جھاڑ پھونک، طلسمات، اور اس قسم کے دیگر مزخرفات جن کے ذریعہ سے وہ اکثر اپنے زعم کے مطابق بیماریوں سے بچنے کی کوشش کرتے۔

قدیم عربوں نے کن قوموں سے طب سیکھا

تاریخ کے صفحات اس عنوان کے متعلق بہت کچھ خاموش ہیں اور بالوضاحت ثبوت کے ساتھ یہ کہیں بھی مرقوم نہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں نے طب کس سے سیکھا؟۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علم طب یونان کی طبی درسگاہوں سے منتقل ہو کر مدرسہ اسکندریہ میں پرورش پا رہا تھا اور وہیں اس علم کے تمام شعبوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات و تدقیقات عمل میں آ رہی تھیں اس مدرسے کے فیض سے رومیوں میں طب کا چرچا پھیل گیا تھا اور ان کی ماية ناز جالینوس اور انٹی لس جیسی مشہور طبی ہستیوں کے مسائل اور نظریوں پر طرح طرح کی بحثیں کرتے تھے، لیکن بایں ہمہ جہاں تک تحقیق رسائی کر سکتی ہے، ان سب باتوں سے عرب بالکل متاثر نہ ہوتے۔ کسی جاہلی سیاح عرب کو رومی اطبا سے فائدہ نہیں پہونچا۔ عرب مصر بھی تجارتی مقاصد سے آیا جایا کرتے تھے لیکن مدرسہ اسکندریہ کے علمی آفتاب کی کوئی شعاع بھی ان پر نہ پڑی۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عربوں کا طب زیادہ تر ان کے ذاتی تجربات اور خود ساختہ ٹوٹکوں اور توہمات پر مشتمل تھا۔
ڈاکٹر فانڈیک کی تحقیقات کے مطابق وہ غیر قومیں جن سے انھوں نے تھوڑے بہت طبی مسائل حاصل کئے، زیادہ تر تین ہی تھیں، ہنود، ایرانی، اور سریانی ان قوموں سے گہرے اختلاط کی بنا پر انھیں کچھ کچھ اصولی طب سے واقفیت ہوگئی تھی۔ ان کے ذاتی طب میں تو محض بے ترتیب مفرد دواؤں کے نسخے یا طبی اوہام و خرافات تھے لیکن جو کچھ انھوں نے ان تینوں قوموں سے حاصل کیا وہ ان کے ذاتی طب کے مقابل میں اصولی ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان تینوں قوموں میں چند علمی ہستیاں اس قسم کی تھیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ اجانب کے درمیان زیادہ تر انھیں کی ذات سے عربوں کو طبی فیض پہونچا۔ ان علمی ہستیوں کے نام عرب مصنفین نے بگاڑ کر اور انھیں عربی صورت میں لاکر اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اکثر تو اس قدر محرف ہیں کہ اصل کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ہندوؤں میں جن علماء کے تعلقات سے جاہلی عربوں نے ویدک طب کی بہت سی باتیں اخذ کیں۔ ان میں زیادہ مشہور حسب ذیل اشخاص ہیں۔

(۱) قلقہ ہندی، یہ ہندوستان کا ایک مشہور حکیم اور فلسفی تھا۔ کتاب "الالوف" میں مذکور ہے کہ قلقہ کو علم ہیئت اور علم طب میں ید طولی حاصل تھا۔ اسکی تصنیفات کا زمانہ ابعد میں عربی میں ترجمہ ہوا ان میں "اسرار الموالید"، "الاقران الاعلی والاسفل طباپارات"، "قوانین الطب"، "دوران الافلاک" اور "منازل القمر" کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔
(۲) سندہیل ہندی۔ یہ شخص اپنے زمانہ میں ہیئت اور طب کا امام تھا۔
(۳) ابو قابیل ہندی۔ اسکی ایک تصنیف عربی تاریخوں میں "کتاب الامراض والعلل" کے نام سے مذکور ہے۔

(۴) شاناک الہندی، یہ شخص ہیئت، طب میں ماہر تھا، علم السموم میں ایک کتاب لکھی جس کا ترجمہ پہلے فارسی میں ہوا اور پھر عباس بن سعید جوہری نے مامون رشید کے ایما سے اسے عربی میں نقل کیا جس کی شرح یحییٰ بن بطریق نے کی شاناک نے ایک کتاب طب بیطری اور ایک ہیئت میں بھی لکھی۔

(۵) جودل ہندی، اسنے جنین کی تحقیق میں ایک کتاب لکھی جس کا ترجمہ بعد کو عربی میں ہوا۔

(۶) شرک، ابوبکر رازی نے اپنی کتاب "الحاوی" میں اس ہندو طبیب کا ذکر کیا ہے، اس کی تصنیفات کا پہلے فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور پھر [illegible] بن علی کے قلم سے اس زبان سے عربی میں منتقل ہوئیں۔

(۷) سسرد ہندی، اس کی بھی ایک طبی تصنیف نے فارسی میں منتقل ہو کر یحییٰ بن خالد برمکی کی جانفشانیوں کی بدولت عربی جامہ پہنا۔

عرب مورخین نے اپنی تصنیفوں میں ان کے علاوہ دوسرے متعدد ہندو اطبا کا بھی نام لیا ہے مثلاً باکور، رجار، صنغا، داہر، انکر، زنکل، جہر، اندی، جاری، ان لوگوں نے بھی کچھ نہ کچھ قدیم عربوں کو اپنے چشمۂ فیض سے بہرہ ور کیا اور عہد مابعد میں ان کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔

ایرانیوں میں سب سے زیادہ مشہور ہستی جس سے قدیم عربوں نے طبی واقفیت کا استفادہ کیا برزویہ ابن ازدھر کی ذات تھی جس کا وطن مرو شاہجہان تھا۔ اس نے علم طب ایران ہی میں مکمل طریقہ سے حاصل کیا تھا، نوشیرواں بن قباد کے حکم سے اسنے ہندوستان کا سفر کیا جہاں اس نے افسانہ کی مشہور کتاب جس کو حکیم بیدپا نے لکھا تھا، حاصل کی اس کتاب کو عہد عباسی میں ابن المقفع نے عربی میں منتقل کیا اور اس کا نام کلیلہ ودمنہ رکھا۔

ایران کے ایک پرانے شہر جندشاپور کے باشندوں کی ذات سے بھی جاہلی عربوں کو بہت کچھ فیض پہونچا۔ اس شہر کو ایرانی فرمانروا شاپور ذی الاکتاف نے بسا کر اپنا دار السلطنت بنایا تھا۔ اس نے اپنی کسی ناگہانی علالت سے شفا حاصل کرنے کے لئے ایک یونانی طبیب تھیوڈورس کو اپنے ملک میں بلایا اور جب وہ اچھا ہوگیا تو اپنے ملک میں علم طب پھیلانے کے واسطے اس یونانی طبیب کو وہیں رہنے پر مجبور کیا۔ تھیوڈورس نے جندشاپور میں سکونت اختیار کی اور وہیں اپنا حلقۂ درس قائم کرکے ایرانیوں کو علم طب سکھانا شروع کیا، اس طرح جندشاپور کچھ عرصہ بعد ایران کے واسطے اسی قسم کا طبی مرکز ہوگیا جیساکہ ایتھنز یونان کے لئے یا اسکندریہ مصر کے لئے تھا۔ اس شہر میں اتفاق سے کبھی کبھی عرب بھی وارد ہوتے تھے اور وہاں کے اطبا سے کچھ نہ کچھ طبی معلومات حاصل کرتے تھے۔ حارث بن کلدہ کی تمام بضاعت طبی اسی شہر والوں کے فیض کا ثمرہ تھی۔

چونکہ تھیوڈورس یونانی تھا، اور اپنے ساتھ یونانی طب لے کر ایران میں آیا تھا، اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان ایرانیوں نے جو اسکے طبی فیض سے بہرہ ور ہوتے، جاہلی عربوں کو کچھ نہ کچھ یونانی طب سے ضرور آشنا کیا ہوگا۔ تھیوڈورس کا زمانہ حیات

۳۵۰ء اور ۴۵۰ء عیسوی کے درمیان تھا۔ اس نے یونانی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا مسلمانوں نے زمانہ مابعد میں عربی میں ترجمہ کر کے "قواعد الطب العوبیہ" نام رکھا، ابن ندیم کی کتاب "الفہرست" میں اس تصنیف کا ذکر ہے۔ سریانی زبان میں بھی اس نے ایک بیاض لکھی جس میں بہت سے نادر نسخے جمع کئے۔

سریانیوں میں جن اشخاص نے بعثتِ رسول کے پیشتر اپنے طبی معلومات سے عربوں کو سرفراز کیا، ان میں زیادہ مشہور ہستیاں ہیں:۔

(۱) سرجیوس بن الیاس، یہ عیسائی طبیب، جو یعقوبی فرقہ کا پیرو تھا، قیصر جسٹینیس کے زمانہ میں شہر راس عین (واقع عراق) میں رہتا تھا۔ اس نے بہت سی یونانی کتابوں کا سریانی میں ترجمہ کیا اور بعد سریانی سے وہ کتابیں، خلفاء بنی عباس کے عہد میں عربی میں منتقل ہوئیں۔

(۲) اھرون اسکندری، یہ پادری شاہ ہیراکلیوس کے زمانے میں تھا، سریانی زبان میں ایک طبی کتاب تصنیف کی جس کا بعد کو عربی میں ماسرجویہ نے ترجمہ کیا۔

(۳) یوحنا اسکندری، جو اپنی قوم میں کراطیقوس (نحوی) کے لقب سے ممتاز تھا اسکندریہ کا باشندہ تھا، اسکی پیدائش اگرچہ بعثت کے بہت پیشتر ہو چکی تھی نیز بعثت کے پیشتر اس نے بہت سے عربوں کو طبی معلومات سے سرفراز کیا تھا، تاہم وہ عمرو بن عاص کے زمانہ تک زندہ رہا، جب وہ عمرو بن عاص کے دربار میں گیا تو انھوں نے اسکی بہت زیادہ عزت کی اور اسکے فلسفیانہ اقوال سنے، چونکہ یہ صحابی بہت عقلمند اور علم دوست شخص تھے، اس وجہ سے انھوں نے اس طبیب کو اپنے دربار میں مستقل طور پر رکھ لیا۔

۱۹۳۲ء

ان تمام عجمی اطباء سے، جن کی فہرست ڈاکٹر فانڈیک صاحب نے اپنے ایک مضمون "اطبا شرق" (المقتطف سنہ ۱۹۳۲ء) میں پیش کی ہے، جاہلی عربوں نے علم طب سیکھا تو ضرور، لیکن اس قسم کے سیکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، یمن میں، جو عرب کا متمدن حصہ تھا، بیشک بہت سے اس قسم کے اطباء تھے جو اپنے فن میں کمال رکھتے تھے اور باقاعدہ متمدن قوموں سے، دیگر طبی تعلیم پا چکے تھے، لیکن حجاز و نجد وغیرہ میں اس قسم کے تعلیم یافتہ طبیب بہت کم تھے، عرب میں شعر و شاعری ہی کا زیادہ چرچا تھا۔ طب یا اس قسم کے دوسرے علوم نے ان کے درمیان کم شہرت حاصل کی تھی۔

غیر قوموں سے جاہلی اطباء نے کیا سیکھا

اس عنوان کے متعلق کوئی مستند تفصیلی بیان ہمارے پاس موجود نہیں ہے لیکن تاہم اس سے ہر شخص یقینی طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ قدیم عربوں نے ہندوؤں سے ویدک طب اور ایرانیوں سے یونانی طب کے مسائل اور نسخے حاصل کئے، ایرانیوں سے جس زمانہ میں عرب فیضیاب ہوئے، اسوقت تھیوڈوس نے اپنا یونانی طب اس طرح ان کے ملک میں پھیلا دیا تھا کہ ان کا آبائی اور موروثی طب اس کے سامنے بالکل دب گیا تھا، اس بنا پر عربوں نے جو کچھ ایرانیوں سے حاصل

وہ یقیناً یونانی ہی خیالات تھے۔ سریانیوں کے پاس بیشک دونوں قسم کا طب تھا یعنی ان کا آبائی طب اور یونانی طب جو ایران کی طرح ان کے ملک میں بھی پھیل گیا تھا لیکن اس کے مقابلہ میں ان کا آبائی طب بھی محفوظ و برقرار تھا۔ قدیم عرب اطبا نے ان سے دونوں قسم کے طبی خیالات حاصل کئے۔

عربی اطبا کے بعض مقولے ایسے ہیں جن کے اندر اس قسم کے خیال ظاہر کئے گئے جو یقیناً عجمی اطبا کے حلقۂ درس میں بیٹھکر یا کم از کم ان سے اتفاقی طور پر حاصل کئے گئے تھے بلوغ الارب جلد ۳ میں حارث بن کلدہ ثقفی اور کسریٰ نوشیرواں کا ایک مکالمہ مذکور ہے، نوشیرواں نے اس عرب طبیب سے متعدد باتیں پوچھنے کے بعد استفسار کیا کہ انسانی جسم فطرۃً کتنی اشیاء سے مرکب ہے، حارث نے جواب دیا کہ "جسم چار قسم کے اخلاط سے مرکب ہے، سودا، صفرا، خون، بلغم، ان میں سے سودا طبعاً سرد و خشک ہے، صفرا گرم و خشک، خون گرم و تر، اور بلغم سرد و تر ہے جسم اگر بجائے چار اخلاط کے ایک ہی خلط پر مشتمل ہوتا تو اسے کھانے اور پینے کی ضرورت بالکل نہ پڑتی اور نہ اسے کبھی بیماری لاحق ہوتی اور نہ موت جسم کا دو خلطوں سے مرکب ہونا بھی ناممکن تھا کیونکہ دو خلط آپس میں ایک دوسرے کے متضاد ہوتے اور ان میں دائمی مخالفت کی بنا پر اتحاد کا پایا جانا محال تھا۔ اسی طرح جسم کا تین خلطوں سے مرکب ہونا اس بنا پر نامناسب تھا کہ دو موافق اور ایک مخالف خلط اعتدال کے لئے موزوں نہ ہوتے۔ محض چار خلط کی باہمی ترکیب میں اعتدال قائم رہ سکتا ہے۔"

اس کے بعد جب کسریٰ نے اس سے درخواست کی کہ گرم و سرد اشیا کی مختصر اور جامع الفاظ میں تفصیل بیان کرو تو اس نے کہا کہ "تمام میٹھی چیزیں گرم، کھٹی چیزیں سرد، اور تیز اور نہایت کاٹنے والی چیزیں بھی گرم ہوتی ہیں لیکن کڑوی چیزیں معتدل ہوتی ہیں ان میں جتنی گرمی ہوتی ہے اتنی سردی بھی ہوتی ہے۔ صفرا کے علاج کے لئے بہترین دوا وہ ہے جو سرد و تر ہو، سودا کے علاج کے لئے وہ جو گرم و تر ہو۔ بلغم کے علاج کے لئے وہ جو گرم و خشک ہو۔ خون جب حد سے زیادہ ہو جائے تو اسے نکلوا دینا چاہئے اور جب حد سے زیادہ گرم ہو جائے تو . . . . سرد و خشک اشیاء سے اسے بجھا دینا چاہئے۔ ریاح کے اخراج کا طریقہ یہ ہے کہ حقنہ لیا جائے یا گرم و تر تیل کی مالش کی جائے۔ حقنہ بہت مفید چیز ہے میں نے بعض حکما کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ حقنہ پیٹ صاف کرتا ہے اور اس سے تمام امراض دفع ہوتے ہیں۔ حقنہ لینے والے کی جوانی مدت مدید تک برقرار رہتی ہے اور وہ بے اولاد نہیں رہ سکتا۔"

ان دونوں مقولوں میں حارث بن کلدہ کی تمام باتیں ابتدا سے اخیر تک اس قسم کی ہیں جو یقیناً اس کے ذاتی تجربات نہیں تھے بلکہ یہ فی الحقیقت یونانی طبیب تیموڈورکس کے ایرانی شاگردوں سے سنے ہوئے خیالات تھے جنہیں اس جاہلی طبیب نے ان کی صحبت میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ یہ مقولے اس موقع پر اس شخص کے شک کے ازالہ کے لئے بھی کافی ہیں جو مذکورہ بالا ہندی، ایرانی، اور سریانی اطبا کی فہرستیں دیکھ کر کہہ دے کہ یہ سب فرضی نام ہیں اور جاہلی عرب

غیری قوموں کے اطباء سے ہرگز فیضیاب نہیں ہوئے۔ حارث کا یہ کہنا کہ "میں نے بعض حکماء کی کتابوں میں پڑھا ہے الخ"
اس امر کا بین ثبوت ہے کہ جاہلی عرب نے اعاجم کے طبی خیالات سے فائدہ اٹھایا۔

عرب جاہلین کا ذاتی طب اور انکے تجربات

جاہلی عربوں کا ذاتی طب بہت وسیع نہیں تھا بعض چند معدود اشخاص پر تجربہ کرکے لوگوں نے امراض اور ان کی خاص خاص مفرد دواؤں کا علم حاصل کرلیا تھا۔ اس قسم کی دوائیں اور علاج کے طریقہ قبیلہ کے بوڑھے اور بوڑھیوں میں نسلاً بعد نسلاً منقول ہوتے رہے اور ان میں کسی زمانے میں کسی شخص نے بھی اپنی ذہانت اور شوقِ تحقیق کی بدولت کوئی معتد بہ اضافہ نہیں کیا۔ علاوہ بریں ان دواؤں سے تمام لوگ واقف نہیں ہوتے تھے بلکہ محض مسن اشخاص انھیں جانتے تھے اور دوسروں کو تبلاتے تھے۔ اس قسم کی دوائیں جاننے والے طبیب کی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ معمر اشخاص جس طرح بہت سی مختلف قسم کی دوسری باتیں بچوں اور جوانوں سے زیادہ جانتے تھے اسی طرح امراض اور انکے علاج کے متعلق بھی ان سے زیادہ واقف ہوجاتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں "طبیب" کا اطلاق زیادہ تر اسی شخص پر ہوتا تھا جو ان تجربات کے علاوہ غیر قوموں کے طبی مسائل سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرلیتا تھا خواہ یہ شرف اسکو عجمی اطباء سے بغیر واسطہ حاصل ہوتا خواہ بالواسطہ کیونکہ اس عہد میں جو عرب اعاجم کے طبی امور سے آشنا ہوجاتے تھے وہ بسا اوقات انھیں اپنے خاندان والوں یا اپنے دوستوں کو بھی تبلاتے تھے۔

امراض کے متعلق اس قسم کے ذاتی تجربات انکے یہاں بہت کم تھے اور انھیں کم ہونا ہی چاہیے تھا، کیونکہ زمانہ اسلام کے پیشتر سوائے یمن کے عربستان کے تمام بقیہ حصہ میں تمدن کا وجود بہت کم تھا اور علم طب کی ترقی محض تمدن پر منحصر ہے یونان میں طب نے محض تمدن کے پہلو بہ پہلو ترقی کی۔ تمدن ہر قسم کے حاجات و ضروریات کا موجد ہے اور حاجات و ضروریات کے احساس کے بغیر طب یا اس قسم کے دوسرے علوم کا اوج کمال کو پہونچنا غیر ممکن ہے۔ شعر و شاعری اور موسیقی جو انسان کے فطری ذوق کے ماتحت ہیں، بیشک تمدن کے ظہور کے پیشتر ہی عالم وجود میں آجاتی ہیں لیکن علوم طبیعیہ کسی قوم کے وحشی ہونے کی حالت میں ہرگز فروغ نہیں پاسکتے۔ اسی بنا پر عربستان قدیم میں شعراء اور خطیب تو بکثرت پیدا ہوئے لیکن طب کے شیدائی محض خال خال اشخاص رہے۔

جاہلیت کی مفرد دوائیں زیادہ تر وہ اشیا تھیں جو اس ملک میں عام طور پر پیدا ہوتی تھیں مرض سے شفا حاصل کرنے میں زیادہ تر کھانے پینے کی چیزوں سے کام لیا جاتا تھا اور تاوقتیکہ انتہائی مجبوری نہ پیش آتی، ان کو چھوڑکر دوسری چیزیں استعمال نہ ہوتیں۔ اس قسم کی دواؤں میں زیادہ مروج شہد، کھجور، اونٹ گھوڑے، گائے، بھیڑ، بکری، اور ہرن کا گوشت اور دودھ، زیتون کا تیل، مچھلیاں وغیرہ تھیں۔ غیر ماکولات کے ضمن میں برگ سنا، اذخر، حنا، ورس، زعفران ہند، شبرم، اور تاکول قابل ذکر ہیں۔

اہلِ جاہلیت شہد کا استعمال زیادہ تر مسہل کے طور پر کرتے تھے۔ اس سے ان کے اخلاط فاسدہ آسانی کے ساتھ جسم سے خارج ہو جاتے تھے اور انہیں وہ زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی جو مسہلات قویہ کے استعمال کے موقع پر پیش آتی ہے۔ اسہال اندملین کے واسطے شہد، مر اور بگ سنا کا استعمال بھی شائع و ذائع تھا

بخار کا علاج ٹھنڈی دواؤں کے ذریعہ سے عمل میں آتا تھا۔

ذات الجنب کے موقع پر مریض کو عود ہندی، کمنہ اور ورس (زعفران ہندی) کا مرکب پیس کر پلا دیا جاتا تھا۔

بصارتِ چشم کے تحفظ کے لئے سنگِ اثمد کا سفوف آنکھوں میں لگایا جاتا تھا۔ احول (بھینگا) شخص کی کج نظری کے ازالہ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ بار بار چھت پر بیٹھی ہوئی چیل کے پاس کی طرف دیکھے۔ اس طرح کی ایک عرصہ کی مشق کے بعد اس کی نظر سیدھی ہو جائے گی۔

پہلو میں نکلنے والی پھنسیوں کی دوا لعاب دہن تھا جسے وہ ان پر خوب اچھی طرح بار بار لگاتے تھے۔ جاہلی اطباء چونے کے غسل کے بہت زیادہ قائل تھے۔ حارث بن کلدہ کہتا ہے "تم ہر مہینہ چونے کا غسل کیا کرو کیونکہ اس سے بلغم دور ہو جاتا ہے، صفراء مر جاتا ہے اور گوشت بڑھتا ہے۔" اس غسل کا طریقہ یہ تھا کہ چونا اور ہڑتال پانی میں ڈال کر تھوڑی دیر دھوپ میں چھوڑ دیتے تھے، جب وہ خوب پک جاتا تھا تو اسے تمام بدن پر ملتے تھے اور تھوڑے وقفہ کے بعد غسل کرتے تھے۔ غسل کے بعد بدن پر حنا (مہندی) لگاتے تھے تاکہ چونے کی اذیت کا اثر زائل ہو جائے۔

جاہلیت کی جراحی

عرب جاہلیت کے درمیان معمولی جراحی بھی قدرے قلیل رواج پا گئی تھی۔ زخموں کی مرہم پٹی کی جاتی تھی۔ افراط خون، فساد خون اور دوسرے امراض دمویہ کے لاحق ہونے کے وقت فصد اور پچھنے لینے کا عام دستور تھا۔ عرب کی گرم آب و ہوا کے تقاضا کے مطابق پچھنہ بہ نسبت فصد کے زیادہ مرجح سمجھا جاتا تھا اور اس کا بہترین وقت ان کے نزدیک مہینہ کا وہ حصہ تھا جس میں چاند پورا ہونے کے بعد گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، بدلی کے دن میں یا طبیعت کے مکدر ہونے کے وقت پچھنہ لینے سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ گرم سلاخ سے بیمار کو داغنے اور اس طرح مرض کو دفع کرنے کا رواج بھی عام تھا۔

جاہلیت کا علم تشریح

اگرچہ کسی مورخ نے اس بات کا ہرگز نہیں دعویٰ کیا کہ جاہلی عرب تشریح کی معلومات سے بھی بہرہ ور تھے تاہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں اعضاء باطنی کے نام کہاں سے پیدا ہو گئے۔ سوائے لاطینی اور یونانی کے کسی دوسری زبان میں اعضائے باطنی کی اس قدر تفصیل نہیں ہے جیسی کہ عربی میں ہے۔ اعصاب، اوردہ، شرائین، دماغ کے مختلف حصوں، عضلات، وغیرہ کے واسطے ان کے ہاں الگ الگ الفاظ موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان الفاظ

ساجتیں سے اس قسم کے ہیں جن کو عربوں نے زمانہ مابعد میں یونانی علوم سے آشنا ہونے کے بعد وضع کیا یا مصطلح قرار دیا تھا، لیکن ان کا بیشتر حصہ عہدِ جاہلیت ہی میں موجود تھا۔ مشہور لغت نویس ابو عبداللہ محمد اسکافی نے اپنی کتاب "خلق الانسان" میں تمام جسمانی ظاہری و باطنی اعضا اور ہڈیوں وغیرہ کو مفصل طریقہ سے بیان کیا ہے اور مصنفِ بلوغ الارب کے بیان کے مطابق، ان تمام کے ہر علٰحدہ علٰحدہ نام پر جاہلیت کے اشعار سے سند پیش کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام معلومات جانوروں کے جسم کو چیر پھاڑ کر حاصل کی گئی تھی . . . .

. . . . گو عرب بہائم کو اس لئے چیرتے پھاڑتے نہیں تھے کہ ان سے تشریحی واقفیت حاصل کریں بلکہ محض ان کا گوشت کھانے کے واسطے ایسا کرتے تھے۔ تاہم اس قسم کی دائمی عادت نے انھیں اس امر پر مجبور کیا کہ وہ ہر ہر عضو و ہڈی وغیرہ کے واسطے الگ الگ لفظ وضع کریں۔ بہرحال قدیم عربوں کو ایک حد تک تشریحی واقفیت حاصل تھی خواہ کسی طریقہ سے حاصل ہوئی ہو۔

جاہلیت کا طب بیطری

اہل جاہلیت اونٹ اور گھوڑے بکثرت پالتے تھے۔ ان کی وہ نگہداشت کرتے تھے جو خود اپنی نہیں کرتے تھے۔ انکے بہت سے اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ان بہائم کو اپنے اعزا و اقربا کے برابر بلکہ ان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس امر کے ہوتے ہوئے انکے متعلق یہ تخیل قائم کرنا سراسر ظلم ہوگا کہ وہ انکے امراض و علاج سے ناواقف تھے۔ سید محمود شکری کا بیان ہے کہ عرب جاہلیت اونٹ گھوڑے، گدھے، خچر، وغیرہ کے امراض و علاج سے کامل واقفیت رکھتے تھے (بلوغ الارب جلد ۲ ص ۳۳۵) ایک اور مقام پر وہ فرماتے ہیں کہ مجھے عربوں کے طب بیطری کے عنوان پر بغداد کے ایک کتبخانہ میں ایک نادر کتاب دستیاب ہوئی جو اگرچہ اغلاط سے خالی نہیں تھی۔ تاہم اس سے بہت سی مفید باتیں اخذ کیں۔ "کتاب الخیل" مصنفہ ابو عبداللہ محمد اسکافی میں بھی اس عنوان پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بعض متداول اشعار ایسے ہیں جن میں انکے اونٹوں کے امراض اور انکے علاج کا حوالہ ملتا ہے مثلاً اونٹوں کی چیچک کا تارکول کی مالش سے علاج کرنا اشعار میں بکثرت مذکور ہے۔

جاہلیت کے طبی اوہام

دوسری وحشی قوموں کی طرح، عرب جاہلیت بھی طبی اوہام سے بری نہ تھے۔ بلوغ الارب وغیرہ میں ان کے اس قسم کے خیالات فاسدہ بہت سے اشعار سند میں پیش کئے گئے ہیں۔ جنھیں یہاں نقل کرنا تطویل لاطائل ہے قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے نہایت اختصار کے ساتھ ہم ان کے چند طبی اوہام یہاں قلمبند کرتے ہیں۔ (باقی)

اورنگ زیب انشائے مادھورام کی آئینہ میں

ہندو مسلم اتحاد و اعتماد کا مبارک دور

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب نجیب آبادی

مولوی ایوب صاحب نجیب آبادی اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مجلد کتاب مرتب کر رہے ہیں اس کا سرسری تذکرہ فاران ماہ جولائی ۱۹۳۱ء میں ان کے ایک مضمون کے ضمن میں کیا جا چکا ہے یہ مضمون اسی زیر تصنیف کتاب سے ماخوذ ہے۔ ناظرین اس مضمون کو دلچسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھیں گے۔ فاران

منشی رام سب سے پہلے نواب لطف اللہ خاں پسر سعد اللہ خاں مرحوم وزیر اعظم شاہجہانی کی سرکار میں میر منشی تھا پھر اسکے بعد نواب کوکلتاش خاں کا میر منشی رہا پھر شاہزادہ جہاندار شاہ کی سرکار میں اس کی تخت نشینی کے زمانہ تک میر منشی کے عہدے پر مامور رہا۔ مادھورام بھی میر منشی چندربھان برہمن رائے وبندرابن کی طرح اعلیٰ قابلیت کا مالک اور خوش گو شاعر تھا بلکہ مادھورام عربی زبان میں مقدم الذکر ہر سہ مورخین کے مقابلہ میں قابل و برتر تھا۔ اس زمانہ کے میر منشی جن کو نہایت اہم مراسلہ اور فرامین لکھنے پڑتے تھے لازماً اپنے پاس ایک پرائیوٹ رجسٹر یا نوٹ بک رکھتے تھے جس پر اول مضمون کا مسودہ تیار کرتے اور ترمیم و تنسیخ کے بعد جب مضمون مکمل ہو جاتا تو اس کو اصل کاغذ پر خوشخط اور باقاعدہ نقل کرتے یہ مسودات کی پرائیوٹ کتاب ان کے پاس رہتی تھی اور دفتر کی سرکاری کتاب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ انہیں مسودات کی کتابوں سے بعض میر منشیوں نے مستقل کتابیں منشیات کی ترتیب دے کر شائع کیں۔ رقعات ابوالفضل انشائے طاہر وحید اسی قسم کی کتابیں ہیں۔ منشی مادھورام نے بھی اپنے ایک عزیز لالہ ہرپرشاد صاحب کی فرمائش سے ایک کتاب منشیات مادھورام جو انشائے مادھورام کے نام سے مشہور اور اب سے چند روز پہلے تک درسی کتابوں میں شامل تھی ترتیب دی اس کتاب کو مرتب کرنے کے وقت ان کی بہت سی یادداشتیں . . . . ضائع بھی ہو چکی تھیں بالخصوص جہاندار شاہ کے زمانہ کی تمام یادداشتیں بادشاہ گردی یعنی انقلاب سلطنت کے ہنگامہ میں برباد ہو گئیں۔ اس لئے جہاندار شاہی فرامین کی مسودات انشائے مادھورام میں شامل نہ ہو سکے۔ انشائے مادھورام میں دو فصلیں قائم کی گئی ہیں پہلی فصل میں وہ تمام تحریریں جو نواب لطف اللہ خاں اور نواب کوکلتاش خاں کی طرف سے لکھی گئیں مندرج ہیں دوسری فصل میں وہ تحریریں جو منشی مادھورام نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے نام لکھیں موجود ہیں یہ کتاب محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں مرتب و مدون ہوئی۔ لیکن اس میں بہت سی باتیں ایسی موجود ہیں جو عہد عالمگیری پر روشنی ڈالتی ہیں اور نواب لطف

نواب کوکلتاش خاں کے لکھائے ہوئے خطوط اورنگ زیب کے نظامِ حکومت اور ہندو اہلکاروں اور صوبہ داروں
پیشتر کی حکومت پہلے اور ان کے متعلق شاہی اعتماد کی نسبت ناقابلِ رد ثبوت اور نہایت زبردست شہادت بہم پہونچاتے ہیں

نواب لطف اللہ خاں اورنگ زیب کی طرف سے بیجاپور کے صوبہ دار تھے انکے ماتحت مان سنگھ راٹھور راجگڈھ
کا قلعہ دار تھا۔ مان سنگھ کے نام نواب لطف اللہ خاں کی طرف سے ادھورام نے ذیل کا خط لکھا۔

"تہور پناہ جلادت دستگاہ مان سنگھ راٹھور محفوظ باد۔ پیش ازیں حسب الحکم والا دریافت بہم رسانیدن
دزدان کہ مصدر رہزنی بودہ در شاہراہ ڈالی میوہ از کہاران ربودہ اند صادر شدہ و ہنوز تدارک عمل نیامدہ
حکم محکم نافذ می شود کہ پنبۂ غفلت از گوش ہوش برآوردہ مرتکبان را تفحص و تجسس پیدا ساختہ بیا سازند و بنابر
عبرت دیگران لاشہائے آناں بر درختان شاہراہ آویختہ سر و صدا ردد الا بتغیر منصب و خدمت معاتب
خواہد شد۔"

مذکورہ تحریر سے اول تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دکن کے نو مفتوحہ علاقہ بیجاپور کے ایک نہایت اہم قلعہ کی قلعہ داری
عالمگیر نے ایک راجپوت مان سنگھ راٹھور کو سپرد کی تھی اگر عالمگیر ہندوؤں سے ایسا ہی بدگمان تھا جیسا کہ آجکل کہا جاتا ہے تو کم از کم
راجگڈھ کے قلعہ کی قلعہ داری مان سنگھ کو ہرگز سپرد نہ کرتا۔ جہاں بسا اوقات اسکے مرہٹوں اور دکن کے غالب ہندو جنگجو آبادی
سے ملجانے اور سازش کرنے کا قوی احتمال ہوسکتا تھا۔ دوسرے عالمگیر کے چوکس اور ہر حصہ ملک کے چھوٹے بڑے
حالات سے واقف و آگاہ رہنے کا اندازہ ہوتا ہے کہ چوروں یا ڈاکوؤں نے کہاروں کو جو ڈالی لیجا رہے تھے لوٹ لیا تھا
اور ان چوروں یا ڈاکوؤں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ تو قبل اس کے کہ بیجاپور کے صوبہ دار نواب لطف اللہ خاں
کو علم ہوا اور وہ کچھ تدارک کریں۔ عالمگیر کا فرمان ان کے نام پہونچ گیا کہ مان سنگھ کو جس کے علاقہ میں رہزنی ہوئی ہے
توجہ دلاؤ کہ راستہ کے امن کو قائم کرے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ عالمگیر مان سنگھ قلعہ دار کو خود بھی براہ راست
اطلاع دے سکتا اور تنبیہ کرسکتا تھا لیکن اس نے قلعہ دار کے بجائے صوبہ داری کو مخاطب کیا اس لئے کہ صوبہ دار
اعلیٰ افسر اور تمام صوبہ کا مہتمم تھا۔ نیز یہ کہ خود صوبہ دار کو بھی تنبیہ ہوگئی کہ وہ جس چیز سے بے خبر رہا بادشاہ اس سے باخبر ہوگیا۔

عالمگیر نے جب بذاتِ خود ملک دکن میں پہونچکر وہاں کے سرکشوں کو رام کرنے اور اس ملک کے قلعوں کو فتح کرا
کا سلسلہ جاری کیا تو اس کے لشکر میں بہت سے راجپوت اور راجہ مہاراجہ موجود تھے۔ دکن کی لڑائیوں کا سلسلہ کسی قدر
طویل ہوا تو بعض راجاؤں نے رخصتیں طلب کیں منجملہ انکے ایک راجہ کشن سنگھ تھے۔ راجہ کشن سنگھ کی درخواست رخصت
جواب بادشاہ نے خود نہیں دیا بلکہ منشائے شاہی کے موافق نواب کوکلتاش خاں نے ادھورام سے خط لکھوایا یہ خ
انشائے ادھورام میں موجود ہے اس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ تم کو اپنا وطن یاد آیا ہے اور وہاں کے انتظام کے لئے
رخصت طلب کرتے ہو لیکن یہ یاد رکھو کہ وطن کا امن و اطمینان اس کام پر منحصر ہے جس کو تم یہاں انجام دے رہے

اس عرصہ میں کام اودا اپنے فرائض مفوضہ میں پوری مستعدی کے ساتھ مصروف رہا اس جواب کو سن کر راجہ کشن سنگھ بد دل ہوا نہیں ہوا بلکہ پہلے سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ مصروف کار رہا۔ چند دنوں کے بعد رحمت خاں کی سفارش لے راجہ کشن سنگھ کو رخصت مرحمت کرادی مدت رخصت جب ختم ہوئی تو نواب کوکلتاش خاں کی طرف کشن سنگھ کو ان الفاظ میں اودھو رام نے لکھا

"قدر و منزلت آن عمدہ راجہای نمایش زہ و فدویان خیر اندیش شہامت و صرامت مرتبت بہور جلادت منزلت سیکا نعمت آلہی والطاف بے اکناف بادشاہی روز افزون باد۔ چون حضور رخصت آن عمدہ راجہای بلند مکان بساجت و لیاقت تو رو بو میثان والاشان رحمت خان بنا بر انتظام محال وطن از نیکا فضل واحسان میسر آمدہ بود معا منقضی شد ... عنقریب شد کہ چون در یساق با خیل کفرہ و شاق ہر وقت محاربات واقع اتفاق می افتد مرضی حضرت خدیو آفاق مطلوب است و بسرعت و عزیمت بمکان تعیناتی بر تسبیح امور مقدم انگاشتہ بجرد ورود حسب الامر ... زود و شتاب بسر سانند والا عتاب بادشاہی کہ نمونہ غضب الٰہی است متوجہ خواہد شد باید کہ بر وفق مرقوم عمل آرند"

راجہ رام ناتھ کو بادشاہ نے کسی شہزادہ کے ہمراہ دکن سے شمالی ہند کی طرف جانے کا حکم دیا رام ناتھ کے کارہائے نمایاں سے بادشاہ بہت خوش تھا یہ رام ناتھ بادشاہ کا معتمد ... اور بادشاہ کے اشاروں پر کام کرنیوالا شخص تھا رام ناتھ کی یہ جدائی بادشاہ اورنگ زیب کو بہت محسوس ہوئی۔ قلعہ ... کے محاصرہ کے وقت بادشاہ نے فرمایا کہ رام ناتھ اس وقت موجود ہوتا تو خوب ہوتا۔ چنانچہ نواب کوکلتاش کی طرف سے اودھو رام نے راجہ رام ناتھ کو خط لکھا کہ

"الطاف سبحانی و اعطاف حضرت ... روز کا خجستہ آثار آن مقتدائے مبارزان خدیو گیہان مہوائے بیش قدر ... جان عمدہ ... بندگان زبدۂ نوئیان والاشان باد۔ خبر روانہ شدن آن عمدۂ راجہا بر طبق حکم قضا ... کہ بہ سپہر سلطنت علیا معروض واقفان انجمن فیض ما واگردید موجب انشراح خاطر ... بر زبان عالی گذشت کہ آن نوئین والاتمکین بمرا جدائی حضرت قدر قدرت ... کہ در یساق قلعہ ... کار پادشاہی در پیش است ہر چند کہ خود را بتعلقہ تعیناتی زود و شتاب رسانند مجرائی عظیم خواہد شد و برائے پیش آمد و افزایش مراتب و مناصب استحکام مہام وطن بسیار مفید است باید کہ حسب الارشاد عمل آرند"

الشائے اودھو رام میں بہادر شاہ کی وفات کے بعد شہزادوں کی زور آزمائی اور جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے حالات اودھو رام نے خوب لکھے ہیں لیکن چونکہ وہ عالمگیر کے عہد کا زمانہ ہے اس لئے اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔ خود اودھو رام نے اپنے ہم چشم مسلمان دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے اس زمانہ کے خوشگوار دلربا ہندو مسلم اتحاد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ بخوف طوالت جو لکھا جا چکا ہے اسی کو کافی سمجھا گیا۔

ہماری زبان کا نام

"اُردو" کے بجائے "ہندوستانی" رکھا جائے

ذیل میں ہم علامہ سید سلیمان ندوی کا وہ مقالہ بجنسہٖ درج کرتے ہیں جو علامہ موصوف نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں پڑھا تھا۔ آپ نے اس مقالہ میں نہایت فاضلانہ انداز سے یہ ثابت کیا ہے کہ "اُردو" کا اصلی اور حقیقی نام عہد سلطنت میں "ہندوستانی" تھا "اُردو" بعد کی اختراع ہے۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ آج ہم اسے بجائے "اُردو" کے "ہندوستانی" ہی کے نام سے موسوم کریں۔

چونکہ اس وقت اُردو اور ہندی کا مسئلہ نہایت تلخی کے ساتھ چھڑا ہوا ہے اور "اُردو" کے نام کے ساتھ جو "اجنبیت اور غیر ہندوستانیت" پائی جاتی ہے وہ قوم پرور عنصر کو ناگوار گزرتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عام حامیانِ اُردو بالعموم اور مسلمان بالخصوص اس مقالہ کا ٹھنڈے دل کے ساتھ تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر مطالعہ کریں۔"

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی اُن کا خمیر اُٹھتے، مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑنے صدیاں لگتی ہیں۔

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے "ہندوستان" کہہ دیتے ہیں، اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحرِ شور کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس کا نہ یہ نام تھا اور نہ یہ اس کی وسعت تھی اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایک ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہو کر بنگال، مدراس اور بمبئی کے کناروں پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پوری قوم کے لئے جس نے آج اپنے کو "ہندو" کے نام سے ایک قوم بنا لیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام "سندھو" تھا۔ اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں "ہ" اور "س" کا باہم مبادلہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح سندھو ہندھو اس ملک کے دوسرے بحری ہمسایہ کی زبان میں دو لفظ تھے، "السند والہند" کشمیر کی ترائی سے لیکر موجودہ سندھ کے کنارے تک کو وہ سندھ، اور گجرات اور لاڑ سے باقی اندرونی ملک کو وہ ہند کہتے تھے۔ اس ہند نے یورپ جا کر انڈ کی اور انڈ نے انڈیا کی صورت اختیار کر لی، ہند والوں کو عرب "ہندی" اور خراسانی "ہندو" کہتے تھے۔ اور عرب ہندی کی جمع "ہنود" اور خراسانی "ہندوان" بناتے تھے،

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہلِ عرب نے اس ملک کو ہند کا، اور اہلِ خراسان نے ہندوستان کا نام دیا، نخلستان، جگہ یا زمین کے لئے فارسی اور سنسکرت دونوں میں بولتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان ہندو استھان بھی ہو سکتا تھا۔

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی۔ ہر صوبہ کی بولی الگ الگ تھی۔ لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا، یعنی ہندی یا ہندوی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس سرزمین کے ایک ملک کا ایک نام ہند یا ہندوستان اور یہاں کی رہنے والی قوموں کا ایک نام ہندو، اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، اور حقیقت میں یہ مسلمانوں ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک قوم اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا۔

اس ملک میں عرب، عربی، ایرانی، فارسی، اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر تتلا تتلا کر یہیں کی سی کوئی زبان بولنے لگے۔ جس کا نام انھوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی۔ اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اسکو گجری دکھن میں دکھنی، اور اودھ میں اودھی کہنے لگے۔ لیکن صوبہ واریوں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا۔ میں نے آج سے چند سال پہلے یہاں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا اس میں ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کئے ہیں۔

شاہجہاں کے زمانہ میں جب دہلی شاہجہاں آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لئے ترکی لفظ "اردو" "اردوئے معلیٰ" کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا۔ اور صوبہ واری دیسی بولیوں کے لئے اس اردوئے معلیٰ کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کے ساتھ "زبانِ معلیٰ" کہنے لگے۔ اور آج سے کوئی سو ڈیڑھ سو برس پہلے زبانِ اردوئے معلیٰ کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبانِ اردو" یعنی اردو کی زبان بنی اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر "اردو" ہوئی۔

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پالسے پھینکے دوربینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جدوجہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کا تمدن، جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی اس کو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کئے جانے کے لئے کوششیں شروع کیں اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو زبانیں بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے منشی اور مولوی نوکر رکھ کر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر لیا۔ ابھی اٹھارہویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو اور ہندی

چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے اس لئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس
(۱) اس زبان کے دو پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں زیادہ تر ہندی یا ہندوی اور اس کے بعد ہندوستانی (۱)
کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں،
یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے جس کے بہت سے سبب ہیں، ان میں سے ایک ایک
لئے سازش کی جا رہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے۔
مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے ہے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ ان کو دھوکا دینے کے
نام ہے جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی تاکہ یہ زبان پورے ملک کی مملکت کا دعوی کر سکے
کے صحن و ایوان میں محدود ہو گئی تھی اس کو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اس وقت کا
کا نام "اردو" کے بجائے جو اٹھارہویں صدی کے آخر کی ایجاد ہے۔ جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اردوئے معلی
یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان
کے میدان کو چھوڑ کر صرف اردوئے معلی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔
ان کے حوالے کر دیا۔ اور اپنی زبان کی پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے۔ اور اس طرح سارے ہندوستان
معنی میں اتنا انہوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گئی اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیرت برتی، اور خوشی سے یہ نام
کہتے تھے، ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور خاص رسم الخط کو ہندی کہنے لگے۔ اور اس نام کو اس زبان کے
بہر حال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کو جس کو ہم بولتے ہیں اور جس کو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی
قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو۔
کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک بڑھایا کہ وہی ہمارے دیس کی زبان ہو، اور جو ہندو مسلمان دونوں
لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھدار ہندو اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال
ملک کی زبان بنا دی جائے۔
کہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس صوبہ کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں کبھی لکھی تھیں وہی پورے
صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اردو خط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی ہے
اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی، اور بعض
ایسی تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہئے۔ اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کامیاب ہوئی
ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے
کے وہ خاکی پتلے والی سپاہ بنکر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے۔

کے لئے خاص کرنا چاہئے۔ جس کو اب غلطی سے عام طور سے اُردو کہنے لگے ہیں۔

(۲) دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے جو اس کو بولتی ہے یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے۔ اسی اصول کی بنا پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی، انگلستان کی انگلش، فرانس کی فرینچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے ہندوستانی کا نام دینا

(۳) ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے جس کو اس زبان سے نسبت ہے۔ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے، جس سے اس کے مبہم موہوم کی کہانی معلوم ہو۔ لفظ "اُردو" سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن انسانی کو نہیں ملتی اس لئے اس کی جگہ اس کے اصلی نام "ہندوستانی" کو رواج دینا چاہئے۔

(۴) ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے۔ لفظ اُردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس کے ہندوستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے اور اس کے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر نفسیاتی اثر سے ہمارے اندر اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

(۵) اس زبان کو ایک غیر معین بدیسی لفظ سے موسوم کہنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جیسا بدیسی نام ہے ویسی ہی بدیسی زبان بھی ہوگی، اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، یہ نقص ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے۔

(۶) ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہئے جس سے ملک کے ہر صوبہ کو برابر کی حیثیت ہو، تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعوی کر سکے، لفظ اُردو میں یہ بات نہیں، یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے، جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے، اور سب کو اس سے یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے، اور کسی صوبہ میں وہ اجنبی اور بیگانہ نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

(۷) لفظ اُردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ چھپی ہوئی ہے جس سے مرعوبیت کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ ابھرے گا۔

(۸) اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں

ہے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی اس لئے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے
تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہمیشہ یاد رہے ،

۹ ۔ لفظ اُردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراسان سے کوئی بولی لے کر یہاں آئے تھے، جس کو ترکی میں اُردو کہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں، اور یہ وہ بولی ہے جس کو انھوں نے ہندوستان آکر اختیار کر لیا، یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے، اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہ دور ہو جاتا ہے ،

۱۰ ۔ اس زبان کو اُردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین اس کی صرف و نحو کو عربی و فارسی کی صرف و نحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے، اور انھوں نے اس غلط طریق و روش کی بنا پر بہت سی غلطیاں کیں، اور اس کے جوڑوں کو عربی فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے، گو اب ہماری زبان کے نئے نحویوں نے اس غلطی کو ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں اتری ہے، اب اسکو عام طور سے ہندوستانی کہہ کر پکارنے سے اس زبان کی صرفی و نحوی، اور لغوی تحقیقات کا رُخ ایران و خراسان و ترکستان کی طرف سے مڑ کر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائے گا، اور اس سے زبان کی اصولی و لغوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی ۔

۱۱ ۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعویٰ کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے، اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اُسکے دعویٰ کی بنیاد کو کھوکھلی کر رہے ہیں ،

۱۲ ۔ چونکہ شروع شروع میں پرتگالی، یا ہسپانی اور پھر دوسرے یورپین یہاں آئے، بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم میں سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقالہ میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہے، فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق ہے کہ "تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد"، شاہجہان کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے "بہ نغمہ سرائی ہندوستانی زبان" تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس لئے یہ شبہ دور ہو جانا چاہئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے، بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا، اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہئے ۔

۱۳ ۔ اہل نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امن دہلوی سے لے کر سرسید بلکہ آزاد مرحوم تک کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری، جیسا کہ میر امن کا بیان ہے ۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، جب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی

کی من کر حضور میں جمع ہوتے، لیکن ہر ایک کی گویائی و بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین
سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی،

جب حضرت شاہجہاں صاحب قِران نے شہر دہلی کو پایۂ دار الخلافت بنایا اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا
سر سید نے بھی حکایت شاہجہاں کے عہد کی نسبت لکھی ہے، اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں
میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب صرف لفظ اردو ہے، اس نام کو باقی رکھنا اس غلطی
کو باقی رکھنا اور اس کی اصلی تاریخ کو جو اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے۔

(۴) بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نے اپنی آپ بیتی میں "ہندوستانی زبان" کی اکثریت
کو تسلیم کیا ہے، اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کی تجویز منظور ہو چکی ہے
اور ان سب سے مراد "ہندی" ہے، اس لئے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں، اس لئے ہم کو اس لفظ سے پرہیز
کرنا چاہیئے،

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام
"ہندی متعارف" تھا، سر سید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں اردو کے لئے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی
کو ہندی کہتے تھے، ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام سے ملکیت کا دعویٰ اٹھا لینا پڑا، اب ایک
لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا، جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اسکو بھی چھوڑ دینگے تو دوسروں
کے قبضۂ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا، یہی وقت ہے کہ آپ حملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں، اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھانے
کا گناہ نہ کریں، لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو یاد کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں
ہی کی تسلی کے لئے رکھا گیا ہے، اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو
کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مترادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو
سراسر ادبی اور لسانی ہے غلط طور سے سیاسی بنایا جا رہا ہے، جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہئے اور
وہ قدم اٹھانا چاہیئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو،

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جا رہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں
کا فیصلہ ہوتا ہے، بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے، اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوکر
پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ رائے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں، اردو کا نام اردو کسی ایک شخص یا انجمن نے
رکھا ہے؟ یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا، پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا، یہانتک کہ سب پر چھا گیا، غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے
کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے، آپ کے درمیان پیش کیا گیا، اور کبھی کبھی مضمونوں میں ادھر اشارہ ک

گئے، اتنے پر یہ نام مدارس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا، اور کہیں کہیں اسکا چرچا ہونے لگا، یہانتک کہ آج اس اجلاس میں اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی، غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کردیں، اس سلسلہ میں ہماری سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر کرسکتے ہیں، اُمید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرماکر اپنی زبان کے قدیم نام کنندہ کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کریں گے اور ثابت کریں گے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام "ہندوستانی" ہی ہونا زیادہ مناسب ہے، اور یہ ہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے بول چال میں ہے،

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اُردو کا ملکی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آجکل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے، بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اُسی ناگپور میں جہیں ساہتیہ پرشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا آج سے چھبیس برس پہلے ۱۹۱۱ء کی مسلم لیگ کے اجلاس میں مرزا عزیز مرزا مرحوم نے بعینہ یہی تحریک پیش کی تھی اور اسکے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی۔

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کریں جس سے وہ ہندی، یا ہندی کے قریب بنجائے، حاشا وکلا اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ بعینہٖ اسی اُردو اسی زبان، اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں، ہم ہندوستانی کہتے ہیں،

ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اُردو باقی رہے، لیکن عمومی طور پر اس کے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے، ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی بتایا تھا جو عام بول چال کی زبان تھی، ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اسکے پرانے نام ہندی کی جگہ اُسکے دوسرے بدلے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے، خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اُردو ہی رکھئے، اسمیں کچھ ہرج نہیں مگر اپنی علمی تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اسکو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کرکے ثابت کیجئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے، اور اس کا یہی نام اسکے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہوجائیں گی، گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھماتے ہی ساری بلائیں دور ہوجائینگی، بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اسکے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے، اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کررہے ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اسکو اسکے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اسکی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے اور پورے ملک کی اس کے اندر سمائی ہوتی ہے'۔ . . . .

. . . . اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کرینگے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر نیک تحریک میں ہماری عادت ہوگئی ہے، عملاً اُسکے رواج دینے کی کوشش کرینگے، تاکہ اس کا جو نام صرف خواص کو معلوم ہے وہی عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات اُنھوں نے پیش کئے ہیں، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں تاجروں کمپنی کے حاکموں، اور لکھے پڑھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے یہی مشہور و معروف تھا، جو اب عام طور سے متروک ہورہا ہے ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے۔

سوراج

(از مولانا ظفر علی خاں)

تھے کل کی ہی بات کہ تھے ہند کے سرتاج — دیتے تھے تمہیں آکے سلاطین زمن باج

پر رنگ زمانہ نے یہ بدلا ہے کہ تم کو — دنیا کی ہر ایک قوم سمجھتی ہے ذلیل آج

دامان نگہ جس کی فضا کے لئے تھا تنگ — وہ باغ ہوا دیکھتے ہی دیکھتے تاراج

محفل میں ضیا بیز نہ ساقی ہے نہ ساغر — گلشن میں نواریز نہ بلبل ہے نہ دراج

سوچو تو ذرا تم کہ تمہارا ہی سفینہ — کیوں ہوگیا بازیچۂ زخاری امواج

ہر برق جو کوندی ہے گری ہے وہ تمہیں پر — ہر فتنہ جب اُٹھتا ہے تمہیں بنتے ہو آماج

جب تک سبب تم دست نگر اپنے خدا کے — ہونے نہ دیا اس نے تمہیں غیر کا محتاج

جس وقت گرا تم سے سر رشتہ رضا کا — چھوٹا تو نہ تھا بخت نہ تھا تخت نہ تھا تاج

جھک جاؤگے اب بھی اگر اللہ کے آگے — بن جاؤگے گر خاک در صاحب معراج

مٹی بھی اٹھاؤگے تو ہو جائے گی سونا — کنکر بھی اٹھاؤگے تو بن جائے گا پکھراج

پھر ہوگئے اس کے وہ ہوا ان کا نگہبان — اس کی ہے جنہیں شرم ہو ان کی بھی ہے لاج

ترکوں ہی کو دیکھو کہ جب اس پر ہوئے قربان — یورپ کی دھری رہ گئی سب کثرت افواج

اک سجدہ میں حاصل ہوئے جاتے ہیں دو عالم — وہ کیوں نہ کرو بات کہ اک پنتھ ہو دو کاج

مٹ جاؤ گر حق کو نہ مٹتے ہوئے دیکھو — سیکھو یہ روش گر تمہیں لینا ہے سوراج

(زمیندار)

عہدِ حاضر کی ایک مشہور شخصیت

مصطفیٰ کمال پاشا

(۸)

(از جناب عبدالحکیم صاحب بی اے)

سیاسی اور اقتصادی اصلاحات

"قومی زندگی کے ضبط و نظام کے لئے بنیادی اور اساسی چیز یہ ہے کہ ہمیں مکمل آزادی حاصل ہو، دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح اپنی ترقی و بہبودی کی راہیں ہم آپ متعین کریں۔ اقتصادی نظام اور جماعتی شیرازہ بندی کے لئے جدید اور یقینی صورتیں اختیار کریں، اپنے ان مقاصد کے ماتحت ان تمام پابندیوں کے ہم سخت مخالف ہیں جو ہماری مالی۔ عدالتی اور سیاسی زندگی میں ہم پر عائد کی گئی ہیں"

یہ ترکوں کے میثاقِ قومی کے دفعہ ۶ کا خلاصہ ہے۔

یہ نامنصفانہ پابندیاں، حقیقت یہ ہے، کہ سلطنت عثمانی کا خون چوسے ڈال رہی تھیں۔ یہ امر نہایت حیرت انگیز تھا کہ حکومت عثمانیہ کے اندر غیر اقوام کو عدالتی، مالی اور اقتصادی شعبوں میں ترکوں کے علی الرغم مخصوص حقوق و اختیارات حاصل تھے جن سے ترکوں کی نہ صرف زبردست توہین ہوتی تھی بلکہ انہیں کی بنا پر اکثر فسادات بپا ہو جاتے تھے۔ عدالتی معاملات میں غیر اقوام ترکی حکومت کے اندر اپنی الگ عدالتیں اپنا قانون اور اپنے مخصوص جج رکھتی تھیں جو حکومت ترکیہ کے اثر و اقتدار سے یکسر آزاد تھے۔ ترکوں اور غیر ترکوں کے باہمی جھگڑے بھی ایسی عدالت کے سپرد ہوتے تھے جس میں غیر ترکی عنصر کو غلبہ حاصل ہوتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فیصلے ہمیشہ ترکوں اور سلطنت عثمانیہ کے خلاف صادر ہوا کرتے تھے علاوہ ازیں غیر ملکیوں کو ٹرکی کے اندر تجارتی معاملات میں اس درجہ مراعات حاصل تھیں کہ ترک اس میدان میں ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ملک کی تجارت پر غیر اقوام کی گرفت اتنی مستحکم تھی کہ حکومت ترکیہ کا اقتدار بھی ان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا تھا۔ غیر ترکی رعایا کے حقوق ہر طرح محفوظ تھے۔ یہ لوگ نہایت بیباکی کے ساتھ ہر جائز و ناجائز فعل اپنے فائدے کی خاطر کر ڈالتے تھے۔ اس سے سلطنت کے وقار کو صدمہ پہونچتا تھا۔ یہ لوگ بہت سے ایسے محاصل کر مستثنیٰ تھے جو ملکی رعایا سے وصول کئے جاتے تھے۔ غیر ملکیوں کے یہ اختیارات بجائے خود ناقابل برداشت تھے۔ لیکن جس بیباکی اور جرأت کے ساتھ وہ اپنے حقوق صنعت، تجارت، مالیات، کے شعبوں میں استعمال کرتے تھے۔

وہ حکومت کے لئے سراسر مضر تھے۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں سلطنت عثمانیہ نے یہ سارے حقوق و امتیازات منسوخ کردیئے تھے لیکن لڑائی ختم ہو جانے کے بعد دول متحدہ نے پھر انہیں بحال کردیا۔ صلحنامہ سیورے میں اتحادیوں نے چاہا تھا کہ اس قسم کے مخصوص حقوق و امتیازات پر قانونی جواز کی مہر لگائیں لیکن مصطفےٰ کمال اور اسکے رفقا، ان کے کلی خاتمہ کے درپے ہوگئے مصطفےٰ کمال جو بات ۱۹۲۰ء میں حاصل نہ کرسکا تھا وہ صلحنامہ لوسین میں اسے حاصل ہوگئی۔ مخصوص امتیازات کا نظام ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اور اس طرح ملک کی تجارتی اور اقتصادی ترقی کی راہ سے وقت کی سب سے بڑی رکاوٹ دفع کردی گئی۔ اسی نظام کے مشابہ ایک چیز اور ترکی میں تھی۔ ملک کی غیر اسلامی آبادی جو سلطنت عثمانیہ میں عرصہ دراز سے موجود تھی چند مخصوص حقوق و امتیازات رکھتی تھی اسمیں شبہ نہیں کہ وہ بھی ترکی رعایا میں شامل تھی لیکن ان کے مختلف خود مختار جتھے سلطنت ترکی کے اقتدار پر براہ راست اثر ڈال رہے تھے۔ یہ نظام مختلف مذاہب کے اصول پر لوگوں کو مختلف ٹولیوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اس سے مساوات اور اخوت کے جذبات فنا ہوتے جارہے تھے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ جماعتیں ملکی حکومت کے خلاف بیرونی ممالک سے ربط و اتحاد پیدا کرلیتی تھیں علاوہ ازیں ان میں باہمی طور پر بھی جھگڑا اور فساد برپا رہتا تھا۔ نیشنلسٹ ترک جو سارے ملک میں یکرنگی اور یکسانی چاہتے تھے لوسین کانفرنس کے موقع پر اس نظام ہی کے ختم کرنے کے درپے تھے۔ آرمینیا اور عرب ان تجاویز سے متاثر نہیں تھے اس لئے کہ وہ ترکی کے دائرہ سے باہر تھے۔ البتہ یونان کے اوپر خاص اثر پڑ رہا تھا لوسین کانفرنس ۱۹۲۳ء میں یہ طے ہوا کہ ترکی اور یونان ایکدوسرے کو ان کی ہم قوم رعایا واپس کردیں۔ چنانچہ ترکی کے عیسائی یونان چلے گئے اور یونان کے مسلمان ترکی میں آگئے۔ یہ غیر معمولی صلحنامہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ترکی میں غیر اسلامی اقلیتوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہوگیا اب عیسائیوں کی کوئی جماعت ترکی میں فتنہ و فساد نہیں پیدا کرسکتی تھی۔ مذہب اور قومیت کے نام پر سلطنت عثمانیہ میں بڑے بڑے فتنے اٹھائے گئے لیکن اب ان کا کوئی خدشہ باقی نہ رہا۔ وحشیانہ مظالم، قتل عام، جذبۂ انتقام نے گذشتہ پچاس برس تک تاریخ ترکی کے صفحات کو رنگین اور خونیں بنا رکھا تھا۔ اس صلحنامے کے بعد کم سے کم ترکی حدود کے اندر یہ چیز ختم ہوگئی اور داخلی امن و امان کی توقع بندھنے لگی اتنی بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ترک اور عیسائی اپنے شدید مذہبی جذبات کے ساتھ ساتھ باہمی رقابت، تفرقہ اور عداوت کو کسی طرح دفن نہیں کرسکتے تھے۔ پس موجودہ صورت حالات کا بہترین حل یہی تھا کہ یونان کی اسلامی آبادی ..... ترکی میں منتقل ہوجائے۔ اور ترکی کی عیسائی رعایا یونان میں چلی جائے۔ اس طرح نیشنلسٹ ترک، مذہبی اور نسلی یکرنگی اور یکسانیت کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے اسمیں شک نہیں کہ اس طرح کی تبدیلی وطن سے ایک بڑی آبادی کو سخت مشکلات اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہوگا لیکن ترکی نیشنلزم کو ٹھوس بنیاد پر قائم کرنے کے لئے زبان، نسل، مذہب کے امتیازات کا رفع کردینا اشد ضروری تھا نیشنلزم کی یہی فضا پیدا کرنے کے بعد ترکی کو سازشوں، ہنگاموں اور آئے دن کے قتل و خون سے نجات مل گئی۔

قدیم نظام سلطنت کا خاتمہ اور جمہوریت کا قیام

مصطفٰے کمال اور اسکے رفقاء کا یہ خیال تھا کہ ترکی سے یورپ کا اقتدار ختم ہونے کے بعد سلطان اور اسکے وزیر کا اثر اب برائے نام رہ گیا تھا، ترکی کی جدید تعمیر میں نیشنلسٹ پارٹی کے ہمنوا ہو جائیں گے۔ نیشنلسٹ پارٹی ابتک سلطان اور اس کے خاندان پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ٹرکش نیشنلسٹ کانگریس سیواس نے ستمبر 1919ء کو اس بات کا پوری وضاحت کے ساتھ اعلان کر دیا تھا کہ اناطولیہ کے تحریک جدید کا مقصد صرف سلطنت کی حفاظت وصیانت ہے چنانچہ ابتداء سے اس کی ہیم کوشش یہ رہی کہ سلطان کو خارجی اثرات سے آزاد کرکے عثمانی تخت کو ذمہ داری اور شاہانہ وقار کی وہ حیثیت دی جائے جہاں سے وہ جمہور کی سچی خدمات انجام دے سکیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ان توقعات سے مایوس ہو گئے۔ سلطان وحید الدین، دول متحدہ اور خصوصاً سلطنت برطانیہ سے اب تک ملکی حکومت کے خلاف ..... سازش کر رہا تھا۔ وزراء قسطنطنیہ بھی پوری وفاداری سے اس کا ساتھ دے رہے تھے یہ بات قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ انگورہ کی پیہ در پیہ یاددہانیوں سے کوئی اثر نہ ہوا سلطان اپنی غدارانہ راہ عمل کو نہ چھوڑ سکا۔ اب مصطفٰے کمال کی حکومت کو اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ سلطان کو اپنی راہ سے ہٹا دے چنانچہ یکم نومبر 1922ء کو نیشنل اسمبلی نے مندرجہ ذیل تجویز متفقہ طور پر پاس کر دی۔

"ترکوں نے اپنے نظام اساسی کے آئین کے تحت یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ حکومت اور فرمانروائی کے سارے اختیارات ٹرکش نیشنل اسمبلی کو حاصل ہیں جو ترکوں کی سچی نمائندہ جماعت ہے۔ اور وہ اپنے حقوق اور اختیارات سے دستبرداری یا انکی تقسیم اور منتقلی کسی طرح نہیں کر سکتی۔

ترکوں نے اس بات کا بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کسی ایسی طاقت اور جماعت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کی بنیاد قوم کی خواہش پر نہیں ہے۔

پس ترکوں کا خیال ہے کہ قسطنطنیہ کی حکومت جسکی بنیاد شخصی اقتدار پر قائم ہے قطعاً ناکارہ ہے

خلافت کا تعلق آل عثمان سے رہا ہے۔ اس خاندان کا وہ فرد جو معلومات اور کردار کے لحاظ سے سب سے بلند ہوا ٹرکش نیشنل اسمبلی اسے خلیفہ منتخب کرتی تھی ترکی سلطنت وہ اساس و بنیاد ہے جس پر خلافت قائم ہے

اس کے بعد مصطفٰے کمال پاشا نے فرانسیسی وزیر خارجہ کو لکھا کہ حکومت قسطنطنیہ چونکہ قوم کی حمایت سے محروم ہو چکی ہے اس لئے اس کا وجود اب ختم ہو چکا ہے۔ ملک نے عوام الناس، کسانوں اور جمہور کی بہبودی اور بہتری کے لئے ایک جمہوری نظام حکومت کی بنیاد ڈالی ہے اسمبلی کے اس فیصلہ کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ سلطان اور حکومت قسطنطنیہ کا وجود بیک جنبش قلم مٹا دیا جائے لیکن سلطان کو عقل نہ آئی اس موقع پہ اسے تخت سے دست بردار ہو جانا چاہئے تھا لیکن بخلاف اس کے اس نے اپنے مغربی حامیوں اور طرفداروں سے حکومت انگورہ کو کچل ڈالنے کی درخواست کی

اس رویہ سے سلطان پر اپنے ملک سے غداری کا جرم عائد کیا گیا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس پر اور اس کے دفقاء پر مقدمہ چلایا جائے۔ لیکن برطانوی حکومت سلطان کے اس آڑے وقت میں کام آئی۔ اور ٹرکی سے اسکے فرار کے متعلق ضروری انتظام کر دیئے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو سلطان مع اپنے لڑکے اور متعلقین قصر شاہی کے پوشیدہ طور پر ایک چور دروازے سے نکل گیا۔ اور اس طرح ایک برطانوی سٹیمر سے برطانوی حدود سلطنت میں داخل ہو گیا۔ برطانوی حدود میں داخل ہونے پر شہنشاہ برطانیہ کے نام سے اس کا استقبال کیا گیا۔ نیشنلسٹ گورنمنٹ نے اس خبر سے مطلع ہو کر اعلان کر دیا کہ سلطان حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ اور اسلئے سلطنت پر اس کا کوئی دعویٰ نہیں رہا۔ وحدانیت سلطنت کو قومی حکومت نے ناجائز قرار دیا اور سلطنت کا پچھلا نظام مسترد ہو گیا۔ اور جمہوری نظام حکومت میں بجائے سلطان کی جگہ ایک صدر جمہوریت ہو قائم کیا گیا۔ یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو عبدالمجید آفندی سابق سلطان کا ابن عم خلیفہ اسمبلی کا خلیفہ بنایا گیا۔ یہ اپنی قسم کا پہلا خلیفہ تھا جسے امور سلطنت میں کوئی دخل نہیں تھا۔ قدیم نظام سلطنت کو ختم کر کے مصطفےٰ کمال کی جماعت نہ صرف دنیا کی بڑی بڑی جمہوری سلطنتوں کے دوش بدوش ہو گئی، بلکہ اخراجات سلطنت کو بھی بہت کچھ کم کر سکی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو ترکی میں جمہوری حکومت کا اعلان کیا گیا جس کا صدر مصطفےٰ کمال تھا۔ اس اعلان پر ترکی اور یورپ ہر جگہ تنقید کی گئی۔ (باقی)

طبی امداد بذریعہ ریڈیو

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ صحت عامہ نے جہاز کے مسافروں کی طبی امداد کا ایک نہایت قابل قدر انتظام کیا ہے اگر کوئی مسافر جہاز پر بیمار ہو جائے، اور ڈاکٹر کی عدم موجودگی یا مرض کی صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے مریض کو افاقہ نہ ہو رہا ہو، تو جہاز کا کپتان فوراً "ریڈیو پر ڈاکٹر" کو اطلاع کرتا ہے، جب کسی جہاز سے "ریڈیو پر ڈاکٹر" (ریڈیو) کی آواز سنائی دیتی ہے، تو اس کی حد کے اندر ریڈیو کے تمام دوسرے پیغامات فوراً موقوف کر دیئے جاتے ہیں، ان ناگہانی اطلاع کے معنی یہ ہوتے ہیں، کہ کسی جہاز پر کوئی مسافر سخت بیمار ہو گیا ہے اور ڈاکٹر علاج کے لئے موجود نہیں ہے، اس اطلاع کے پاتے ہی کوئی ریڈیو اسٹیشن جو بحری پیغامات حاصل کرتا رہتا ہے، جہاز کے کپتان سے مریض کا حال دریافت کر کے اُسے فوراً ہی ٹیلی فون کے ذریعہ سے محکمہ صحت عامہ کے قریب ترین بحری ہسپتال میں پہونچا دیتا ہے، ہسپتال کے ڈاکٹر جمع ہو کر مرض کی تشخیص کرتے ہیں، نسخہ تجویز کرتے ہیں، اور اپنی رائے سے اس ریڈیو اسٹیشن کو بذریعہ ٹیلیفون مطلع کر دیتے ہیں ریڈیو اسٹیشن یہ پیغام فوراً جہاز کے کپتان تک پہنچا دیتا ہے اس طرح پندرہ منٹ کے اندر طبی مشورہ حاصل ہو جاتا ہے جب سے یہ انتظام شروع ہوا ہے، بے شمار آدمیوں کو شدید ترین امراض سے نجات مل چکی ہے اور بہزاروں جانیں بچائی جا چکی ہیں۔

(معارف)

شہید محبت

(از جناب مقبول امر صاحب نظامی)

آٹھ برس کے طویل غربت وسفر کے بعد جس دن غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے قسطنطنیہ میں ترکی نجات دہندہ کی حیثیت سے قدم رکھا تو اس دن کا سماں جس درجہ حیرت انگیز تھا اتنا ہی مسرت خیز تھا، ایک لاکھ انسانوں کا ایک ساتھ خوش آمدید کا نعرہ اور پرجوش اظہار عقیدت دلوں کو جنبش دے رہا تھا انسانوں کے دلوں میں شادمانی کی بجلیاں کوند رہی تھیں القدرۃ للہ وہی مصطفےٰ کمال جو قسطنطنیہ کی گلیوں اور بازاروں میں آٹھ برس پہلے سر جھکائے مستغرق جا رہا تھا اور جس کا تعاقب اتحادی جہازوں نے اس طرح کیا تھا جیسے چور اور ڈاکو کا پیچھا کیا جاتا ہے آج وہی بے یارومددگار انسان ایسے انداز سے وارد ہوا ہے کہ گویا اس کی آمد ایک معجزہ یا کرامت ہے جس کے دیکھنے کے لئے ہر دل مضطرب اور ہر آنکھ بیقرار ہے۔

ترکی کے ہر مرد وزن بچہ بوڑھے نے اس نظارہ کو دیکھا اور ہر ایک پر عجیب اثر ہوا انہیں میں ایک پاکیزہ دل نوجوان لڑکی تھی جو صرف محبت کے لئے پیدا ہوئی تھی وہ بھی اس بحر انبساط کا ایک تنکا تھی جو بہتی چلی جاتی تھی اور آخر اس مسرت خیز ہنگامہ میں گم ہو گئی۔

اس محل میں جہاں زرق برق وردیاں آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی تھیں اور جہاں انسان تو کیا جنات کا گذر بھی مشکل سے ہو سکتا تھا، آج اسی قصر فلک بوس میں قسطنطنیہ کے آٹھ سو نمائندوں کا اجتماع ہے لڑکی اس نظارہ کو دیکھ رہی تھی اور غازی کے روشن چہرہ پر اس کی نظر تھی، اس نے ایسا تاریخی اجتماع پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ غازی کی تقریر صاف بلند اور خطابت کی سحر کاریوں سے بھری تھی، اس کا چہرہ اپنی قوم کی طرف تھا اور اس کی آنکھ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی غازی نے کہا:۔

میں خوش نصیب ہوں کہ آج آپ کے واسطہ سے، قسطنطنیہ اس کے باشندوں، اور اس کی انجمنوں اور اس کی تمام جماعتوں کو سلام کر رہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں آپ کے خلوص و محبت کے ان شاندار مظاہروں سے بے حد متاثر ہوا ہوں جن کے ذریعہ میرے ہموطنوں نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے آپ میری جانب سے بہت بہت شکریہ قبول کیجئے

آج پورے آٹھ سال کے بعد میں نے قسطنطنیہ کی صورت دیکھی ہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حسرت و فراق کی گھڑیاں بہت دراز اور تلخ ہوتی ہیں تو آپ آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں نے آستانہ (قسطنطنیہ) کی جدائی میں یہ آٹھ برس کیسے گذارے ہوں گے، آستانہ جو دو عظیم دنیاؤں کے مابین واقع ہے ترکی وطن کی زینت ترکی تاریخ کی دولت

ترکی کی آنکھ کا تارا ہے تمام ابنائے وطن کے دلوں میں اس کی محبت جڑ پکڑے ہوئے ہے ایک مرتبہ جب منحوس حوادث نے یہ شہر گھیر لیا تھا، تو نہ صرف تمام ترکوں کے بلکہ تمام مشرق کے دل زخمی ہو گئے تھے اُن میں ایک، میں، بھی تھا جو اپنے پہلو میں خونچکاں دل لے پھرتا تھا،

لیکن آج خدا کا شکر ہے کہ تاریک راتوں نے نورانی آفتاب کی شعاعیں پیدا کر دیں رات کب کی ختم ہو چکی ہے اور ہماری تاریخ کا نیا دن طلوع ہو گیا ہے۔

مضطرب اور روتے ہوئے آستانہ کو میں نے آٹھ سال پہلے اس حال میں چھوڑا تھا کہ میرا دل خون سے چور تھا اور ایک متنفس بھی مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے نہیں آیا تھا لیکن آج میں آستانہ آیا ہوں تو اس کا خندۂ مسرت اور قہقہہ انبساط میرے سامنے ہے اُس کا حسن اب دوبالا ہو گیا ہے، میرا دل بھی مطمئن ہے میں اس وقت اپنے آپ کو استانبولیوں (اہل قسطنطنیہ) کی محبت بھری گود میں پاتا ہوں "

حسین دوشیزہ اس خطابت کی جادوگری سے مدہوش ہو گئی اور جس طرح ایک معمول بے حس و حرکت ہو کر عامل کے ارادوں میں جذب ہو جاتا ہے اس کا دل کھینچ کر اس حسین آزاد اور دنیا کی عظیم شخصیت کے قدموں میں جا پڑا۔

اس نے دنیائے نشیب و فراز کو نہ دیکھا تھا، اپنے جسم میں ایک پاک و صاف دل رکھتی تھی جس میں محبت کا شیریں چشمہ بہہ رہا تھا اور جس کے کناروں پر فداکاری کے خوش الحان طیور چہچہا رہے تھے۔

ترکی خاتون کے لئے سب سے زیادہ جو چیز اثر ڈالنے والی تھی وہ غازی کی شخصیت اور اس کا بے نظیر عزم استقلال تھا جس نے ترکی قوم ترکی ملک و وطن پر گراں بہا احسان کیا تھا اور جس کے احسان سے ترکی کی آئندہ نسلیں بھی سبکدوش نہ ہو سکتی تھیں،

اسے معلوم تھا کہ غازی نے ابھی تک شادی نہیں کی، اور چونکہ اُس کا نسبی تعلق اور رشتہ غازی سے تھا اس لئے اگر اُس کے قلب میں ایک جائز اور پاک تلاطم پیدا ہوا تو اس پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی،

وہ اکثر غازی سے ملتی تھی اس نے کتنی ہی دفعہ غازی سے بات چیت کی تھی لیکن آج اُس کے افکار و خیالات کا تموج جس درجہ شور انگیز تھا اس سے پہلے یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

وہ شریف تھی، آزاد تھی۔ تعلیم یافتہ تھی حسین و جمیل پاکیزہ خصلت تھی، وہ غازی ہمیشہ اُس سے ادب و احترام سے پیش آتا تھا۔ اور چونکہ غازی کو ایسے رفیق کی ضرورت تھی جو خانہ داری کے کاموں میں اُس کو سبکدوش بنا سکے اس لئے کبھی کبھی اسکے دل میں ایک نامعلوم خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اس پاک نہاد لڑکی کو رفاقت خانہ داری کیلئے منتخب کر لے

وہ آج بھی اُس گھر میں گیا جہاں لڑکی کی شب و روز کی زندگی بسر ہوتی تھی اور آج بھی اتنی ہی رضامندی اتفاق

جو آج کی زندگی کا فطری خاصہ تھا اُس پیکر محبت و فداکاری سے مخاطب ہوا،
وہ نامعلوم خواہش جو اسکے دل میں کبھی پیدا ہوتی تھی آج کسی قدر اُبھری ہوئی تھی اور بے اختیار اپنے ارادے
کو ظاہر کردینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اظہار ہوا اور لڑکی اپنے لئے نہیں غازی کی رفاقت اور ضروریات خانہ داری پورا کردینے
کے لئے، انگورہ روانہ ہوگئی۔

غازی صبح سے شام تک اور رات کے اکثر حصوں میں مصروف رہتا وہ ترکی قوم کی تشکیل کر رہا تھا اور اس کی
ان تھک کوششیں جس طرح یونانیوں کے دستبرد سے وطن عزیز کو بچانے اور ترکی قوم کی عزت کو اوج ثریا تک پہونچانے
میں مرکوز تھیں اسی طرح پایۂ تخت انگورہ کو مضبوط بنانے میں بھی مصروف تھیں۔
وہ کام کرتے کرتے تھک جاتا، اُس کی آنکھ اپنی گرد وپیش کی چیزوں اپنی راحت وآسایش کے نظاروں سے
بے پرواہ ہو جاتی تو اُس وقت ایک میٹھی اور خوشگوار آواز کانوں میں آتی:۔
"دماغ قوم کا دماغ ہے، دل قوم کا دل ہے جسم قوم کا جسم ہے آنکھ قوم کی آنکھ ہے دماغ کو راحت دیجئے تاکہ آیندہ
کام دے سکے دل کو اطمینان دیجئے تاکہ کثرت کار سے مضطرب نہ ہو۔ جسم کو آرام دیجئے تاکہ غنیم کے مقابلہ میں سستی نہ
برتے۔ آنکھ کو ٹھنڈا رکھئے نیند سے تکان دور کیجئے تاکہ دشمن کی نقل وحرکت دیکھنے سے انکار نہ کرے"
یہ آواز غازی کے کان میں آتی وہ دیکھتا کہ ایک صاف و روشن مسکراتا ہوا چہرہ جس کا حُسن چاند کی طرح ٹھنڈا
اور بے عیب ہے جس میں بناوٹ اور تصنع کا شائبہ بھی نہیں سامنے ہے اور وہ ہمدردی کے عمیق جذبات سے متاثر
ہوکر غازی کو ساکن و مطمئن دیکھنے کا آرزومند ہے،
مسکراہٹ کے جواب میں غازی کی آنکھوں میں سرور وانبساط کی ہلکی جھلک پیدا ہو جاتی اور کاغذات کو
سمیٹ کر میز کے سامنے سے اُٹھ کھڑا ہو جاتا۔
لڑکی محبت کا کھیل، کھیل رہی تھی وہ ہر وقت مصطفےٰ کمال پاشا کی نقل وحرکت کی نگراں تھی لیکن یہ نگرانی
محبت کی تھی وہ ہر وقت مصطفےٰ کمال کو دیکھتی تھی مگر یہ دیکھنا اُس کی محبت کو بڑھاتا تھا۔
وہ اُس کے چہرہ کو دیکھتی ٹھنڈے سانس بھرتی، اور اُس کی خوبصورت آنکھوں میں فوراً خوشی یا محبت کے
آنسو آجاتے، اُس کی مخمور آنکھوں میں بے پایاں محبت کا ایک جام چھلکتا تھا جو میخانۂ عشق سے ہر دم لبریز رہتا تھا۔
اُس کے دل میں محبت کی سلگتی ہوئی بھٹی نہ تھی جس سے دوسرے کے دل وجگر میں سوزش پیدا ہو بلکہ ایک
بہتا ہوا صاف ومقدس چشمہ تھا جس کو دیکھ کر مضطرب اور پیاسی روح تسکین پاسکتی تھی، اُس کی محبت اُس کی حم[illegible]
[illegible]ال کی طرح شیریں تھی جس میں تلخی کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔

کتنے دن اور کتنی راتیں گزر گئیں، کتنے موسم تھے کہ بدل گئے مگر لڑکی کی محبت میں کوئی تغیر نہ ہوا وہ پہلے سے زیادہ غازی کی محبت میں سرشار تھی۔

جس طرح ستارے آسمان کے وسیع گوشوں میں چمکتے اور چاند کی نورانیت رات کی تاریکی میں کائنات کو جگا تی ہے لڑکی کی محبت نے اس گھر کو منور کر دیا تھا، محبت کی وسیع دنیا تھی جس نے سمٹ کر اس گھر میں اپنا مسکن بنا لیا تھا۔

آہ! کسے معلوم ہے کہ مستقبل ہمارے لئے کیا حالات فراہم کر رہا ہے کسے معلوم ہے کہ ہمارے ارادے اور خیالات کس نتیجہ تک پہونچ کر ختم ہوں گے، کاش انسان انھیں جان سکتا۔ لڑکی کو معلوم نہ تھا کہ یہ اُمیدوں کا ذخیرہ اور خوشنما دل کس زمین پہ جا کر برسے گا اور یہ سرسبز کرنے والا ابر بہار کس کھیتی کو شاداب کرے گا، جس طرح ہر محبت کرنے والا دل نتائج سے غافل ہوتا ہے وہ بھی مستقبل سے بے خبر تھی۔

مستقبل اُس کے لئے صرف اُمیدوں کا آماجگاہ تھا اور اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال پیدا نہ ہوتا تھا کہ چاند کے طلوع اور روشنی کی وسعت میں تاریکی بھی مخفی ہوتی ہے وہ صرف چاند کی غیر محدود ترقی کا تصور رکھتی تھی حالانکہ زوال اور غروب کے آثار بھی اس پر طاری ہونا لازمات سے ہیں۔

چودھویں تاریخ کا چاند روشنی سمیٹ رہا تھا جنگلوں کے درخت اور ریگستانوں کے ذرے خاموش ہو چکے تھے بہار اپنا دامن لپیٹ کر جا گئے پکر باندھے کھڑی تھی اور خزاں کے بے رحم ہاتھ نے سرسبز و حسین درختوں کو ننگا کرنا شروع کر دیا تھا۔

۱۰ ر تاریخ کا یادگار دن ایشیا کے لئے پیام مسرت تھا جس دن فتح سمرنا کی خوشی میں جلسے کئے جا رہے تھے ٹرکی کی ہر بدنت مسرت سے لبریز تھی، سمرنا کی دلہن پر اوس دولہا نے بازی لگائی تھی جس پہ ٹرکی کا بچہ بچہ شیدا تھا اور آج ہر آنکھ اُس کے سر پہ سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ مصطفےٰ کمال تھا جس نے ٹرکی کی عزت ٹرکی کی دولت ٹرکی کا وقار بچایا تھا جس نے ٹرکی کا مستقبل روشن و درخشاں بنایا تھا،

دولہا نے اپنے دوستوں کو فتح کی خوشی میں دعوت دی تھی، عصمت پاشا خالدہ ادیب، لطیفہ خانم اور دوسرے احباب شریک تھے؛

مصطفےٰ کمال نے لطیفہ خانم کو پہلی مرتبہ غور سے دیکھا اس میں شک نہیں کہ لطیفہ خانم کی عمر ۲۲ برس سے بھی کم تھی مگر اُس کے اطوار میں ایک سنجیدگی تھی اس کے سلام میں جبکہ وہ پروقار تمکنت سے چشم و ابرو کا اشارہ کرتی تھی ایک ساحرانہ اثر ہوتا تھا وہ ایک جمیل و شکیل عورت تھی،

جسطفے کمال پاشا نے اُسے دیکھا اور پہلی ہی نظر میں اس پر نظر التفات مبذول ہو گئی ایسی نظر التفات کہ جس نے اُسکے دل سے لڑکی کی محبت کو ــــــ ہاں اُسی لڑکی کی محبت کو جو اب تک اپنا دل کا تحفہ لئے کمال کے قدموں میں پڑی سربگزریہی تھی ــــــ بھلا دیا ، بھلا دیا اور ہمیشہ کے لئے بھلا دیا

محبت وعشق کے فرمانروا کو بلاؤ کہ وہ اپنی رعیت کا حال زار دیکھے، وہ دیکھے کہ اس کی حکومت میں کیسا اندھیر ہے کیسا ظلم وستم ڈھایا جا رہا ہے، حسرت زدگان الفت کے نام پروانے جاری کرو کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر سوگواری کریں، بے تار کی برقی رو سے انھیں پیام دو کہ ایک حسرت زدہ تمہاری انجمن میں شریک ہونے کا آرزومند ہے ایک سوختہ بخت تمہاری مجلس کی رنگینت کے لیے سعی اقدام کرتا ہے اس کی طرف دیکھو اس کی درخواست پر غور کرو اور اپنی محفل میں جگہ دو۔

عورت مرد سے زیادہ صبر کر سکتی ہے، عورت مرد سے زیادہ شجاعت و بے جگری کا مظاہرہ کر سکتی ہے، عورت مرد جیسے رحم اور بے خوف ہو سکتی ہے تاہم عورت کا جذبہ وفاداری ان تمام جذبات سے بالاتر ہے وہ پیکر وفاداری راہ الفت میں اپنی جان عزیز نثار کر سکتی ہے، مگر آہ! دنیا نے اس جنس گراں مایہ کی قدر اور اس کے جذبہ الفت ومحبت پہنچانے کی سعی نہ کی۔

انسان نے تعلیم گاہوں میں عظیم ترین شخصیتوں کے سوانح حالات دیکھے لیکن اُس گہوارہ کو نہ دیکھا جس نے ان عظیم شخصیتوں کو اپنی گود میں لے کر پروان چڑھایا انسان نے جنگ وانقلاب کی تاریخیں پڑھیں حکمت وفلسفہ کے دفتر پڑھنے کا مطالعہ کیا نباتات وطبقات الارض کی تشریحات میں اپنی عمریں بسر کیں لیکن کبھی اسکے لئے فرصت تلاش نہ کی کہ عالم تکوین وتخلیق کی بنیاد واساس کا مطالعہ کرو جس نے انسانیت اور جنگ وامن کے خیالات کی پرورش کی ہے۔

انسان جو محض اپنی خواہشات وحسیات کا بندہ ہے انسان جو اپنے افکار وخیالات کی تکمیل کا شیدائی ہو کیا کبھی اس کے سوچنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے کہ دنیا کی راحتوں کی تقسیم میں کتنا حصہ اُس جنس کو ملنا چاہئے جس کی خدمات پر نظر ڈالنے کی فرصت اسے میسر نہیں آتی۔

عورت، عورت، کائنات انسانی کا جوہر، خاکستان عالم کا چمکتا ہوا ستارہ ظلمات خود غرضی کا درخشندہ آفتاب ہے وہ اس کی قیمت سے دوسرے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور یہ خود چٹانوں کے پتھروں میں مٹی کے ڈھیروں میں پڑی ہے اسی کو دنیا کے شہنشاہ اپنی کلاہ حکومت کا طرہ امتیاز اور اپنے مضطرب اور بے چین دل کا سکون بناتے ہیں تاہم اسکی بیکسی وبیچارگی کی زنجیر میں ایک کڑی بھی کم نہیں ہوتی، وہ محض ایک کھلونا ہے جس کو کھیلتے کھیلتے توڑ دیا جاتا ہے، وہ محض

ایک پھولوں کا ہار ہے جو بستر پر رکھنے کے بعد صبح ہوتے پھینک دیا جاتا ہے،

وہ جو دنیا کی پر پیچ راہوں میں عالم کے آثار چڑھاؤ میں راستہ بھولتے اور گر پڑتے ہیں عورت کا ہاتھ انہیں سنبھال کر سیدھا راستہ بتاتا اور ان کی منزل آسان بناتا ہے جس طرح سورج کی شعاعیں کثافت کو اڑالی اور نکویں و تخلیق کی نشو ونما میں امداد کرتی ہیں اسی طرح عورت کا وجود انسانی افکار و مصائب کو ہٹاتا اور بہترین و خوشگوار جذبات اور تعمیر ہمدردی کا نشوونما کرتا ہے

لڑکی نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کمال پاشا خلوص و محبت کی آنکھ سے اسے نہیں دیکھتا اور جب اسے معلوم ہوا کہ لطیفہ خانم نے فاتح سرنا کا دل مفتوح کر لیا تو وہ انتہائے رنج سے مجنون بن گئی۔

دنیا کی تمام دلچسپیاں اُس کے لئے بیکار ہو گئیں پس دنیا بھی اُس سے چھن گئی۔ اُس کی دلفریبی غازی کے لئے تھی اور چونکہ اب اسے اس کی ضرورت نہ تھی اس لئے ساری دلفریبیاں رخصت ہو گئیں اور حسرت نصیبی شروع ہو گئی اُس کے چہرے کی تابناکی اُس کی آنکھ کی کشش وغیرہ چونکہ غازی کے لئے تھا اس لئے وہ بھی رفتہ رفتہ اُس سے کنارہ کش ہو گیا، مایوسی و اضمحلال نے اُس کے حُسن پر قبضہ کر لیا اور رنگ و روپ کی شادابی ناامیدی کی گرمی نے خشک کر دی وہ بیمار ہونے لگی اور ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ اُسے دق ہے۔

مصطفےٰ کمال نے مناسب سمجھا کہ لڑکی کو کسی شفاخانے میں رکھا جائے اس ارادے سے لڑکی کو موٹر میں بٹھا کر وہ صحت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے اس وقت لڑکی کا پہچاننا مشکل تھا اُس پر یاس و ناامیدی نے قبضہ کر رکھا تھا وہ کسی خوشگوار بات کے جواب میں مصنوعی تبسم بھی نہ کر سکتی تھی اُس کے لئے اس سے بہتر موقعہ تھا کہ اپنے جذبات کو صفائی و وضاحت سے بیان کرے لیکن مایوسی و حسرت نصیبی اس درجہ پر پہونچ چکی تھی کہ خود مسیحا کا سرہانے آنا بھی اُس کی مردہ اُمیدوں کو زندگی دے نہیں سکتا تھا۔ اور اُس کے مرجھائے ہوئے نخل حسرت میں کسی قسم کی تازگی اور شادابی نہ آسکتی تھی۔

موٹر میدانوں سبزہ زاروں اور پہاڑوں کے بیچ میں سڑک کے نشیب و فراز میں اُڑتی چلی جا رہی تھی لڑکی ایک خاموش اور پُر سکون انداز سے بیٹھی تھی اُس کی آنکھیں بند خیالات منتشر دماغ کثرت افکار سے مضمحل تھا وہ موت کے فرشتہ کو اپنے قریب دیکھ رہی تھی اور اس وقت بڑی خوشی سے جان دینے کے لئے تیار تھی،

اس کی سہیلی نے ...... موٹر میں بیٹھتے وقت کہا تھا ،، میری پیاری تم تندرست ہو جاؤ گی اور جلد ہم کو ملو گی ،، اس کے کان میں وہ الفاظ اب تک گونج رہے تھے اور بیٹھے بیٹھے ان کی تلخ حقیقت پر غور کر رہی تھی اور کبھی کبھی ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو جاتی تھی۔

عالم احتضار میں اس نے دیکھا کہ موت کا فرشتہ اپنے بازو پھیلائے ہوئے اسے گود میں اٹھا لینا چاہتا ہے،
اس کی آنکھیں بند ہو گئیں سر جھکا لینے لگا، وہ موٹر کے گدے پر سر رکھ کر غافل ہو گئی یہ غفلت کیسی پر سکون تھی
اس کی آنکھیں خاموش تھیں خیال خاموش تھا زبان خاموش تھی مگر دل بول رہا تھا اس کی حرکت میں ایک کھٹکا تھا
کھٹکے میں ایک طلب تھی اور وہ ایک نام کو بار بار پکارتا تھا۔
لڑکی اتنی دیر تک غافل رہی کہ آخری منزل آ گئی اور ایک خوش آیند سحرکار آواز نے اسے جگا دیا اس وقت
اسے محسوس ہوا کہ پہاڑ کی بلند ترین چوٹی سے کسی نے اسے پکارا ہے، یہ آواز مصطفیٰ کمال پاشا کی تھی جو لڑکی کو آہستہ
آہستہ ہوشیار کر رہا تھا "میری عزیزہ! اٹھو شفا خانہ آ گیا"
لڑکی اٹھ بیٹھی اس نے اپنے بالوں کو درست کیا دل کو سنبھالا اور اس کو درست کیا اور شفا خانہ میں داخل ہو گئی
مصطفیٰ کمال نے شفا خانہ کے مہتمم کو جلد جلد ہدایتیں دیں اور لڑکی کو ایک صاف ستھرے کمرے میں پہونچا دیا گیا۔
وہ منتظر تھی کہ غازی رخصت ہوتے وقت مجھ سے مل کر جائیں گے لیکن غازی نہ آئے اور مہتمم شفا خانہ نے لڑکی کو
یہ پیام پہونچایا۔
"پیاری لڑکی، غازی نے چلتے وقت سچے دل سے تمہاری صحت و سلامتی کی دعائیں مانگی ہیں اور
فرما گئے ہیں کہ مجھے تمہاری صحت و تندرستی کا ہر دم خیال رہے گا"
لڑکی نے یہ پیام سنا، اس کا دل امنڈنے لگا اور جس طرح سمندر میں جوش آتا ہے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں

مصطفیٰ کمال پاشا کی شادی لطیفہ خانم سے ہو گئی اور جس طرح یہ خبر دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچی میونک کی صحت گاہ میں بھی لڑکی نے سنا
وہ فوراً ایک موت کیساتھ روانہ ہو گئی وہ بیمار تھی اور اب تو جسم کے ساتھ روح کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا وہ کس طرح انگورہ
پہونچی کسی کو معلوم نہیں۔

۱۹۲۳ء کی صبح کے چھپنے والے اخبارات لوگ ہاتھوں ہاتھ خرید رہے تھے اس میں ایک سرکاری اعلان تھا جس پر
انگورہ کی مخلوق گری پڑتی تھی۔
"ایک عورت نے جس کا نام فخری خانم تھا اور جو مصطفیٰ کمال پاشا کی دور کی رشتہ دار بھی تھی پاشا کی خدمت
میں باریاب ہونے کی ناکام کوشش کی اور ان کے قصر کے متصل گولی مار کر اپنے کو ہلاک کر ڈالا"
حسرت نصیب فخری خانم کون تھی؟ وہی لڑکی تھی جس نے میونک کی صحت گاہ سے انگورہ تک محض اعلیٰ حضرت پاشا کی
محبت کی قربان گاہ پر اپنے نحیف و نزار دل کی آخری بھینٹ چڑھا دی اور فضا میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے

بیسویں صدی کے خرافات

(از جناب اصغر احسن صاحب متعلم مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ)

ہم بیسویں صدی کے بسنے والے متمدن انسان، قرون ماضیہ کے انسانوں سے علوم و فنون تمدن و معاشرت ایجاد و اختراع ہر چیز میں ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہمارے قلوب بیہودہ اور لغو عقائد کی اندھیریوں اور تاریکیوں سے آزاد اور پاک و صاف ہوتے لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ خرافات کا تسلط اب بھی ذہن انسانی پر اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے صدیوں پہلے تھا اس بارے میں ہم میں اور ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے ہمارا تمدن اور ہماری معاشرت جتنا خرافات اور لغویت کا مجموعہ ہے اور ہمارے اعمال و حرکات ان سے بہت زیادہ متاثر ہیں، دنیا کی کوئی قوم اور کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو بیہودہ و بے بنیاد اوہام و رسوم کی بیڑیوں سے آزاد ہو دنیا کے جس گوشے کا بھی آپ چاہیں گھوم گھر کر جائزہ لے لیں چاہے آپ سائبیریا اور بورنیو کے وحشی باشندوں کے اندر سے ہو کر گذریں یا مغرب کے خوبصورت اور متمدن شہروں میں سے ہو کر جائیں، آپ کو تمام انسانی طبقات اس باب میں یکساں نظر آئیں گے آپ دیکھیں گے کہ ہر دل خواہ متمدن انسان کے سینہ میں ہو خواہ غیر متمدن کے بیہودہ عقائد کی بیڑیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ نیویارک جو موجودہ زمانہ میں تہذیب و تمدن کا مرکز اور گہوارہ سمجھا جاتا ہے وہ بھی اپنی گود میں انسانوں کی ایک ایسی جماعت کی پرورش کر رہا ہے جو جاہل اور وحشی قبائل کی طرح بہت سی لغویات اور خرافات کی معتقد ہے۔ ڈاکٹر کلارک ویسلر نے جو امریکہ کے طبیعاتی عجائب خانہ کے ممبر ہیں ایک مقالہ لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ متمدن زمانہ میں بھی ہم سحر اور شعبدہ بازی وغیرہ کے ویسے ہی معتقد اور دلدادہ ہیں جیسے چھوٹے بچے جن و عفریت کی کہانیوں اور قصوں کے معتقد ہوا کرتے ہیں اس باب میں ہم اور وحشی اقوام ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اس میں ہمارا اور ان کا حال بالکل یکساں ہے ہاں فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ یہ عقائد ان کے اندر کمزور اور ہمارے اندر بہت ہی قوی اور راسخ ہیں اس بات کے ثبوت کے لئے کہ ہم خرافات کے قائل ہیں یا نہیں بہت سی چیزیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ ہم بہت سی باتوں کے سعد و نحس ہونے کے قائل ہیں۔ مثلاً امریکہ کا متمدن باشندہ علی الصباح بیدار ہونے کے وقت چارپائی کے اس جانب سے اترتا ہے جس جانب سے کہ وہ بستر پر گیا تھا اور اس کے خلاف ہونا بدشگونی اور بدفالی خیال کرتا ہے کمرے میں چھتری کھولنا یا سامنے سے سیاہ بلی کا گذرنا اس کے نزدیک بدشگونی ہے اسی طرح جمعہ کے دن جبکہ مہینہ کی تیرہویں تاریخ ہو پڑے کسی اہم کام کے کرنے پر مجبور ہونا یا کسی کا اس کے سامنے چھرا، قینچی یا کوئی اور کاٹنے کا آلہ پیش کرنا بدشگونی کی علامت ہے۔ برخلاف اس کے امریکہ کے بہت سے اعلیٰ نسل گھوڑے کی نعل کو متبرک سمجھتے ہیں

اور اپنے گھروں کے دروازوں پر قفل کر دیتے ہیں اگر ان میں کا کوئی شخص علی الصباح گھر سے نکلے اور اس کے سامنے
سے کوئی سفید گھوڑا سواری کی گاڑی کھینچتا ہوا نکل جائے تو اسے وہ اپنی نوش اقبالی خیال کرتا ہے۔ کتنی عجیب و غریب
اور قابل تمسخر ہے ان کی یہ رسم کہ شادی کے بعد جب میاں بیوی گرجا کی رسومات ادا کرکے نکلتے ہیں تو ان پر چاول اور پرانی
جوتیاں پھینکی جاتی ہیں ایک امریکی کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جبکہ اس کی لڑکی کا گذر شہد کے چھتے والے درخت کے
نیچے ہو اور اسکی ہری بھری شاخوں کے سایہ میں کسی جوانی کے متوالے نے اسے اپنی آغوش محبت میں لے کر بوسہ لیا ہو
اس قسم کی بے شمار رسمیں اور خرافات ہیں جو لوگوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں گنجایش نہیں ورنہ ہم اور بہت کی
مثالیں پیش کرتے۔ یہ اوہام و خرافات بچپن ہی سے ان کے دل میں پرورش پاتی رہتی ہیں اور ان کا اثر انسان کے تمام افعال
پر آخر عمر تک ظاہر ہوتا رہتا ہے اس میں متمدن اور غیر متمدن کی کوئی تفریق نہیں تقریباً دو سال ہوئے شہر میامی کے گرد و نواح
میں موٹروں کی دوڑ کا مقابلہ ہوا جس میں بہترین رفتار کے بیشمار موٹر کار لائے گئے تھے ان تمام موٹروں پر قسم قسم کے گنڈے اور
تعویذ مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے لٹکائے گئے تھے۔ مشہور امریکی ہواباز کپتان فرنک ہوکس دوسرے ہوابازوں کی
طرح خرافات کا معتقد ہے وہ لوگوں کے عام عقیدہ کے خلاف ۱۳ کے عدد کو متبرک سمجھتا ہے اسی لئے اس نے لوگوں کی
مخالفتوں کے باوجود اپنے طیارہ پر اس عدد کو نقش کرایا ہے۔ یہاں پر یہ ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اعداد ہر قوم کو لوگوں کے
ذہن و دماغ پر بہت بڑا اقتدار و تسلط حاصل ہے انسان اپنے تجربہ کے اعتبار سے مختلف اعداد کو اپنے لئے سعد یا نحس خیال
کرتا ہے لیکن اس کی کوئی عقلی توجیہ نہیں بیان کر سکتا۔ ۱-۳-۵-۷-۱۳-۷۷-۹۹-۱۰۰ وغیرہ اعداد ایسے ہیں
جن سے لوگوں کے دلوں میں انقباض یا انشراح تفاؤل یا تشائم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

میکسیکو کی ایک یونیورسٹی کے پرنسپل ڈاکٹر ہیڈن نے ایک علمی انجمن میں خطبہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے مدارس
اور یونیورسٹیاں اب تک بیہودہ رسومات اور عقائد کو مٹانے اور انسانی دماغ سے ان کے اثرات کو زائل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں
اس وقت جو باطل اوہام اور بیہودہ رسوم دنیا میں رائج ہیں وہ سب کے سب زمانہ قدیم سے نہیں چلے آرہے ہیں بلکہ
ان میں بہت سے موجودہ زمانہ کی پیداوار ہیں۔

عہد جدید کے بیہودہ رسومات اور عقائد کا ظہور انسانی اعمال و افعال سے ہوتا رہتا ہے۔ کتنے یورپین اور امریکن ایکٹر
اور ایکٹریس ابتداً جب کسی ایکٹ یا ڈرامے کے تجربہ کے لئے خاکہ اور مضمون تیار کرتے ہیں تو وہ ڈرامے کی آخری عبارت کو
ایکٹ کرتے وقت ادا نہیں کرتے اسی طرح وہ زیب و آرائش کے کمرے میں سیٹی بجانے کو نحوست خیال کرتے ہیں کسی ڈرامہ
کا خاکہ تیار کرتے وقت جبتک پردہ گرا رہتا ہے اس ڈرامے کا اعادہ نہیں کرتے اتفاق سے اگر ان کے سامنے کسی رسی
کا ٹکڑا پڑا ہوا نظر آگیا پھر ان کے لئے ایکٹ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اسی طرح جمعہ کے دن ایکٹ کی ابتدا کرنا انکے نزدیک ناجائز ہے
اگر آپ انواع و اقسام کے بیہودہ عقائد دیکھنا چاہتے ہیں تو جلوں کی صفحات زندگی پر نظر ڈالئے ان کی زندگی کا ہر

آپ عجیب و غریب بیہودہ رسومات کا مزاحیہ افسانہ ہے وہ جوا کھیلتے وقت اپنے احول کی ہر حرکت سے اچھا یا برا شگون حاصل کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جب کسی جواری کو نقصان کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو کبھی اپنی کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھتا ہے کبھی دیا سلائی جلانے لگتا ہے کبھی اپنی جگہ تبدیل کرنے لگتا ہے اسی قسم کی اور بہت سی بیہودہ رسمیں اپنی کامیابی کی امید میں کرتا رہتا ہے اوہام و خرافات کے بہت زیادہ قائل جلاد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا مشہور عقیدہ ہے کہ مجرم کی پھانسی کی رسی بہت متبرک ہے اور پھانسی پانے والے کی لاش کو لیجانے والی گاڑی میں بیٹھ کر لوٹنا باعث سعادت ہے وہ تمام رسوم و عقائد جو زمانہ قدیم سے انسانوں کے اندر مروج ہیں ان سب کا شمار کرنا بہت مشکل ہے ان میں بہت سے ایسے ہیں جو کثیر الشیوع ہیں یہ آسانی اعداد شمار میں آسکتے ہیں گھوڑے کی نعل کو اکثر لوگ اپنے دروازوں پر معلق کرتے ہیں یہ عامیانہ قدیم سے رواج ہے لیکن اس کی منشا کا پوری طرح علم نہیں ہے سبز دھاگے گنڈے کا بیہودہ عقیدہ مشرقی اقوام میں بہت ہی مشہور ہے اور عام طور سے اسے بچوں کو ان کی مائیں نظر بد سے بچنے کے لئے پہناتی ہیں دانت ٹوٹ جائے تو اسے سورج کی طرف پھینکنے گہن کے وقت باجے بجانے پہلی تاریخ کا چاند دیکھنے کے بعد اپنے دوستوں کی طرف دیکھنے یہ تمام کی تمام رسمیں مشرقی ممالک میں بہت زیادہ رائج ہیں۔ یہ چیز محتاج بیان نہیں کہ حقیقی علم بیہودہ رسومات اور عقائد کا سخت ترین دشمن ہے لیکن عجیب بات ہے کہ دونوں چیزیں ایک ہی مقصد کے لئے کوشاں ہیں جس طرح علم حقیقی کائنات کے اسرار و نوامیس کو اجاگر کرنا چاہتا ہے ٹھیک اسی طرح خرافات کا ایمان یا سحر و شعبدہ بازی کے ذریعہ بھی قوائے طبعیہ اور اسکے غوامض پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

برقی کمبل

امریکہ کے ایک موجد نے ایک ایسا کمبل تیار کیا ہے، جس کی بناوٹ میں برقی تار لگے ہوئے ہیں سوتے وقت بجلی کی بیٹری سے جو پلنگ کے سرہانے رکھی رہتی ہے ایک تار کے ذریعہ اس کا تعلق قائم کر دیا جاتا ہے، باہر سردی خواہ کتنی ہی شدید ہو، سونے والا آرام سے سوتا رہتا ہے۔ مشین میں یہ رعایت بھی رکھی گئی ہے کہ کمبل کو جس قدر گرم کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن اگر کمبل حد سے زیادہ گرم ہو جائے تو برقی رو خود بخود منقطع ہو جاتی ہے اور سونے والے کو تکلیف نہیں ہوتی، یہ کمبل دھویا بھی جا سکتا ہے اور اس کے استعمال کرنے میں ڈھائی تین آنہ فی رات سے زیادہ بجلی کا خرچ نہیں ہے۔

مسلمہ!

(از جناب الطاف مشہدی صاحب)

مسلمہ! کچھ یاد ہے عہدِ کہن کی داستاں
ناز کرتے تھے تری ہستی پہ جب پیر و جواں

غیر کی نظریں تری توقیر سے جب محروم تھیں
تیرے ماتھے پر وطن کی قسمتیں مرقوم تھیں

جوہرِ علمِ حقیقی سے تو بہرہ یاب تھی
آرزوئے خدمتِ اسلام سے بیتاب تھی

تیری ہستی باعثِ تسکین تھی شوہر کے لئے
وقف تھیں آرائشیں تیری فقط گھر کیلئے

کھیلتے تھے گود میں تیری کبھی شام و سحر
دیکھ کر جن کو عرق آتے جبینِ دہر پر

تیوروں میں جن کے ہمت آنکھ میں سحرِ جلال
جن کے بشروں سے نمایاں سطوتِ جاہ و جلال

غسل کرتے تھے لہو کی ندیوں میں رات دن
دل میں کچھ قدرِ جوانی تھی نہ کچھ پروائے تن

زندگی کا جن کی مقصد خدمتِ قوم و وطن
جو بدل دیتے تھے مظلوموں کی قسمت کے چلن

چومتی تھی جن کے قدموں کو جبینِ آفتاب
جو لپک کر موت کے رخ سے الٹتے تھے نقاب

جن کی تلواروں سے لرزاں تھی زمین و آسماں
جن کے برچھوں کی چمک سے کانپتی تھیں بجلیاں

شب کو سوتے تھے جو رکھ کر موت کے زانو پہ سر
مسکراتے تھے جو توپوں کے دہانے دیکھ کر

توڑتے تھے جن کے خنجر کج کلاہوں کا غرور
جن کی چوکھٹ پر جھکاتا تھا جبینوں کا وفور

جن کے کہنے پر عمل کرتی تھی لیلائے حیات
دم زدن میں جو بدل دیتے تھے نظمِ کائنات

خندہ زن تھا گنبدِ افلاک پر جن کا شہاب
ڈوبتا تھا جن کی پیشانی میں ہنس کر ماہتاب

جن کی مرہونِ کرم لیلیٰ تھی وہ گل پرست
تھرتھرا اٹھتے تھے جن کے نام سے باطل پرست

جن کی قوت سے اسندذی بھی لرزاں تھی کبھی
جن کے نعروں سے صنم خانہ ہراساں تھی کبھی

آج تیری تربیت میں آہ وہ جوہر کہاں
دوڑتی تھیں جن سے بچوں کی رگوں میں بجلیاں

ہوش میں آ قوم کی قسمت کی مالک بے خبر
اب تو ان آرائشوں کے ساز کو خاموش کر

آ بتاؤں تجھ کو تیری غفلتوں نے کیا کیا
نوجوانانِ وطن کے دل میں کیا کچھ بھر دیا

جن کے ہاتھوں پر حنا کاری لبِ شمشیر سے
اور گلے کی زیب و زینت آہنی زنجیر سے

جو پڑھا کرتے تھے تلواروں کے سائے میں درود
جھک گئے تیرِ دل کی بانہیں میں بھی جو ہر سود

حلقۂ گیسوں سے وابستہ ہے اُن کی زندگی
اور پوڈر سے رخِ گلگوں کی ہے تابندگی

نیم عریانی سے تیری قوم عریاں ہو گئی
گود میں بحرِ حوادث کی سمٹ کر سو گئی
تیری ہستی کیا ہے اب اک مشترقاں کا ساز ہے
خرمنِ اسلام پر جو برقِ بے آواز ہے

اٹھ کہ اب طوفاں اٹھا ہے شانے کے لئے
کشتیٔ اسلام کو تہ میں سُلانے کے لئے
تابکے یہ غفلتوں کی نیند ہوگی اور تو
اٹھ کہ اب باقی نہیں ہر مجھ میں تابِ گفتگو
چونک اس خوابِ گراں سے دھوپ سر پر آ گئی
قوم کے رُوئے حسیں پر مُردنی سی چھا گئی
جاگ اور لذت سے ہوئے ایام کو آواز دے
اٹھ کے پھر صیدِ حزیں کو قوتِ پرواز دے

غزل

(از جناب بسملؔ سعیدی صاحب)

تمہاری بزم میں تنگ آ گیا ہوں زندگانی سے
کسی کی بد زبانی سے کسی کی بدگمانی سے
ہوا ہوگا وہ شادیٔ مرگ فرطِ شادمانی سے
خوشی کیا ہو مجھے دشمن کی مرگِ ناگہانی سے
اُدھر شرمندۂ قاتل ہوں بسملؔ سخت جانی پر
اِدھر کیا کیا پشیماں ہوں خود اپنی زندگانی پر
یہ عمرِ عاشقی جو موت سے بدتر گزرتی ہے
نہ بدلوں اس کا اک لحظہ بھی عمرِ جاودانی سے
جفا بھی تو نہیں اٹھتی وفا کی تاب کیا ہوگی
تری نامہربانی بھی ہے تیری مہربانی سے
مری دنیا تو میرے ہی بدلنے سے بدلتی ہے
یہ وہ دنیا نہیں بدلے جو دورِ آسمانی سے
مرے دشمن کے دل میں بھی اگر تیری محبت ہو
بدل سکتا ہوں میں اسکو بھی اپنی زندگانی سے
تری نامہربانی پر بھی وہ دل سے نہیں جاتی
جو اک امید وابستہ ہے تیری مہربانی سے
کوئی دنیا میں اپنی جان کا دشمن نہیں ہوتا
مگر مجھ کو محبت ہے تمہاری شادمانی سے
مذاقِ عشق سے ہے عرصۂ ہستی کا اندازہ
حیاتِ جاودانی سے نہ مرگِ ناگہانی سے
مبارک دشمنوں کو اس جہاں میں شادماں بننا
تمہاری ناخوشی ہو جس جہاں کی شادمانی سے
ہوئی جاتی ہے جیسے اور سے کچھ اور یہ دنیا
کہیں اٹھتی جوانی سے نہیں ڈھلتی جوانی سے
یہ دیتے ہیں مجھے طعنے تری نامہربانی کے
جو میرا حال مجھ سے پوچھتے ہیں مہربانی سے
دمِ فکرِ سخن اک بارشِ الہام ہوتی ہے
مری آنکھوں سے جب آنسو نکلتے ہیں روانی کر
معاذ اللہ بسملؔ آپ اندازہ لگاتے ہیں
خدا کی مہربانی کا بتوں کی مہربانی سے

زندہ درگور

(از جناب مولوی ممتاز احمد صاحب اصلاحی)

امریکہ میں ایک سوسائٹی ۱۹۰۵ء سے قائم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو زندہ دفن ہونے سے بچائے۔ اس کا نظریہ ہے کہ اکثر انسان زندہ ہی دفن کردیئے جاتے ہیں۔ اور اس بات کے اسکے پاس بہت سے شواہد ہیں۔ جن کا انکار ناممکن ہے۔ اس سوسائٹی کا حلقہ اثر روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں ہیں اور جو شخص اس کا ممبر بننا چاہے ایک مقررہ رقم ادا کرکے بڑی آسانی سے بن سکتا ہے۔ اس سوسائٹی کے سامنے جو نظریہ ہے اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

امریکہ کی ایک خاتون "ل" نامی کو سکتہ ہوگیا۔ اطبا نے سمجھا کہ مرگئی اور دفن کا حکم دے دیا۔ رات کے وقت قبر کے نگہبان پادری نے قبر سے کچھ آواز سنی۔ قبر کھودنے پر معلوم ہوا کہ خاتون مذکور زندہ ہے اس کے بعد وہ مدتوں زندہ رہی اور صاحب اولاد ہوئی۔

ابھی دو برس کی بات ہے کہ بلغاریا میں ایک حسین عورت ابالا ہوا انڈا نگل رہی تھی۔ انڈا غالباً حلق میں پھنس گیا اور مردہ سمجھ لی گئی۔ اور اسکو ملک کے عام دستور کے مطابق اسکے تمام زیورات کے ساتھ دفن کردیا گیا۔ زیورات بیش قیمت تھے ایک چور نے ہمت کرکے قبر کھود ڈالی۔ لیکن اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اس نے دیکھا کہ عورت زندہ ہے۔ وہ الٹے پاؤں وہاں سے بھاگا۔ عورت زندہ اپنے گھر والوں میں واپس آئی۔

اس قسم کے واقعات میں سب سے اہم واقعہ وہ ہے جو امریکہ میں ایک شخص کے ساتھ پیش آیا۔ نیویارک کے ایک باشندہ واشنگٹن ارونگ بشپ نے دعوائے غیب دانی کی بدولت ولایات متحدہ میں کافی شہرت حاصل کرلی۔ اس کے کارناموں نے بڑے بڑے ماہرین کو حیرت میں ڈالدیا۔ ان کارناموں کے صلہ میں اس نے متعدد تمغے بھی حاصل کئے۔ زار روس سے بھی اس نے ایک تمغہ حاصل کیا تھا۔ اس کا سب سے حیرت انگیز کارنامہ یہ تھا کہ ہندوستان کے فقیروں کی طرح ایک طویل مدت تک کے لئے اپنی سانس روک لیتا تھا۔ اور اس پر موت کے تمام اثرات طاری ہوجاتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اسکو زندہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد وہ پھر یکایک جی اٹھتا۔ اپنے انھیں تجربات کو پیش کرنے کیلئے بشپ نے مئی ۱۸۸۹ء میں نیویارک کے علماء و اطبا کی ایک مجلس منعقد کی۔ اور ان کے سامنے سانس روک کر مردہ بن گیا جب کافی مدت گذر گئی اور زندگی کے آثار نمودار نہ ہوئے تو لوگوں میں اس کی موت کے متعلق سرگوشیاں ہونے لگیں لیکن بشپ جب اس قسم کے تجربات کا ارادہ کرتا تو جیب میں ایک کارڈ پر یہ وصیت لکھ کر ضرور رکھ لیتا کہ "مجھے تین دن سے پہلے دفن کرنا"۔ اس وصیت کے مطابق لوگوں نے تین دن تک انتظار کیا۔ لیکن تین دن کے بعد بھی جب اس میں

زندگی کے آثار نمودار نہ ہوئے تو اطبا نے اس کی موت کا فیصلہ کر دیا اور اس کے اسرار سمجھنے کے لئے اس کی کھوپڑی توڑ کر اس کا بھیجہ نکال لیا۔ چنانچہ اب تک عوام میں یہ مشہور ہے کہ لڑکا بے چارہ مرا نہیں تھا بلکہ جن لوگوں نے اس کا بھیجا نکالا انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔ نیویارک کے باشندے عرصہ تک اس واقعہ پر افسوس کرتے رہے۔

ان واقعات کی موجودگی میں کون شخص ہے جو موت و زیست کا قطعی فیصلہ کر سکتا ہے اور پھر سکتے کا معاملہ تو نہایت پیچیدہ ہے۔ اس نے موت و زندگی کے معاملہ کو اور زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔

اطبا، اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ جس شخص پر یہ مرض طاری ہوتا ہے اس کے اندر سے زندگی کی تمام علامات مفقود ہو جاتی ہیں۔ اور یہ اکثر ہسٹریا اور جنون کے مریضوں کو لاحق ہوتا ہے۔ زندگی کے آثار میں سے صرف ایک علامت دوران خون باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن اس کا معلوم کرنا آسان نہیں ہے۔ اس سوسائٹی نے موت و حیات کے فیصلہ کے لئے جو اصول قرار دیے ہیں وہ بہت سے ہیں ان میں چند نمایاں اصولوں کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ نبض کی تحقیق کرو چلتی ہے یا نہیں؛
۲۔ آلات کے ذریعہ قلب کی حرکت کا پتہ لگانا۔
۳۔ سینہ میں تنفس کا پتہ لگانا۔
۴۔ جسم کو روشنی میں لے جا کر دیکھنا اگر مردہ نہیں ہے تو انگلی کا نصف حصہ شفاف ہوگا۔
۵۔ ناک اور منہ کے سامنے آئینہ رکھنا اگر زندگی باقی ہے تو بشکل بھاپ آئینہ پر تنفس کے آثار نمایاں ہو جائیں گے
۶۔ کوئی چمکدار چیز مردے کی آنکھ کے سامنے ہلانا اگر زندگی باقی ہوگی تو وہ چمکدار چیز آنکھوں میں گردش کرتی ہوئی معلوم ہوگی۔

یہ چند واضح قرائن ہیں جن سے موت و زندگی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور طریقے ہیں لیکن ان سے صرف اطبا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے فوائد اور خوبیوں کو دیکھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں اس کی شاخیں قائم ہو جائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک دنیا کے ہر حصہ میں اس کی آواز نہیں پہونچی ہے امریکہ کے علاوہ جہاں اس کی شاخیں ہیں بھی تو بہت معمولی حالت میں۔ جو موت کی تحقیق کسی علم صحیح کی بنا پر نہیں کرتیں اور وہ بھی ان سے مرنے والے کے خاندان والوں ہی کو تشفی ہوتی۔ جرمنی کے اکثر شہروں میں مردہ کے جسم کو معمولی کپڑے پہنا کر تین دن کے لئے کھلی جگہ میں رکھ دیتے ہیں۔ اور اگر لوگ چاہیں تو اس سے زیادہ مدت تک رکھ سکتے ہیں اور بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ مردہ کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھ دیتے ہیں جو معمولی حرکت پر بھی بجنے لگتی ہیں اور زندگی کا پتہ لگ جاتا ہے لیکن گرم ملکوں میں خاصکر ہندوستان میں تو جسم چوبیس گھنٹے سے زیادہ باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ یہاں گرمی اس قدر ہے کہ اس سے زیادہ رہ گئے میں جسم کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ قدیم [illegible]

اسرائیلیوں کے یہاں یہ اصول تھا کہ بغیر ایک ہفتہ گذرے دفن نہیں کرتے تھے۔

ان خطرات کی وجہ سے بہت سے لوگ مرتے دم اپنے دفن کے متعلق خاص خاص وصیتیں کر جاتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ کے ایک مشہور ناولسٹ کو اکثر سکتہ طاری ہو جایا کرتا تھا اس لئے اس نے وصیت کی تھی کہ بغیر پوری تحقیق کے اسے دفن نہ کیا جائے۔ اسی قسم کی وصیت انگلستان کے مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر نے بھی کی تھی۔ آئرلینڈ کے ایک شخص اوکونیل نامی نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا سینہ چیر کر دل دیکھ لیا جائے تاکہ موت و حیات کا قطعی فیصلہ ہو کر انگلینڈ کے مشہور سیاستداں ڈزرنیلی کو آخری عمر میں اکثر سکتہ طاری ہو جایا کرتا تھا اور لوگوں کو یہ گمان گذرتا کہ وہ مرگیا ہے اس لئے اس نے بھی وصیت کی تھی کہ جبتک اس کی موت کا قطعی فیصلہ نہ ہو جائے اسے دفن نہ کیا جائے۔ اسی طرح امریکہ کی ایک عورت کو سکتہ طاری ہوا لوگوں نے سمجھا کہ مرگئی اور دفن کر دیا لیکن دفن کرنے کے ساتھ ہی معلوم ہوا کہ ابھی زندہ ہے۔ وہ قبر سے نکلکر گھر والوں میں واپس آئی اور اس کے بعد بیس برس تک زندہ رہی اور اسکے متعدد اولادیں ہوئیں اور اس نے ہر ایک کے متعلق وصیت کی کہ جبتک موت کا صحیح ذریعہ سے علم نہ ہو جائے اس کو دفن نہ کیا جائے۔

جادو کا دائرہ

فرانس کے میدانوں اور جنگلوں میں جہاں جنگ عظیم برپا ہوئی تھی ابھی تک مقتولین کی لاشیں تلاش کی جارہی ہیں اور بقول ایک یورپین معاصر کے ہر ہفتہ اوسطاً ۲ برطانوی سپاہیوں کی ہڈیاں زمین سے برآمد ہورہی ہیں قبور جنگ کے شاہی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ گذشتہ سال ۴۸۸ لاشیں برآمد کی گئی تھیں۔ ان میں سے بہت سی اُن لوگوں کو ملی ہیں جو اُن میدانوں میں لوہے اور فولاد کے ٹکڑے چن چن کر جمع کرتے پھرتے ہیں۔ یہ ٹکڑے اس لئے جمع کئے جاتے ہیں کہ اُن کو پگھلا کر پھر آلات جنگ تیار کئے جائیں! یہ ایک عجیب جادو کا دائرہ ہے جس میں یورپ کی ذہنیت پرورش پارہی ہے۔ ایک ہی سانس میں امن و تحفظ بنی نوع انسان اور احترام قبور اور اُسی سانس میں جنگ کی تیاریاں! ادھر تو جنگ عظیم کے لاکھوں مقتولین کی ہڈیاں سمیٹی جارہی ہیں، اور ادھر ان ہی میدانوں میں لوہا اور فولاد جمع کیا جاتا ہے تاکہ پھر اُس سے آلات جنگ تیار کئے جائیں! گویا جنگ و جدل کے متعلق لاکھوں انسانوں کی لاشیں اور ہڈیاں اس زمانہ کے انسانوں کو آئندہ جنگ کے لئے تیار ہونے سے روک سکیں! امن اور جنگ کے احساسات کا یہ مرکب ایک عجیب اور ناقا مرکب ہے۔ (پیام)

کوائف عالم اسلامی

ترکی

ترکی مال کی درآمد و برآمد

ترکی حکومت کے ادارہ عامہ نے جنوری ۱۹۳۷ء کے تجارتی اعداد و شمار شائع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ میں ۵۲۰۳۴۳۰ پونڈ کا تجارتی مال برآمد اور ۴۲۱۶۹ پونڈ کا درآمد ہوا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی تجارتی مال کی برآمد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔

ترکی جہاز انگلستان میں

انگلستان میں شاہ جارج ششم کی رسم تاجپوشی کی تقریب میں بحری جہازوں کا جو مظاہرہ ہونے والا ہے اس میں شرکت کے لیے ترکی حکومت کی وزارت دفاع نے چند تباہ کن جہازوں کو مخصوص کر دیا ہے جو اس بحری مظاہرہ میں ترکی حکومت کی طرف سے نمایندگی کریں گے سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ امیر البحر شکری بے کی قیادت میں ترکوں کا جنگی بیڑہ ۱۱ مئی میں یوگوسلاویہ کے بحری مستقروں اور قلعوں کا معائنہ کرنے کی غرض سے روانہ ہو جائیگا۔

ترکی حکومت کی جنگی تیاریاں

حکومت ترکیہ جنگی تیاریوں میں پوری سرگرمی دکھا رہی ہے۔ حکومت ایسے بل تیار کر رہی ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے وقت عوام الناس کو منظم رکھا جا سکے۔ ان بلوں کے مطابق ہر شخص کو جس کی عمر ۱۵ سے ۶۰ برس کے درمیان ہوگی، سپاہیانہ زندگی کا اہل سمجھا جائے گا۔ تمام مکاتب میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں طور پر جنگی ٹریننگ دی جائیگی۔ چالیس ہزار یا اس سے زائد کی آبادی کے شہروں میں فضائی کلب قائم کئے جائیں گے اور بلدیات کو ہدایت کی جائے گی کہ عوام الناس کو فضائی تعلیم دینے کے لیے فضائی میدان تیار کرائیں پرائمری اسکولوں میں جو تعلیمی کتب مقرر کی جائیں گی ان میں فضائی امور کی تعلیم کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا۔

حجاز

عراق حجاز اور یمن کے روابط

آجکل بلاد عرب میں اس ذہنی ربط اور اجتماعی تعلق کا خاص ذکر کیا جا رہا ہے جو حال ہی میں شاہ غازی امیر سعود حجاز اور شہزادگان یمن کے درمیان قائم ہوئے ہے۔

تینوں ملکوں کے نوجوان شہزادے جوان عمر شاہ غازی کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کا رجحان یہ ہے کہ زمانہ کے حالات کے مطابق عربی وحدت کے اس سلسلہ کو ترقی دی جائے حال ہی میں یمن کے تین شہزادے حجاز کی سیاحت کر کے واپس ہوئے ہیں ان کی آمد حجاز سے حجاز و یمن کے تعلقات کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ امیر سعود شاہ غازی کی دعوت پر عراق گئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ولیعہد حجاز کا استقبال عراق حدود پر بہت پر جوش کیا گیا

فلسطین

شورش فلسطین فرو نہیں ہوئی۔ اس کے ختم کرنے کے لئے پولیس کو مضبوط کیا جا رہا ہے اور عبرانی نو آبادیوں کی حفاظت کے لئے قریباً ایک سو یہودی نوجوانوں کو پولیس میں بھرتی کیا گیا ہے مصر کے سابق ہائی کمشنر لارڈ جارج آجکل فلسطین کے سیاسی حالات کی تحقیقات کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ملک کی بڑی بڑی جماعتوں اور ذمہ دار اشخاص سے ملاقاتیں کر رہے ہیں آپ عربوں کی مجلس علیا کے ارکان سے بعض اہم سیاسی مسائل پر گفت و شنید کر چکے ہیں اور اب امیر عبداللہ والی شرق اردن سے ملنے کے لئے عمان روانہ ہو گئے ہیں وہاں سے آپ پھر فلسطین واپس آئیں گے اور فلسطین کے مفتی اعظم سید امین الحسینی سے گفت و شنید کریں گے۔

فلسطین کی تقسیم اور امیر عبداللہ

معلوم ہوا ہے کہ فلسطین کا شاہی کمیشن ملک معظم کی حکومت کے سامنے یہ سفارش کرے گا کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ عربوں کے لئے ہوگا اور دوسرا یہودیوں کے لئے عربی اخبارات کا بیان ہے کہ اس تجویز کے محرک امیر عبداللہ والی شرق اردن ہیں جو اپنی سیادت عربوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں مگر امیر عبداللہ نے لندن روانہ ہونے سے قبل اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل بیان شائع کیا ہے۔

"فلسطین کی تقسیم کی تجویز کو میری جانب منسوب کیا جا رہا ہے اس افواہ میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے کیونکہ فلسطین میں عربوں کے نام پر مجھے نمائندگی کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ میں نے فلسطین کی تقسیم کے سلسلہ میں اپنی رائے ظاہر کی ہے"

فلسطین کی تقسیم کے متعلق عرب ہائی کمیٹی کا بیان

فلسطین کی تقسیم کے سلسلہ میں عرب ہائی کمیٹی .... نے ایک مفصل بیان شائع کیا ہے جس میں ارض مقدس کی تقسیم کی تجویز کی سخت مخالفت کی گئی ہے اور اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ عرب ہائی کمیٹی نے جو مطالبات شاہی کمیشن کے سامنے پیش کئے ہیں ان کی تکمیل کے سوا وہ کسی چیز پر راضی نہیں ہے اور ان ہی مطالبات پر اس کو اصرار ہے اور آخر تک رہے گا

حزب یہود کے صدر کا اعلان

جب سے فلسطین کی تقسیم کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے یہودیوں کے حوصلے بہت بڑھ رہے ہیں وہ سارے فلسطین میں یہودی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں چنانچہ تمام ذمہ دار یہودی لیڈر پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ وطن یہود کی سکیم

کو کامیاب بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ سرزمین مقدس میں یہودی حکومت قائم کر دی جائے تاکہ یہودی اپنی مرضی کے مطابق قومی اور قانونی قوت سے عربوں کے جہاد کا خاتمہ کر سکیں۔ مذہب یہود کے صدر نے اعلان کیا ہے کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ اتحادیوں کے مواعید کی صریح خلاف ورزی ہے یہودی اس منصوبہ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتے ہمارے اطمینان کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ سارے فلسطین کا یہود کو مالک و حاکم بنا دیا جائے۔

شام

۱۹۴۰ء میں شام آزاد ہوگا

شامی وفد جو اس وقت پیرس میں مقیم ہے۔ شامی اخبارات کا بیان ہے کہ اس کو حکومت فرانس نے مطلع کیا ہے کہ شامی فرانسیسی معاہدہ کا نفاذ فی الفور ہو جائے گا اور معاہدہ کی رو سے شام کو کامل آزادی ۱۹۴۰ء میں حاصل ہوگی۔

معلوم ہوا ہے کہ سید امیل اوہ صدر جمہوریہ لبنان جو پیرس کی بین الاقوامی نمائش میں تشریف لے جائینگے وزارت خارجہ فرانس کے اجلاس خصوصی میں بھی شریک ہونگے اور فرانسیسی لبنانی معاہدہ پر مہر تصدیق ثبت فرمائینگے۔

افغانستان

افغانستان کی جنگی تیاریاں

کابل کی . . . ایک خاص اطلاع مظہر ہے کہ افغانستان میں جنگی تیاریوں کا وسیع سلسلہ جاری ہے۔ موجودہ صدر سردار ہاشم خاں نے اپنے تدبر سے ایک مستحکم سیاسی نظام قائم کر دیا ہے۔ تعمیری اور اقتصادی ترقی کی ہزاروں صورتیں بروئے کار ہیں لیکن اسی کے ساتھ فوجی طاقت کو بہت زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔

کابل کا شمالی سمت کا بے آباد حصہ عسکری تعمیرات کے لئے ایک زبردست مستقر کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ دارالسلطنت کو اول درجہ کی فوجی چھاؤنی بنا دیا گیا ہے جہاں جدلالی کے مقابلہ میں فوجوں میں تین گنا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

جدلالی میں نا تربیت یافتہ اعلیٰ خاندانوں کے لڑکوں کے ہاتھ میں فوجی نظام تھا جو انجام کار وقت پر کام نہ آسکا لیکن اب اُن لوگوں کو فوج کی زمام دی گئی ہے جو اپنے ملک میں جنگ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ تجربہ کار جنگجو قبائل کے پختہ کار اصحاب کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ نئے فوجی ضابطوں کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس وقت افغانی فوج کا استحکام اور نظم قابل تعریف ہے۔

مطبوعات جدیدہ

دیوان باقر :- مرتبہ جناب مولوی سید عطا حسین صاحب حجم ۲۴۹ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۲ علاوہ محصول ڈاک
ملنے کا پتہ :- مولوی عطا حسین صاحب محلہ نگم پلی حیدرآباد دکن -

مولانا سید شاہ باقر علی صاحب بہار کے ایک مشہور صوفی و عالم گذرے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے علمی و روحانی کمالات کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی خاص ذوق عطا فرمایا تھا، حضرت شاہ صاحب زیادہ تر فارسی میں شعر کہتے تھے اور اپنے زمانہ کے یگانۂ روزگار فارسی داں، اور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیا کرتے تھے، پیش نظر دیوان انہی کے فارسی اشعار کا مجموعہ ہے جس میں ردیف وار ان کی غزلیں درج کی گئی ہیں۔ دو تین قصیدے دو چار رباعیاں اور کچھ قطعات بھی شامل ہیں - دیوان کو ہمیں تفصیل سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ کچھ غزلیں ادھر ادھر سے پڑھیں - کلام میں خاصہ درد اور اثر محسوس ہوا۔ شروع میں جناب مرتب صاحب کی طرف سے ۶۵ صفحات کا ایک طویل مقدمہ درج ہے جس میں حضرت باقر علیہ الرحمۃ کے خاندانی اور ذاتی حالات و کرامات اور ان کی شاعری کی خصوصیات وغیرہ بیان کی گئی ہیں۔

غالب نے برہان قاطع کی رد میں جو کتاب قاطع برہان لکھی تھی اس پر اس زمانہ میں بڑا طوفان برپا ہوا تھا اور کئی برس تک اس کا ہنگامہ جاری رہا۔ اور موافقت و مخالفت میں متعدد کتابیں اور رسالے لکھے گئے۔ حضرت باقر نے بھی اس ہنگامہ میں حصہ لیا اور استاد کی حمایت میں کئی قطعے اور بعض تحریریں نثر میں لکھیں جو کتاب میں درج ہیں۔

اُمید ہے فارسی سے ذوق رکھنے والے حضرات اس کتاب کی قدر کریں گے۔

جامع النحو :- مؤلفہ جناب مولانا حکیم محمد احمد صاحب معلم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ - ضخامت ۰۰ صفحات کاغذ کتابت و طباعت عمدہ قیمت فی نسخہ ۲

مولانا حکیم محمد احمد صاحب ایک مدت سے اعظم گڈھ کے مشہور مدرسۃ الاصلاح میں عربی صرف و نحو کی تعلیم دے رہے ہیں اور اس کا نہایت بہترین تجربہ رکھتے ہیں۔ حال ہی میں مذکورہ بالا نام سے ان کی ایک جدید تصنیف شائع ہوئی ہے جس میں نحو کے تمام ضروری مسائل، عام فہم اردو زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ یوں تو عربی صرف و نحو کے متعلق اردو زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے گئے ہیں لیکن یہ کتاب اس لحاظ سے ایک خاص امتیازی شان کی مالک ہے کہ اس میں فن نحو کے تمام ضروری مسائل بیان کئے گئے ہیں اور انہیں مثالوں کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ذہن میں آنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب عربی مدارس کے نصاب تعلیم کے لئے بہت زیادہ موزوں ثابت ہوگی مصنف کے مذکورہ بالا پتہ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

آفتاب رسالت :- مصنفہ جناب راؤ بہادر حاجی محمد عبدالحمید خان صاحب منظر افہت ضلع میرٹھ۔ حجم ۴۰ صفحات تقطیع چھوٹی کتابت وطباعت بہتر سرورق دو رنگ بہ قیمت فی جلد ۱۲ مصنف کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

نثر میں آنحضور صلعم کی بہت سی سیرتیں لکھی گئی ہیں اور ہر زمانہ میں لکھی جاتی رہتی ہیں لیکن بعض خاص وجوہ سے لوگوں نے نظم میں سیرت مقدس لکھنے کی طرف بہت کم توجہ کی ہے حالانکہ اثر و دل نشینی کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو نظم کو نثر پر خاص فوقیت حاصل ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آنحضور صلعم کے صحیح واقعات زندگی موثر اور دلنشیں انداز میں نظم کئے جائیں تو اس کا مسلمانوں کی زندگی پر بہت اچھا اثر مرتب ہو۔ آفتاب رسالت اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس میں آنحضرت صلعم کے سوانح حیات نظم میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن کتاب بہت مختصر ہے اور زیادہ تر سرسری حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ کاش اسی انداز میں آنحضور صلعم کی زندگی کے موثر حالات وواقعات ذرا تفصیل سے بیان کئے گئے ہوتے بہرحال مصنف صاحب کی کوشش قابل قدر ہے امید ہے مسلمان اس کتاب کو ذوق کے ساتھ پڑھیں گے۔

طبیب نسواں :- یہ ایک ماہوار طبی رسالہ ہے جو دہلی سے ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب علمی و ادبی حلقے میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ان کے علمی اور طبی مضامین ملک کے موقر رسائل میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ہندوستانی عورتوں کی جہالت اور خرابی صحت کو دور کرنے کا خیال ہمیشہ سے رہا ہے اور وہ اپنے مضامین کے ذریعہ اس کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں پیش نظر پرچہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں حفظان صحت کے مضامین کے ساتھ ساتھ عورتوں کے لئے دوسری دلچسپیاں بھی ہیں۔ اس پرچہ کا مطالعہ عورتوں کے لئے بہت زیادہ مفید ہوگا۔ حجم ۴۰ صفحات چندہ سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

ملنے کا پتہ :- منیجر رسالہ طبیب نسواں دہلی

مالک
محمد حبیب حسن

فاران

مدیر
ابو اللیث ندوی اصلاحی

ہر ماہ انگریزی کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

نمبر ۶ | بجنور ماہ جون ۱۹۳۷ء مطابق ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ | جلد ۳

فہرست مضامین

بحث و نظر

مدحِ صحابہ کے بارے میں شیعوں اور سنیوں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف جو بیانات اخبارات میں شائع ہوئی تھیں، ان کے متعلق پچھلی اشاعت میں اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے اُس وقت تک رونما اس بات کا تھا کہ دو طرف ایک معمولی مسئلہ میں نامناسب طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور اسے باہم طے کر لینے کے بجائے اس کے فیصلے کے لئے حکومت کے محتاج بن کر، خود اپنے ہاتھوں اسلامی شرف و وقار کو نا قابلِ برداشت صدمہ پہنچا رہے ہیں۔ لیکن کسے خبر تھی کہ اس کے چند ہی روز بعد، ان کی جہالت و نادانی یا بدنصیبی و بدبختی سے ایسے واقعات رونما ہونے والے ہیں جن پر قیامتیں بپا ہو جائیں گے اور ہمیں شرم و ندامت سے گردن جھکا لینی ہوگی۔

اخبارات کے ذریعہ ناظرین کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ گذشتہ ماہ کے عشرۂ آخیر میں لکھنؤ کے شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک زبردست ہنگامۂ خونیں برپا ہو گیا جس میں فریقین نے انتہائی بیدردی کے ساتھ ایک دوسرے کا خون بہایا اور کمال سفاکی و بہیمیت سے کام لیتے ہوئے کمسن لڑکوں اور قابلِ رحم بوڑھوں کے قلب و جگر میں بھی چھرے بھونک دئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک درجن سے زائد مسلمانوں کی عزیز جانیں اس ہنگامہ کی نذر ہو گئیں اور سو سوا سو افراد بری طرح مجروح ہوئے۔ غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ کے اس کشت و خون کا سبب کیا ہے اور کیوں شیعوں اور سنیوں نے عقل و ہوش کو بالائے طاق رکھ کر اس سرزمین کو فتنہ و فساد کا گہوارہ بنا دیا جہاں وہ کسی زمانہ میں بھائی بھائی بن کر زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر آپ کو اس کا علم نہ ہو تو سن لیجئے کہ صرف اتنی سی بات پر کہ سنیوں کو مدحِ صحابہ کا حق ملنا چاہئے یا نہیں ——— افسوس ہے کہ اسلامی حکومت و خلافت کی دھجیاں زمانہ ہوا بکھر گئیں اور جو چند نام کی اسلامی سلطنتیں باقی رہ گئی ہیں وہ بھی ہر طرف سے خطرے میں گھری ہوئی ہیں لیکن مسلمان ہیں کہ اب تک یہی فیصلہ نہ کر سکے کہ خلافت کے مستحق حضرت ابوبکرؓ تھے یا حضرت علیؓ۔ موجودہ زمانہ انقلاب کا زمانہ ہے۔ دنیا کی تمام قومیں میدانِ ترقی میں تیزی سے قدم بڑھاتی جا رہی ہیں اور اپنی ترقی و تنظیم میں شب و روز مشغول ہیں لیکن مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان تمام مسائل کو چھوڑ کر جن پر ان کی ترقی و تنزل کا دارومدار ہے اب تک انہی مسائل کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جن کا موجودہ حالاتِ زندگی سے کوئی تعلق نہیں

دنیا میں اور بھی ملک ہیں جہاں شیعہ سنی ساتھ ساتھ آباد ہیں۔ اور جہاں تک امامت و خلافت وغیرہ مسائل کا

تعلق ہے ان کے عقائد و معاملات بھی قریب قریب وہی ہیں جو ہندوستان کے شیعوں اور سنیوں کے درمیان پائے جاتے ہیں لیکن ان کا ان کے باہمی تعلقات پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا اور وہ مل جل کر ترقی و تعمیر کے کاموں میں مصروف ہیں یہ سچ ہے کہ کسی زمانہ میں وہ بھی ... میں مبتلا تھے جس میں اس وقت مسلمانان ہند مبتلا ہیں لیکن اب حالات یکسر منقلب ہو گئے ہیں فرقہ بندی ان ممالک سے ختم ہو گئی ہے۔ تازہ مسائل نے ان کی توجہات بے سود جھگڑوں سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کر لی ہیں اور تمام فرقے قدیم اختلافات و مناقشات کو فراموش کر کے حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مذہبی اختلافات کو مٹانے اور ... بنیادوں پر اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا جذبہ جس تیزی کے ساتھ ان ممالک میں بڑھتا جا رہا ہے وہ قارئین ... پچھلے نمبر میں تفصیل کے ساتھ دیکھ پا چکے ہیں۔ ابھی حال ہی میں کرنا لک کالج کے ایک پروفیسر ایران کی سیاحت سے واپس آئے ہیں اور بمبئی کرانیکل کے ایک نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے ایران جدید کے بہت دلچسپ حالات بیان کئے ہیں موصوف نے ایرانی شیعوں اور سنیوں کے کامل اتحاد و یکجہتی کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اسے ہندوستانی مسلمانوں کو غور و توجہ سے پڑھنا چاہئے۔ کاش ہندوستان کے مسلمان ٹھنڈے دل سے غور کرتے کہ وقت کا تقاضا کیا ہے اور وہ اب تک کس مہلک غفلت میں مبتلا ہیں۔

چند ماہ ہوئے، مصری نوجوانوں نے اپنے ایک زبردست اجتماع میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ مصر کا نظام سلطنت قانون شریعت کے مطابق بنا دیا جائے لیکن، حکومت کی جانب سے اس مطالبہ کا بہت زیادہ گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ اس لئے اب مصر کے نوجوانوں نے ملک کے بعض حصوں میں اپنے مظاہروں اور مطبوعات کے ذریعہ اعلان کرنا شروع کر دیا ہے کہ اگر حکومت اپنے نظام کو شرعی قالب میں نہ ڈھالے گی تو ملک میں بہت جلد ایک ہمہ گیر اور نتیجہ خیز تحریک شروع ہو جائے گی اور حکومت سخت خطرات میں مبتلا ہو جائے گی''۔

نوجوانان مصر کا یہ جذبہ نہایت مبارک ہے کہ وہ مصر میں جہاں کہا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہے اسلامی نظام سلطنت نافذ کرنے کے لئے تلے ہوئے ہیں۔ اسلام نے حکومت و سلطنت کا جو نظام پیش کیا ہے اور زندگی کے ہر گوشے میں جن اصول و قوانین کی طرف رہنمائی کی ہے اگر ان پر پوری شدت اور ہمہ گیری کے ساتھ عمل کیا جائے تو ان تمام مفاسد اور خرابیوں کا قلع قمع ہو جائے جو اس وقت انسانوں کے بنائے ہوئے اصول و قوانین پر عمل کرنے کی وجہ سے تمام بڑی بڑی سلطنتوں میں رونما ہیں۔ دیکھئے نوجوانوں کی ان مساعی کا انجام کیا ہوتا ہے۔

مصری نوجوانوں کے اس جذبہ سے ان ہندوستانی طلبہ کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو مذہب سے بغاوت کو ہی ترقی کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں۔

توحید اور اس کے اثرات

(۸)

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

پچھلے پرچے میں ایک تاریخی واقعہ نقل کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ عقیدۂ توحید اپنے ماننے والوں کے دلوں میں وہ جرأت ہمت اور بے خوفی پیدا کر دیتا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی قوت سے مرعوب نہیں ہوتے اور کسی طاقت کی پرواہ کئے بغیر جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اس جرأت و ہمت کے واقعات اگر دیکھنے ہوں تو تاریخ کی کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے تم معلوم کر سکتے ہو کہ کس طرح مسلمانوں کا ایک معمولی فرد بڑے بڑے بادشاہوں کو آزادی اور بے باکی کے ساتھ مخاطب کرتا ہے، ان کے غلط اعمال پر نکتہ چینیاں کرتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال اپنے دل میں نہیں آنے دیتا کہ وہ ہر قسم کی طاقت و جبروت کے باوجود کچھ اس کا بگاڑ سکتے ہیں

ظالموں کے دربار میں ان کی سطوت و جبروت سے مرعوب نہ ہونا اور ان کی غلطیوں پر علانیہ انہیں ٹوک دینا بلاشبہ ایک نہایت جرأت آزما کام ہے اسی لئے حدیثوں میں کسی ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے حق کا اظہار کرنے کو کمال ایمان کی علامت بتایا گیا ہے لیکن اس کے علاوہ جرأت اور بے خوفی کے امتحان کے اور بھی بے شمار مواقع ہیں جن میں کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے سینوں میں ایمان کی انگیٹھی روشن ہوتی ہے۔ ان مواقع میں سب سے زیادہ صبر آزما اور ہمت شکن وہ موقع ہوتا ہے جبکہ میدان جنگ گرم ہو، تلواریں ہر طرف چمک رہی ہوں، تیروں کی بارش ہو رہی ہو، انسان کے جسم و اعضاء کٹ کٹ کر ادھر ادھر گر رہے ہوں اور موت بالکل سامنے کھڑی دکھائی دے رہی ہو۔ ایسی حالت میں بھی ہراسان نہ ہونا اور بے خوف و خطر اپنے کو موت کے منہ میں ڈال دینا یقیناً بہت بڑی جرأت و ہمت کا کام ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کے حالات پڑھو تو تم دیکھو گے کہ وہ کس بے خوفی کے ساتھ ہنستے ہوئے خطرات کا استقبال کرتے تھے اور لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا کہتے ہوئے اپنے کو موت کے منہ میں ڈال دیتے تھے، یہی جرأت تھی جس نے مسلمانوں کو فتوحات عراق کے سلسلہ میں اس بات پر آمادہ کر دیا تھا کہ اگر دجلہ کو پار کرنے کے لئے پل اور کشتی نہیں ہیں تو اپنے گھوڑے اس مواج اور زخار دریا میں ڈال دیں اور پھر رکاب سے رکاب ملا کر آپس میں باتیں کرتے ہوئے کنارے پر پہنچ جائیں۔

مشہور ہے کہ جب ایرانیوں نے، جو دوسرے کنارے پر موجود تھے، مسلمانوں کو اس طرح دجلہ پار کرتے دیکھا تو یہ

بیٹے کو دیوان اور دیوان اور بھاگ کھڑے ہوئے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق دجلہ کا اس حیرت انگیز طریقہ سے پار کرنا انسان کا کام نہیں ہوسکتا تھا۔ ایرانیوں کو اس پر حیرت تھی اور حیرت ہونی بھی چاہئے تھی کہ انھیں اس ہمت و جرأت کے سرچشمہ کا علم نہ تھا۔ مذہب نے ان کے دلوں میں جو جوش و استقلال اور ہمت و بے خوفی پیدا کر دی تھی اس کی لحاظ سے ان سے اس قسم کے کارنامے ظاہر ہونا معمولی بات تھی وہ مذہب کے نشہ میں اس طرح سرشار تھے کہ انھیں مطلق کسی خطرہ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ان کی یہی سرشاریاں تھیں جن کی بدولت انھوں نے مشرق و مغرب میں اپنا جھنڈا لہرا دیا

مسلمانوں کی موجودہ حالت

گو اس وقت مسلمانوں پر مذہب کا نشہ اتنا نہیں ہے جتنا قرن اول کے مسلمانوں پر تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اب بھی خدا کے تصور اور دارالجزا کے یقین کی بدولت ان کے اندر جرأت و بے خوفی اور ثبات و استقلال کے جو جوہر پائے جاتے ہیں ان سے دوسری قومیں بالکل خالی ہیں۔ ترکوں کی بہادری آج چہار دانگ عالم میں مشہور ہے، ان کے شجاعانہ کارنامے، دشمنوں سے بھی داد حاصل کرتے ہیں، اور بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ثبات و استقلال اور ہمت و شجاعت میں دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی یہاں تک کہ جرمنی کے ایک بہت بڑے اور مشہور جرنیل نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر اسے ترکی فوج کے زیادہ نہیں صرف ایک لاکھ سپاہی مل جائیں تو وہ انھیں کے ذریعہ تمام عالم کو فتح کر سکتا ہے۔ ترکوں کی ان خصوصیات کی وجہ سوا اس کے کیا ہے کہ ان کا ایمان خدا پر ہے اور وہ دارالجزا کے قائل ہیں

طرابلس غرب، برقہ اور بلقان وغیرہ میں اہل یورپ حکومتوں اور مسلمانوں کے درمیان سخت معرکہ آرائیاں ہوئیں اور اب تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں لیکن جو لوگ ان جنگوں کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی بے سروسامانی اور بے بضاعتی کے باوجود یورپ کے مہلک اور آتشیں حملہ کا مقابلہ کیلئے اور دشمنوں کے خون کی ندیاں بہادی ہیں۔

جنگ عظیم میں فرانس اور انگلستان کی طرف سے محکوم اسلامی ملکوں سے بے شمار مسلمان شریک ہوئے تھے ان کے متعلق واقف کاروں کا اعتراف ہے کہ جس پامردی اور استقلال کا ثبوت انھوں نے دیا کوئی جماعت اس کی مثال نہ پیش کر سکی۔

فلسطین کے تازہ واقعات آپ کے سامنے ہیں چند لاکھ نفوس پر مشتمل آبادی نے ایک مستحکم و منظم حکومت کا جس دلیری و بے جگری کے ساتھ اب تک مقابلہ کیا ہے اس کی مثال کسی دوسری قوم میں تلاش کرنا بے سود ہے حقیقت یہ ہے کہ اب بھی مسلمانوں کے اندر شجاعت و بسالت کے جوہر موجود ہیں اور اب بھی وہ اپنی ہمت و استقلال میں دوسری قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ان کی زمام ہے وہ خود ان صفات سے محروم ہیں عام مسلمانوں میں اب بھی جو قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں ان سے اگر کوئی کام لینے والا ہوتا تو ان کی حالت

۔۔۔ وہ ہوتی جو آج ہے

ذکر و توجہ کی قوت

باوجود اس وقت دنیا کی دوسری قومیں بہترین جنگی اسلحہ سے آراستہ ہیں اور ہر روز اپنی بری، بحری و فضائی طاقتوں میں اضافہ کرتی رہتی ہیں لیکن مسلمان اپنے مذہب کی بدولت اپنے اندر ایک ایسی طاقت رکھتے ہیں جس کا مقابلہ کوئی قوم اپنے مہلک ترین ہتھیار کے ذریعہ نہیں کر سکتی۔ یہ طاقت ان کے بے نظیر استقلال و جرأت کی طاقت ہے جس کے بغیر ہر قسم کے جنگی سر و سامان کے باوجود میدان جنگ میں کامیابی نہیں حاصل کی جا سکتی۔ اور جس کے ہوتے ہوئے اسلحہ اور فوج کی کثرت کی زیادہ ضرورت باقی نہیں رہتی مسلمانوں نے جس زمانہ میں دنیا پر اپنی حکومت قائم کی تھی اس وقت بھی وہ سامان جنگ کے اعتبار سے مقابل قوموں پر فوقیت نہیں رکھتے تھے لیکن ایمان نے ان کے دلوں میں وہ قوت پیدا کر دی تھی کہ آندھی کی طرح اٹھے اور تمام عالم پر چھا گئے۔ وہ قومیں جن سے ان کا واسطہ پڑا تھا دنیا کی طاقتور قومیں تھیں اور اپنی جنگی صلاحیتوں اور سر و سامان کی کثرت کے اعتبار سے خاص شہرت رکھتی تھیں لیکن مسلمانوں کے سامنے جم نہ سکیں اور خس و خاشاک کی طرح بہ گئیں۔ یہ قومیں اپنی فتح و ظفر کے لئے فوج کی کثرت اور اسلحہ کی زیادتی پر اعتماد کرتی تھیں، لیکن مسلمانوں کا سب سے زیادہ اعتماد ذکر اور توجہ الی اللہ پر ہوتا تھا۔ ان کا مذہب انھیں مخاطب کر کے کہتا ہے۔

یاایھاالذین اٰمنوا اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون	اے ایمان والو! جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم مراد پاؤ۔

اور ایک جماعت کا حال بیان کرتے ہوئے اسی ذکر و توجہ کو اس کی فتح مندی کی علت بتاتا ہے۔

ولما برزوا لجالوت وجنودہ قالوا ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکٰفرین فھزموھم باذن اللہ	اور جب روبرو ہوئے جالوت کو اور اس کی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارے ڈال دے ہمارے دلوں میں صبر اور جما کر رکھ ہمارے پاؤں اور مدد کر ہماری اس کافر قوم پر پس شکست دی مومنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے

تاریخ کے مطالعہ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے سلسلہ میں ہر چیز سے زیادہ اعتماد اسی طاقت پر کیا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے تین بار اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا جو ان کے دلوں کو ماسوی اللہ کے خوف سے خالی اور ایک خاص جوش سے معمور کر دیتا تھا اور سپاہیوں کو جانبازی پر آمادہ کرنے کے لئے قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں جن میں قیامت کے دن خدا کی راہ میں جان دینے والوں کی کامیابیوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ یہ آیتیں قلت و کثرت کے خیال سے انھیں غافل کر دیتی تھیں اور ان میں بے نظیر ہمت و استقلال کا مادہ پیدا کر دیتی تھیں۔ تاریخ کی بعض مستند کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب مسلمانوں نے رومی سیحیوں کے مشہور شہر اسکندریہ پر حملہ کیا اور اس کے محاصرہ میں آٹھ مہینے کا عرصہ لگ گیا تو اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلمان سالار لشکر حضرت عمرو بن العاص کے نام

خطبہ کا بعض کے چند فقرے یہ ہیں۔

..... پس جس وقت میرا خط آپ کے پاس پہنچے آپ نمازیوں کو جمع کر کے خطبہ دیں اور انہیں جہاد میں بہادری طرح اپنے جوہر شجاعت دکھانے کا شوق دلائیں اور کہیں کہ مسلمان اپنے حرکت و سکون میں صرف رب الارباب کی خوشنودی اور کلمہ حق کی تبلیغ کی نیت رکھے..... اور زیادہ موزوں یہ ہوگا کہ حملہ جمعہ کے دن زوال کے بعد کیا جائے کہ وہ نزول رحمت اور قبولیت دعا کا وقت ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ حق تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس سے مدد طلب کریں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے مسلمان غسل اور نماز و دعا کے بعد گئے تھے اور پہلے ہی حملہ میں شہر کو فتح کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا تصور، اس کی نصرت کی توقع اور مرنے کے بعد قیامت کے دن کامیاب اور پُر مسرت زندگی بسر کرنے کا یقین مسلمانوں میں بے خوفی، جرأت اور شوق شہادت کا وہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ دوسری قومیں اپنے سپاہیوں کو شراب پلا کر، یا فانی دنیا کے مال و دولت اور اعزاز کا طمع دلا کر اس کا عشر عشیر جذبہ بھی نہیں پیدا کر سکتیں اقبال نے سچ کہا ہے۔ ؎

مرد حر محکم ز ورد "لا تخف"	ما بمیدان سر بجیب او سر بکف
مرد حر از لا الہ روشن ضمیر	می نگردد بندۂ سلطان و میر

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو لوگ عقیدۂ توحید کے قائل ہوتے ہیں ان کے قلوب ہر قسم کے خوف و حزن سے پاک ہوتے ہیں۔ انسان ہر چیز سے زیادہ موت سے ڈرتا ہے لیکن جو لوگ موت ہی کو حیات سمجھتے ہوں انہیں پھر کس چیز کا خوف دامن گیر ہو سکتا ہے۔

مسلمان اور خوف الٰہی

اوپر کی سطروں سے آپ کو دھوکا نہ ہو کہ مسلمانوں کا دل بالکلیہ خوف و ہراس سے خالی ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک ماسوی اللہ کا تعلق ہے، اسے کسی چیز کا خوف لاحق نہیں ہوتا لیکن وہ بھی اپنے دل میں خوف محسوس کرتا ہے اور وہ محض خدا کا ہوتا ہے۔

شاید تم خیال کرو کہ جب ایمان کے بعد بھی خوف و ہراس سے نجات نہ ملی خواہ خدا ہی کا خوف ہو تو پھر کفر و شرک اور ایمان کی حالتوں میں فرق کیا ہوا؟ بیشک سوال قابل غور ہے لیکن آئندہ جب ہم ان دونوں کے خوفوں کا فرق اور خوف الٰہی کی حقیقت و ماہیت تفصیل سے واضح کریں گے تو اس وقت تم آسانی سے سمجھ لو گے کہ دونوں خوفوں میں اثرات و نتائج اور کیفیات و کیفیات کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ فی الحال اتنی بات یاد رکھو کہ ماسوی اللہ کا خوف

بےشمار مفاسد کا اور فساد کا خوف بےشمار بلاؤں کا باعث ہوتا ہے۔ انفرادی حیثیت سے دیکھو تو ماسوی اللہ کا خوف صرف یہی نہیں کہ ذہن ودماغ کو ہر وقت پریشانیوں میں مبتلا رکھتا ہے بلکہ اس کی بنا پر انسان مختلف قسم کی برائیوں اور خطاؤں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جھوٹ، مکر وفریب، خوشامد، تملق، بغض وحسد وغیرہ وہ تمام امراض جن کی اس وقت گرم بازاری ہے . . . . اور جن کی وجہ سے دنیا جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے اگر تم ان کے اسباب وعلل کا پتہ لگاؤ گے تو ان میں سے ہر ایک کی علت اسی خوف کو پاؤ گے۔ اسی بنا پر حکیم مشرق نے کہا ہے ؎

مکر و مکاری و کین و دروغ — این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

اور جب اجتماعی نقطۂ نظر سے اس خوف کے مفاسد پر غور کرو گے تو اس کے اثرات ونتائج اور زیادہ تباہ کن نظر آئیں گے دنیا میں وہ قومیں کبھی عروج نہیں حاصل کر سکتیں جن پر ہر آن خوف کا تسلط رہتا ہے۔ قوموں کے عروج کے لئے اولیں شرط یہ ہے کہ دنیا کی کسی چیز کا خوف لاحق نہ ہو آج یورپ کی موجودہ ترقیوں نے ہماری آنکھیں خیرہ کر دی ہیں لیکن کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اس نے میدان ترقی میں قدم اس وقت رکھا جبکہ اس نے احبار ورہبان اور امراء وسلاطین کے پنجۂ استبداد سے چھٹکارا حاصل کیا اور ان کی خدائی سطوت وجبروت کا انکار کر کے ان کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔

غرض ماسوی اللہ کا خوف مختلف خرابیوں کا باعث ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی قوم یا فرد راحت وسکون حاصل کر سکتا ہے اور نہ ترقی کے میدان میں گامزن ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے خوف الٰہی جو مومنین کا حصہ ہے انسان کو ان تمام فواحش ومنکرات اور ان تمام بداخلاقیوں اور بداعمالیوں سے روکتا ہے جن میں مبتلا ہونے والے ذاتی حیثیت سے بھی نقصان اٹھاتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی ہلاکت وبربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے دنیا میں بہتر زندگی اور فوز وفلاح کا جو وعدہ کیا ہے اس کے ایفا کی شکل یہ نہیں ہے کہ وہ زمین کو حکم دیدے کہ ان کے لئے اپنے تمام خزانے اگل دے آسمان سے کہدے کہ ان پر زر وجواہر کی بارش کرے اور فرشتوں کو بھیج دے کہ بادشاہوں سے تخت خالی کرا لیں اور ان پر انہیں متمکن کر دیں بلکہ اس وعدہ کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے اور یہی ایک اس کی شکل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب اور پیارے رسول کے ذریعہ جو اصول وقوانین بتائے ہیں، مسلمان ان پر عمل کریں۔ خدا کے احکام وہدایات کی تعمیل خود ہی انہیں اس راہ پر ڈال دے گی جو ترقی اور فوز وفلاح کی راہ ہے ...... جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں وہ ان کاموں سے باز رہتے ہیں جو شخصی اور ذاتی حیثیت سے یا قومی واجتماعی اعتبار سے مضر ہوں۔ اس کی مفصل بحث آگے آئے گی۔ (باقی)

معذرت:- اس پرچہ کی کتابت میری عدم موجودگی میں ہوئی ہے اس لئے غلطی سے بعض ایسے مضامین درج ہو گئے ہیں جو بہت زیادہ اصلاح وترمیم کے محتاج تھے۔ کاپیاں دیکھتے وقت میں نے اس قسم کے مضامین کو درست کرنے کی کوشش کی لیکن اس ڈر سے کہ کاپیاں بالکل چھلنی نہ ہو جائیں پوری طرح اصلاح وترمیم نہ ہو سکا اس مرتبہ کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں امید ہے ناظرین معذور سمجھیں گے۔ ادیب

یادِ اندلس

(۷)

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

عرب اندلس اور مادی علوم کی ترقیاں

اوپر جیسا کہ بیان کیا گیا ہے مسلمانوں کی توجہ ابتداً صرف مذہبی علوم کے ساتھ مخصوص رہی لیکن زیادہ دن نہیں گذرنے پائے تھے کہ ان کی بے چین اور سکون ناآشنا فطرت نے انھیں غیر مذہبی علوم سیکھنے پر آمادہ کر دیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے وہ کارنامے انجام دئے جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے۔ فلسفہ، ہیئت، طب، کیمیا، تاریخ، جغرافیہ، غرض کوئی ایسا علم نہ تھا جن میں انھوں نے کمال نہ حاصل کیا ہو اور خود انھیں درجہ کمال تک نہ پہونچایا ہو۔ ان علوم و فنون میں جن مسلمانوں نے کمال مہارت حاصل کی تھی ان کی تعداد بے شمار ہے اور ان کے حالات بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں حکومت اپنی تھی، حکمران علم و فن کے قدرداں تھے، ایجادات و اکتشافات پر انعامات مقرر تھے، اس لئے اہل علم، مصنفین اور مفکرین ہماری حالات کے برعکس، فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنی تصنیفات، اختراعات و اکتشافات میں مشغول رہتے تھے۔ ملکوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے بحر و بر کا سفر طے کرتے تھے، ایک ایک بوٹی کی تلاش میں صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھانتے تھے۔ تحقیق مسائل کی دھن میں شب و روز ایک کر دیتے تھے۔ کتنے ایسے مصنفین گذرے ہیں جن کی تصنیفات کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ ابن حزم کی تالیفات چار سو جلدوں پر مشتمل بتائی جاتی ہیں، اندلس کے ایک عالم عبد الملک بن حبیب نے ایک ہزار کتابیں لکھ ڈالیں ابو حیان جو اندلس کا ایک مشہور مورخ ہے، ساٹھ جلدوں میں ایک کتاب لکھی، احمد بن ابان جو قرطبہ کا افسر پولیس تھا، لغت میں ایک کتاب لکھی جو سو جلدوں میں تھی۔

ابو زید سلمان نے ہند و چین کا سفر کیا۔ ابن جبیر اندلسی نے سیاحت کے شوق میں مصر و شام، عراق و حجاز بلکہ عالم کی خاک چھانی اور ہر ایک نے اپنے سفرنامے ترتیب دئے جنھیں صدیوں بعد میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی۔ شریف ادریسی نے نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھ کر علم جغرافیہ پر بہت بڑا احسان کیا۔ ابن حیان، ابن خلدون، ابن خطیب نے فن تاریخ کی از سر نو بنیاد رکھی اور اسے ایک عظیم الشان فن بنا دیا۔

ابن باجہ، ابن رشد، علی بن خلف، احمد بن یوسف، عیسیٰ بن احمد، ابو عامر بن عقبہ، ابن عبد الرحمن بن سید نے دمریت یکارا سطور سقراط کے مردہ فنون کو جلا یا بلکہ ہر ایک نے فلسفہ میں اپنی الگ شاہراہ بنائی اور اس فن کو اوج کمال تک پہونچایا۔

اصبغ بن محمد، ابو اسحاق ابراہیم بن یحییٰ حسن بن عبد الرحمن نے علم نجوم میں مہارت تامہ حاصل کی اور حیرت انگیز آلات رصد وغیرہ ایجاد کئے۔

ابو عثمان سعید، ابو المطرف اور عبد الرحمن وغیرہ نے اپنی جستجو اور تحقیق و تدقیق سے علم طب کو اس درجہ بڑھایا کہ یہ ایک عظیم الشان فن بن گیا اور یہ اس کے بانی سمجھے جانے لگے۔ ابن خاطا اور زاد اندھا ہونے کے باوجود متعدد علوم بالخصوص طب میں بہت زیادہ مہارت رکھتا تھا اور باقاعدہ مطب کیا کرتا تھا۔

ایجادات و اختراعات کا جہاں تک تعلق ہے، ان کا درجہ اس میں دوسرے علوم کے مقابلہ میں پست نہ تھا پتھر سے شیشے بنانے کا طریقہ سب سے پہلے انھوں نے معلوم کیا۔ گھڑیاں انھوں نے ایجاد کیں، بارود بنانے کی خاص ترکیب انھوں نے سوچی، رصدگاہیں انھوں نے قائم کیں، کاغذ سازی کے بڑے بڑے کارخانے انھوں نے تعمیر کرائے فضا میں اڑنے کی پہلی کوشش اندلس ہی کے ایک فرد عباس بن فرناس نے کی۔ عربوں ہی نے علم طب اور فن کیمسٹری میں اوہام پرستی کی بیخ کنی کی، اور صرف عملی تجربوں پر ہر چیز کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے بہت سی ایسی چیزیں معلوم اور ایجاد کیں جن کے بغیر اس زمانہ کی کیمیائی تجربہ گاہیں بیکار ہو جائیں گی۔ مثلاً پوٹاس، سہاگا، گندھک، تیزاب وغیرہ وغیرہ غرض یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ دنیا انتہائی جہالت کے دور سے گذر رہی تھی، مسلمانوں نے علوم و فنون اور ایجادات و اختراعات کے سلسلہ میں وہ کام کئے جن کا دوسری قومیں اس زمانہ میں تصور نہیں کر سکتی تھیں۔

اگر عربوں نے ریاضیات، الٰہیات، کیمیا، وغیرہ یعنی ان علوم میں کمال نہ حاصل کیا ہوتا جنہیں اس وقت حقیقی علوم کہا جاتا ہے تو اندلس میں وہ عظیم الشان کارنامے نہ ظاہر ہوئے ہوتے جن کے آثار اب تک وہاں کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔ انہی علمی ترقیوں کی بنیاد پر عربی تہذیب و تمدن کی وہ مستحکم عمارت کھڑی تھی جس کے بعض آثار کو انیسویں صدی کا ایک ماہر فن ڈاکٹر روزیہ، بلنسیہ کے بندوں کی صورت میں دیکھ کر اپنی انتہائی حیرت و استعجاب کے اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے اور کمال تاثر کے ساتھ افسوس ظاہر کرتا ہے کہ یہ آثار مٹ رہے ہیں اور کوئی ان کو بچانے والا نہیں ہے۔

عربوں کے علوم و فنون کا اثر یورپ پر

آج یورپ ترقی کے جس بلند مرتبہ تک پہونچ گیا ہے اور اس کے مقابل میں مسلمان ذلت و پستی کے جس دور سے گذر رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے کون باور کر سکتا ہے۔ کہ کسی زمانہ میں یورپ کا درجہ مسلمانوں کا

سبق دیا اور مفسر و مقتدر تھا اور یہ کہ اہل یورپ نے انہی سے تہذیب و تمدن کے سبق سیکھے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے اور تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر ان کا عربوں سے میل جول نہ ہوتا اندلس کے مدارس میں وہ داخل ہو کر مسلمانوں کے علوم و فنون سے وہ مستفید نہ ہوتے اور انھیں اپنی زبانوں میں منتقل نہ کرتے تو ان کا موجودہ تمدن، صدیوں کے بعد موجودہ شکل میں ظاہر ہوتا۔ یورپ کی موجودہ ترقیوں نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے لیکن اجتماعیات کے واقف کار جانتے ہیں کہ یورپ کے تمدن کا قصر رفیع عربوں ہی کے تمدن و تہذیب کی بنیادوں پر قائم ہے عرب جس زمانہ میں علم و تحقیق کے دریا بہا رہے تھے۔ اہل یورپ جہالت کے قعر میں پڑے ہوئے تھے۔ اگرچہ، فرانس، جرمنی اسوڈن کے بسنے والے عربوں کے زمانہ تمام اندلس میں دوسرے ملکوں کے باشندوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن مورخین کا اتفاق ہے کہ علم، عمران، صناعت و زراعت ہر چیز میں ان کا درجہ اندلس کے مسلمانوں سے بہت زیادہ پست تھا۔ اسی لئے اس زمانہ میں یورپین ممالک کے طلبہ تحصیل علوم کے لئے اندلس کی یونیورسٹیوں کا قصد کرتے اور جب فارغ ہو کر اپنے ملکوں کو واپس جاتے تو خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ اگرچہ ابتداً مذہبی تعصب اور جہالت نے اہل یورپ کو ان مدارس سے مستفید ہونے سے باز رکھا۔ وہ عرصہ دراز تک انھیں نجس خیال کرتے اور ان میں داخلہ سے گریز کرتے رہے لیکن میل جول اور کثرت اختلاط کی بنا پر جب ذرا تعصب کم ہوا اور ان کے چند مذہبی پیشواؤں نے ان مدارس میں ... داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تو دوسروں نے بھی ان کی اقتدا کی اور ان مدارس سے کسب فیض کرنے لگے۔ اس زمانہ میں اندلس کو وہی حیثیت حاصل تھی جو اس وقت یورپ کو حاصل ہے۔ ہر قسم کے علوم کی تکمیل وہیں جا کر ہوتی تھی اور یورپین طلبہ کے لئے یہ بات قابل فخر تھی کہ وہ قرطبہ یا غرناطہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ یہ طلبہ اندلس سے جو علوم و فنون سیکھ کر جاتے تھے ان سے وہاں کے لوگ اس درجہ ناواقف ہوتے تھے کہ ان علوم کی بنا پر انھیں انسانوں سے بالاتر سمجھنے لگتے تھے۔ گربرٹ کو جس نے عربوں سے بہت کچھ سیکھا تھا اور جو بعد کو سلفسٹر کے نام سے روما کا پوپ بنا، لوگ اس کے علمی کمالات کی بنا پر جادوگر کہا کرتے تھے۔ غرض یہ ہے کہ یورپ نے اندلس کے عربوں سے جو علوم و فنون سیکھے اور ان کے اختلاط و معاشرت سے جو فوائد حاصل کئے ان کا موجودہ ترقی و عروج پر بہت گہرا اثر پڑا اور ان کی بے شمار علمی ترقیوں کی بنیاد ثابت ہوئے اگرچہ متعصب یورپین مصنفین کو یہ اعتراف بہت شاق گذرتا ہے لیکن ان میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے صراحتاً تسلیم کیا ہے کہ علوم و فنون میں اندلس کے عربوں کا درجہ اہل یورپ سے بہت بلند تھا اور وہی موجودہ تہذیب و تمدن کے بانی ہیں۔

موسیلیم جبانی کا قول ہے

ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ طب، فلسفہ فلک اور ان تمام علوم کا جو دسویں صدی ہجری کے بعد پھلے پھولے ہیں اصل سرچشمہ خصوصاً اسلام کے وہی ہیں۔ سیدیو نے اعتراف کیا ہے کہ عرب اخلاق، علم اور صنعت وغیرہ میں اسپین اور ہمسایہ ملکوں کے باشندوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے

تفسیر سورہ بقرہ

(۵)

(از امام اجل سید رشید رضا مرحوم)

ولھم عذاب عظیم اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے

عذاب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے تکلیف پہونچے یا جو زندگی کا لطف غارت کر دے مثلاً بھوک، پیاس، درد وغ
امام راغب فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اس لفظ کی اصلیت کے بارے میں اختلاف ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عذب الرجل
سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھانا (بعضوں کے نزدیک پیاس کی شدت کی بنا پر) اور سونا ترک کر دینے کے ہیں۔ اس اعتبار
سے تعذیب کے اصل معنی ہوئے، انسان کو بھوکا اور بیدار رہنے پر مجبور کر دینا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس کی اصل
عذب ہے جس کے معنی شیرینی کے ہیں گویا عذبتہ کے معنی ہوں گے اس کی زندگی کا لطف غارت کر دیا جیسے قذیتہ
کے معنی ہیں اس کی آنکھ کا تنکا نکال دیا یا مرضتہ کے معنی ہیں اس کا مرض زائل کیا اور کہا گیا ہے کہ اس کی اصل
تعذیب ہے جس کے معنی کوڑے کے عذبہ یعنی کنارے سے سخت مارنے کے ہیں اور بیضاوی کا قول ہے عذب نکال
کا ہم وزن اور ہم معنی ہے۔ عذب عن الشئ ونکل عنہ دونوں کے معنی رک رہنے کے ہیں۔ اسی سے ماء عذب شیریں پانی
نکلا ہے کیونکہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے چنانچہ اسی بنا پر ماء عذب کو نقاخ اور فرات بھی کہا جاتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ عذاب
کے اس معنی میں بہت وسعت پیدا ہو گئی اور ہر تکلیف کے لئے بولا جانے لگا اگرچہ وہ کوئی ایسی سزا نہ ہو جو مجرم کو آئندہ
ارتکاب جرم سے باز رکھے۔ الخ

عظیم حقیر کا ضد ہے اور کبیر صغیر کا اس لئے عظیم کو کبیر پر تفوق ہے یہاں پر عذاب کو نکرہ لایا گیا اس میں اس
بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک ایسی نوع کا عذاب ہے جو دنیا والوں کے لئے مجہول اور مبہم ہے یہ اس صورت
میں جبکہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے جو عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے شیخ نے جمہور
کی پیروی کرتے فرمایا کہ یہ تنکیر تعظیم اور تہویل کے لئے ہے لیکن اس کے باوجود اس کی وصف میں "عظیم" کا تذکرہ
اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا کہ عذاب کم و کیف ہر اعتبار سے انتہائی حد کو پہونچا ہوا ہوگا۔ سخت
تکلیف دہ ہوگا اور بہت زیادہ دیرپا ہوگا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ عذاب دنیا میں ہوتا ہے یا آخرت میں؟

قرآن کی ایک آیت ہے۔

لهم فی الدنیا خزی ولهم فی الاخرة عذاب عظیم | ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے

اس آیت سے نیز قرآن کی دوسری آیتوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام سے اور اس کے بتائے ہوئے طریق سے اعراض کرنے کا نتیجہ دنیا میں تنگی، تنگدستی ذلت اور بے عزتی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہوگا۔

اس موقع پر ایک شخص نے استاذ امام سے سوال کیا کیا آیت زیر بحث سے صراحۃً تکلیف بالمحال کا اثبات نہیں ہوتا؟ فرمایا نہیں۔ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے ہر قسم کے اختلافی مسائل چھیڑ دوں۔ میں صرف وہ معنی بیان کرنا چاہتا ہوں جو صحابہ کرام سمجھتے تھے اور ان میں سے کسی کے دل میں تکلیف بالمحال کا خیال بھی نہیں گذرتا تھا۔ تمام ائمہ بلکہ تمام امت کا اتفاق ہے کہ تکلیف بالمحال نہیں دی جاتی۔ خدا نے قرآن میں اس کی تصریح کردی کہ

لا یکلف الله نفسا الا وسعها | اللہ کسی نفس کو اس کی گنجائش سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

نیز احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بقیہ اختلافی باتیں قرآن عزیز سے بہت دور ہیں۔

ومن الناس من یقول آمنا بالله وبالیوم الاخر وما هم بمؤمنین۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ابتداء سورۃ سے قرآن کا اور لوگوں کی ان قسموں کا بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے قبول یا عدم قبول کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ تین جماعتوں کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔ دو جماعتیں وہ ہیں جو قرآن سے ہدایت یاب ہوتی ہیں۔ پہلی جماعت متقین کی ہے جن کا حال "الذین یؤمنون بالغیب الخ" کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور جن میں نشئین اور وہ منصف مزاج اہل کتاب داخل ہیں جو آفتاب ہدایت کے طلوع ہونے کے منتظر تھے اور دوسری جماعت وہ ہے جس کا تذکرہ آیت والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک میں بیان کیا گیا ہے اور جن سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب یا غیر اہل کتاب میں سے آنحضور صلعم پر ایمان لائے۔

ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان دونوں مذکورہ بالا جماعتوں کے مقابل میں دو اور جماعتیں پائی جاتی ہیں جن کی ہدایت کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ ان آخر الذکر دونوں جماعتوں میں سے پہلی جماعت کا حال ان الذین کفروا سواء علیهم الخ میں بیان کیا گیا ہے یہ جماعت دو قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے (۱) وہ لوگ جو منکر ہیں اور حق کی آواز سننا گوارا نہیں کرتے (۲) وہ لوگ جو حق کو پہچانتے ہیں لیکن عناد کی وجہ سے انکار و تکذیب کرتے ہیں اب جن آیتوں کی ہم تفسیر کرنا چاہتے ہیں ان میں چوتھی جماعت کے احوال بیان کئے گئے ہیں اور یہ جماعت ایسی ہے جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان آیات سے مراد منافقین میں سے وہی لوگ ہیں جو زمانہ نزول قرآن میں موجود تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

ومن الناس من یقول آمنا بالله وبالیوم الاخر | لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخر پر

اور ان کی طرف سے یہ نہیں کہا کہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ "وآمنا بک یا محمد" (اور اے محمد ہم تجھ پر ایمان لائے)
پھر یہ بھی خیال کرنا چاہئے کہ اس جماعت کے احوال اللہ تعالیٰ نے گذشتہ تینوں جماعتوں سے زیادہ بسط و تفصیل سے
بیان کئے ہیں اگر اس سے آنحضور صلعم کے زمانہ ہی کے منافقین مراد ہوتے تو ہرگز ان کا تذکرہ اس اہتمام کے ساتھ نہیں
کیا جاتا اور اس حالیکہ وہ خدا کے علم میں جلد مٹ جانے والے تھے۔

اصل یہ ہے کہ یہ آیتیں اپنے مفہوم میں بالکل عام ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ کے منافقین بھی
مراد ہو گئے ہیں منافقین کر جو اوصاف ان آیات میں بیان کئے گئے ہیں وہ ان پر اچھی طرح چسپاں ہوتے ہیں لیکن انہی کے ساتھ انہیں مخصوص نہیں
عام منافقین مراد ہیں۔ گذشتہ زمانہ کے بھی اور وہ بھی جو بعد کے زمانوں میں قیامت کے آنے تک پیدا ہوتے رہیں گے منافق
یہود و نصاریٰ صابی، مجوس اور ان تمام گروہوں سے ہوتے تھے جو کسی دین پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور آئندہ بھی انہی
سے ہوتے رہیں گے۔

یہاں پر منافقین کے متعلق یہ نہیں بیان کیا گیا کہ وہ ایمان بالانبیاء اور اعمال صالحہ کا بھی دعویٰ کرتے ہیں
حالانکہ یہ دعویٰ کرنے والے ان میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان بالآخرت ایمان بالعبادات کو متضمن ہے کیونکہ یوم آخر
کا علم انبیاء ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ قرآن کا اعجازی ایجاز ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ منافقین کی جماعت میں ایسے لوگ بھی تھے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے مثلاً یہودی
منافقین پھر کس وجہ سے ان کی تکذیب کی اور کس بنا پر ان سے ایمان کی مطلق نفی کی اور اس کی تاکید کے لئے "ما" کی خبر
پر حرف باء داخل کیا (وما ہم بمؤمنین) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ محض کورانہ اور تقلیدی ایمان رکھتے تھے۔ اس ایمان
کے اخلاق و اعمال پر ذرہ برابر بھی اثر نہ تھا۔ وہ نماز، صدقہ وغیرہ جو چند اعمال صالحہ کرتے بھی تھے تو محض لوگوں کے
دکھانے یا شہرت حاصل کرنے کے لئے۔ اور علاوہ بریں وہ جھوٹ، مکر و فریب، خیانت، طمع، افساد وغیرہ بے شمار برائیوں میں
مبتلا تھے چنانچہ ان کی ان برائیوں کو قرآن نے بھی بیان کیا ہے اور رواۃ حدیث نے بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ وہ خدا پر اس طرح ایمان نہیں لاتے تھے جس طرح لانا چاہئے یعنی اس طرح کہ اس پر ایمان لانے والا اس کی دانا
قدرت کا اچھی طرح احساس کرے اور یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے وہ دل کی باتوں کو
جانتا ہے، اندرونی بھیدوں سے واقف ہے، گویا اسے اپنے ظاہر و باطن ہر لحاظ سے خدا کو خوش رکھنا چاہئے۔ لیکن
منافقین کا یہ حال نہ تھا۔ وہ چند ظاہری عبادات انجام دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ انہیں سے خدا کو راضی کر لیں گے
اسی لئے ان کے متعلق فرمایا:-

یخادعون اللہ والذین آمنوا الخ — وہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں

باقی

عہد حاضر کی ایک مشہور شخصیت

مصطفیٰ کمال پاشا

(۹)

(از جناب عبد الحکیم صاحب بی اے)

مصطفیٰ کمال پاشا نہایت راسخ الاعتقاد مسلمان ہے۔ ایک بار کسی ملا صاحب نے سبز حریر کا ایک ٹکڑا جس پر چند آیتیں لکھی ہوئی تھیں ہدیتہً بھیجا مصطفیٰ کمال نے اُسے تبرکاً اپنی میز کے سامنے آویزاں کر دیا اور وہ اب تک موجود ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ترک پہلے ہے اور مسلمان بعد میں لیکن اس قدر تسلیم ہے کہ دنیا کے بہت سے لوگوں کی طرح مصطفیٰ کمال کا بھی یہی خیال ہے کہ مذہب افراد کے ذاتی رجحانات و تصورات سے متعلق ہے اور یہ کہ معاشرتی اور سیاسی معاملات میں مذہب کو ضرورت سے زیادہ دخل نہیں دینا چاہیے۔ جمہوریہ ترکیہ جس کی بنیاد سلطنت عثمانیہ کے اختتام کے بعد رکھی گئی ہے اگر چاہتی ہے کہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو تو ضروری ہے کہ پچھلے موانع و مشکلات پر قابو حاصل کرے۔ خلافت کا مسئلہ تنہا ترکی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ پوری دنیائے اسلام سے متعلق تھا پس ترکی کا بیرونی اثرات سے محفوظ رہنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ انہیں وجوہ کی بنا پر محکمہ خلافت حکومت سے الگ کر دیا گیا۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۲ء کو نیشنل اسمبلی کے ذریعہ سابق سلطان وحید الدین آفندی کی جگہ خلیفہ عبد المجید آفندی کا انتخاب عمل میں آیا خلیفہ کو امور سلطنت سے کوئی سروکار نہ رہ گیا مذہبی امور میں البتہ اس کی سیادت تسلیم کی گئی لیکن یہ صورت حال بھی کچھ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی، سولہ مہینے کے بعد ۱۹۲۴ء میں یہ نام کی خلافت بھی ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کمال نہیں چاہتا تھا کہ یہ برائے نام خلافت قائم رہے، بالکل ممکن تھا کہ کوئی جماعت پیدا ہوتی اور خلیفہ کو اس کے سابق حقوق و اختیارات دلانے کے لئے جمہوریہ ترکیہ سے برسر پیکار ہو جاتی اور اس طرح ملک پھر قدیم خانہ جنگیوں کا شکار ہو جاتا اور اتحاد و ترقی کی جو فضا پیدا ہو گئی تھی وہ پھر گدلی ہو جاتی اسی مقصد کے پیش نظر کمال نے ترکی سے خلافت کا مکمل طور سے استیصال کر دیا۔

یہ حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیے کہ نیشنل اسمبلی نے وحید الدین آفندی کو جس قسم کا خلیفہ بنایا تھا اُسے خلافت اسلام کے حقیقی تخیل سے کوئی لگاؤ نہ تھا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم امور مذہبی کے ساتھ ساتھ امور ... ملکی کے بھی مالک تھے، خلفائے راشدین کے زمانہ تک مذہب و سیاست دو الگ چیزیں نہیں تھیں اسی طرح خلافت میں وراثت کا رواج نہ تھا قوم جسے اس منصب جلیل کا اہل سمجھتی اُسے منتخب کر لیتی تھی لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی

برس بعد خلافت حلاث ہوگئی تیرہویں صدی عیسوی تک خلافت کا مرکز ہر حرکز عرب ہی۔ لیکن تیرہویں صدی عیسوی میں آخری عربی خلیفہ نے مصر میں بھاگ کر پناہ لی جہاں ایک سلمان خاندان حکمراں تھا۔ یہاں عرصہ تک خلیفا اور ان کی اولاد کی خلافت تسلیم بھی جاتی تھی لیکن امور سلطنت میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا یہاں تک کہ سلطان سلیم اعظم مصر پر حملہ آور ہوا اسے فتح کر کے خود اپنی خلافت کا اعلان کر کے قسطنطنیہ کو مرکز خلافت بنایا اس کے بعد عثمانی سلاطین ہی ساری دنیائے اسلام کے خلیفہ سمجھے جانے لگے۔ سلطان عبدالحمید کا زمانہ خلافت اس لحاظ سے نہایت بابرکت تھا کہ انھوں نے اتحاد ملی کی عظیم الشان کوششیں کیں اور یہ کوششیں بڑی حد تک مشہور بھی ہوئیں لیکن ۱۹۱۳ء کی جہاں سوز لڑائی کے بعد اتحاد اسلام کا تصور پارہ پارہ ہو کر رہ گیا عربوں نے خود ۱۹۱۵ء میں ترکی کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ انگلستان۔ فرانس اور روس کے مسلمان باشندوں نے بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ ترکی کی مخالفت کی۔ خود ہندوستان میں جہاں سترملین (۷ کروڑ) مسلمان بستے ہیں ترکی کے اس فیصلے پر کہ وہ جنگ عظیم میں جرمنوں کا ساتھ دے گی ایک عجیب ہنگامہ برپا ہوگیا۔ انگریزی حکومت کو یہ معلوم تھا کہ ہندوستانی سلمانوں کو ترکی سیاست سے گہری دلچسپی اور ہمدردی ہے لہٰذا اس نے سلمانوں کو یہ یقین دلا دیا کہ ترکی سے ہماری لڑائی مذہبی لڑائی نہیں ہے اور یہ کہ ہم ترکی مقبوضات پر دست اندازی نہیں کریں گے لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد ان سارے وعدوں کے خلاف بالکل اس طرح عمل کیا گیا گویا وہ کبھی کئے ہی نہیں گئے تھے۔ ہندوستانی سلمانوں نے اپنی توقعات کو اس طرح پامال ہوتے دیکھ کر زبردست ایجی ٹیشن کیا اس کا نتیجہ ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

مندرجہ ذیل سطور مصطفےٰ کمال کی کتاب سے جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی لی گئی ہیں ان سے معلوم ہوجائیگا کہ رفتہ رفتہ خلافت کے متعلق ترکوں کی ذہنیت میں کتنا زبردست انقلاب برپا ہوگیا تھا۔

"ہمیں بتلایا جاتا تھا کہ بادشاہ ظل اللہ یعنی زمین پر خدا کا سایہ ہے اور ہم سب اسکی ملک ہیں، زمین کی کوئی قوت خدا کے اس ارضی خلیفہ کی مخالفت کسی حال میں بھی نہیں کر سکتی اور یہ کہ ہمارے نظام تمدن اور اصول معاشرت سے بہتر دنیا میں کوئی تمدن نہیں ہے درانحالیکہ ملک میں ہر چہار طرف گوناگوں مصائب اور فاقہ مستی کی شکایت عام تھی۔ ہر سال ہمارے ملک کا کوئی نہ کوئی قطعہ ہم سے ضرور چھن جاتا۔ ہماری حکومت کا حال یورپ کی سب سے کمزور ریاست سے بھی بدتر تھا رشوت، قتل و خونریزی اور ہر طرح کی بداخلاقی ملک کی عام خصوصیات تھیں مزید برآں اپنی ہر ضرورت پر ہم یورپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لئے مجبور رہتے تاہم ہمارے لئے زمین پر خدا کا سایہ موجود تھا جس کی خدمت کے لئے چالیس بیویاں اور چالیس حسین اور خوبرو غلام رہتے۔ مدرسوں میں ہمیں سکھلایا جاتا تھا کہ دنیا کچھ نہیں اور بہشت سب کچھ ہے۔ اور بہشت کے تصور میں دنیا پر لات مار دینا عین اسلام ہے۔ ہماری جاعتی زندگی کو اندر ہی اندر گھن لگ رہا تھا۔ ہمیں حقیقت اور صداقت کا پتہ اس وقت چلا جب ہم نے مغربی علوم و فنون حاصل کئے ہم نے ان کی حالت

...سے ماند کیا اور کہا کہ فنی و مالی ترقیوں اور جامع و سائنٹفک طریق تعلیم کے ہر شعبہ میں وہ ہم سے بہت دور نکل گئے ہیں ہم پر یہ حقیقت کھل گئی کہ ظل اللہ کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ ایک مرمریں بت تھا اتنا کہ وہ ادیبان قاہرہ و ہندوستان کا کوئی بت ہو سکتا ہے۔ خدا کے رسول نے جس طرح تمام پچھلے بتوں کو توڑ ڈالا تھا اسی طرح ہم نے خلافت مدرسہ و دیگر اسی طرح کے سارے بتوں کو چور چور کر دیا۔ یہ تھا ہمارے انقلاب کا مقصد کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ہمیں اس سے کیا کیا فائدے حاصل ہوئے"۔

جب ۱۹۲۴ء میں اسمبلی نے خلافت کا قطعی طور پر استیصال کر دیا تو ساری دنیا کے مسلمانوں میں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی کی ایک عام لہر دوڑ گئی لیکن کمال اور اس کے رفقاء جو قدم اٹھا چکے تھے سختی کے ساتھ اس پر قائم رہے۔ حکومت ترکیہ نے ہندوستانی اور بیرونی مسلمانوں کا ترکی کے ساتھ ان کی غیر معمولی ہمدردی اور دلچسپی کے لئے شکریہ ادا کیا لیکن ساتھ ساتھ نہایت مودبانہ درخواست کی کہ ترکی کے اندرونی معاملات میں آپ حضرات مداخلت کی زحمت نہ فرمائیں۔

یہ حکم لگانا کہ ترکی سے خلافت کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہو گیا ابھی قبل از وقت ہے قطعیت کے ساتھ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ترکی سے یہ چیز ختم ضرور ہو گئی ہے اور یہ بھی قطعی ہے کہ مصطفےٰ کمال یا اس کے ہم خیال وزراء جب تک برسر اقتدار رہیں احیائے خلافت کا کوئی امکان نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ترک تبدیلی مذہب کے سبب معمولی شہری حقوق سے بھی محروم کر دیے جاتے تھے لیکن اب ترکی میں مذاہب و عقائد کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ گورنمنٹ کسی کے معتقدات میں دخل نہیں دے سکتی۔ اسلامی دنیا اب تک ترکی کے ان اقدامات پر آتش زیر پا ہے لیکن حالات سے یہ توقع ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے مسلمان ترکی کی جدید حکومت سے مخلصانہ دوستانہ روابط پیدا کر سکیں گے۔ اگرچہ خلافت ختم ہو جانے سے عالمگیر اسلامی اتحاد و اخوت کی توقعات بھی ختم ہو گئیں لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نقصان کی تلافی اس طرح ہو گئی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس سے پہلے جو عداوت و دشمنی کی زبردست خلیج حائل تھی وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اور امید ہوتی ہے کہ مستقبل میں ان کی باہمی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا اور ان کے تعلقات زیادہ خوشگوار اور دوستانہ ہوں گے مسلمان اپنے مقبوضات کے سوا ساری دنیا کو اب وطن نہیں خیال کریں گے اور مسلمانوں کی داخلی اخوت و ہمدردی کے بجائے بین الاقوامی اخلاص و محبت، اخوت و مساوات کی فضا پیدا ہو جائے گی۔

خلافت توڑ دینے کے بعد کمال خاموش نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد محکمۂ شریعت و اوقاف کو بھی اس نے توڑ دیا یہ عجیب بات ہے کہ باوصف اس کے کہ سولہویں صدی عیسوی سے قرآنی اور اسلامی آئین و ضوابط کے بجائے حکومت سلطانوں کے بنائے ہوئے ضابطوں پر کاربند تھی لیکن معلوم نہیں شریعت کے احترام کے لئے یا کسی اور

فرض کرتے محکمۂ شریعت و اوقاف کو عثمانی سلاطین نے برقرار رکھا تھا شیخ الاسلام بہت بلند مرتبہ شخصیت کا مالک تھا کیبنٹ کے محکموں میں سے ایک اس کے لئے مخصوص تھا شرعی عدالتیں جن میں شادی، طلاق اور وراثت کے مقدمے فیصل ہوتے تھے شیخ الاسلام ہی کے تحت ہوتی تھیں۔ اسمبلی نے شیخ الاسلامی کا منصب کیبنٹ میں ۱۹۱۹ء تک قائم رکھا لیکن ۱۹۲۲ء میں اسے توڑ کر بجائے اس کے "صدارت امور مذہبی" کا محکمہ قائم کیا اس کا تعلق تمام تر مذہب اور اعتقادات سے تھا اور براہ راست یہ محکمہ وزیر اعظم کے سپرد کر دیا گیا۔

۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو مذہبی مدارس بھی توڑ دیئے گئے ان کا سرمایہ اور ان کے اوقاف دوسرے مفید کاموں میں صرف کئے جانے لگے بعد ازاں درویشوں اور صوفیوں کی خاص خاص جماعتوں کو توڑ دیا گیا تکیے اور خانقاہیں حکومت کے قبضہ میں آگئیں ان میں فوجی تعلیم کے مدرسے کھول دیئے گئے ۱۹۲۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ترکی کے دستور حکومت میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن تین سال کے بعد یہ دفعہ بھی نکال دی گئی لیکن صدارت امور مذہبی کا محکمہ بدستور قائم ہے۔ پہلے حکومت کے تمام افسر اسلامی طریق پر قسم کھانے کی رسم ادا کرتے تھے لیکن اب وہ اپنے منصب اور عہدے قبول کرتے وقت عزت نفس کی قسم کھاتے ہیں۔ جمعہ کے بجائے اتوار تعطیل کا دن قرار دیا گیا ماہ و سال کا حساب نظام شمسی کے اصول پر رکھا گیا ہے قدیم تہوار رسم و رواج وغیرہ آہستہ آہستہ ختم ہو چکے ہیں

کمال زندگی کے ہر شعبے میں مکمل انقلاب دیکھنا چاہتا تھا اس نے ایک لمحہ بھی غفلت میں ضائع نہ ہونے دیا مذہبی اصلاحات سے فارغ ہو کر وہ سماجی، تعلیمی، اقتصادی، صنعتی اور تجارتی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہو گیا مغربی نقطۂ نظر سے ترکی میں عورتوں کی حالت حد درجہ ناگفتہ بہ تھی، پردہ، ان کی جہالت، پستی اور نااہلی کا سب سے بڑا سبب سمجھا جاتا تھا۔ ملکی ترقی کی راہ میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ پردہ تھا کمال نے ان تمام نقائص کو دور کرنے کے لئے عظیم اصلاحات کا ایک تانتا باندھ دیا اور چند روز میں ترکی کی طرح قلب ماہیت ہو گئی کہ لوگ حیرت کرنے لگے تعدد ازدواج کو اگرچہ شریعت نے جائز رکھا ہے لیکن اس اجازت سے مسلمان جتنا غلط اور ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں ظاہر ہے ترکی میں دو تین شادیاں کرنا ناپسندیدہ خیال کیا جاتا ہے۔ تعدد ازدواج کو ترکی حکومت نے بھی جائز رکھا ہے لیکن ضوابط قوانین کی اتنی پابندیاں لگا رکھی ہیں کہ عملاً یہ چیز ناممکن ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد مرد عموماً عورتوں کو ایک کنیز سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے لیکن اب عورت مرد کی برابر کی شریک سمجھی جاتی ہے ترکی میں کوئی تعلیم یافتہ خاتون اپنے جائز حقوق سے دستبردار ہو کر شادی نہیں کر سکتی وہ مرد عورت کے درمیان مکمل مساوات چاہتی ہے۔ برقعے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ چارشف کا استعمال بھی غیر مقبول ہو رہا ہے۔ عورت اور مرد آزادی سے ملتے ہیں، پبلک جلسوں میں خواتین کی گیلریاں عموماً خالی ہوتی ہیں مردوں کے ساتھ وہ بے تکلف تمام جلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ ٹریم اور ٹرین میں عورتوں کے لئے مخصوص گاڑیاں نہیں ہوتیں۔ لڑکیوں میں تعلیم اسی طرح عام ہے جیسے لڑکوں میں

عورتوں کے اسکول ہی میں عمل شروع ہو گیا ہے۔ اسکول اور مدارس لڑکیوں سے پُر نظر آتے ہیں اور ہر سال نئے نئے مدرسوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے جامعہ قسطنطنیہ نے قانون، طب اور اصول تعلیم میں بے شمار خواتین کو گریجویٹ بنا دیا ہے یہ خواتین یونیورسٹیوں سے نکل کر اپنی بہنوں میں تعلیم و تعلم سے گہری دلچسپی پیدا کر دیتی ہیں۔ ترکی میں خواتین کی ایک مشہور انجمن "مجلس تحفظ حقوق نسواں" کے نام سے موجود ہے۔ اس انجمن نے عورتوں میں عام بیداری اور تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ حکومت ترکیہ میں بھی اس انجمن کا خاصہ رسوخ ہے۔ معاشرتی اصلاحات کے سلسلے میں اس نے حکومت کو نہایت مفید اور گرانقدر مشورے دئے ہیں حکومت کی اجازت سے اس انجمن کے اراکین مسجدوں میں اپنے اغراض و مقاصد کی اشاعت کی خاطر تقریریں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی خواتین تجارتی، علمی اور دوسرے شعبوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔ شہروں میں فیکٹریاں، دوکانیں اور دفاتر ملازم عورتوں سے پُر ہوتے ہیں کچھ عورتیں۔ حفظان صحت، زچہ بچہ کی پرورش وغیرہ شعبوں میں ماہر ہیں انھوں نے بھی ملک کی نہایت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ غریب اور نادار عورتوں کو دستکاری۔ سینے اور بُننے کا کام سکھائیں تاکہ ان کی روزی کا سہارا ہو۔ سوئٹزرلینڈ کے ضوابط حکومت کو ترکی کا اصول بنا دینے کے بعد عورتوں کو وہی آزادی حاصل ہو گئی جو ان کی بہنوں کو مغربی ممالک میں حاصل ہے۔

ترکی نے بعض بعض جگہ مغرب کی بیجا تقلید بھی کی ہے عورتیں چھوٹے فراک پہنتی ہیں۔ رقص و سرود کی محفلوں میں بے باکانہ شریک ہوتی ہیں مردوں کے سامنے غمزہ و عشوہ کی نمائش بھی ہوتی رہتی ہے۔ سنا ہے ان کی کثرت ہوتی جاتی ہے۔ عورتیں عموماً لبوں کو پینٹ کرتی ہیں لیکن توقع کی جاتی ہے کہ ترک خواتین آزادی کے ان خارجی مظاہر کو ترک کر دیں گی اور آزادی کے صرف سچے اور صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھیں گی۔

ترکی کے تجدد کے سلسلے میں سب سے پہلے ۱۹۲۵ء والا ہیٹ کا قانون سامنے آتا ہے مسٹر ایف جے اسپنڈر کی کتاب "انقلاب مشرق" میں اقتباس کی سطریں یہ ہیں۔

"جب میں قسطنطنیہ آنے والے جہاز میں سفر کر رہا تھا تو برنڈسی کے مقام پر ہیٹ سے بھری ہوئی دو لاریاں ہمارے جہاز کا انتظار کر رہی تھیں۔ جہاز کے پہنچتے ہی اتنے زیادہ ہیٹ جہاز میں بھر دیے گئے کہ کپتان کو مجبوراً مزدوروں کو روک دینا پڑا اس نے بقیہ ہیٹ لینے سے انکار کر دیا۔"

"گذشتہ چند مہینوں سے ملک میں برابر جہاز اور ٹرینیں ہیٹ فراہم کر رہی تھیں لیکن مانگ اسی شدت کی تھی۔ کمال نے حکم نافذ کر دیا تھا کہ کوئی شخص لال ترکی ٹوپی نہ اوڑھے جو لوگ نافرمانی کرتے تھے سخت سزاؤں کے مستوجب قرار دئے جاتے تھے۔ جس روز ہمارا جہاز قسطنطنیہ میں پہنچا ایک ترکی اخبار میں میں نے پڑھا کہ پندرہ آدمی سرخ ترکی ٹوپی پہننے کے جرم میں گرفتار کئے گئے ہیں وہ حوالات میں ہیں اور اپنے مقدمے اور فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہیٹ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والے بعض رہنماؤں کو پھانسی تک کی سزا دی گئی چنانچہ آج پورے شہر قسطنطنیہ میں ایک بھی لال ترکی ٹوپی نظر نہیں آتی۔ ترکی ٹوپی کے علاوہ دوسری ٹوپی کا استعمال بظاہر ممنوع نہیں ہے لیکن ہیٹ کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ قلی، ریل، پھل بیچنے والے سب استعمال کرتے ہیں۔ ترکی میں ہیٹ کے قانون کی سب سے زیادہ مخالفت کی گئی خیال کیا گیا کہ سوائے یورپ کی اندھی تقلید کے اس میں کوئی فائدہ پیش نظر نہیں ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اسی قانون کے سبب مغربی ممالک ترکی معاملات کی طرف بہت زیادہ متوجہ ہوگئے کہا گیا ترک یا تو خود مہذب ہو ہی گئے وہ ہیٹ پہننے لگے ہیں" ممکن ہے کمال مغرب کے اہل الرائے حضرات سے یہ الفاظ سننے کا آرزومند رہا ہو۔

تعلیم کا رواج ترکی میں نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے اب تک ذریعہ تعلیم صرف وہ مذہبی مدارس تھے جو مسجدوں سے ملحق ہوتے تھے ان مدرسوں میں مذہبی تعلیم ہوتی تھی ان کے علاوہ وہ اسکول بھی تھے جنہیں غیر ملکی [illegible] خالص مغربی اصول پر چلا رہے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ۱۹۲۴ء میں کمال نے تمام مکاتب بند کرا دیے ان کی جگہ نئے اصول تعلیم کے بموجب سرکاری امداد سے بہت سے اسکول کھولے گئے۔ ابتدائی تعلیم سب کے لیے لازمی قرار دی گئی ان اسکولوں میں زبان، ادب، تاریخ، جغرافیہ اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ثانوی تعلیم کے مدارس لڑکوں اور لڑکیوں کے ٹریننگ کالج، نارمل اسکول بھی بکثرت موجود ہیں اور ان تعلیم گاہوں میں حکومت مفلس اور نادار لڑکوں کی امداد کرتی ہے ان کے لباس و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے معاوضے میں گورنمنٹ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد ان سے کچھ مختصر خدمات لیتی ہے۔

اعلیٰ قومی مدارس بھی قائم کیے گئے ہیں تمام ملک میں زراعتی کالج کھولے گئے ہیں۔ تجارتی اور ٹکنیکل اسکول قریب قریب تمام شہروں میں موجود ہیں۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی کی توسیع کی گئی ہے جدید اصلاحات کے بعد یہ یونیورسٹی ملک کی ذہنی و علمی زندگی کی روح رواں بن گئی ہے۔ غیر ملکیوں کے اسکول اور مدارس خصوصاً مشن اسکول بھی ترکی میں کافی تعداد میں موجود ہیں ان کا انتظام پسندیدہ ہے ان کا کام زیادہ تر عیسائیت سے [illegible] ہے ترکوں کا اعلیٰ طبقہ ان مدارس کو اور ان کی خدمات کو بنظر استحسان دیکھتا ہے۔ لیکن ترکی محکمہ تعلیم ان کے کورس طریقہ امتحان اور طرز تعلیم کی برابر جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے کچھ مخصوص ترکی مضامین ان مدرسوں میں لازمی قرار دیے گئے ہیں ان کا پڑھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے جب تک یہ مدرسے کسی مخصوص مذہب کی اشاعت کے ادارے نہ بن جائیں یا جب تک ان کی تعلیم سے ملک کے امن وامان میں کوئی رخنہ پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو حکومت اس وقت تک برابر ان مدارس کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے عام طور پر یہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے کہ جدید حکومت نے ملک کی تعلیمی حالت میں کایا پلٹ کر دی ہے سماجی معاشرتی اور ملکی اصلاح و فلاح تمام تر اسی جدید نظام تعلیم کی رہین منت ہے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ترکی کو روشن خیال یورپ اور امریکہ کی طرح روشن کر دینے کی ہر امکانی کوشش کی گئی ہے اور صحیح اور سچی ترقی [illegible]

علم طب اور عرب

(۲)

جاہلیت کے طبی اوہام

(از جناب مولانا تقی احمد صاحب صلاحی)

قدیم عرب نظر بد، آسیب، اور سحر کے بہت زیادہ قائل تھے اور بچوں کو ان سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کے گلے میں مختلف قسم کے منکے (تمائم) یا خرگوش کی پنڈلی کی ہڈی لٹکاتے تھے بچوں کو ام الصبیان سے بھی بچانے کی یہی صورت اختیار کی جاتی تھی۔ آسیب اور ارواح خبیثہ کو دور رکھنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ گلے میں مختلف قسم کی گندی چیزیں مثلاً حیض کی روئی یا کپڑے، مردے کی ہڈیاں وغیرہ لٹکاتے تھے اور چونکہ جنون اور دوسرے دماغی امراض ان کے نزدیک یہی ارواح خبیثہ پیدا کرتی تھیں، اس بنا پر جب کسی کے دماغ پھر جانے کا اندیشہ ہوتا تو اس کے گلے میں یہی نجس اشیاء باندھ دیتے نظر بند کے لگانے والے ان کے نزدیک انس وجن دونوں ہوتے تھے۔

اگر کسی شخص کی بیماری عرصہ دراز کے بعد بھی معمولی علاج سے دور نہ ہوتی تو وہ سمجھتے کہ بیمار نے مرض میں مبتلا ہونے کے پیشتر کسی سانپ، جنگلی چوہے، یا ساہی کو مار ڈالا ہے اور چونکہ یہ جانور جنوں کو محبوب ہیں، اس وجہ سے اسے جن لگ گیا ہے اور وہ اسے اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک کہ اس مقتول جانور کی دیت نہ ادا کی جائے اس وجہ سے وہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے اونٹ بنا کر ان پر غلہ یا خرمے سے بھرے ہوئے بورے لادتے جنھیں وہ لے کر شام کو کسی کی طرف جاتے اور کسی بل میں ڈال دیتے۔ ان لوگوں کی وہ رات وہیں بسر ہوتی۔ صبح کو جب وہ ان مٹی کے اونٹوں اور بوروں کو بکھرا ہوا اور اپنی اصلی حالت سے متغیر پاتے تو سمجھتے کہ دیت منظور ہو گئی اور مریض اچھا ہو جائے گا اور اگر انھیں اپنی اصلی حالت پر پاتے تو سمجھتے کہ دیت اپنی کمی کی بنا پر منظور نہیں ہوئی، اس سبب سے وہ بورے بھرے ہوئے مٹی کے چند اور اونٹ بھی اس بل میں داخل کر دیتے اور پھر صبح کو وہ برابر یہ زیادتی اس وقت تک عمل میں لاتے جب تک دیت بکھری ہوئی نہ ملتی یا یوں کہئے کہ منظور نہ ہو جاتی۔

مرض محبت کو دور کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ عاشق کو ایک شخص پیٹھ پر اٹھا لیتا اور دوسرا کسی جلتی ہوئی سلاخ سے اس کی دونوں رانوں کے درمیان داغ دیتا۔ بعض اوقات وہ اس کا دوسرا طریقہ یہ اختیار کرتے کہ ایک مہرہ کو جس کا نام "سلوان" تھا گھستے اور گھسے ہوئے سفوف کو پانی میں حل کر کے عاشق کو پلا دیتے۔

شب کوری کا مریض اپنا علاج اس طرح کرتا کہ اونٹ کے کوہان اور جگر سے ایک ایک ٹکڑا کاٹ کر آگ پر بھونتا

پھر اس میں سے ہر لقمہ کھاتے وقت اپنی انگشتِ سبابہ آنکھوں کی پلک پر پھیرتا اور یہ شعر پڑھتا ہے

فیا سنا منا دکبد | الا ذھبا بالھد بد
لیس شفا والھد بد | الا اسنام والکبد

(اے کوہان اور اے جگر، تم دونوں میری شبکوری کو دور کرو، شبکوری کا علاج سوائے کوہان و جگر کے کچھ نہیں)

مارگزیدہ کو اچھا کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اس کے گلے میں زیور اور گھونگرو لٹکا دیتے تھے۔ دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے شخص کی بہترین دوا کسی بادشاہ یا سردار کا خون تھا، اگر وہ اسے پی لیتا تو ان کے زعم کے مطابق اس کی شفا یقینی تھی۔

جب کسی لڑکے کے ہونٹوں پر پھنسیاں نکل آتی تھیں تو وہ ایک ٹوکری سر پر رکھ کر گلی کوچہ پھرتا اور باآواز بلند پکارتا پھنسیاں نکلیں، پھنسیاں نکلیں، کچھ کھانا دو، کچھ کھانا دو" عورتیں اس کی آواز سن کر روٹی، گوشت اور خرمے اسکی ٹوکری میں ڈال دیتیں، وہ لڑکا ان چیزوں کو کسی کتے کے سامنے پھینک دیتا۔ جب وہ انھیں کھا لیتا تو لڑکا سمجھتا میں اب اچھا ہو جاؤں گا۔ اگر کوئی دوسرا صحیح و سالم لڑکا کتے کے سامنے ڈالی ہوئی چیزوں میں سے کچھ کھا لیتا، تو وہ خود پھنسیوں کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا۔ پہلو میں نکلنے والی پھنسیوں کا علاج یہ تھا کہ کوئی جوسی جو اپنے حقیقی ماموں کا لڑکا ہوتا، اپنی انگلیوں میں اپنا لعاب دہن لگا کر ان پر بطور ٹوٹکے کے کچھ نشان کر دیتا تھا۔

پاؤں کے سُن ہونے کا علاج یہ تھا کہ مریض اپنے محبوب کا نام زبان سے لے۔ بخار کا مریض بعض اوقات کسی درخت کی شاخ میں کوئی دھاگا باندھ دیتا۔ جو شخص اس دھاگے کو کھولتا، بخار میں مبتلا ہو جاتا اور پہلا مریض شفا پا جاتا۔ کسی بستی کی آب و ہوا یا بیماری کے اثر سے بچنے کا طریقہ یہ تھا کہ اس میں داخل ہونے کے پیشتر تین مرتبہ گدھے کی بولی بولی جائے۔ اس کا نام انکے عرف میں "تعشیر" تھا۔

مشاہیر اطبارِ جاہلیت

کسی جاہلی طبیب کی مفصل سوانحعمری کسی مورخ نے تحریر نہیں کی تاہم چونکہ عنوانِ مذکور کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے، اس لئے ہم چند اطبا کے مختصر حالات، چند مستند کتابوں سے اخذ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) لقمان، اس شخص کی زندگی کے صحیح حالات اس قدر مجہول ہیں کہ اس کی شخصیت کا بھی وجود مشتبہ نظر آتا ہے بعض یورپین مصنفین کا خیال ہے کہ یونانی ایسپ اور عرب کا لقمان دونوں ایک شخص ہیں۔ اس امر کے تسلیم کرنے کے بعد کہ یہ شخص واقعی عرب میں موجود تھا، دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا لقمان حکیم اور لقمان بن عاد جو یمن کا ایک بادشاہ تھا، دونوں ایک ہیں یا مختلف اشخاص ہیں، بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں ایک شخص ہیں وہب بن منبہ نے اپنی تصنیف "کتاب التیجان" میں لقمان بن عاد کو علم و حکمت سے متصف ثابت کرنے کے بعد اس کے متعلق چند معاشکر

باتیں قلمبند کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ لقمان کو سو آدمیوں کی طاقت حاصل تھی، اس لئے خدا سے طول عمر کی دعا کی اس وجہ سے اسکو ۰۰ سو برس اور ایک روایت کی بناپر چار ہزار برس کی عمر پائی۔

لقمان نے قبیلہ بنو حمیر پر مدت دراز تک خوبی کے ساتھ حکومت کی۔ اس کا مشہور طبی مقولہ ہے کہ "ہر مرض کا آخری علاج جلتی سلاخ کا داغ ہے۔"

(۲) ابن حذیم۔ یہ طبیب قبیلہ تیم الرباب کا ایک فرد تھا۔ قدیم عرب اس کو اطبا کے زمرہ میں سب سے زیادہ ہوشیار اور قابل تسلیم کرتے تھے۔ داغ دینے والے طریقۂ علاج میں اس شخص کو خاص مہارت حاصل تھی۔ عرب لوگ جب اس طریقۂ علاج کے کسی ماہر کی تعریف میں مبالغہ کرتے تھے تو بالعموم یہ فقرہ استعمال کرتے تھے "ھو اطب فی الکی من ابن حذیم" اس کا زمانۂ حیات صاف نہیں معلوم صرف اتنا یقینی ہے کہ لقمان کے بعد سب سے زیادہ قدیم طبیب یہی شخص ہے۔

(۳) حارث بن کلدہ ثقفی، یہ شخص طائف کا باشندہ تھا۔ ایام شباب میں سیر و سیاحت کے شوق میں ایران کی طرف گیا۔ وہاں جب اس کا گذر شہر جندیشاپور کے شفاخانوں میں ہوا اور مختلف اطبا کے حلقۂ درس پر اس کی نظر پڑی تو طب کے شوق میں وہ وہیں ٹھہر گیا۔ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب "طبقات الاطباء" میں تصریح کی ہے کہ "اس نے باقاعدہ جندیشاپور کے طبی مدارس کی سند تکمیل حاصل کی"۔ زمانۂ تعلم ختم کرنے کے بعد بہت دنوں تک اس نے ایران ہی میں طبابت کا پیشہ کیا اور اکابر و اخیار کا علاج کر کے بہت زیادہ دولت کمائی۔ پھر وطن مراجعت کرنے کا خیال اسے لاحق ہوا اور وہ طائف لوٹ آیا۔ اس کی وفات ۱۳ھ میں اور دوسری روایت کے مطابق ۵۰ھ میں ایک زہر کے اثر سے ہوئی جو اسے ایک سال پیشتر پلایا گیا تھا۔ اس نے زمانۂ اسلام پایا اور بہت سے صحابہ کا علاج بھی کیا تاہم مشرف باسلام نہ ہوا

اس طبیب کی عرب میں وہی عزت تھی جو یونان میں بقراط کی تھی۔ امراض کی شناخت اور فن علاج میں قابلیت رکھنے کے علاوہ وہ سراپا ذہانت و ذکاوت کا مجسمہ تھا۔ بلوغ الارب جلد ۳ میں ایک روایت مذکور ہے کہ قبیلہ بنی ثقیف میں دو بھائی تھے جن میں بہت زیادہ میل و جول تھا۔ بڑا بھائی کسی ضرورت کی بنا پر سفر کو چلا، چھوٹے کو ہدایت کی کہ تم میری عدم موجودگی میں میری بیوی کی ہر طرح نگہداشت کرنا اور اس کے عصمت و عفت کا خیال رکھنا۔ اتفاق سے اس نے کسی روز اسے دیکھ لیا اور چونکہ وہ بہت حسین تھی فوراً عاشق ہو گیا، اب محبت میں گھل گھل کر روز بروز دبلا ہوتا گیا، اور اس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی، لوگ اس کو بہت سے اطبا کے پاس لے گئے لیکن بے سود۔ آخر میں وہ اسے حارث کے پاس لائے۔ تشخیص کرنے کے بعد جب اسے کوئی بیماری نہ ملی تو وہ فوراً تاڑ گیا، کہا "اس مریض کو تھوڑی شراب پلاؤ" پہلے جام شراب سے مست ہو کر عاشق نے اپنی معشوقہ کے کمال حسن کی تعریف کی پھر جب حارث کی ہدایت کے بموجب اسے دوسری مرتبہ شراب پلائی گئی تو اس نے معشوقہ کا پورا پتہ بتلایا اور صاف کہہ دیا کہ وہ میرے بھائی کی بیوی ہے

بڑے بھائی نے یمن کر اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور چھوٹے بھائی سے کہا کہ تم اس سے نکاح کرلو۔ بایں ہمہ اس نے غیرت
اور حمیت کے تقاضے کے بموجب اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھایا اور نکاح سے انکار کردیا۔

اس طبیب کے طبی مقولے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ فی الحقیقت حفظان صحت کے اصل اصول
ہیں، مثال کے طور پر چند ملاحظہ ہوں:

"تمام دوائیوں کی جڑ پرہیز ہے۔ تمام بیماریوں کا گھر معدہ ہے۔ بلا ضرورت دوا کا استعمال اتنا ہی مضر ہے جتنا مرض
کی حالت میں مفید ہے۔ غذا حتی الامکان بہترین، حسب مقدار، اور سویرے کھانی چاہئے۔ میوے بلا فصل ہرگز نہ کھانے
چاہئیں۔ شکم سیر کھا کر غسل نہیں کرنا چاہئے۔ بہترین گوشت بکری کا اور بدترین اونٹ اور گائے کا ہے۔ بہترین میوہ انار
اور ترنج ہے اور بہترین سبزی ہندبا اور خس ہے۔ شراب پانی ملا کر پینی چاہئے کیونکہ خالص پینے سے درد سر اور
انواع و اقسام کے دوسرے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ رات کو سونے سے پیشتر اجابت سے فراغت حاصل کر لینی چاہئے۔
گرمی کا ایک غسل جاڑے کے دس غسل سے بہتر ہے۔ شکم سیر کھا کر یا شراب پی کر مجامعت نہیں کرنی چاہئے۔ کھانا کھاتے
وقت غصہ و غضب سے بچنا چاہئے۔ جو شخص زیادہ روز زندہ رہنا چاہتا ہے اس کو تین باتوں پر عمل کرنا چاہئے غذا
سویرے کھائے، عورتوں کی صحبت کم کرے، قرض سے پرہیز کرے۔"

بصارت کے متعلق اس کا نظریہ بالکل نرالا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "آنکھ تین چیزوں سے مرکب ہے اس کا سفید حصہ
ایک قسم کی چربی ہے، سیاہ حصہ پانی ہے، اور پتلی ایک قسم کی ہوا ہے۔"

مناظرین نے حارث بن کلدہ کا ایک طبی مکالمہ جو اس کے اور کسریٰ کے درمیان واقع ہوا تھا، زمانہ مابعد میں بصورت
کتاب شائع کیا ہے۔

(۴) نضر۔ یہ طبیب حارث بن کلدہ کا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لڑکا تھا۔ اپنے باپ کی طرح اس نے بھی تحصیل
علم کے لئے مختلف مقامات اور خاصکر ایران کا سفر کیا اور علماء، فلاسفہ اور اطباء کی صحبت میں رہ کر متعدد علوم عقلیہ میں
دستگاہ حاصل کی۔ طبی معلومات اس نے بہت کچھ اپنے باپ سے بھی حاصل کیں۔ یہ طبیب اپنی قابلیت کے غرور
میں آنحضرت کو بہت ہی حقیر سمجھتا تھا، اخیر تک ان کا دشمن رہا اور اسلام نہ لایا۔ اس کی وفات ۲ھ ۶۲۴ء میں بدر کی
لڑائی میں ہوئی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں نے فتح پا کر اپنے بہت سے مخالفین کو جن میں نضر بن حارث بھی تھا، گرفتار
کیا۔ بعض قیدی تو زر فدیہ دے کر چھوٹ گئے لیکن نضر اور چند دوسرے اشخاص کے متعلق آنحضرت نے قتل کا فیصلہ
کیا اور فدیہ منظور نہ کیا۔ نضر مقتول ہو کر مقام اثیل میں دفن ہوا۔ اس کی بہن قتیلہ بنت حارث نے اس کا مرثیہ لکھتے
وقت آنحضرت کو ان شکوہ آمیز الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔

أمحمدٌ ولأنتَ ضنءُ نجيبةٍ — من قومها والفحل فحلٌ معرقُ

ما کان ضرك لو مننت وربما　　منّ الفتی وهو المغيظ المحنق
والنضر اقرب من اصبت وسيلة　　واحقهم ان کان عتق يعتق

(اے محمد) تم ایک شریف خاتون کے لڑکے ہو اور تمہارا باپ بھی شریف آدمی تھا، اگر تم اس پر نظرِ عنایت کرتے تو اس میں تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ انسان بسا اوقات غصہ کی حالت میں بھی دشمن پر نظرِ عنایت کرتا ہے۔ جن لوگوں کو تم نے گرفتار کیا تھا ان میں رشتہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ قریبی اور آزادی کا سب سے زیادہ حقدار نضر ہی تھا)

(۵) ابن ابی رمثہ تیمی، یہ طبیب قبیلہ بنو تمیم کی ایک نامور شخصیت اور حارث بن کلدہ کا معاصر تھا۔

۲- دورِ اسلام

شریعت اسلامیہ اور طب

اسلام نے ابتدا ہی سے طب کے متعلق وہ فیاضانہ رویہ اختیار کیا جس کی نظیر دوسرے قدیم مذاہب میں ہرگز نہیں مل سکتی۔ بانیٔ اسلام نے مبعوث ہونے کے بعد اپنے پیروؤں کو بارہا مرض کا علاج کرنے اور طبیب سے استشارہ کرنے کی ترغیب دی۔ آنجناب سے متعدد حدیثیں اس قسم کی مروی ہیں جن میں سے بعض تو مرض کے علاج کے استحباب اور بعض اس کے وجوب پر بھی دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا ہے کہ،

"ہر مرض کی کوئی نہ کوئی دوا ہے۔ جب دوا مل جاتی ہے تو مرض خدا کے حکم سے ضرور اچھا ہو جائے گا" (مسلم)

"اے خدا کے بندو علاج کرو، کیونکہ سوائے بڑھاپے کے خدا نے کوئی ایسا مرض نہیں پیدا کیا جس کی دوا نہ ہو" (ترمذی)

ایک دوسری حدیث میں ایک صحابی فرماتے ہیں کہ "میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا، یا رسول اللہ کیا یہ تمام جھاڑ پھونک جن کو پڑھ کر ہم اپنے اوپر دم کرتے ہیں، یہ تمام دوائیں جن سے ہم علاج کرتے ہیں، اور یہ تمام حفظ ما تقدم کے طریقے جنہیں ہم عمل میں لاتے ہیں خدا کے لکھے ہوئے فیصلہ کو ٹال دیں گے؟ آپ نے جواب دیا کہ ان جھاڑ پھونک اور دواؤں کی تاثیر بھی خدا ہی کا لکھا ہوا فیصلہ ہے" (مسند امام احمد)

ان احادیث میں سے، جنہیں ہم نے بطور مثال پیش کیا ہے، دوسری حدیث میں لفظ "علاج کرو" بصیغہ امر استعمال ہوا ہے اور امر بالعموم وجوب کے اظہار کے واسطے استعمال ہوتا ہے۔ تیسری حدیث میں اس جہل و حماقت کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے جس کی بنا پر بعض لوگ "رضا" "توکل" کے غلط معنی سمجھ کر اپنی دوا بھی نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ مرض تو خدا کا بھیجا ہوا ہے، جو کچھ خدا نے تقدیر میں لکھ دیا ہے، ہو کے رہے گا۔

اسلام نے اپنے مذہبی امور کے ضمن میں بھی طب کی ہر طرح سے قدر و منزلت قائم رکھی۔ اس نے عبادات کے متعدد ارکان، جو اس کے نزدیک فرض عین تھے، تدبیرِ صحت کے اصولوں کا خیال کرکے ضرورت کے موقعہ پر سا[قط]

کر دیا۔ تدبیر صحت کے اصول فی الجملہ تین ہی ہیں، حفظانِ صحت، استفراغ مواد فاسدہ، اور پرہیز۔ حفظانِ صحت کا
خیال کرکے اسلام نے سفر کی حالت میں روزہ کا فرض ساقط کر دیا کیونکہ سفر میں تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے اور کھانے
پینے کا معقول انتظام نہیں ہوتا، مسافر اگر اپنا روزہ قائم رکھے گا تو اس کی صحت میں خلل آ جانے اور بیمار ہو جانے کا
اندیشہ ہے۔ استفراغ مواد فاسدہ کی رعایت کی مثال اس کا وہ مشہور مسئلہ ہے جس کی بنا پر حج میں احرام باندھنے والوں
کے لئے یوں تو بالعموم سر منڈانا ناجائز ہے لیکن اگر سر میں کسی قسم کی شکایت یا مرض ہو جس کی بنا پر ابخرات ردیہ کا خارج
ہونا ضروری ہو تو اس وقت سر منڈانا جائز ہے۔ اسی طرح اصولِ پرہیز کی رعایت کرتے ہوئے اسلام نے مریض کو اس
وقت جبکہ پانی کے استعمال میں ضرر کا اندیشہ ہو، اس امر کی اجازت دی کہ وہ بجائے وضو کے تیمم کر سکتا ہے۔

طبیب سے استشارہ کرنے کی بھی بانی اسلام نے بہت زیادہ تاکید کی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ "آنحضرت
ایک مریض کی عیادت کے واسطے آئے اور کہا کسی طبیب کو بلاؤ۔ ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کیا آپ کی بھی یہی رائے
ہے، آپ نے فرمایا یقیناً کیونکہ خدا نے جس مرض کو پیدا کیا ہے اس کے لئے کوئی نہ کوئی دوا بھی پیدا کی ہے" (زاد المعاد جلد ...)
اسی باب میں بانی اسلام نے اس امر پر بھی بہت زیادہ زور دیا ہے کہ جس طبیب سے بیماری کے متعلق مشورہ لیا جائے وہ حتی الامکان
اپنے فن میں ماہر ہو۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں ایک شخص زخمی ہو گیا اور اس کے زخم سے
بہت زیادہ خون نکلنے لگا۔ اس شخص نے اپنے علاج کے لئے بنی انمار کے دو آدمی بلا بھیجے جو آ کر اسے دیکھنے لگے لیکن آنحضرت
نے ان سے پوچھا تم دونوں میں زیادہ ہوشیار طبیب کون ہے؟ (جو زیادہ ہوشیار ہو وہی مرہم پٹی کرے) ......
(موطأ امام مالک)۔ ایک دوسری حدیث میں آنحضرت کا یہ قول مروی ہے "جو شخص طبیب کی حیثیت نہ رکھتا ہو اور
علاج کرے تو اسے اپنی فاش غلطی کا تاوان دینا پڑے گا" (ابوداؤد و ابن ماجہ) یہ حدیث صاف صاف اس بات
پر دلالت کرتی ہے کہ بانی اسلام نے محض حاذق طبیب کو علاج کرنے کی اجازت دی ہے اور یہ کہ حتی الامکان بنا بر
احتیاط محض اس طبیب سے علاج کروانا چاہئے جو طب میں کافی تجربہ رکھتا ہو۔

مؤخر الذکر دونوں حدیثوں سے ضمناً یہ بات بھی متصور ہو سکتی ہے کہ جو شخص بھی اس سے تعارف پیدا کرنا چاہے
اسے ادھورا علم نہیں حاصل کرنا چاہئے کیونکہ اس قسم کا طبیب بہت ہی خطرناک ہو گا۔ اسی وجہ سے اس کام میں کمال پیدا کرنا چاہئے غالباً یہی آپ کی منشا
تھیں جنھوں نے زمانہ مابعد میں ہر کس و ناکس کو طبابت کرنے سے روک دیا جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں عام رواج تھا۔
اور نیز انہیں حدیثوں نے مسلمانوں کے دلوں میں علم طب میں انتہائی کمال حاصل کرنے کا خیال پیدا کر دیا۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو مسلم و غیر مسلم دونوں قسم کے اطباء سے استشارہ کرنے کی اجازت دی۔ خود پیغمبر اسلام
نے بعض صحابہ کے علاج کے واسطے حارث بن کلدہ کو بلا بھیجا حالانکہ یہ طبیب اخیر تک مشرف باسلام نہ ہوا، متعدد روایتوں
میں اس کے علاج کا تذکرہ موجود ہے، یقیناً آنحضرت کا یہی عمل تھا جس نے زمانہ مابعد میں خلفاء بنی امیہ کو اس امر

کی طرف متوجہ کیا کہ اپنے دربار میں عیسائی اور یہودی اطبا کو جگہ دیں۔

فرزندانِ اسلام نے شروع ہی سے اپنے پیغمبر کے لئے طب کی طرف مائل ہونے کے واسطے ہر قسم کے سامان بہم پہنچا رکھے تھے اور اس کے مذہبی مسائل میں اس قسم کا کوئی عنصر موجود نہ تھا جو فنِ طب کے اصول و مقاصد سے ٹکراتا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ بعد میں مسلمانوں کو اس فن سے بہت زیادہ محبت ہوگئی اور انھوں نے اس کی فضیلت سے متاثر ہوکر وہ مشہور موضوع حدیث "العلم علمان، علم الادیان وعلم الابدان" اختراع کی۔

طبِ نبوی اور اس کی حقیقت

حدیث کی کتابوں میں محدثین نے "طب النبی صلعم" کا ایک عنوان قائم کرکے آنحضرت کے بہت سے طبی ارشادات نقل کئے ہیں۔ ان ارشادات میں متعدد دواؤں کے ساتھ ساتھ فصد، جراحی اور جھاڑ پھونک کا بھی ذکر موجود ہے۔ دوائیں زیادہ تر از قسم مفردات ہیں۔ بعض بعض جگہ دو دو چیزوں کے مرکب کے استعمال کی ہدایت کی گئی ہے۔ محدثین کا خیال ہے کہ اس قسم کی تمام حدیثوں میں جن طبی امور کا اظہار کیا گیا ہے وہ فی الحقیقت الہاماتِ خداوندی ہیں جو آنحضرت کی جانب القا کئے گئے۔ وہ یقیناً صحیح اور قطعی ہیں اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے، ابن قیم جوزی فرماتے ہیں۔

"آنحضرت کا طب اطبا کے طب کے مثل نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت کا طب تو یقینی، قطعی، اور خداوندی ہے اور اس کا مصدر وحی، نورِ نبوت، اور کمالِ عقل سے ہوا ہے۔ بخلاف اس کے اطبا کا طب زیادہ تر تجربات اور ظنی اشیا پر مشتمل ہے۔ اگر بہت سے مریضوں کو طب نبوی سے فائدہ نہیں ہوتا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ فائدہ اسی کو ہوسکتا ہے جو اس کو کامل اعتقاد اور ایمان کے ساتھ استعمال کرے، اس کی مثال بعینہٖ قرآنِ مجید کی سی ہے جس کے متعلق خدا "شفاء لما فی الصدور" کی صفت استعمال کرتا ہے حالانکہ یہی قرآنِ مجید شافی ہونے کے باوجود منافقین کے مرض کو اور بھی زیادہ کرتا ہے (جس کی وجہ سوائے بے اعتقادی کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں)" (زاد المعاد جلد ۳ ص ۲۹)

نووی نے شرح مسلم میں اس قسم کی حدیثوں پر اعتراض کرنے والوں کو "المعترض الملحد" کے لفظ سے یاد کیا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان حدیثوں پر اعتقاد رکھنا مسلمان کے واسطے لازمی ہے۔

ہمارے خیال میں محدثین کو اس موقع پر بہت کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیثیں بادیہ نشین جاہلی عربوں کے طبی خیالات کی ترجمانی کررہی ہیں۔ طب نبوی کا وہ حصہ جس کا تعلق صرف جھاڑ پھونک سے ہے، بیشک بانیٔ اسلام کی ایجاد کردہ شے ہے، لیکن دواؤں اور جراحی کا بیشتر حصہ پرانے بدوی عربوں کے خیالات سے ماخوذ ہے، گو اس امر کا امکان ہے کہ ان مفرد دواؤں میں سے بعض کو آنحضرت نے خود تجربہ کرکے تجویز کیا ہو۔ زمانۂ قدیم سے عرب کے بڈھوں اور بڑھیوں میں جو طب منقول ہوتا چلا آرہا تھا، اسی کو آپ نے

بطور استحباب یا اجازت بیان کر دیا ہے ان طبی حدیثوں میں بہت سی بے اصل اور ناقابل فہم باتیں ہیں جو ان کو الہام و وحی ہونے کے بالکل منافی ہیں مثلاً

پیچش اور بدہضمی کا علاج شہد تجویز کیا گیا ہے (صحیحین) حالانکہ صحیح تحقیق کے مطابق شہد خود مسہل ہی ہے پھر اسہال کے ازالہ کے واسطے کیونکر مفید ہو سکتی ہے؟ اگر اس مریض کو جس کا ذکر اس حدیث میں ہے شہد سے فائدہ ہو گیا تو اس کے یقیناً دوسرے اسباب رہے ہوں گے نہ کہ مسہل نسخہ شہد ۔ عہد جاہلیت میں شہد کو بطور مسہل استعمال کرنے کے علاوہ کبھی غلطی سے پیچش اور بدہضمی کے لئے استعمال کرتے رہے ہوں گے لیکن علمی اصول سے اس کی غلطی ثابت ہو گئی ہے اور اس میں شبہ کی گنجایش نہیں ۔

بخار کا علاج ٹھنڈے پانی کا غسل بتایا گیا ہے (صحیحین) حالانکہ غسل اور بخار میں کوئی مناسبت ہی نہیں ۔

زہر کا حفظ ما تقدم یہ تجویز کیا گیا ہے کہ صبح کو سات خرمے کھا لئے جائیں (صحیحین) بعض دوسری روایتوں میں زہر کی دوا بھی خرما ہی بتائی گئی ہے (نسائی و ابن ماجہ) طبی تحقیقات کے لحاظ سے خرما ان دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا ۔

اس قسم کی اور بھی متعدد مثالیں ہیں جن میں ایسی باتوں کا اظہار کیا گیا ہے جو طبی اصولوں کے بالکل مخالف ہیں ۔ چونکہ محدثین نے ان روایتوں کو بالکل وحی اور الہام تصور کر لیا تھا ، اس بنا پر انھیں ان .... کی بہت سی پیچدار اور بارد تاویلیں کرنی پڑیں ، کبھی تو انھوں نے یہ کہدیا کہ یہ دوا آنحضرت نے محض اہل عربستان یا بالخصوص اہل حجاز کے لئے تجویز کی تھی ۔ کبھی یہ کہ یہ دوا آنحضرت نے فلاں مرض کی محض مخصوص قسم کے لئے تجویز کی ۔ کبھی یہ کہ یونانیوں نے جو طبی اصول قائم کئے وہ محض اپنے ملک کے مزاج اور آب و ہوا کے لحاظ سے نہ کہ عرب یا دوسرے ملکوں کے حالات کے لحاظ سے اور کبھی جب بالکل تاویل کی گنجایش نہ دیکھی تو انھوں نے یہ کہدیا کہ آنحضرت نے اس بات کو کسی ایسے نکتہ کی بنا پر فرمایا ہے جہاں تک اطبا یونان کی نظر ہرگز نہیں پہونچی وغیرہ وغیرہ

ہمارے نزدیک اس قسم کی تاویلوں کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ آپ نے محض ماحول کے طبی خیالات بطور استحباب یا اجازت بیان کر دئے ہیں ۔ اور اس بنا پر وہ محض ظنی امور ہیں اور غلط ہونے کا احتمال رکھتے ہیں ۔ اس سے آنحضرت کی ذات پاک پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا کیونکہ آپ نے خود "انتم اعلم بامور دنیاکم" کے اعلان سے اس قسم کے شبہ کا دفعیہ کر دیا ہے ، ہم اپنی اس رائے میں منفرد نہیں ہیں بلکہ علامہ ابن خلدون کا بھی یہی خیال ہے وہ فرماتے ہیں ۔

وللبادیة من اهل العمران طب یبنونه فی غالب الامر
علی تجربة قاصرة علی بعض الاشخاص متوارثاً
عن مشائخ الحی و عجائزه وربما یصح منه البعض

عرب کے بادیہ نشینوں کے پاس ایک قسم کا طب تھا جس کی بنیاد
ان لوگوں نے صرف چند اشخاص پر تجربہ کرکے ڈالی تھی اور
وہ قبیلہ کے بڈھے اور بوڑھیوں سے بطور وراثت منتقل ہوتا

الا انہ لیس علی قانون طبیعی ولا علی موافقۃ المزاج وکان عند العرب من ھذا الطب کثیر وکان فیھم اطباء معروفون کالحرث بن کلدۃ وغیرہ والطب المنقول فی الشرعیات من ھذا القبیل ولیس من الوحی فی شیٔ وانما ھو امر کان عادیاً للعرب (مقدمہ عنوان علم الطب)

چلا آتا تھا۔ اس کا بعض حصہ کبھی کبھی صحیح ثابت ہو جاتا لیکن وہ کسی طبی قانون یا موافقت مزاج پر مبنی نہیں تھا۔ عربوں کے پاس اس قسم کا طب بہت تھا اور ان میں بہت کو مشہور اطبا بھی مثلاً حارث بن کلدہ وغیرہ گذرے ہیں۔ اور وہ طب جو شرع میں منقول ہے اسی قسم کا ہے وہ وحی کا کوئی جزو بھی الہامی نہیں ہے۔ یہ محض ایک ایسی چیز ہے جو عربوں کے درمیان معتاد و مروج تھی۔

اس کے بعد علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ آنحضرت محض اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ ہم کو شریعت بتلاویں نہ اس لئے کہ طب یا اس قسم کی دوسری متعادہ اشیاء سکھاویں۔ بہر کیف اس "طب نبوی" کا بیشتر حصہ عرب میں پہلے سے متعارف تھا اور اس بناء پر ان طبی حدیثوں میں ایسی باتیں مل سکتی تھیں جو جاہلی عربوں کے طبی تجربات کے عنوان کے ماتحت درج ہو سکتی تھیں لیکن احتیاطاً ہم نے وہاں محض وہی باتیں لکھیں جو ہمیں جاہلی طب کے متعلق صاف صاف کتابوں میں مل سکیں احتمال تھا کہ طب نبوی میں کچھ باتیں خود آنحضرت کی تجربہ کی ہوئی ہوں۔ (باقی)

دُرِّ منثور

(مولانا ظفر علی خاں صاحب مدظلہ)

نام کا زندہ بن منت میں بدنام نہ ہو
ظرف ہی جب نہیں عالی تو مے آشام نہ ہو

نہیں سوائے شہادت تو نہ کہلا مسلم
ہند میں موجب رسوائی اسلام نہ ہو

اس سے کافر سے نزدیک ہے سو بار اچھا
جس مسلمان کے پیش نظر انجام نہ ہو

آپ کہتے ہیں پرایوں نے کیا ہم کو تباہ
بندہ پرور کہیں اپنوں ہی کا یہ کام نہ ہو

مرغ دانا سنبھل اور دانہ کے لالچ میں نہ آ
اس کے نیچے کہیں ہم رنگ زمیں دام نہ ہو

یوں تو ہے شرم پیمبر کی انہیں بھی لیکن
جی میں ڈرتے ہیں کہ ناراض کہیں شام نہ ہو

نعمتیں خوان صحافت کی ہیں ساری بے لطف
اگر اس مائدہ میں لذت دشنام نہ ہو

علم بخشا ہے تو دے ذوق عمل بھی یا رب
عزم ہی کیا ہے وہ جس کے لئے اقدام نہ ہو

استوار اپنے خدا سے جو ہمارا رشتہ
تو کبھی بھی گلۂ گردش ایام نہ ہوا

(بہارستان)

مجدد ملت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(از حافظ شاق [illegible] مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڑھ)

اس حقیقت سے تاریخ داں واقف ہے کہ جب کسی قوم میں فساد و خرابی پیدا ہوجاتی ہے، اور لوگ صراط مستقیم سے ہٹ کر غلط راہ اختیار کرلیتے ہیں، تو خدا اس قوم میں ایسے افراد پیدا کرتا ہے جو نہایت بلند ہمت اور اولو العزم ہوتے ہیں جن کا باطن ہر طرح کی خرابیوں سے پاک ہوتا ہے۔ جن کے قلوب میں خدا ایک ایسی روشنی ودیعت کردیتا ہے جس سے وہ بالکل صحیح اور فطری راہ اختیار کرتے ہیں حق گوئی ان کا شیوہ ہوتا ہے اور ان کی فطرت سچائی کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھلی ہوئی ہوتی ہے کہ سچائی کے خلاف کوئی بات اس میں آہی نہیں سکتی وہ دنیاوی جاہ و جلال اور دنیاوی شان و شوکت بالکل پسند نہیں کرتے۔ جس کام کو وہ شروع کرتے ہیں اس میں صرف اس قادر مطلق پر بھروسہ رکھتے ہیں جس کے دست قدرت میں مطلق عالم کی کلید ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے پائے ثبات میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی تزلزل نہیں پیدا کرسکتی، انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ہم کوئی دعوت پیش کریں گے تو ساری دنیا دشمن ہو جائے گی۔ جس کام کو کرتے ہیں اس میں کوئی ذاتی فائدہ مدنظر نہیں ہوتا، بلکہ اس سے قوم و ملک کی خدمت مقصود ہوتی ہے، وہ اپنے قیمتی اوقات اور مساعی کو قوم کی بہبود و درکھنے اور اس کے اندر بیداری کی روح پیدا کرنے کے لئے صرف کرتے ہیں، اپنی لمبی لمبی عمریں قوم کی فلاح و بہبود میں گذار دیتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ قوم تمام راہوں کو چھوڑ کر صرف اس راہ کو اختیار کرے جو کتاب اللہ و سنۃ رسول اللہ کے مطابق ہے، ایسے ہی لوگ مسلمانوں کے ہادی و راہبر ہیں ان ہی کی اقتدا کرکے ہم راہ یاب ہوسکتے ہیں، ان کی مثال آفتاب کی سی ہے جس کی روشنی سے ہر شخص مستفید ہوتا ہے، ان ہی خدا کے سچے اور مخلص بندوں میں سے شاہ ولی اللہ صاحب بھی ہیں، آج کی صحبت میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ حالات اور کارنامے اختصار کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں ممکن ہے ان کا مطالعہ ناظرین کیلئے مفید اور دلچسپی کا موجب ثابت ہو۔

آپ کی ولادت

۱۱۱۴ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ دہلی میں پیدا ہوئے آپ کا نام نامی عظیم الدین تھا، آپ کے والد شیخ عبدالرحیم ہندوستان کے مشاہیر علماء میں سے ہیں، آپ کا نسب نامہ سلسلہ بسلسلہ حضرت عمر فاروقؓ تک پہونچتا ہے آپ کے بچپن کے حالات کا ہمیں زیادہ علم نہیں ہے کیونکہ اسوقت کسی کو یہ علم نہ تھا کہ آپ آئندہ ایک جلیل القدر عالم ہوں گے، ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ساری دنیا آپ کے بحر علم سے سیراب ہوگی، بڑے بڑے بادشاہ آپ کے آستانۂ علم پر گردن جھکائیں گے اور آپ کی عظمت و بزرگی کا شہرہ دور دور تک پہونچیگا تاہم بچپن کے بہت کچھ حالات محفوظ چلے آتے ہیں جن کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا

پانچ سال کی عمر میں آپنے کلام پاک پڑھنا شروع کیا، اور سات سال کی عمر میں اس کو حفظ کر لیا اس کے بعد فارسی کی تعلیم میں مشغول ہو گئے، اور تھوڑی سی مدت میں زبان فارسی میں کافی استعداد پیدا کر لی، پھر عربی شروع کی اور پندرہ سال کی عمر میں اس زبان کے جملہ علوم و فنون سے فراغت حاصل کر لی، تعلیم کے اختتام پر آپکے والد مولوی عبدالرحیم نے ایک مجلس منعقد کی جس میں وقت کے اکابر علماء و فضلاء جمع ہوئے اور تمام نے بالاتفاق آپ کی علمی فضیلت وکمال کا اعتراف کیا۔ اس کے چند ہی سال بعد آپ نے صوفیائے کرام (نقشبندی) کے طریق پر اپنے والد مولوی عبدالرحیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

کتابوں کے مطالعہ میں آپ کی مشغولیت

آپکے مطالعہ کا یہ حال تھا کہ ہمہ وقت گوشۂ تنہائی میں کتابیں لے کر پڑے رہتے تھے، کتابوں ہی کو اپنا مصاحب سمجھتے یہی رنج و غم کی حالت میں تسکین کا باعث ہوتیں، شب و روز کتابوں کیساتھ سرگوشیاں کرنے کے سوا آپکا کوئی کام نہ تھا کھانے کا وقت آتا اور چلا جاتا لیکن آپکو خبر نہیں ہوتی، صبح سے بیٹھتے شام ہو جاتی درمیان میں محض نماز کے لئے اٹھتے، گویا جسمانی و روحانی ہر قسم کی غذا کتابوں ہی کے مطالعے سے آپ کو حاصل ہوتی تھی اسی ان تھک کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ نے علمی میدان میں وہ عظمت پیدا کی جو آپکے ہمعصر علماء میں کسی کو حاصل نہ ہوئی علوم و فنون میں جو مرتبہ آپ کو حاصل تھا اس کی مثال تلاش کرنا اس عہد میں بے سود ہے۔

آپ کا علمی مرتبہ

آپنے جب درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو لوگ جوق در جوق کتساب علم کے لئے آتے اور آپ کے بحر علم سے سیراب ہو کر واپس جاتے، تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ آپ کی علمی روشنی سے ساری دنیا منور ہو گئی۔ اس عہد کے بڑے بڑے جلیل القدر علماء نے آپ کی علمی قابلیت کا لوہا مان لیا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو آپ کی لیاقت کا معترف نہ ہو۔ تمام فرقوں اور جماعتوں . . . . کے یہاں آپ کا یکساں مرتبہ تھا تصوف کے بارے میں آئمہ کرام کا جو اختلاف اور مسائل کی جو تفصیلیں ہیں ان سے آپ کو پوری پوری واقفیت تھی، مختلف علوم و فنون میں آپ کی بہت سی تصنیفات موجود ہیں جن سے آپ کی معلومات وکثرت علم کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اہل ہند ان کتابوں کے باعث دوسروں پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے، آپ کی جلالت و بزرگی پر تمام لوگوں کو قدیم زمانہ میں بھی اتفاق تھا اور آج بھی ہے اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کے . . علماء میں صرف آپ ہی کی ذات اقدس ایسی ہے جس کا احترام تمام اسلامی جماعتیں یکساں کرتی ہیں تو بجا نہ ہوگا و ذالک فضل من اللہ یوتیہ من یشاء،

یہ مسلم امر ہے کہ ایک مذہب کا پابند دوسرے مذہب کے پیرو کو، ایک ہم عصر دوسرے ہمعصر کو، ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا، وہ کبھی اپنے مخالف کی خوبیوں کا معترف نہیں ہو سکتا، وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ

ہمارا ہمعصر ہم سے بلند مرتبہ ہوتا ہے، اس کے باوجود بھی آپ کے محاسنِ اخلاق آپ کے علمی کمالات و فضائل کا آپ کے ہمعصر
بھی کا اقرار معاصرین ہر مذہب کے علماء نے کیا یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ اگر گذشتہ زمانوں
میں ہوتے تو جو فضل و کمال خدا نے آپ کو عطا کیا تھا اس کی بنا پر امام مجتہد کہے جاتے تمام علوم میں آپ خود اپنی نظیر تھے۔
آپ کی یہ تعریف گذشتہ ہی زمانہ میں نہ تھی بلکہ آج بھی انھیں اوصاف سے آپ کو متصف کیا جاتا ہے۔ اگر آپ میرے ان الفاظ
کی تصدیق چاہتے ہیں تو پھر نواب صدیق حسن خاں کے خیالات کا بغور مطالعہ فرمائیے۔ اگرچہ نواب صاحب کے مسلک اور
آپ کے مسلک میں کچھ اختلاف ہے، پھر بھی ان لفظوں میں مدح خواں ہیں اگر وجودِ او در صدرِ اول و زمانۂ ماضی
می بود، امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد۔ اسی قسم کی رائیں اور بہت سے اکابر علماء کی آپ کی مذہبی فضیلت
علمی مرتبہ کے بارے میں موجود ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس سے قطع نظر اہل ہند کی وہ اخلاقی حالت جو آپ سے پہلے
تھی مختصراً لکھوں۔ تاکہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ آپ نے مسلمانوں کی حالت میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔

ہندوستان کی حالت

آپ کے قبل مسلمانانِ ہند کی علمی حالت نہایت ابتر تھی، کتاب اللہ و سنت رسول سے بے حد بے اعتنائی برتی
جا رہی تھی۔ قرآن مجید سے انھیں کوئی شغف نہ تھا، قرآن پڑھتے بھی تھے تو اس طرح سے کہ ان کے دل میں کوئی جوش
نہیں پیدا ہوتا، ان کی تمام تر توجہ فقہ و فلسفہ یونان کی طرف لگی ہوئی تھی، انھیں علوم کے حصول و ترقی میں وہ اپنی
ساری عمر گذار دیتے تھے، اس طرح کی مذہبی بے اعتنائی اور جہل و جمود کی داغ بیل اسی وقت سے پڑ چکی تھی جبکہ چنگیز و
تیمور کے پیہم حملوں نے مسلمانوں کو بہت زیادہ افسردہ خاطر کر دیا، ان کے سامنے کوئی قابل اطمینان راہ باقی نہ رہ گئی
تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا سارا علم اور ان کی تمام متاع دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی، اس کے بعد جو علم ان کے پاس باقی
رہ گیا تھا اس کی بھی حفاظت نہ کر سکے، مذہب نام کو باقی رہ گیا لم یبق من الدین الا اسمہ ولا من العلم الا رسمہ،
کسی چیز کی حقیقت سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا، کورانہ تقلید ان کا طرۂ امتیاز تھی، چاپلوسی سے خاص شغف تھا، جہل و
جمود انتہا کو پہنچ گیا تھا، عبد و معبود کا رشتہ کٹ چکا تھا، جب کارسازِ عالم نے دیکھا کہ ان کی یہ حالت یوماً فیوماً ترقی کرتی
جا رہی ہے، یہی نہیں کہ صرف اہل ہند ہی ان امراض میں مبتلا ہیں بلکہ تمام عالم ان کا شکار ہو چکا ہے، تو خدائے مقدس نے
اپنا وعدہ پورا کیا اور حضرت شاہ صاحب کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے پیدا کیا، آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے دنیائے
اسلام میں کونسا تغیر پیدا کیا؟ مسلمانوں میں کونسی روح پھونکی؟ انھیں علم و معرفت کے کس درجہ پر پہونچایا؟ آپ نے مسلمانوں
میں وہ روح پیدا کی جو ۱۲۰۰ برس پہلے ان کے اندر تھی، انھیں علم و معرفت کے اس آخری زینہ پر پہنچا دیا جہاں سے وہ
اپنی غفلت کی بنا پر گر کر تنزل کے غار عمیق میں پہنچ گئے تھے، برائیوں سے بچنے اور اچھائی کی طرف رجوع ہونے کی ترغیب
دی، جس ٹھیک راہ سے ہٹ کر وہ غلط راہ پر لگ گئے تھے پھر اسی پر لگا دیا، اور یہ بتلایا کہ جو گروہ جس راہ کو اختیار کرے

اپنی عقل و دانش سے جانچ کر کہ آیا ٹھیک ہے یا نہیں، آپ نے جو انقلاب مسلمانانِ ہند کی حالت میں پیدا کیا اسکی ساری دنیا معترف ہے، اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو علمی و مذہبی بیداری موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے اندر موجود ہے، آپ ہی کی مساعی حسنہ کا نتیجہ ہے، ورنہ کبھی کو مسلمان اپنے جہل و جمود کے سبب ہلاکت کے شکار ہو چکے ہوتے۔ علمائے ہند میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو آپ کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل آپ کے دامنِ تربیت میں پلے، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا تاہم آپ کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر ہو سکتے ہیں؟ حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہ سے پہلے بہ نسبت دوسرے ممالکِ اسلامی کے مسلمانانِ ہند کی حالت "اگفتہ بہ" تھی، دنیا کے دوسرے مسلمانوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو محقق تھے، اندھی تقلید سے انہیں ... نفرت تھی، جس طریقہ کو اختیار کرتے خوب سوچ سمجھ کر، گو مسلمانانِ ہند کی طرح منطق و فلسفہ کے دلدادہ وہ بھی تھے تاہم قرآن سے ان کا رشتہ بالکل منقطع نہیں ہوا تھا لیکن مسلمانانِ ہند اس کے بالکل برعکس تھے، ان کی ساری توجہ منطق و فلسفہ میں لگی ہوئی تھی۔ قرآن کے سمجھنے کے لئے مخصوص علوم و فنون تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ جب تک کوئی ان میں پوری دستگاہ پیدا کرے ناممکن ہے کہ وہ کلام پاک کے مطالب و معانی سمجھ سکے، اتفاق سے اگر کوئی ان علوم کو حاصل بھی کر لیتا تو وہ بھی آزاد ہو کر قرآن مجید میں غور و تدبر نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ان تمام خیالات کا تتبع کرنا پڑتا تھا جو اسلاف میں سے بعض نے اپنی کوتاہ فہمی و عقل کی بنا پر قائم کر لئے ہیں۔ حدیث کے بارے میں بھی ایسا ہی حال تھا، جو کچھ اسلاف لکھ گئے ہیں ان کو تسلیم کرنا ضروری تھا، بعینہٖ ہمیں اسلاف کی رایوں پر عمل کرنا چاہئے لیکن جینا بن کر نہیں، ہمیں بھی عقل دی گئی ہے، ہم میں بھی غور و تدبر کا مادہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں یہ خیال صحیح ہے یا غلط کوئی ضروری نہیں کہ ایک شخص کے تمام خیالات ٹھیک ہی ہوں، ہو سکتا ہے کسی وجہ سے اس نے غلط سمجھا ہو، یا یہ کہ اس کا دماغ اس حقیقت تک نہ پہنچ سکا ہو جہاں دوسرے کا ذہن آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ اگر کوئی توفیق خداوندی سے کسی حدیث کے بارے میں واضح سے واضح دلیل بیان کرتا تو وہ قابلِ قبول نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ الٹے اسی کو سزا کا مستحق قرار دیا جاتا، چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے شیخ نظام الدین سلطان الاولیاء کا مسئلہ سماع کے متعلق اس عہد کے علماء کے ساتھ مناظرہ ہوا جب وہ اپنے دعویٰ پر کوئی حدیث پیش فرماتے تو تمام علماء بالاتفاق اس کا انکار کر دیتے اور کہتے ہم حدیث کو حجت نہیں سمجھتے فقہ سے آپ استدلال کیجئے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہلِ ہند کا اس وقت حدیث کے بارے میں کیا مسلک تھا؟ (باقی)

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۰ ملاحظہ ہو)

نہ پیش آتی امید مذکورہ بالا شبہ پیدا ہوتا بلکہ وہ بھی سلف کی رائے سے اتفاق کرتے اصول بالا کی روشنی میں اس آیت کی تاویل ہو گی کہ جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو خدا انہیں جانتا بھی نہیں کہ انکا وجود بھی ہو تو خدا کی یہ لاعلمی مستوجب ہے کہ عدم وجود کی دلیل ہو گا۔

فہم قرآن کے اصول یہی ہیں جب تک یہ مسلمات نہ ہوں گے تب طالب قرآن کے سامنے ہوں گے وہ بہت سی ٹھوکروں سے محفوظ رہ سکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوسکا تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا قدم کہاں پھسل جائے۔

رسم ورواج کی تباہ کاریاں

چودہویں صدی کی دختر کشی

(جناب محمد عطاکریم صاحب ظرافت نظام پوری)

اس وقت جبکہ اسلام اور اسلامی تہذیب اپنے عروج وارتقار کی آخری حد کو طے کرنے کے بعد پھر رفتہ رفتہ رجعت قہقری کر کے اسی نقطہ پر پہونچ چکی ہے جہاں سے آج تیرہ سو برس پیشتر مصلح اعظم نے اسے اپنی روحانی تعلیم کے ذریعہ انتہائی بلندی پر پہونچا دیا تھا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ آج ایام جہالت کی تہذیب اور کہیں اسلام کے پردہ میں رائج ہو گئی ہیں؛ دوسرے ممالک کے حالات سے قطع نظر کر کے جس وقت ہم ہندوستان بالخصوص صوبہ بہار کے مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت، رسم ورواج پر نظر ڈالتے ہیں تو بلاشبہ ہمیں عرب کے ایام جہالت کی زندہ تصویر نظر آتی ہے، اسلام کا بنیادی اصول جس سے ایک انسان اپنے کو مسلمان کہنے کا مستحق ہو سکتا ہے وہ شرک و بدعت سے احتراز کلی ہے۔

لیکن صد حیف! ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد ایسے انسانوں کی نظر آتی ہے جو بزعم خود مسلمان ہیں مگر حقیقت میں اسلام سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں ہر شہر ہر قصبہ قریہ میں سیکڑوں آدمی رات دن شرک و بدعت میں مبتلا رہ کر علی الاعلان ماسوا اللہ کو پوجتے ہیں،

کہیں مزاروں کو سجدہ کیا جاتا کہیں مُردوں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اور کہیں فقیروں اور پیروں کی اللہ سے بڑھ کر پرستش کی جاتی ہے۔

اگرچہ ان میں معتد بہ تعداد عورتوں کی ہوا کرتی ہے مگر مرد بھی کچھ ہی پیچھے ہیں اور اگر بالفرض صرف عورتیں مبتلائے شرک ہیں تو من حیث مذہب مرد وعورت کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اور کوئی مرد عورتوں کی نقص عقل وجہالت کا عذر دکھلا کر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جو عورتوں کے متعلق اُس پر عائد ہوتی ہے کیونکہ یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اگر ہم اپنی عورتوں کو تھوڑی بہت بھی مذہبی تعلیم اور اس کے ساتھ ان کے پیدائشی حقوق دے دئے ہوتے تو پھر کوئی وجہ نہ تھی جو آج وہ اس طرح صریح گمراہیوں میں مبتلا ہو جایا کرتیں خداوند تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں عورتوں کے تذکرہ میں صاف اور صریح طور پر ان کے حقوق کو

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ	اور ان (عورتوں) کا بھی حق ہے جیسا کہ ان (مردوں) کا ان (عورتوں) پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو ان (عورتوں) پر کچھ فضیلت ہے

فرما کر واضح کر دیا ہے۔

پیغمبرِ اعظم نے بھی اپنے اعمال و اقوال سے روحانی زندگی میں مرد و عورت کا حصہ برابر کر دیا، البتہ مادی زندگی میں ان کی تخلیق کی کمزوری کا لحاظ کر کے باریک سا فرق ضرور فرما دیا ہے۔ صنفِ نازک سے متعلق اسلام کی یہی وہ مایہ ناز خصوصیت ہے جس نے اسے حق کے تمام مذاہب پر ایک نمایاں فوقیت حاصل کر لی۔ لیکن ہم نے کیا کیا؟ ان کے تمام وہ حقوق جو فرمانِ خدا اور حکمِ رسول کے مطابق ان کو ملنے چاہئیں ہمیشہ کے لئے غصب کر لئے اور انھیں اپنا دائمی قیدی بنا لیا، قیدی بھی ایسا قیدی جس کی زندگی کے پنجرہ پر ہماری حکومت کا فولادی پنجہ ہمیشہ مسلط رہا کرتا ہے۔ یہاں پر قیدی کے ہونے نے پردہ کے متعلق بھی کچھ شبہ پیدا کر دیا ہے جو ایک حد تک درست ہے، قیدی سے میرا مطلب پردہ کی مخالفت نہیں البتہ میں پردہ کی اس سختی کا ضرور مخالف ہوں، جو شریعتِ اسلامیہ سے بڑھ کر گئی ہے اور ہماری خودساختہ شرافت کا ایک جزو ہے، جس کی رو سے کسی شریف عورت کو اس بات کا حق باقی نہیں رہتا کہ وہ ریل، موٹر اور جہاز پر برقعہ اوڑھ کر تھوڑی دور پا پیادہ بھی اپنے خاص لوگوں کے ساتھ سفر کر سکے، یہی وہ پردہ ہے جس نے پل بھر میں ہماری ہزاروں بے گناہ عورتوں کا صفایا کر دیا، اور ہم اپنی خودساختہ شرافت کو لئے ہوئے منہ تکتے رہ گئے "آرا، اٹہ، ضلع شاہ آباد کی قربانی یاد ہوگی جہاں برادرانِ وطن کے "امن شدہ" ہاتھوں عمل میں آئی جن کے ہاں گؤ ہتیا ایک سنگین جرم ہے انھوں نے محض معمولی جانور کے قصاص میں ہماری ہزاروں قیمتی جانیں تلف کر دیں، لیکن اس قتلِ عام میں جتنی جانیں ضائع ہوئیں ان میں مردوں کی تعداد ایک ربع سے بھی کم تھی، اس کی وجہ ہرگز یہ نہ تھی کہ عورتوں کی تعداد کا تناسب ہی یہ تھا بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ وہ بے چاریاں پردہ کی ماری اپنے قیدخانہ کے محدود حلقہ میں سہم کر رہ گئیں جہاں انھیں نہایت آسانی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اور ان کے شریف و غیرت دار مرد ان مجبور بے بس قیدیوں کو چھوڑ کر دشمن کے حملے سے بہت پہلے پہونچ چکے تھے جہاں ان کی حیادار زندگی ہر طرح پر محفوظ تھی پردہ کی اس سختی کو دور کرنے کی جہاں کہیں بھی تحریک کی جاتی ہے تو اس کا جواب صرف یہی دیا جاتا ہے۔ کہ ہندوستان دارالحرب ہے، اغیار کی نظروں سے اپنی عورتوں کا بچانا ہم پر فرض ہے جو بغیر سخت پردہ کے ناممکن ہے لیکن یہ کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ اگر ہندوستان واقعی دارالحرب ہے تو یقیناً ہمیں اپنی عورتوں کو پردہ کے شرعی حکم کے ماتحت ایسی تعلیم دینی چاہئے کہ اگر یہ حضرت خولہ کی طرح میدانِ جنگ میں نہ لڑ سکیں تو کم از کم اپنے مردوں کے ساتھ راہِ فرار اختیار کرنے کے لائق تو ہو جائیں۔

یہی حال ہماری تمام تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج کا ہے، روحانی تہذیب جو اسلام کی جان تھی کب کی رخصت ہو چکی، ظاہری تہذیب و اخلاق کا یہ حال ہے کہ جتنی اچھی اور شریفانہ خصلتیں تھیں قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں نہ اب وہ اخلاص ہے نہ ہمدردی، نہ صداقت ہے نہ دیانتداری نہ ایفائے عہد ہے نہ پرہیزگاری، بلکہ ان کی جگہیں فریب اور ریاکاری، جھوٹ اور بددیانتی، وعدہ خلافی اور بدکرداری نے لے لیں جس کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبہ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔

ازدواجی زندگی کا تو اور بھی بُرا حال ہے پیشتر فی صدی ایسی شادیاں ہوا کرتی ہیں جن سے مرد و عورت کی زندگی کامیاب ہونے کے بدلے اور بھی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کی وجہ بے جوڑ شادی کے سوا اور کچھ نہیں، شادی کے پہلے ایک دوسرے کا دیکھ لینا تو درکنار صرف استمزاجاً پوچھ لینا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے کہ باپ یا ولی صرف اپنی پسند پر شادی جیسی اہم چیز کا فیصلہ کیا کرتے ہیں جو زیادہ تر بلکہ برابر ناکام ثابت ہوا کرتی ہیں" ان میں ایسے باپ یا ولی کی بھی کمی نہیں، جو لالچ میں پڑ کر اپنی نوجوان لڑکیوں کو صد سالہ بڈھے سے بیاہ کر دولت و ثروت کی قربان گاہ پر ہبشٹ کے لئے بھینٹ چڑھا دیا کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں عموماً چند دنوں میں لڑکی بیوہ ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن ایسے بے حس افراد کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی بلکہ وہ مال و دولت کے ہاتھ آجانے کی مسرت میں اس کی عبرتناک زندگی پر دو چار قطرے افسوس گرانے کے عوض دل ہی دل میں مسرور ہوا کرتے ہیں کیونکہ حقیقتاً ان کا منتہائے مقصد یہی ہوا کرتا ہے،

ہمارے عقد و نکاح میں رسم و رواج کو بہت کچھ دخل ہے عورت کو تو خیر سوسائٹی نے اس کا حق ہی نہیں دیا کہ وہ زبان سے اقرار یا انکار کر سکے صرف اپنی قسمت پر جی بھر کر رو سکتی ہے وہ بھی اگر ان کے بس کی بات ہوتی تو اس کی اجازت بھی مشکل تھی، البتہ مرد کو کچھ اختیار ہوتا ہے مگر اُسے بھی بہ استثنائے خاص والدین کے تابع فرمان رہنا ہوتا ہے۔ غرضیکہ ہر حال میں مرد و عورت کے بلوغ اور عدم بلوغ دونوں صورتوں میں طرفین کے بزرگوں کو ہمیشہ کامل اختیار ہوا کرتا ہے اس لئے بعض حالتوں میں مرد کے استمزاج کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی حتیٰ کہ باپ اپنے بیٹے سے کبھی حکماً بھی نکاح کا اقرار کرا دیتا ہے گو اُسے دل سے انکار ہی کیوں نہ ہو، رہی عورت تو اس غریب کو بھی ایک مرتبہ نادری حکم کی طرح آخری فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔

مہر کی گرانباری کا یہ حال ہے کہ کسی شخص کا بشرطیکہ وہ شریف ہو چالیس ہزار روپیہ سے کم مہر مقرر نہیں کیا جا سکتا گرچہ وہ غریب نان شبینہ کا بھی محتاج کیوں نہ ہو ایسی صورت میں لوگ زیادہ تر صرف معافی کی اُمید پر اور رسم محض سمجھ کر چالیس ہزار تو کیا اگر لاکھ دو لاکھ بھی ہو زبان کی ایک ہلکی جنبش میں ختم کر دیتے ہیں،

وہ تو خیریت ہے جو زر مہر فوراً نہیں وصول کر لیا جاتا ورنہ غریبوں کی زندگی تو عالم تجرد ہی میں گذر جایا کرتی کیونکہ چالیس ہزار تو الگ چالیس سو بھی ادا کرنا ہر شخص کے لئے آسان نہیں، کس قدر لائق افسوس اور قابل غیرت بات ہے کہ محض رسم و رواج کی پابندی میں عقد جیسی اہم اور ضروری چیز کی یوں مٹی خراب کی جاتی ہے اور جان بوجھ کر حلال کو حرام بنا کر رکھ دیا جاتا ہے، افسوس! وہ زمانہ کیسا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا مہر صرف قرآن شریف کی سورۃ، یا کسی رکوع کی تلاوت مقرر کر دی تھی اور آج ہمارا یہ حال ہے۔

ایسی صورت میں حقیقت اس کے سوا کوئی دوسری نہیں کہ لڑکیوں کے والدین اتنا زیادہ مہر صرف اس لئے مقرر کرتے ہیں کہ آیندہ ان کے لئے ایک ذریعہ حصول دولت کا نکل آئے جیسا کہ آجکل تمام عدالتوں میں اس قسم کے

میں بکثرت سے نظر آتے ہیں، اس پر طرہ یہ ہے کہ شاذونادر اس قسم کا دعویٰ نظر آسکتا ہے جو بیوی کی طرف سے شوہر پر کیا گیا ہو، بلکہ اس سے کہیں زیادہ یا قریب قریب تمام دعوے ایسے ہوتے ہیں جو بیٹی کے مر جانے پر اُس کے والدین کی جانب سے اس کی دولت سمیٹ لینے کے لئے دائر کئے جاتے ہیں۔

پھر عقد کے علاوہ دوسری رسمیں جن کے بغیر عقد ہی غیر مکمل رہ جاتا ہے ایسی بیہودہ ہیں جن کی تفصیل ذرا مشکل ہے، منگنی اور عقد کے بعد جب دلہن کے یہاں برات جاتی ہے تو مہذب سے مہذب اور تعلیم یافتہ دولہا سر سے پاؤں تک سُرخ لباس میں ملبوس منہ پر جالیدار سہرا ڈالے گھوڑے پر سوار عزیز و اقارب جلوس میں اس شان سے سسرال جاتا ہے کہ اگر ایرانی، یا عربی، یا ترکی اسے اس ہیئت کذائی میں، اپنے ملکوں میں دیکھ پائیں تو ہندوستان کے تھیٹر کا "چارلی چیپلن" سمجھ کر کوئی ایسا نہ ہو گا جو اس مضحکہ خیز شکل کو دیکھ کر ہنستا نہ رہ جائے،

اسی پر بس نہیں قرض اُدھار سے روشنی، باجا، آتشبازی جیسی نمائشوں میں اپنی ساری دولت کو پانی کی طرح بہا دیتے ہیں، ہائے افسوس! ہمیں اپنے پیشوائے اعظم کی سادہ طرز زندگی، شادی و بیاہ کا وہ آسان طریقہ یاد نہ رہا، باعث ایجاد زمین و آسمان کی چہیتی بیٹی خاتون جنت کے عقد میں حضرت علیؓ نے صرف ایک زرہ بیچ کر سب کچھ انتظام کر لیا۔ انتظام۔ روشنی، باجا، آتشبازی کا نہیں بلکہ صرف ایسی چیزوں کا جن کی ضرورت رات دن اپنی زندگی میں پیش آیا کرتی ہے،

وہاں بھی ہماری طرح ماں باپ کا بسا بسایا گھر نہ مل جایا کرتا تھا بلکہ شادی و بیاہ اسی کا نام تھا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو رفیق زندگی ہو کر زندگی کی دشوار گذار گھاٹیوں کو طے کریں، ایسا ممکن نہ تھا کہ شادی کے بعد نوجوان لڑکے اپنی بیویوں کو ماں باپ کے سر چھوڑ کر خود آزادی اور بے فکری یا بالفاظ دیگر کاہلی کی زندگی بسر کریں نہ باپ کو اس کا خیال نہ بیٹے کو احساس، وہ طریقہ دوسرا تھا بالغ ہوتے ہی باپ بیٹے سے سبکدوش ہو جاتا پھر شادی کے بعد تو اور بھی نہ باپ کو بیٹے کی فکر نہ بیٹا باپ کا دست نگر اپنے قوت بازو سے حلال روزی حاصل کر کے میاں بیوی کا میاب زندگی بسر کرتے تھے۔

آج بھی اُن قوموں کا یہی حال ہے جو ترقی و تعلیم دولت و ثروت میں ہم سے کہیں بڑھ کر ہیں اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کی ترقی کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کیونکہ اس طرح افراد کی کاہلی و بیکاری کا سدباب ہو جایا کرتا ہے اور جس قوم کا کوئی فرد کاہل یا بیکار نہ ہو گا اُس کی ترقی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے علاوہ دنیا میں ہمارا سب سے بڑا گناہ عقد ہو گان کا استیصال ہے جسے ہم دختر کشی کے لفظ سے تعبیر کریں تو زیادہ بہتر ہو گا گو لفظ دختر کشی پر کتنے دلوں میں طرح طرح کے اعتراضات پیدا ہوں گے لیکن جو حضرات دل و دماغ کے ساتھ قوت مفکرہ بھی رکھتے ہوں گے وہ بلا خوف اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ہمارا موجودہ گناہ دختر کشی کے گناہ سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کہیں بڑھ کر ہے،

ایام جہالت میں عرب والے اپنی لڑکیوں کو ضرور زندہ دفن کر دیتے تھے مگر اُس وقت جب اُن معصوم ہستیوں کو

احساس اذیت، زندگی اور موت کی تمیز، یاس و امید سے کوئی واسطہ نہ تھا، صرف ایک معصوم روح تھوڑی کشمکش کے بعد غیر محسوس طور پر خالق حقیقی کے دربار میں پہونچ جاتی تھی، بہ خلاف اس کے تم اپنی بیٹیوں کو اُس وقت زندہ درگور کرتے ہو جب اُن میں ہر طرح کا احساس، زندگی اور موت میں تفریق کی قوت، یاس و امید، رنج و غم، خوشی و مسرت کی [illegible] ہے وہ اپنی بے چارگی کو تمہارے ظلم و ستم کو اچھی طرح محسوس کرتی ہیں، اُس وقت تم انہیں ایک ظالم جلاد کی طرح [illegible] ذبح کرتے ہو۔ تم اُن کے حق میں ایسے ظالم اور شقی بن جاتے ہو کہ ایک صحیح العقل انسان کسی جانور تک پر اپنے ظلم و جور کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مگر تم میں احساس و تمیز باقی نہ رہی، بے حسی، جمود . . . . اور خود غرضی نے تمہارے دماغ کے اچھے جوہر کو پامال کر دیا اور اس کی جگہ فاسد اور گندے خیالات نے لے لی!

تمہارا آج بھی لڑکیوں کے متعلق وہی نظریہ ہے جو تیرہ سو برس پیشتر قبل از ظہور اسلام عرب والوں کا تھا، وہ بھی تمہاری طرح لڑکیوں کی پیدائش کو نحس، بے عزتی اور باعث افلاس سمجھتے تھے اور یہی تم بھی سمجھتے ہو اور آیت

واذا بشر احدهم بالانثیٰ ظل وجهه مسودا وهو کظیم۔

اور جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری ملے تو سارے دن منہ کا سیاہ رہے اور جی میں اپنے گھٹا کرے۔

کے مصداق تمہارے ہاں بھی جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو تمہاری پیشانی پر بل آ جاتے ہیں، اور بجائے اس کے لڑکے کی پیدائش کے موقع پر تمہاری مسرت کا کچھ عجب حال ہوتا ہے، عام اس سے کہ وہ تمہارے لئے پسر نوح کیوں نہ ثابت ہو۔ بیٹی اور بیٹا کا امتیاز تمہاری زندگی کے ہر لمحہ میں کارفرما رہتا ہے۔ اُسکی پیدائش سے رخصتی تک یا وہ جب تک تمہارے گھر رہتی ہے بیٹے کے مقابلہ میں ایک عشر بھی تمہاری شفقت و محبت اُس کے ساتھ نہیں ہوتی وہ پریشان طور پر صرف اپنی ماں کے سہارے زندگی کی اُن چند گھڑیوں کو گذار ڈالتی ہے جو اُسے تمہارے ہاں بسر کرنی پڑتی ہیں حالانکہ اُس کے نازک دل میں تمہاری محبت اُس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جتنی محبت تمہاری، تمہارے بیٹوں کے دلوں میں ہوا کرتی ہے، بیٹی اپنے باپ سے محبت ہی نہیں کرتی بلکہ اس پر فدا رہتی ہے، لیکن عموماً باپ اُس کے حق میں ویسا ہی ظالم اور شقی ہوا کرتا ہے ہائے کیا تم نے نہیں سنا! سردار دوجہاں سیدۃ النساء پر کیسی شفقت فرماتے تھے، افسوس! جہاں تم نے سب کچھ دفن کر دیا وہیں اسلام کی اس خصوصیت کو بھی مٹا دیا، وائے بر حال ما و شما، آج غالباً قوانین حکومت کی وجہ سے تمہارا زور نہیں چلتا ورنہ کوئی تعجب نہیں جو تم بھی اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے، مگر حق تو یہ ہے کہ اگر ایسا کرتے تو اس قدر لائق ملامت نہ ہوتے، کیونکہ گھلا گھلا کر تکلیف و مصیبت کے ساتھ مار ڈالنے سے یہ کہیں بہتر تھا۔

غرض یہ کہ جس طرح اور جس قدر بھی شقاوت اور بددیانتی ہو سکتی ہے تم بیٹی کے حق میں کر گذرتے ہو اگر تم اس کی شادی بڑے ساز و سامان سے کرتے ہو تو صرف اپنی دولت و حشمت دکھانے کو، نام و نمود کے لئے، اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے بعد پھر تمہیں اس کے ساتھ کسی طرح کی ہمدردی باقی نہیں رہتی، حتیٰ کہ تم نے اس

لڑکی سے بھی محروم کر ڈالتے ہو جو تمہارے بعد شریعت اسلامیہ کی رو سے اُس کا جائز حق تھا، تم اپنی تمام چیزوں کا فیصلہ اپنی زندگی ہی میں بیٹے کے حق میں کر دیتے ہو، اور اس طرح حکم خدا اور رسول کی بین خلاف ورزی تمہارا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے
لیکن حیف! اور صد حیف! کہ تم اُس کے ان تمام حقوق کو بھی غصب کر لینے کے بعد مطمئن نہیں ہوتے، اگر خدانخواستہ کہیں فطرت کے ظالم ہاتھوں اُس کے سہاگ کی رنگین دنیا اُجڑ جاتی ہے تو پھر اُس کا کہیں بھی ٹھکانا نہیں رہنے دیتے تم اُس کے ساتھ ایسے وحشیانہ طور پر پیش آتے ہو کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عقد ثانی کی اجازت تو ایک طرف تم اس کا شمار بھی زندہ انسان میں باقی نہیں رہنے دیتے، ہر لمحہ ہر آن خدا سے اسکی موت کی درخواست کرتے ہو۔ بدنصیب بدقسمت جو چاہتے ہو کہتے ہو تمہیں پرسش نہیں تمہاری دیکھا دیکھی جاہل عورتیں جنھیں تم نے تعلیم نہیں دی ہے، اپنی ہی جنس کی اس بے کس و بے بس عورت کو کوئی شفقت سے بدبخت، سوختہ قسمت، کوئی تسخر سے مردم خوار، عمر خضری کی ٹھیکہ دار، جو جی میں آتا ہے کہہ ڈالتی ہے وہ سنتی ہے اور دل ہی دل میں گھٹتی ہے اُس کا خدا اُس کے دل کے قریب ہوتا ہے وہ ایک آہ میں اپنی فریاد ختم کر دیتی ہے، اُس کا گناہ کیا ہوتا ہے؟ صرف اسقدر کہ وہ بے بس اور کمزور ہے؟ اور اُس نے اپنے شوہر کو کیوں مرنے دیا؟ اُس کے بدلے خود کیوں نہ مر گئی؟
آہ! تمہاری اس شقاوت کا بھی وہی نتیجہ ہوا کرتا ہے جو زندہ دفن کر دینے کا ہوا کرتا تھا اور جس نے ہندوؤں میں "ستی" جیسی رسم پیدا کر دی تھی یہ اگر زندہ رہتی ہے تو صرف غم و الم کے لئے تم تمام جہاں کے رنج و غم اس کے لئے مہیا کر دیتے ہو، وہ اسی میں اس وقت تک اپنی زندگی کی سخت گھڑیوں کو گذارتی ہے۔ جب تک جنون، سکتہ، مالیخولیا، اور دق کی صورت میں موت اس کا خاتمہ نہ کر دے۔
لیکن افسوس تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ جب داور محشر کے سامنے تمہارا اور اُن کا معاملہ اس درخواست کے ساتھ پیش ہوگا

اس گنہ پہ ہیں مارا کہ گنہگار نہ تھے

تو پھر اس کا کیا جواب دے سکو گے؟
اب اُن کے مقابلہ میں تم اپنے کو دیکھو، تمہاری بیوی جب مر جاتی ہے تو طرح طرح سے . . . . تمہاری تعزیت شروع ہو جاتی ہے عزیز و اقارب گھر بسانے کی فکر، چھوٹے بچوں کی پرورش کا خیال کر کے فوراً منسوبہ مہیا کر لیتے ہیں اور تم بیوی کے مرنے کے دو ہی تین دن بعد ماتم کدے سے اٹھ کر عشرت کدہ میں پہونچ جاتے ہو، اسی طرح تمھیں ہمیشہ اس بات کا حق باقی رہتا ہے کہ تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک نو عمر لڑکیوں سے عقد کر سکتے ہو عام اس سے کہ دس بیس عورتیں کیوں نہیں تمہارے سر سے قربان ہو جائیں۔ مگر عورت! غریب و بے کس عورت!! جب بیوہ ہو جاتی ہے تو حکم خدا اور رسول کے باوجود تم اُسے دوسرے عقد کی بھی اجازت نہیں دیتے، تم نے اپنی شرافت کا معیار اتنا بلند کر لیا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی، گویا تمہاری شرافت اُسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک تم حکم خدا اور رسول کی نافرمانی اور قرآن و حدیث کی

صریح خلاف ورزی نہ کرو، ورنہ دوسری صورت میں تمہاری شرافت بزعم خود مقدس یا اس کے ماننا ماؤں کی نگاہ میں باقی نہیں رہ سکتی۔

ہائے تمہاری آنکھوں پر کیسا پردہ پڑ گیا تمہیں نہیں سوجھتا کہ تمہاری اس خود ساختہ شرافت کا معیار کس قدر پست اور رذیل ہے۔ شاید تم دنیا کی کسی قوم کی مثال نہیں پیش کر سکتے۔ جس کے آباؤ اجداد اور مذہبی پیشواؤں کی تہذیب و معاشرت شرافت و عظمت کا معیار کچھ رہا ہو اور اس کے جانشینوں نے اس معیار کو بدل کر بالکل برعکس قائم کر کے، اسلاف کی عزت پر خود اپنے ہاتھوں ایسا ایک حملہ کیا ہو .... آؤ اور دیکھو سید جو تمہارے نزدیک سب کو زیادہ شریف و افضل ہیں ان کی ابتدا کہاں سے ...... ہوتی ہے کیا سیدۃ النساء سے بڑھ کر کوئی افضل، اور حضرات حسنین سے زیادہ کوئی شریف ہو سکتا ہے، یہی وہ یگانہ ہستیاں ہیں جن کی اولادیں، سید کہی جاتی ہیں، حضرت فاطمہ زہرا کی والدہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا عقد سردار دوجہاں سے تیسرا تھا، اسی طرح فخر دو عالم کی پردادی حضرت سلمیٰ کا عقد حضرت ہاشم سے دوسرا تھا۔

کس قدر قابل غور بات ہے کہ گر ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا عقد تیسری مرتبہ سرکار دو عالم سے نہ ہوتا تو پھر نہ سیدہ خاتون ہوتیں اور نہ حضرت حسنین، اور نہ ان کی ان سید اولاد کا وجود ہوتا جن کا سلسلہ سیکڑوں پشت کے بعد ہندوستان کے سادات تک پہونچتا ہے۔

اسی طرح اگر حضرت سلمیٰ کا عقد دوسری مرتبہ حضرت ہاشمؓ سے نہ ہوتا تو پھر نہ حضرت عبدالمطلب ہوتے، نہ حضرت عبداللہ نہ باعث ایجاد زمین و آسمان، پھر نہ زمین ہوتی نہ فلک ہوتا، نہ دریا ہوتا نہ پہاڑ ہوتا نہ ہم ہوتے نہ تم ہوتے۔

عقد بیوگان اور اسوۂ حسنہ

کتنی صاف و سچی تعلیم ہے رسول برحق کی جس نے اقوال کے علاوہ اپنے افعال سے بھی ہمیں سب کچھ کر دکھایا اور نمونۂ عمل بن کر ہمارے لئے ایک ایسی مثال قائم کر دی جو بلاشبہ خاتم النبیین کا حصہ تھا، دوسری باتوں کو سے قطع نظر کر کے صرف عقد بیوگان ہی کو دیکھو صریح حکم کے باوجود دینی مصالح کی بنا پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عقد بھی کئے ماسوا حضرت عائشہ سب کی سب بیوائیں یا مطلقہ تھیں کیا اگر آپ چاہتے تو اس کے خلاف کرنے پر قادر نہ تھے کون ایسا تھا جو اس امر کو حاصل کرنے میں کچھ پس و پیش کر سکتا تھا مگر حقیقتاً رحمۃ للعالمین کو حقوق بیوگان کی حفاظت مد نظر تھی، مثال کے طور پر ان دس شوہر دار محترم بیویوں کو دیکھو۔

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت میمونہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت سودہؓ حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینبؓ بنت خزیمہ، حضرت زینبؓ بنت جحش، حضرت جویریہؓ

ان میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت میمونہ، حضرت صفیہ کا عقد حضرت صلعم سے تیسرا تھا البتہ حضرت

(زینب کا عقد ثانی)

کے متعلق اختلاف ہے کیونکہ بعض پانچواں کہتے ہیں یعنی حضرت سودہ حضرت عائشہ حضرت حفصہ حضرت ام سلمہ حضرت ام حبیبہ حضرت زینب بنت جحش حضرت زینب بنت
سے دوسرا تھا البتہ زینب بنت خزیمہ کے متعلق بھی اختلاف ہے کیونکہ بعض تیسرا یا پانچواں کہتے ہیں۔

حضرت زینب بنت جحش سرکار دو عالم کی پھوپھی زاد بہن تھیں آپ نے پہلے ان کا نکاح زید بن حارثہ سے کر دیا تھا زید گو شریف النسب تھے مگر کسی نے انہیں پکڑ کر اور غلام بنا کر بیچ ڈالا تھا، خوبی قسمت سے ان کو ایسے آقا کی غلامی نصیب ہوئی کہ آپ ان کی غلامی بھی ہمارے لئے باعث فخر ہے، جب ان کے باپ کو خبر ملی اور وہ لینے آئے تو محبوب خدا نے فوراً انہیں آزاد کر دیا، لیکن زید ایسے شفیق آقا کو کیونکر چھوڑ سکتے تھے آزاد ہونے کے بعد بھی آپ سے جدا نہ ہوئے حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے انہیں بیٹے کی طرح پالا تھا اور بے حد شفقت فرماتے تھے جب آپ نے ان کا عقد حضرت زینب سے کرنا چاہا تو زینب اور ان کے بھائی عبد اللہ نے ان کی سابق غلامی پر نظر کر کے تامل کیا لیکن آیت

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم	اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو حق نہیں کہ جب خدا اور رسول کسی بات کا فیصلہ کریں تو وہ پھر اپنی رائے کو دخل دیں۔

کے سامنے تسلیم خم کرنا پڑا مگر پھر غالباً کوئی دوسری وجہ درمیان میں آئی یا حضرت زینب کا وہی پرانا خیال رنگ لایا طرفین میں دن بدن بے لطفی بڑھتی گئی آخر مجبور ہو کر زید کو طلاق سے فیصلہ کرنا پڑا۔

جب زید نے طلاق دے دی تو پھر خود فخر دو جہاں نے انہیں اپنے عقد میں لے لیا اور اس طرح عورتوں کو عقد ثانی کے عمل و حکم کے ساتھ رحمۃ للعالمین نے غلام و سردار کی بھی تفریق مٹا دی، ازواج مطہرات کے بعد اب لڑکیوں اور نواسیوں کا درجہ ہے۔

آپ کی صاحبزادیاں حضرت رقیہ حضرت ام کلثوم دونوں کے دو عقد ہوئے، حضرت رقیہ کا پہلا نکاح عتبہ بن ابی لہب سے ہوا پھر حضرت عثمان بن عفان سے۔ اسی طرح حضرت ام کلثوم کا عقد پہلے عتیبہ بن ابی لہب سے ہوا پھر بعد وفات حضرت رقیہ حضرت عثمان سے۔

آپ کی نواسی حضرت امامہ کے بھی دو نکاح ہوئے پہلا حضرت فاطمہ کے انتقال پر ان کی وصیت کے مطابق حضرت علیؓ سے دوسرا بعد شہادت حضرت علیؓ ان کی وصیت کے موافق مغیرہ بن نوفل سے۔

سیدۃ النساء فاطمہ زہراؑ کی بیٹی حضرت ام کلثوم کے چار عقد ہوئے پہلا امیر المومنین عمر ابن الخطاب سے دوسرا عون بن جعفر طیار سے، تیسرا محمد بن جعفر طیار سے چوتھا عبد اللہ بن جعفر طیار سے، حضرت سکینہ حضرت امام حسین کی صاحبزادی کے بھی چار نکاح علی الترتیب مصعب بن زبیر، عبد اللہ ابن عثمان، اصبغ بن عبد العزیز، زید بن عمر کے ہوئے، حضرت شہربانو زوجہ سید الشہداء کا بھی دوسرا نکاح بعد شہادت حضرت امام حسین زید نامی بزرگ سے ہوا ازواج مطہرات اور اہلبیت کے علاوہ دوسری بزرگوں کو بھی متعدد عقد ہوئے جن میں حضرت اسماء قابل ذکر ہیں حضرت اسماء کا پہلا نکاح

جعفر طیار سے ہوا جن سے آٹھ بیٹے، عون محمد، عبداللہ وغیرہ تھے انھوں نے ان آٹھوں کی موجودگی میں بعد شہادت حضرت جعفر اپنا دوسرا عقد حضرت ابوبکر سے کیا جن سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے پھر بعد وفات حضرت ابوبکر تیسری مرتبہ حضرت علیؑ سے ہوا جن سے بھی پیدا ہوئے،

اب مجھے یہ بتا دو! کہ معیار شرافت وہ ہے جس کی مثال ازواج مطہرات اور اہلبیت نے قائم کر دی ہے جس میں عقد بیوگان بھی ایک فعل مستحسن اور عین شرافت ہے یا یہ جسے تم نے مقرر کیا ہے اور عقد بیوگان کو منافی شرافت سمجھتے ہو پھر اسی عقد میں اگر یہ نعوذ باللہ کر معیار شرافت ہو تو خدا کے لئے مجھے بتا دو کہ تمہارے ان بزرگوں کا شمار جو ہر ایک ان میں آدیکا ہو خود تمہارے ایمان میں کن لوگوں میں ہوگا

ڈرو! ڈرو!! اس دن کہ جب دنیا کی یہ خود ساختہ شرافت کچھ کام نہ آئے گی اور ناحق یہ بے بنیاد شرافت جو حقیقت میں عین نفاق ہے قیامت کے دن شافع محشر کے سامنے رسوا کرے گی،

کیا اس زمانہ میں منافق کوئی دوسرے قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے؟ وہ بھی تمہاری طرح ظاہر میں توحید و رسالت کے قائل تھے مگر باطن ان کا سیاہ تھا حکم خدا و رسول کی عظمت ان کے دلوں میں نہ تھی وہ بھی رسول خدا اور اہلبیت پر طرح طرح کے اتہام لگایا کرتے تھے، اب تم خود اس کا فیصلہ کر لو کہ حکم خداوندی اور سنت نبوی کو ذلیل اور منافی شرافت سمجھنے والا منافق ہے یا مومن؟

منافقین کے حق میں خداوند تعالیٰ نے جس غیظ و غضب کا اظہار فرمایا ہے وہ کسی ذی علم مسلمان پر پوشیدہ نہیں تمثیل کے طور پر ذیل کی یہ دو آیتیں جن میں خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے،

ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم	اگر تم ان (منافق) کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کرو تو اللہ انھیں معاف
ان اللہ جامع المنٰفقین والکٰفرین فی جہنم جمیعا	نہ کرے گا، وہ اللہ اکٹھا کرے گا منافقوں اور کافروں کو جہنم میں یکجا

عبرت اور پشیمانی کے لئے بہت ہیں خدا کے لئے اب بھی اپنے اوپر رحم کرو اور ایسی شرافت سے باز آؤ جو دین و دنیا کی تباہی کا سبب ہو شیرازی تمہارے ہی جیسے لوگوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

جب تم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو گے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے اس گناہ نے تمہاری اخلاقی روحانی زندگی کو کتنا داغدار بنا رکھا ہے۔ اور تمہارے قلب و دماغ سے مذہب کی اس صحیح اسپرٹ کو کس بری طرح فنا کر دیا ہے جو پیغمبر اسلام نے اپنی کوششوں سے پیدا کی تھی۔

(باقی)

اسلام اور نظام حکومت

(از جناب عبدالرحمن صاحب سنبھلی متعلم مدرسۃ الاصلاح)

لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب اسلام سیاست سے بالکل خالی ہے اس میں ایک ترقی کرنے والی جماعت کے لیے تمام راستے مسدود ہیں نہ تو اس میں کوئی آئین ہے اور نہ نظام۔ موجودہ نظام حکومت مغربی اقوام کے غور و فکر کا نتیجہ ہے لیکن یاد رہے اس خیال کی بنیاد تعصب یا اسلامی تعلیمات سے لاعلمی پر مبنی ہے جو لوگ بنا پر تعصب اس خیال کا اظہار کرتے ہیں انکو نظر انداز کیجیے کیونکہ جب تک وہ تعصب کی عینک سے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں گے اسوقت تک انہیں اس میں کوئی خوبی نظر آ ہی نہیں سکتی لیکن جو حضرات لاعلمی کی بنا پر ایسا کہتے ہیں میری ان سے درخواست ہے کہ وہ ایک مرتبہ اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کریں تاکہ ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے کہ اسلام نے نظام حکومت کا کتنا پاس و لحاظ کیا ہے اور اس نے حکومت و سلطنت کے کتنے بہترین قوانین و ضوابط بنائے ہیں . . . اگر ایسا نہ ہوتا تو عرب جیسی وحشی و جاہل قوم اتنی عظیم الشان . . . حکومت قائم نہ کر سکتی۔ چند صحرا نشین اٹھ کر تمام عالم پر اتنی نمایاں فتح حاصل کر سکتے۔ اسلام نے عربوں کو ایسے نظام حکومت کی تعلیم دی جو معاشرتی۔ ملکی۔ تجارتی۔ تعزیری۔ سیاسی معاملات پر مشتمل تھی مگر افسوس کہ یورپ نے اسے بالکل فراموش کر دیا تاریخ ہمیں صاف بتلاتی ہے کہ حکومت و سیاست کے جو اصول قرآن حکیم نے بتلائے تھے اس سے دوسری مذہبی کتابیں یکسر خالی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے بتائے ہوئے اصولوں پر جبتک مسلمانوں نے عمل کیا اس وقت تک ان کی حکومت ترقی کرتی رہی۔ دنیا ان کی اطاعت کرنے پر مجبور تھی ان کی شان و شوکت کا سکہ تمام عالم پر بیٹھا ہوا تھا جب انھوں نے اس کے اصولوں کو ترک کر دیا اس کے بتائے ہوئے قوانین کو ٹھکرا دیا تو قعر ذلت میں گر گئے . . . . امیر معاویہ کے بعد اسلامی حکومت کے زوال کا یہی سبب ہے انھوں نے اسلام کے مقررہ اصولوں کو چھوڑ کر خلافت کو نئے اصولوں پر قائم کرنا چاہا ان کی خواہش ہوئی کہ ہم شخصی حکومت قائم کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اس کے برعکس حضرت عمر فاروق نے جمہوری حکومت قائم کی جو اسلام کے منشا کے مطابق تھی اسی وجہ سے ان کی حکومت اتنی مستحکم اور دیرپا ثابت ہوئی کہ اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی،، اسلامی نظام حکومت میں سب سے نمایاں اور امتیازی چیز نظام جمہوریت ہے اس سے بہتر کوئی نظام نہیں آج تمام یورپ اسی کا دلدادہ نظر آتا ہے اسی کے اصول و مبادی کو مد نظر رکھ کر اپنے اصول بناتا ہے اسلام میں جس طرح مجلس شوریٰ ہے اسی طرح سے مغربی اقوام نے کونسل آف اسٹیٹ اسمبلی پارلیمنٹ وغیرہ قائم کی اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے یورپ بہت سی چیزوں میں اسلام کا مرہون منت ہے اسی طرح نظام حکومت میں بھی ہے۔ اسلام ہی نے ان کو حکومت کرنے کا سلیقہ بتایا۔ اسلام سے پہلے کی

تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے دنیا میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کیا اس کے یہاں امیر و غریب شاہ و گدا اور دولتمند و مفلس سب حکومت کے معاملات میں شریک ہو کر اپنی رائے ظاہر کرسکتے ہیں ایک بڑھیا بھی خلیفۂ وقت سے سوال و جواب کرسکتی ہے ایک ادنیٰ شخص بھی اپنا حق خلیفۂ وقت سے طلب کرسکتا ہے اور خلیفہ پر اس کی ادائیگی لازم و ضروری ہے یہ محض اس وجہ سے کہ اسلام کا حکمران نہ تو عام رعیت سے کوئی بلند تر ہستی ہے نہ وہ شان و شوکت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے نہ اپنی اطاعت و فرمانبرداری میں کسی کو اپنے سامنے سرنگوں کرا سکتا ہے نہ ان قوانین و ضوابط کی خلاف ورزی کرسکتا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے بتائے ہیں نہ اسے اختیار ہے کہ وہ اپنے ذاتی منافع - ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے دوسروں کے حقوق دبالے - حق کے خلاف وہ ایک قدم اٹھا نہیں سکتا نہ کسی غریب کی ایک گز زمین پر بزبردستی قبضہ کرسکتا ہے - اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا ہے کہ میرے تمام اعمال کا حساب لیا جائیگا - اور اگر حرام کی ایک کوڑی اور زبردستی سے قبضہ کی ہوئی زمین کا ایک چپہ - تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ بھی اس کے حساب میں آیا تو اسے اس کی سزا بھگتنی پڑے گی گویا اسلام نے بادشاہت کے وجود کو یکقلم مٹا دیا اس نے امرہم شوریٰ کا درس دے کر بتا دیا کہ حکومت کی ترقی کا راز صرف باہمی مشورہ میں ہے آج جو قومیں اس اصول پر عمل پیرا ہیں ان کی حکومت یوماً فیوماً مستحکم ہوتی جاتی ہے ان کا دائرہ حکومت وسیع ہوتا جاتا ہے ان کی رعایا نہایت خوشحالی کی زندگی بسر کر رہی ہے برعکس اس کے جن ممالک میں شخصی حکومت رائج ہے ان ملکوں کی اقتصادی - معاشرتی - سیاسی، غرضیکہ تمام حالتیں ابتر ہیں تاریخوں کے مطالعہ سے - پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں دنیا کی تمام حکومتیں شخصی تھیں ہر بادشاہ اپنے زمانہ کا فرعون تھا بادشاہ اپنے ذاتی منافع کے لئے سب کچھ کرسکتا تھا ظلم و ستم کے تمام طریقے اختیار کرسکتا تھا یہی وجہ تھی کہ تمام مخلوق اسے بطور خدا کے مانتی تھی اپنی تمناؤں پر اس کی خواہشوں کو ترجیح دیتی تھی ہمیشہ تیغ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی رہتی اپنی تمام خوشیاں محض ایک شخص کی خوشی پر موقوف رکھتی تھی - بادشاہ کو اختیار تھا کہ جو سمجھ میں آئے کرے - کسی کو اس کے دربار میں چوں و چرا کی اجازت نہ تھی دنیا اسی مصیبت میں پریشان لیکن جب اسلام آیا تو اس نے ایک ایسا قانون پیش کیا جس سے رعایا آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگی اور دنیا میں ایک جدید نظام حکومت کی بنیاد ڈالی مگر افسوس کہ دلدادگان یورپ بلا سوچے کہدیتے ہیں کہ قرآن حکیم نے سیاسیات سے بحث ہی نہیں کی ہے - حالانکہ قرآن حکیم میں تمام تعلیمات موجود ہیں کون سی چیز ہے جس کا بیان اس میں نہیں ہے "لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین"، قرآن میں ایک معمولی قانون سے لے کر ایک اعلیٰ قانون تک کی باتیں ملیں گی افسوس لوگ اس کا بنظر غائر مطالعہ نہیں کرتے مستشرقین یورپ میں سے جنھوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا ہے اس کی تعلیمات پر منصفانہ غور کیا ہے ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے مورخ گبن لکھتا ہے کہ "قرآن کو مسلمانوں کا ایک مذہبی، تمدنی، ملکی، تجارتی، فوجی دیوانی - فوجداری قانون کہہ سکتے ہیں - جو ہر ایک کے اوپر حاوی ہے - مذہبی عبادت سے لے کر رات و دن کے

کا معاملہ۔ روحانی نجات سے لے کر صحت جسمانی۔ جماعت کے حقوق سے لیکر حقوق افراد۔ اخلاق سے لے کر جرائم اور دنیاوی سے لے کر دینی سزا و جزا کی باتیں قرآن میں موجود ہیں،،

مسٹر لڈنٹ کرنل کہتا ہے

"قرآن میں عقائد اور اخلاق کا مکمل ضابطہ اور قانون موجود ہے۔ وسیع جمہوریت۔ رشد و ہدایت۔ انصاف و عدالت۔ فوجی تنظیم و تربیت اور سیاسیات اور غرباء کی حمایت و ترقی کے اعلیٰ آئین موجود ہیں۔

ڈیون پورٹ کہتا ہے

"قرآن مسلمانوں کا مشترکہ قانون ہے اس میں معاشرتی و ملکی۔ تجارتی۔ فوجی۔ تعزیری و سیاسی الغرض سب معاملات اس میں ہیں۔ باوجودیکہ وہ ایک مذہبی کتاب ہے اس نے ہر چیز کو باقاعدہ بنا دیا ہے،،

مسٹر ای ٹوی ایل کہتا ہے

اسلام کی قوت و طاقت قرآن میں ہے۔ قرآن سیاسی قانون اور حقوق کی دستاویز ہے،،

قرآن مجید کے متعلق مستشرقین نے اس قسم کی بیشمار رائیں لکھیں ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں اس پر طویل بحث کی جائے گی۔

انگریزی حروفِ تہجی

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انگریزی حروفِ تہجی کی اصل فنیشین ہے لیکن حال کی تحقیقات سے یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے، چھ سال قبل شام کے علاقہ راس شمرا میں جو مٹی کی تختیاں برآمد ہوئی تھیں، ان کے کتبوں کے مطالعہ سے اب تحقیق ہوا ہے کہ وہ حروف یونانی حروف سے ملتے جلتے ہیں، نہ کہ فنیشین حروف سے، انگریزی حروف انہی سے ماخوذ ہیں،

خطرہ کی گھنٹی

موٹر ڈرائیور جو بعض اوقات لمبی مسافت میں کبھی اونگھنے لگتے ہیں، اور اونگھنے کی وجہ سے اکثر حادثات پیش آ جاتے ہیں ان کے لئے خطرہ کی گھنٹی ایجاد ہوئی ہے، یہ گھنٹی ڈرائیور کے گلے میں بندھی رہتی ہے، جوں ہی وہ اونگھتا ہے، اس کی ٹھوڑی گھنٹی کے بٹن پر لگتی ہے اور وہ گھنٹی بجنے لگتی ہے۔

تاویل قرآن کے چند اہم اصول

(گذشتہ سے پیوستہ)

لغت عرب چونکہ فہم قرآن کا بہت بڑا وسیلہ تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے زبان عرب کی حفاظت پر بڑا زور دیا تھا چنانچہ ان کا ایک فقرہ بہت مشہور ہے۔

علیکم بدیوان العرب فانہ نعتکم ولغۃ القرآن | دیوان عرب کو ضرور سامنے رکھو کیونکہ وہ تمہاری زبان ہے اور قرآن کی

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ متاخرین نے اس اصول سے بہت کم کام لیا یہی وجہ ہے کہ ان سے بسا اوقات ایسی ایسی فحش غلطیاں ہو جاتی ہیں کہ ایک عالم کو حیرت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک غلطی کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا سورہ یونس کی آیت (۱۸) کے مشہور و معروف مفہوم سے زمانہ حال کے بعض جدت پسند حضرات اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سلف کی تاویل صحیح تسلیم کرنے میں خدا کی طرف لاعلمی کا انتساب لازم آئے گا حالانکہ خدا نے دوسری جگہ تصریح کے ساتھ فرمایا ہے کہ ان اللہ یعلم ما یدعون من دونہ من شئی۔

اس زحمت سے بچنے کے لئے انہوں نے آیت کو توڑ مروڑ کر ایک نئے قسم کی تاویل کی ہے، اور لغت سے ناواقفیت کا پورا ثبوت دیا ہے آیت یہ ہے

ویعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السموات ولا فی الارض

اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں۔

جو شخص لغت عرب سے واقف ہوگا وہ اس تاویل کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا اور نہ اس قسم کے غلط شبہ پیدا ہونے کی اس کے یہاں گنجائش نکل سکتی اس لئے کہ کلام عرب کا یہ نہایت نمایاں اصول ہے کہ کبھی کبھی ایک چیز کی نفی اس کے لازم کی نفی سے کیجاتی ہے اسی کو عربی زبان میں نفی الشئی بلازمہ کہتے ہیں اشعار عرب میں اس کی بیشمار مثالیں ہیں امرؤالقیس کا شعر ہے

علی لاحب لا یھتدی بمنارہ اذا سافہ العود النباطی جرجرا

ایک حماسی شاعر کا شعر ہے

لکل امرئ شعب من القلب فارغ وموضع نجوی لا یرام اطلاعھا

اگر کلام عرب کی روشنی میں جدت پسند حضرات اس آیت کی تاویل کرتے تو کبھی بھی انھیں اس آیت میں توڑ مروڑ کی ضرورت

تاریخ مغرب کی دس مشہور خواتین

(از جناب عبدالرحمن صاحب اعظمی)

خواتین کے تذکروں میں حضرت حوا کا تذکرہ سب سے پہلے ہونا چاہئے تھا، لیکن افسوس ہے کہ تاریخ کے صفحات ان کے حالات سے بالکل خالی ہیں۔ اسی طرح ہیلانہ جس نے خونریز جنگوں کے ذریعہ اپنی عظمت کا دلوں پر سکہ بٹھایا تھا اور سمیرامیس جس نے شہر بابل کو آباد اور اس کو باغات سے آراستہ کرکے بہت زیادہ شہرت حاصل کی تھی ان دونوں کا بھی تاریخ میں کہیں ذکر نہیں، تا ہم قصوں اور تشبیہ کی دنیا سے تخیل میں ان کے وجود کی دھندلی سی جھلک نظر آتی ہے۔

پھر بھی تاریخ ہمارے سامنے ایسی بے شمار عورتوں کی مثالیں پیش کرتی ہے جو مذہب و سیاست صلح و جنگ اور علوم و فنون میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھیں بالخصوص مغرب کی تاریخ اس قسم کی خواتین کے تذکروں سے بھرے، تاریخ کی تمام مشہور عورتوں پر بحث کرنا تو اس مختصر فرصت میں ہمارے بس کی بات نہیں، اسلئے آج ہم مغرب کی صرف دس خواتین کا اجمالاً تذکرہ کرتے ہیں

(۱) اسپاسیا

جس زمانہ میں ایتھنز کے علوم و فنون، و سیاست و سیادت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ لوگ اسے بجا طور پر ایتھنز کے نام سے یاد کرتے تھے۔ پرکلیس کی پہلی بیوی کا جب انتقال ہوگیا تو اس نے اسپاسیا کو اپنا ہمدم و دمساز بنا لیا۔ اور ہر معاملہ میں اس سے مشورہ لیتا اور اس کی رائے پر عمل کرتا چاہے معاملات سیاسی، جنگی، اصلاحی، تجدیدی جیسے بھی ہوتے۔ پلوٹارک اپنے تذکرے میں اور ارسٹافان اپنے نغموں میں، پرکلیس کو دست اسپاسیا کی ایک آلہ کار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ انہی وجوہ کو پیش نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ پرکلیس کی خوبیوں کی داد کی اصل مستحق اور اسکی غلطیوں کی اصل ذمہ دار اسپاسیا ہی ہے۔ اس کا گھر ہمیشہ یونانی کمال کا مرکز بنا رہتا تھا مشہور فلاسفر سقراط اس کے گھر جاکر اس کی صحبت سے فیض حاصل کرتا تھا اور ایک جگہ اپنے متعلق لکھا بھی ہے کہ وہ اسپاسیا کا شاگرد ہے حکیم سقراط نے بھی اپنے اکثر کاموں میں اس کی عقل و دانائی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے سنگ تراش فڈیاس کی ہمیشہ باقی رہنے والی تمثالوں میں اسی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔

(۲) کیتھرائن

یہ اٹالین تھی۔ اس کی نشو و نما خاص زہد و تقویٰ کی آغوش میں ہوئی تھی۔ بچپن کے خوابوں میں وہ اکثر شہدا اور مقدسین کو دیکھا کرتی تھی۔ سات برس کی عمر میں اپنے کو حضرت مسیح کی نذر کر دیا۔ لیکن جب شباب نے اس کا خیر مقدم کیا تو وہ ڈری کہ کہیں شباب کی نیرنگیاں اور اس کا ناز و فریب حسن رنگ نہ لائے اور عہد و پائے ثبات

میں لغزش نہ آجائے۔ اسی خیال سے اس نے عیش وآرام کو چھوڑ کر زہد وتقشف کی زندگی اختیار کرلی سر کے بال کٹوا دیے گوشت کھانا ترک کردیا تختوں پر سونے لگی اور گوشۂ تنہائی اختیار کرلیا۔

اس کے باوجود وہ ایک جاہل اور نادار عورت تھی اس نے کلیسا کی تاریخ میں کبھی نہ فنا ہونے والا اپنا ایک کارنامہ چھوڑا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب کلمنٹ پنجم نے "فرانس کا پوپ منتخب ہوجانے کے بعد فرانس کے ایگنون میں سکونت اختیار کرلی تو روما کے کلیسا کی حالت بہت ابتر ہوگئی اور آپس کے اختلافات بہت بڑھ گئے۔ تقریباً ستر برس تک یہی حالت باقی رہی پھر جب کیتھرائن نے اپنے ہوش وحواس سنبھالے اور مسیحیت کے شیرازے کو اس طرح پراگندہ دیکھا تو اس کے قلب کو بہت ٹھیس لگی۔ اس کے بعد اس نے عہد کرلیا کہ جب تک کلیسا کے ٹکڑے جوڑ نہ دے اور اس کا منتشر شیرازہ دوبارہ اس چہرہ پر ڈالے گی اور پوپ کو دوبارہ اپنے قدیم مرکز پر واپس نہ بلا لے گی اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لے گی۔ چنانچہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے پوپ گریگوری یازدہم اور اس کے ناطین مخالفین کے پاس خطوط بھیجنے شروع کئے۔ اس کی یہ کوشش بارآور ہوگئی اور اس نے اختلافات کا بالکل قلع قمع کردیا۔ ورنہ اگر یہ دن اور باقی رہ گئے ہوتے تو دین مذہب کا نام ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے۔

اگرچہ وہ نوشت وخواند سے ناآشنا محض تھی لیکن اس کے رسائل اور پیپرس قلم انسانی کے بے نظیر شاہکار مانے جاتے ہیں۔ اس کی کتاب "الناد الالٰہی" کے مقابل میں اطالین لٹریچر آج تک دانتے کی کتاب "الکامیڈی الالٰہیہ" کے کوئی دوسری کتاب نہ پیش کرسکا۔

افسوس کہ حوادث روزگار نے قبل از وقت اس کی شمع حیات کو گل کردیا۔ چنانچہ ابھی اس کی عمر کے ۳۳ برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اس نے دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اس کی ساری زندگی مریضوں کی عیادت ناداروں کی دستگیری، گمگشتہ راہوں کی ہدایت، پادریوں کو نیکی وتقویٰ کی صلاح اور حاکموں کو جنگ وجدال سے باز رکھنے ہی میں بسر ہوئی۔

(۳) جان آف آرک

اس کی ساری زندگی دین وایمان کی حمایت میں گزری۔ لوگ اس کی پوری حیات کو ایک معجزہ سے تعبیر کرتے ہیں بچپن ہی سے اسے چرند پرند کے ساتھ ایک الفت سی ہوگئی تھی۔ ان کی ہر تکلیف پر تڑپ جاتی اور ان کی ہر چیخ پر وہ شبرانداز ہوجاتی غرضیکہ اس کے قلب کا ہر گوشہ رحمت، رافت اور احسان واکرام کے جذبات سے معمور تھا دور شباب کے شروع ہوتے ہی سے اپنی خلوتوں میں عجیب وغریب آوازیں سنائی دینے لگیں اس نے اپنی ساری زندگی راہ خیر کے لئے وقف کردی تھی اور تاحیات شادی نہ کی۔

ایک مرتبہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہے "تو (جان آف آرک) ایک امر عظیم یعنی فرانس کو انگریزی

لشکر سے جو حدود فرانس میں زبردستی گھس آیا ہے آزاد کرنے کے لئے بھیجی گئی ہوں"، چنانچہ اس نے شہسواروں کا لباس پہنا
مضروب تن کی، ننگی تلوار ہاتھ میں لی اور ایک اصیل گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا "اے قوم! مجھے ہاتف غیب نے
حکم دیا ہے کہ میں اپنے وطن عزیز کی گردن اس کے دشمن کے ظالم پنجوں سے آزاد کرا دوں"، یہ سن کر قوم نے اس کا مضحکہ
اڑایا اور مجنوں سمجھ کر اس کے قول کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ مگر ولیعہد فرانس نے اپنی فوج اس کے ساتھ کر دی کمسنی کے باوجود
اس نے قلوب کو قربانی اور فدویت کے جذبات سے معمور کر دیا اور پورے لشکر کے اندر ایسا صور پھونکا کہ سب کے سب
جام شہادت نوش کرنے کے لئے بیقرار ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی اسوقت وہ سترہ برس کی تھی
جنگ کے بعد اس نے ولیعہد کو کلیسہ ریمز میں لے جا کر اس کے سر پر فرانس کی بادشاہت کا تاج رکھ دیا اور
کہا میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو چکی اب مجھے جانے دیجئے۔ لیکن بادشاہ نے اصرار کیا کہ ابھی اس وقت تک
وہ فوج کمانڈ کرتی رہے جب تک کہ فرانس سے انگریزی فوج کے نقش تک نہ مٹ جائیں۔ اس کے روز افزوں اعزاز
کو دیکھ کر فرانسیسی سپہ سالاروں کے حسد و عداوت کی دبی ہوئی چنگاری یک بیک بھڑک اٹھی۔ انہوں نے سازش کر کے
اس پر کفر و الحاد کے جھوٹے الزامات قائم کئے اور ظالم پادریوں سے ملکر نذر آتش کر دینے کا فتویٰ صادر کرا دیا۔ آہ!
وہ جلا دی گئی ابھی اس نے زندگی کی صرف ۱۹ بہاریں دیکھی تھیں۔

(۴) ملکۂ انگلینڈ الزبتھ

یہ بہت عقلمند، دلیر، جری، اور پیکر متانت تھی۔ مگر ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ حاسد بھی واقع ہوئی تھی
چنانچہ جب اس نے سنا کہ اس کی قدیم دشمن میری اسٹوارٹ کے لڑکا پیدا ہوا ہے تو اسے بڑا رنج ہوا اور بیمار پڑ گئی
اس نے کبھی شادی نہیں کی اور ستر برس کا زمانہ کنوارے پن میں گذار دیا۔ اس کے بعد تخت کا وارث بجز میری
اسٹوارٹ کے کوئی دوسرا نہ ہوتا تھا اور دونوں کی دشمنی معلوم۔ اس لئے الزبتھ نے طرح طرح کے مکر و فریب سے کام
لے کر میری اسٹوارٹ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا اور اس طرح اپنی آتش انتقام بجھائی۔
الزبتھ کے عہد حکومت میں انگلستان پر اسپینی جنگی بیڑے نے چڑھائی کی لیکن انگلینڈ کے جنگی بیڑے نے اس کو
پاش پاش کر دیا اور اس کے بعد خود سمندروں کا حاکم بن گیا۔ ملکہ کا دور حکومت تاریخ انگلستان کا سنہرا دور تھا۔
اس عہد میں سیاست کے مردہ جسم میں اک نئی روح پیدا ہو گئی تھی۔ عام خوشحالی کا دور دورہ تھا ذہنیتوں میں
انقلاب ہو گیا تھا اور اسی دور کی آغوش میں شکسپیر جیسا شاعر پھولا پھلا اور پروان چڑھا۔

(۵) ملکۂ آسٹریا میری تھریزا

اس کے اندر ذہانت ذکاوت اور عزم و استقلال کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور اس کا نتیجہ تھا کہ فریڈرک
دی گریٹ جیسے عظیم الشان شخص سے آنکھ ملانے کی جرأت کرتی تھی۔ اس کا یہ معمول تھا کہ جب کبھی وہ اپنی طاقت کو

فرعونک کے مقابلہ میں گرتی ہوئی دیکھتی تو فوراً اس سے صلح کر لیتی لیکن جونہی کہ اس کی طاقت پھر بڑھ جاتی حملہ کر کے ہلاک کر دیتی۔ تھوڑی دیر دشمن کے سامنے سر جھکا دیتی۔ دوستوں سے بھی مشورہ کر کے باتیں کرتی۔ متانت و سنجیدگی اس کا خاص حصہ تھا۔ اس کے نو بچے تھے اور وہ اپنی لڑکیوں کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی تاکید کیا کرتی تھی۔

(۶) میڈم آف مینٹنان

قید خانہ میں پیدا ہوئی۔ بچپن میں غربت کی تکلیفیں ہمیشہ سہتی رہیں لیکن خوش قسمتی سے آخر میں اپنے عہد کے سب سے زبردست بادشاہ لوئی چہاردہم کی ملکہ بن گئی حالانکہ کوئی زیادہ خوبصورت بھی نہ تھی۔

شروع شروع میں اس نے ایک بوڑھے [illegible] ظریف جو گوشہ عزلت [illegible] سے شادی کر لی۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح اسے شہر کے [illegible] ملنے کا موقع ملے گا کیونکہ وہ لوگ شاعر کی پر لطف باتوں سے محظوظ ہونے کے لئے اکثر اس کے گھر آیا کرتے تھے۔ کچھ دن بعد شاعر کا انتقال ہو گیا اور میڈم کے رزق کا [illegible] بھی منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے بادشاہ کی ایک آشنا کے بچوں کی تربیت اپنے ذمہ لی۔ اس نے ان بچوں کی اتنی بہتر تربیت کی کہ آخر میں بادشاہ نے خوش ہو کر ان کو باقاعدہ [illegible] مان لیا۔ اور میڈم کو [illegible] ہوئے قصر شاہی میں چلی آئی یہاں [illegible] اس نے بادشاہ کے [illegible] و اطوار کو بھی بدل [illegible] اس کا شیوہ عیاشی اور نفس پرستی تھا مگر اس کے بعد وہ [illegible] شرافت و متانت کا پیکر معلوم ہونے لگا۔ بادشاہ اس کا بہت احترام کرنے لگا یہاں تک کہ جب ملکہ کا انتقال ہو گیا اس نے میڈم سے شادی کرنے پر اصرار کیا۔ میڈم نے کہا میں آپ کی لونڈی بن کر رہنا چاہتی ہوں ملکہ نہیں۔ [illegible] باوجود اس کے میڈم کی انگلیوں کے اشارے پر پورا فرانس رقص کرتا تھا۔ وزیر بھی حکومت کے اکثر کام اس کی رائے پر چھوڑ دیتا۔ [illegible] اس کے ساتھ [illegible] میں کمپنیاں قائم کرتے تاکہ اس کی سب [illegible] کارروائیاں عمل میں آئیں۔ اپنے اقتدار و ثروت کے بعد بھی وہ غریبوں کا [illegible] نہ بھلا سکی۔ اور ہمیشہ ان کے لئے مدارس اور [illegible] قائم کرنے میں مصروف رہی۔

(۷) فلارنس نائیٹنگل

یہ ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اپنی فرصت کا بیشتر حصہ مغرب اور مشرقی ممالک کی سیاحت میں گذارتی تھی۔ یہ خیال [illegible] کہ اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتا تھا کہ اسے کوئی عظیم الشان کام انجام دینا چاہئے۔ اکثر وہ تنہا بڑبڑایا کرتی "عقل کہتی ہے کہ میں قناعت کی زندگی گذاروں لیکن حرص طبیعت کا اضطراب۔ شادی، محبت اور سیاحت کسی چیز کے [illegible] نظر نہیں آتا۔ خدایا! کون سی چیز سکون بخش سکتی ہو؟ آخر میرا کیا انجام ہونے والا ہے؟"

جب وہ ۳۰ برس کی ہوئی تو اسے اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کا ایک بہتر موقع ہاتھ آ گیا اور وہ اس طرح کہ اسی زمانہ میں جنگ کریمیا چھڑ گئی۔ جس میں زخمیوں اور مریضوں کی زیادہ تعداد موت سے ہمکنار ہو جایا کرتی تھی۔ وہ فوراً [illegible]

بہت سی دوسری نرسوں کو ساتھ لیکر میدان جنگ میں پہونچی۔ وہاں رات دن شفا خانوں کی نگرانی اور مریضوں کی تیمارداری کرنے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موتوں کی تعداد ۴۲ فی صدی سے گھٹ کر ۲ فیصدی تک پہونچ گئی جنگ کے اختتام پر جب وہ انگلینڈ واپس آنے لگی تو لوگوں نے چاہا کہ اس کا شاندار استقبال کریں مگر اس نے پسند نہ کیا اور اپنی متاع گمنامی کو کسی قیمت پر بیچنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس کی ساری زندگی شفا خانوں اور صحت گاہوں کی اصلاح درستگی میں گذری اور ۹۰ برس کی ہو کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۸) ہارٹ اسٹو

اس نے اپنا سارا زور قلم غلامی کی استیصال کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ بڑی حساس واقع ہوئی تھی اس لئے غلاموں کی ذلتوں اور تکلیفوں سے متاثر ہو کر۔۔۔۔ ایک افسانہ "انکل ٹام کا محل" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ جس میں اس نے غلامی کی لعنتوں کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ افسانہ تین نمبروں میں ختم ہو جائے گا۔ لیکن کئی نمبروں کے نکل جانے کے بعد آخر میں اس نے لکھا "میں افسانہ کے اختصار پر قابو نہ پا سکی۔ اتنا بڑا افسانہ خود بخود لکھا گیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ خدا نے لکھایا اور میں محض آلہ کار رہی"۔ اس افسانہ نے لنکن کی غلامی کے خلاف چھڑی ہوئی جنگ میں حصہ لینے کے لئے لوگوں کو بالکل تیار کر دیا۔

(۹) میڈم کوری

اس نے "ریڈیم" کا انکشاف کیا۔ زمانۂ حاضرہ کی یہ ایک مشہور عورت تھی۔ صبر و تحمل کا مجسم نمونہ تھی۔ آلات علمیہ کی بے سروسامانی کے باوجود وہ اپنے شوہر کے ساتھ نور افگن اجسام کی خاصیات کا مطالعہ کرتی رہی اور آخر میں ریڈیم کے انکشاف کے نتیجہ تک پہونچی۔ جب حکومت فرانس نے اس کے شوہر کو تمغہ عنایت کرنا چاہا تو اس نے تمغہ کے بجائے علمی تجربات کے لئے ایک کارخانہ قائم کرنے کے لئے کہا۔ کچھ دنوں کے بعد جب شوہر کا انتقال ہو گیا تو اس نے اس کی لاش پیرس میں خوشی خوشی تابوت کے اندر رکھتے ہوئے کہا "اس کی ساری زندگی ضیق میں بسر ہوئی کبھی امن و سکون نصیب نہیں ہوا۔ میں اکثر اس کے سامنے اس کی اس زندگی پر اظہار افسوس کیا کرتی تھی مگر ہمیشہ وہ مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیتا تھا کہ یہی زندگی تو ہے جسے ہم نے پسند کیا۔

(۱۰) الیانورہ ڈیوز۔ یہ اٹلی کی ایک مشہور ایکٹرس تھی چلتی ہوئی ریل میں پیدا ہوئی تھی۔ بچپن فقر و فاقہ اور بیماریوں میں بسر ہوا لیکن خوبی قسمت سے انیسویں برس میں اٹلی کی سب سے مشہور ایکٹرس بن گئی۔ شروع میں اٹلی کے ایک مشہور شاعر ڈانزیو سے محبت ہو گئی تھی۔ پھر وہ لندن اور امریکہ کے اسٹیجوں کی زینت بنتی رہی۔ اس اثنا میں عیش و عشرت کی تمام چیزیں اس کے قدموں پر نثار ہو رہی تھیں لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد قسمت کا ستارہ گردش میں آیا اور اس کی دولت و شہرت و ناموری، دوست آشنا سبھوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ آخر کار غربت ہی کی حالت میں اس نے امریکہ کی ایک سرائے میں اپنی جاں شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔

ایک نامعلوم مزار پر

(از جناب حافظ محمد سلیمان صاحب سالک کانپوری)

مجھ کو بتلا دے تو آج اے اشکبار روزگار — سامنے آنکھوں کے ہے کس پاک ہستی کا مزار

تو کس کے دل کا ہے یہ کس کے گھر کا ہے چراغ — جگمگاتا ہے جس کی ضو سے شاعر کا دماغ

کس کی تربت ہے یہ آخر کون ہے یہ سر در خواب — گرد جس کے پھر رہے ہیں آفتاب و ماہتاب

تنگدل ہو کر کسی دنیا کے شور و شین سے — خاک کی چادر کو اوڑھے سو رہا ہے چین سے

کاروبار دہر میں شاید نہیں آتی ہے نیند — گوشۂ مرقد میں اسکو کھینچ کر لائی ہے نیند

موجوں کی مانند ہوتی کشتی جو ساحل پر ہو
یعنی دنیا کا مسافر موت کی منزل میں ہو

آفرینش سے یہی ہے کاروبار روزگار — موت پر ہوتا ہے آخر زندگی کا انحصار

کنج تنہائی میں سایہ افگنوں میں جگمگا رہا ہے تو — محفلوں میں شاہزادوں میں کھیلتا ہوں ہی تو

جھونپڑے کے گھر میں او بادشاہوں کے کاشانوں میں تو — شہروں کو بنگلوں میں صحن ویرانوں میں تو

کون ہے تو کیا ہے تو کہاں ہے؟ کچھ بتا سکتا نہیں — کیا ہمیشہ خود کو جو لب تک لا سکتا نہیں

جس کے دم سے سارا جہاں معمور ہو
قبر کی آغوش میں وہ اس قدر مجبور ہو

جب یہی ہے پیدائشِ پاک انجام حیات — چھائے شمع زندگی پر قبر کی تاریک رات

مجھ کو دے وہ زندگی جو جاوداں ہو کر رہے — میری مشت خاک رشک آسماں ہو کر رہے

تھرتھرا جائیں مری آواز سے شیروں کے دل — یعنی پانی کی طرح بہنے لگے پتھر کی سل

پھونک دیں باطل کا خرمن عرصۂ پیکار میں — بجلیوں کا آشیانہ ہو مری تلوار میں

فرق دشمن کو پیام برشِ شمشیر دوں — اپنے دونوں ہاتھوں سے باطل کا کلیجہ چیر دوں

جنگ کا انجام دشمن صورت مایوس ہیں — خون انکے چہروں کا میری نگاہیں چوس لیں

دشت دریا کی طرح موجوں کی رو دینے لگے — خون کا قطرہ گرے تو خاک رو دینے لگے

آؤں میں جس وقت بھی تیرے حضور ذوالجلال — خون میں ڈوبا ہوا مرد مجاہد کی مثال

خون کے چھینٹے بجائیں زندگانی کا شرر — مسکراؤں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

سوال و جواب

حضرت داؤد علیہ السلام اور قصہ اوریا

(۳)

(از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

ایک عزیز دوست اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔
آیات وھل اتاک نبؤا الخصم اذ تسوروا المحراب اذ دخلوا علی داؤد ففزع منھم قالوا لا تخف خصمان بغی بعضنا علی بعض فاحکم بیننا بالحق ولا تشطط واھدنا الی سواء الصراط الخ (سورہ ص رکوع ۲)
کے تحت میں تفسیر کی اکثر کتابوں میں ایک عجیب و غریب قصہ منقول ہے۔ معلوم نہیں یہ قصہ کچھ اصلیت بھی رکھتا ہے یا بعض حکایات پسند حضرات کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے؟

جس قصہ کی بابت استفسار کیا گیا ہے اسے بعض غیر محتاط مفسرین نے اپنی کتابوں میں جگہ ضرور دیدی ہے لیکن عام طور سے یہ بات معلوم ہے کہ اس عجیب و غریب قصہ کا ماخذ تمام تر اسرائیلیات ہے جمہور مفسرین نے اسے سرتاسر لغو اور ناقابل التفات قرار دیا ہے۔ محققین کی تو پوری جماعت نے اسے بیہودہ ٹھہرایا ہے۔ خوف طوالت مانع نہ ہوتا تو اس بے سروپا قصہ کو کتاب مقدس کے باب سموئیل دوم سے نقل کر کے خود اسی کتاب سے اس کا ابطال کیا جاتا۔ خدا کا شکر ہے زمانہ حال کے بعض بزرگوں نے اس نہج سے اس قصہ کی خوب قلعی کھولی ہے۔
ائمہ تفسیر میں سے یوں تو سب نے اس قصہ کی خوب پردہ دری کی ہے لیکن اس باب میں امام رازی کو خصوصیت کبریٰ حاصل ہے۔
امام صاحب نے اس قصہ کے ابطال میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ اختصار کے ساتھ ہم اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

امام رازی کی تقریر کا خلاصہ۔ امام صاحب فرماتے ہیں:۔ اس قصہ میں لوگوں کی تین جماعتیں ہیں۔
(۱) فریق اول اس قصہ کو اس طرح بیان کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے (نعوذ باللہ)

(۲) فریق ثانی کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ کبیرہ کے تو مرتکب نہ ہوئے لیکن صغیرہ کی صورت پیدا ہو گئی

(۳) فریق ثالث کے نزدیک تو اس قصے سے حضرت داؤد کی جانب کبیرہ کی نسبت جعلی ہے اور صغیرہ کی بلکہ اس میں تو آپ کی مدح کا پہلو نکلتا ہے۔

فریق اول کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت داؤد کو اوریا کی بیوی سے محبت ہو گئی پس اس کے حصول کے لئے آپ نے [illegible] کے [illegible] جنگ میں بھیج دیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا اور آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا اس پر اللہ نے دو فرشتوں کو ایک مقدمہ کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا تاکہ اس کے ذریعہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوں چنانچہ ایسا ہی ہوا جب اس قضیہ کے فیصلے سے آپ پر اپنی غلطی منکشف ہوئی تو آپ فوراً دعا و استغفار میں لگ گئے۔

امام صاحب فرماتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ قصہ حسب ذیل وجوہ کی بنا پر سراسر کذب و افترا ہے

(۱) انبیاء علیہم السلام کی شان عصمت کے بالکل منافی ہے۔

(۲) اس قصہ کے تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت داؤد علیہ السلام دو شرعی گناہوں کے مرتکب ہوئے اول یہ کہ ایک مسلمان کو ناحق قتل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے یہ کہ ناجائز طریقے سے اس کی بیوی کو حاصل کرنے کا ارادہ کیا

(۳) آغاز قصہ سے پہلے اور اختتام قصہ کے بعد حضرت داؤد کے جو اوصاف مذکور ہیں وہ اس قصہ کے بالکل منافی ہیں

(۱) مثلاً اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے حضرت داؤد کے صبر و استقامت کی داستان بیان کی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ نے خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر ایک ناحق خون بہایا تو خدا کے لئے کیونکر مناسب تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کا سبق حضرت داؤد کی سیرت سے لینے کا حکم دے حالانکہ وہ خواہش نفس کے مقابلہ میں صبر و استقامت نہ دکھا سکے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو عبدنا کہہ کر پکارا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اطاعت و تقویٰ کے اعتبار سے کامل تھے اگر ہم تسلیم کریں کہ آپ مذکورہ اعمال کے مرتکب ہوئے تو ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ عبدیت میں بالکل ناقص تھے۔

(۳) آپ کی صفت میں ذو الاید کہا گیا ہے یعنی احکام الٰہی کی ادائیگی میں آپ کو بڑی قوت حاصل تھی اگر اس وصف کے باوجود آپ ان محرمات کے مرتکب ہوئے تو اس صفت کا انتساب آپ کی ذات کی جانب بے معنی ہے۔

(۴) آپ کو صفت اواب سے موسوم کیا گیا ہے یعنی آپ اللہ ہی کے سامنے ہمیشہ رجوع رہتے تھے حالانکہ ان افعال کو تسلیم کر کے آپ کو اس وصف سے متصف ماننا بالکل ناموزوں ہوگا۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے اپنے عنایات کے [illegible] جس شخص کے کارنامے اس قسم کے ہوں [illegible] کہ وہ دنیا میں شر و فساد پھیلائے۔

[illegible] ان مزخرفات سے

بالکل پاک ہے، سب وہ اوصاف جو اختتام قصہ کے بعد مذکور ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ سراسر باطل ہے ان میں سے چند مشہور اوصاف کا ہم یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) اگر اس قصہ کا مطلب وہی ہو جو حکایات پسند مفسرین قرار دیتے ہیں تو خدا کا یہ ارشاد وان لہ عندنا لزلفی وحسن مآب اختتام قصہ کے بعد بالکل بے موقع ہوگا۔

(۲) آغاز قصہ سے پہلے کی آیت اور اختتام کے بعد کی آیت دونوں سے حضرت داؤد کی مدح نکلتی ہے اب اگر یہ کہا جائے کہ درمیان کی آیت ان کی مذمت پر مشتمل ہے تو یہ بالکل لایعنی بات ہوگی اور قرآن کی فصاحت و بلاغت پر حرف آئیگا

(۳) حضرت داؤد نے وان کثیرا من الخلطاء لیبغی بعضھم علی بعض الا الذین آمنوا میں مومنین کو بغی سے مستثنیٰ کر دیا ہے اگر اس بیہودہ قصہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ بغی کے ساتھ متصف تھے اور عدم ایمان کا خود ہی فیصلہ کر دیا اور یہ سراسر باطل ہے۔

(۴) ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی فرمایا کرتے تھے جو شخص حضرت داؤد کے قصہ کو اس طرح بیان کرے گا جس طرح قصہ گو حضرات بیان کرتے ہیں تو اسے میں ۱۶۰ درے لگاؤں گا۔

اسی طرح اور بہت سے وجوہ امام صاحب نے اس بے سروپا قصہ کے ابطال میں بیان کئے ہیں جنھیں میں قصداً نظر انداز کرتا ہوں۔

فریق ثانی کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام گناہ کبیرہ کے مرتکب تو نہ ہوئے لیکن صغیرہ کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس فیصلہ کی متعدد توجیہیں اس طرح کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ سے گناہ صغیرہ کا ارتکاب ہوا مثلاً وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اوریا کو قتل کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی البتہ آپ سے یہ غلطی (نعوذ باللہ) سرزد ہوئی کہ اگرچہ اس عورت کی نسبت اوریا سے ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے اقربا نے اوریا کے مقابلہ میں آپ کو ترجیح دی اور آپ نے اس سے شادی کرنی منظور کر لیا۔ اسی طرح کی اور بعض توجیہیں ہیں لیکن ان کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں ان توجیہات کے ذکر کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں گو کہ یہ صورتیں جائز ہیں اور انھیں تسلیم کرنے کے بعد صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت داؤد سے ترک اولیٰ کا قصور سرزد ہوا لیکن ہمارے نزدیک یہ بات بھی نبی کی شان کے منافی ہے

فریق ثالث کے قول کا ملخص یہ ہے کہ صغیرہ یا کبیرہ کا کیا ذکر اس قصہ سے تو حضرت داؤد کی مدح نکلتی ہے وہ اس طرح سے کہ جس روز جبکہ آپ خاص عبادت کے لئے محراب میں تشریف فرما تھے چند دشمن موقع پاکر بری نیت سے دیوار پھاند کر آپ کے پاس آ گئے، لیکن جب انھوں نے محافظ اور دربان دیکھا تو اپنے بچاؤ کے لئے ایک قضیہ تراش کر آپ کے روبرو فیصلہ کے لئے پیش کر دیا گو آپ ان کے فاسد ارادہ سے مطلع ہو گئے تھے اور انتقام کا جذبہ بھی مشتعل تھا لیکن یہ سوچ کر کہ پیغمبر کے حلم و عفو کا امتحان ہے اپنے ارادہ سے باز رہے اور توبہ و استغفار میں لگ گئے۔"

تفصیل [illegible] بات متحقق ہوگئی کہ فریق اول [illegible] فریق ثانی نے جو راہ اختیار کی ہے دوسرا سراسر باطل ہے البتہ فریق ثالث [illegible] ہے اور [illegible] امام رازی نے بھی کی ہے اس میں اس قدر کی گنجائش نہیں کہ [illegible] [illegible] ہے اس پر کوئی دلیل نہیں [illegible] کی گئی ہے۔ غالباً فریق ثالث اور امام صاحب نے ذکرہ [illegible] ہے کہ بعض اوقات بعض سے ان کی نسبت ملائکہ کی جانب ممکن نہیں اس لئے [illegible] کے متعلق [illegible] ہے۔

(۱) [illegible]

(۲) [illegible] یا قول

[illegible]

[illegible] تعاون و غلبہ و تفوق [illegible] تاریخ شاہد [illegible] آپ [illegible] کی سلطنت [illegible] خوکیت کی جا [illegible] جاتی تھی [illegible] [illegible] کے سامنے آنے کی حضرت [illegible] دونوں اشتباہ ہوگی [illegible]

[illegible] رسل بھی [illegible] سے [illegible] نعمۃ علی نعمۃ واحدۃ۔ [illegible] کرتے تھے بالخصوص رہبان وغیرہ [illegible] چیزیں ہوا کرتی تھیں [illegible] کی تصویریں ہوا کرتی تھیں [illegible] یہ حقیقت نہیں بلکہ تمثیل [illegible] تصویریں ہوا کرتی تھیں [illegible] ذہنوں میں [illegible] کہ انھیں کے [illegible] ہے۔

[illegible] آیات متعلقہ کے [illegible] ذہن جا سکتا ہو اور جو بظاہر شبہ بھی ہیں امام صاحب نے اسکا مختلف طریقہ سے جواب دیا ہو [illegible] ہمیشہ امر الٰہی کا منتظر رہتا ہو [illegible] کبھی [illegible] صورت حال بیان [illegible]

دلچسپ معلومات

ایک کتاب جو ۵۰۰ سال میں طیار ہوگی

برسلس کے سات آدمیوں نے ۱۹۳۰ء میں سیکی دنیا و مقدسین کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اب تک یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی حالانکہ اس کے مولفین نے ایک دن بھی بیکار ضائع نہیں کیا۔ اس جملہ سے ناظرین اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائیں کہ کتاب کے مولفین ۱۶۳۰ء سے اب تک زندہ ہیں۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ مولفین کی ایک جماعت برابر کام میں مشغول رہتی ہے جب ان میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کی جگہ پر کسی دوسرے کو منتخب کر لیا جاتا ہے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۵۰۰ سال میں اختتام کو پہنچے گی یعنی ۲۱۳۰ء سے پہلے مکمل نہ ہوگی اس کتاب کی تالیف میں حصہ لینے والے وہ رہبان ہیں جنہوں نے اپنے کو اسی کام کے لئے وقف کر دیا ہے یہ لوگ صبح ساڑھو پانچ بجے اٹھتے ہیں اور رات کو ساڑھے نو بجے سوتے ہیں درمیان کے اوقات میں سوا کتابیں پڑھنے اور لکھنے کے اور کچھ ان کا کام نہیں ہوتا۔ مولفین کی یہ جماعت اپنے اس کام پر کسی قسم کی اجرت نہیں لیتی بلکہ محض خدمت دین سمجھ کر انجام دے رہی ہے۔

خود شہر برسلس کے مقدسین کے حالات تقریباً ۳۰۰ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد قلم بند ہو سکے ہیں۔

ایک بندر جو دل کی باتیں معلوم کر لیتا ہے

آجکل کے بہت سے بڑے بڑے علماء کا خیال ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی مخفی طاقت موجود ہے جس کے ذریعہ وہ دوسروں کے خیالات معلوم کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو جو عجیب و غریب قوتیں عطا کی ہیں اس کے لحاظ سے یہ خیال چنداں عجیب نہ تھا لیکن اس خبر نے لوگوں کو سخت حیرت میں ڈال دیا ہے کہ انسان تو انسان بعض بندر بھی اپنے اندر یہ طاقت رکھتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آسٹریا کے ایک ڈاکٹر کے پاس ایک بندر جو لوگوں کے دل کی باتوں کو ان کی پیشانی پر پڑھ لیتا ہے ایک مرتبہ اس ڈاکٹر نے ڈاکٹروں اور علماء کی ایک جماعت کی موجودگی میں سیب، کیلا، گیند، گھڑی اور ایک پنسل بندر کے سامنے رکھدی اور ان سے کہا کہ ان چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اپنے ذہن میں منتخب کریں۔ سب نے پنسل منتخب کی۔ اس کے بعد جب بندر کو چھوڑ دیا گیا تو وہ ہر چیز کو یکے بعد دیگرے الٹ پلٹ کر پنسل کے پاس پہونچا

اوس نے ہاتھ پیر سے کرناٹک کے سامنے رکھ دیا۔ جو لوگ اس موقع پر موجود تھے وہ بندر کی اس عجیب و غریب ذہانت پر حیران ہو گئے۔

بے زبان قبیلہ

بعض سیاحوں نے جنوبی امریکہ میں ایک ایسے قبیلہ کا پتہ لگایا ہے جو اپنی قسم کا بالکل نرالا ہے۔ ان سیاحوں کا بیان ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی گفتگو میں کوئی زبان استعمال نہیں کرتے بلکہ حیوانات کی طرح مبہم اشارات اور ناقابل فہم آوازوں کے ذریعہ ایک دوسرے کا مفہوم سمجھتے ہیں۔

اس قبیلہ کے لوگ بالطبع اپنے قبیلہ کے کسی نام سے واقف نہیں ہیں البتہ آس پاس کے رہنے والے لوگ انھیں "کیوریمو" کہتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس قدیم نسل والے قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو امریکہ کی انکشاف سے پہلے وہاں رہتے تھے۔ ان سیاحوں نے اس قبیلہ کی گفتگو کی بعض آوازیں نقل کی ہیں مثلاً جب وہ اپنے مقصد اور ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو "ہو ہو" "تو تو" کہہ کر چلانے لگتے ہیں۔

خوش بختی اور خودکشی

یہ تو عام طور سے مشہور ہے کہ لوگ مرض، فقر یا زندگی کی کلفتوں سے گھبرا کر خودکشی کرتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں سنا گیا تھا کہ . . . . کوئی اس لئے بھی خودکشی کرتا ہے کہ وہ بہت زیادہ خوش بخت ہے لیکن ابھی حال ہی میں میکسیکو کے ایک دولت مند شخص نے اس لئے خودکشی کر لی ہے کہ وہ بہت زیادہ خوش بخت تھا۔ خودکشی کے بعد اس کی جیب سے ایک رقعہ نکلا ہے جس میں لکھا ہوا ہے کہ "میں دنیا کا انسانی بدقسمت ترین شخص ہوں کیونکہ میں بہت زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میرے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ میری صحت بھی اچھی ہے۔ بیوی بھی حسین اور وفادار ہے۔ مخلص احباب کی ایک کثیر جماعت بھی رکھتا ہوں۔ غرض میرے پاس وہ تمام چیزیں ہیں جن کی ایک انسان خواہش کر سکتا ہے۔ اب مجھے میری موجودہ حالت سے بہتر حالت کا انتظار نہیں۔ اس لئے اب مجھے زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ناقابل علاج مرض

اس زمانہ میں ہر روز نئے نئے امراض پیدا ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ عجیب وہ مرض ہے جو ابھی حال میں امریکہ میں نمودار ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے کسی شہر میں ایک بچہ ہے جو دن رات بولا کرتا ہے اور ایک دم کے لئے بھی خاموش نہیں ہوتا۔ اس کے والدین و اقارب نے ہر چند اسے خاموش رکھنے کی کوشش کی لیکن انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ مجبور ہو کر اسے انھوں نے ہسپتال میں داخل کر دیا ہے جہاں وہ بڑے ڈاکٹروں کے زیر علاج ہے۔ دیکھئے انھیں اس عجیب و غریب مرض کو رفع کرنے میں کامیابی ہوتی ہے یا نہیں۔

کوائف عالم اسلامی

فلسطین

شاہی کمیشن کے ارکان میں اختلاف

فلسطین کے بعض اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ شاہی کمیشن نے ملک معظم کی حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لئے جو تجاویز مرتب کی ہیں ان میں اختلاف ہوگیا ہے۔ کمیشن کے ارکان اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دو مختلف تجویزیں پیش کریں گے ارکان کی اکثریت اس طرف ہے کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔

فلسطین میں شورش

حکومت فلسطین کا ایک سرکاری بیان مظہر ہے کہ قدس کے جنوب میں شورش اور اضطراب ترقی پذیر ہے۔ چنانچہ وہاں چار موٹر کاروں کو آگ لگادی گئی اور عراک میں عید بنی موسیٰ کی تقریب میں کسی شخص نے گولی بھی چلادی۔ ایک عرب اور ایک یونانی کو اسلحہ رکھنے کے جرم میں ۱۵ اور ۵ سال کی سزا دے دی گئی۔ غرض فلسطین کا اضطراب رستور جاری ہے اور حکومت اس کی روک تھام کے لئے انتہائی کوشش کررہی ہے۔

حکومت فلسطین کے محکمۂ مہاجرت کی دلچسپ رپورٹ

حکومت فلسطین کے محکمۂ مہاجرت نے ۱۹۳۶ء کے دلچسپ اعداد و شمار پیش کئے ہیں، اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۲۰ء سے اب تک کتنے یہودی فلسطین میں داخل ہوچکے ہیں، اور ہر سال ہجرت کا کیا تناسب ہے۔

رجسٹرڈ یہودیوں کے اعداد۔	سال
۴۲۶۸۴ -	۱۹۲۰ء ۱۹۲۴ء
۵۶۰۳۲	۱۹۲۶ء۔ ۱۹۲۹ء
۴۹۴۴	۱۹۳۰ء
۳۰۶۵	۱۹۳۲ء
۹۵۵۳	۱۹۳۳ء
۳۰۳۲۶	۱۹۳۴ء
۶۱۸۵۴	۱۸۳۵ء

۱۹۳۶ء
۲۹۷۲۷

موجودہ تعداد وشمار ان یہودی مہاجرین کے ہیں جو باقاعدہ حکومت کی اجازت سے پروانۂ راہداری لے کر فلسطین میں داخل ہوئے ان کے علاوہ یہودی چھپ کر اور پاسپورٹ کے بغیر کثیر تعداد میں داخل ہوئے جن کا سرکاری رپورٹ میں اقرار کیا گیا ہے۔

رپورٹ میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ عربوں اور یہودیوں کی آبادی کب مساوی درجہ حاصل کرلے گی اگر یہ سکیم چلے شمار ہے کہ یہودیوں اور عربوں کی آبادی برابر کردی جائے۔ یہاں صورت یہ ہے کہ آبادی کے تناسب میں یہ مساوات کب اور کس سنہ میں قائم ہوگی نقشہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر ہر سال ۶۰۰۰۰ یہودی فلسطین میں داخل ہوتے رہے تو ۱۹۴۶ء یعنی پورے دس سال جب سال ختم ہونے سے پہلے ہی عربوں اور یہودیوں کا تناسب آبادی مساوی درجہ حاصل کرے گا۔

ایران

ایران میں وحدت جنسیت

کولمبیا کالج کے ایک پروفیسر جو حال ہی میں ایران سے واپس آئے ہیں بمبئی کرانیکل کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے ایران جدید کے متعلق بہت دلچسپ حالات بیان کئے ہیں۔

وحدت جنسیت کے بارے میں فرمایا حکومت ایران نے اپنی رعایا میں نسل وقوم اور مذہب کے امتیازات اور اختلافات کا بالکل خاتمہ کردیا۔ اب ایران میں ہر شخص ایرانی ہے اور کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون ہے اور عیسائی کون ہے۔ ہر شخص پہلے ایرانی ہے پھر اس کا مذہب اور اس کی نسل کا اثر دیکھا جاتا ہے۔ کوئی چیز اب فرقہ واری نہیں ہے شیعہ اور سنی حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں وہ اب سمجھ گئے ہیں کہ عقائد کی منافرت کتنی بری چیز ہے۔

مصر

مصر کی جنگی تیاریاں

مسٹر کابن بشیر حکومت مصر اور دو فوجی افسر احمد ناجی اور احمد عبدالرزاق انگلستان کے لئے پورٹ سعید روانہ ہوگئے تینوں حضرات فن پرواز میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اور انگلستان کی روانگی کا مقصد یہ ہے کہ وہاں جا کر ہوائی جہازوں کے متعدد کارخانوں کا معائنہ کرکے اور یہ معلوم کرکے کہ کس کمپنی سے بہتر جہاز مل سکیں گے یہ لوگ حکومت مصر کے لئے سال رواں میں ۲۰ جہاز خریدیں گے۔ یہ طیارے بمبار بھی ہوں گے اور جنگی بھی کیونکہ حکومت مصر کا فوجی محکمہ ان کو اپنی فضائی طاقت میں استعمال کرے گا۔

حکومت مصری کی جانب سے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے لئے ۹ طیارے خریدے جائینگے۔ اس کے علاوہ یہ مصری وفد یورپ کے ہوائی مدارس کا بھی معائنہ کرے گا۔

مصر میں برہنگی کے خلاف قانون

مصری پارلیمنٹ میں ایک جدید قانون منظور کیا گیا ہے جس میں مصری مسلم خواتین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نیم برہنہ لباس استعمال نہ کریں اور جب گھر سے باہر نکلیں تو پردے کو ملحوظ رکھیں۔

ترکی

ادائگی قرض کے متعلق ترکی اور جرمنی کی گفت شنید

البلاغ کا نامہ نگار مقیم استنبول رقمطراز ہے کہ اس وقت ترکی کا قرضہ بقدر ۴ کروڑ ۵ لاکھ پونڈ بذمہ جرمنی واجب الادا ہے۔ برلن میں دونوں حکومتوں کی تجارتی گفت وشنید میں یہ طے ہوا ہے کہ جرمنی اس قرضہ کے عوض ترکی حکومت کو ۴۴ ہوائی جہاز اور دیگر جنگی سامان بنا کر دے گا اور اس طرح جرمنی ترکوں کا قرضہ آسانی سے ادا کر دے گا۔

نو ماہ میں ترکی حکومت کی آمدنی

ترکی وزیر مال نے ۱۹۳۶ء میں نو ماہ کی آمدنی کے اعداد وشمار شائع کردیئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹ ماہ کے عرصہ میں حکومت کو ۱۳،۷۰،۱۹،۰۱۸ پونڈ کی آمدنی ہوئی۔ ۱۹۳۵ء کے مقابلہ میں ۱۹۳۶ء میں ترکی حکومت کو ۲۸۲۲۲۴۴ پونڈ کی آمدنی زیادہ ہوئی۔

پارلیمنٹ میں وزیر تعلیم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ترکی قلمرو میں ابتدائی اور اقلیمی مدارس کے لئے عام باشندوں نے ۴۴۲۲۴ ۰ ۱۲ پونڈ کے اوقاف سے حکومت کی مدد کی ہے آئندہ اس سے بھی زیادہ کی توقع کی جاتی ہے۔

ممالک اسلامیہ کی روح پرور حرکت

انقرہ ۲۴ مئی۔ بذریعہ ہوائی ڈاک ڈاکٹر ابی دولت عراق کے وزیر امور خارجہ یہاں تین دن کے قیام کے لئے آئے ہوئے ہیں وہ سرکاری مہمان ہیں اور عنقریب ڈاکٹر توفیق آراس سے ان کی اہم سیاسی گفتگو ہونے والی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غالباً مجوزہ ایشیائی میثاق کے سلسلے میں بات چیت کریں گے۔ یہ میثاق بہت مدت سے عالم اسلام اور دیگر ایشیائی ملکوں کے درمیان ایک سلسلہ بحث وتمحیص کا سبب بنا ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک اس کی کوئی تکمیل نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس میثاق کے دائرہ آغوش میں کل ایشیائی سلطنتوں کے لئے اصولاً جگہ رکھی گئی ہے۔ لیکن اب تک یہ ممالک اسلامیہ کے درمیان ہی محدود رہا ہے اور خیال یہ کیا جاتا ہے کہ موسم گرما کے شروع ہی میں کسی خاص رسم طہران دارالسلطنت ایران میں اس میثاق پر ترکی عراق ایران اور افغانستان کے دستخط ہو جائیں گے۔

تقریظ و تبصرہ

جمع القرآن والاحادیث

مرتبہ مولانا ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی، تقطیع خورد، ضخامت ۹۶ صفحات قیمت ۸
ملنے کا پتہ: اہل حدیث اکیڈمی، اہل حدیث دارالاشاعت لاہور

عام طور سے کم علم لوگوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ قرآن مجید کے جمع کرنے والے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں حالانکہ یہ خیال بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ محققین علماء نے ہر دور میں اس کی تردید کی ہے اور مدلل ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید اپنی موجودہ شکل میں خود آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مرتب ہو چکا تھا اور حضرت عثمانؓ کا کام صرف یہ تھا کہ اپنے زمانہ خلافت میں اس کی مستند نقلیں کرا کے اطراف و دیار میں بھجوا دیں۔ خود قرآن مجید سے اس پر محکم دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں چنانچہ استاذ الامام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورہ قیامت میں آیت ان علینا جمعہ وقرآنہ سے اس پر نہایت قوی اور دلنشین استدلال قائم کیا ہے۔ مولانا ابوالقاسم صاحب تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس مسئلہ پر نہایت بسط و تفصیل سے بحث کی اور ایک بہترین رسالہ مرتب فرما دیا۔

اس کتاب میں دو باب ہیں۔ پہلے باب میں قرآنی آیات، احادیث نبوی اور آثار صحابہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید اپنی موجودہ ترتیب کے ساتھ عہد نبوی ہی میں جمع کیا جا چکا تھا اور دوسرے باب میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ احادیث کی تدوین دوسری صدی ہجری میں ہوئی۔ فاضل مصنف نے بکثرت روایات و آثار نقل کر کے واضح کیا ہے کہ احادیث آنحضرت صلعم کے آخری زمانہ رسالت اور عہد صحابہ ہی میں کتابی صورت میں جمع کی جا چکی تھیں۔ ہر دو مذکورہ دعاوی کے اثبات کے لئے مصنف نے مستند کتابوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر روایات و آثار کی ڈھیر لگا دی ہے۔ جس سے ان کی جانفشانی اور وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ یاد پڑتا ہے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں پہلی مرتبہ اس قسم کی روایتیں بسط کے ساتھ جمع کی تھیں جن سے عہد نبوی میں کتابت کا ثبوت ملتا تھا لیکن غالباً اس وقت ان تمام روایات کا استقصاء نہ ہو سکا تھا جو مولانا سیف صاحب نے جمع کر دی ہیں۔

اس رسالہ میں صرف یہی نہیں کہ روایتیں جمع کر دی گئی ہیں بلکہ ساتھ ہی ہر جگہ یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر مدعا پر دلالت کرتی ہیں۔ غرض یہ رسالہ مسئلہ جمع قرآن و احادیث کے متعلق نہایت تحقیق اور محنت سے لکھا گیا ہے البتہ اگر ہمیں اس میں کچھ نقص نظر آتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں ان روایات سے تعرض نہیں کیا گیا ہے جو مستند کتابوں میں مذکور ہیں اور جن سے دھوکا ہوتا ہے کہ قرآن کی جمع و ترتیب حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں ہوئی۔ . . . . مثلاً وہ روایت جس میں حضرت عثمان

حضرت ابن عباس کے استفسار پر سورۃ توبہ اور انفال کے درمیان بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ بیان کی ہے۔ اس قسم کی روایتوں سے جو اشکالات پیدا ہوتے ہیں اگر انہیں اس کتاب میں رفع کر دیا گیا ہوتا تو یقیناً یہ کتاب مسئلہ مذکور کے متعلق "جامع" کہی جانے کی مستحق سمجھی جاتی۔

المعیشۃ الباقیۃ ترجمہ دیوان ابی العتاہیہ

از مولوی محمد ایوب صاحب عثمانی اورنگ آباد ضلع گیا حجم ۴۵ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ مصنف کے پتہ سے منگایا جا سکتا ہے۔

ابوالعتاہیہ عربی کا ایک نامور اور ممتاز شاعر گذرا ہے اس کے دیوان کا ایک حصہ ہندوستان کے متعدد عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ . . . . مترجم نے عربی خوان طلبہ کے لئے بقدر نصاب دیوان کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کر دیا ہے ہر شعر کے نیچے اس کا ترجمہ درج کیا گیا ہے اور جو مشکل الفاظ ہیں ان کی تشریح کر دی گئی ہے۔ ابتدا میں ایک مختصر مقدمہ بھی درج ہے جس میں شاعر کے حالات اور اس کی شاعری وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ ترجمہ ہم نے جا بجا سے دیکھا ہے صحیح سلیس اور شگفتہ ہے لیکن اس کے باوجود ہم طلبہ کو اس کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دے سکتے کیونکہ ہمارے نزدیک ان لوگوں کے لئے ترجموں پر اعتماد کرنا نہایت مضر ہے جو عربی ادب میں کچھ دستگاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، البتہ جو طلبہ محض امتحان میں پاس ہو جانا چاہتے ہیں یا وہ لوگ جو عربی سے ناواقف ہیں اور اس نامور شاعر کے خیالات و افکار سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں انھیں اس ترجمہ کی قدر کرنی چاہئے۔

انہار الادب فی شرح ازہار العرب

از مولانا محمد ایوب صاحب عثمانی اورنگ آباد گیا۔ ضخامت حصہ اول ۹۴ صفحات دوم ۲ ۱ قیمت فی جز ۱۰ ؍

ازہار العرب۔ علامہ محمد بن یوسف سورتی کی ایک مشہور کتاب ہے جس میں ایک خاص ترتیب اور مقصد کے مطابق، متقدمین و متاخرین شعراء کا منتخب کلام درج کر دیا گیا ہے۔ بعض مدرسوں کے نصاب میں یہ کتاب داخل ہے اور عربی ادب کے حصول کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید سمجھا جاتا ہے۔ مولانا محمد ایوب صاحب عثمانی نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور تمام مشکل الفاظ کو مستند لغات کی مدد سے حل کر دیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف اور سلیس ہے اور سمجھ کر کیا گیا ہے۔

ازہار العرب سہل و مشکل ہر قسم کے اشعار پر مشتمل تھی، انہار الادب کے بعد امید ہے طلبہ کے لئے اس کا سمجھنا بہت آسان ہو جائیگا

رسالہ رفیق الصلوۃ حصہ اول

مولفہ جناب مولوی محمد رفیق صاحب نائب صدر جمعیت تبلیغ الصلوۃ دہلی۔

تقطیع کلاں۔ کاغذ کتابت و طباعت معمولی ضخامت ۳۲ صفحات ملنے کا پتہ:۔ قاضی حویلی رضیہ بیگم دہلی۔

اس کتاب میں نماز اور وضو وغیرہ کے فقہی مسائل سہل اور سادے طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ ایمان کی تعریف و تشریح بھی تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے نماز وغیرہ کے مسائل معلوم کرنے کے لئے یہ رسالہ بہت مفید ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں پہلا حصہ مفت